شاہجہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت

تاوان

طاہر جاوید مغل

بار اوّل ——— ۲۰۰۰ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— المدینہ کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۶۰ روپے

ISBN 969-517-021-8

اُس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنا دیا تھا۔ اُس کا نام شاہ جہان رکھا گیا مگر دنیا نے اُسے جہانی استاد کے نام سے پہچانا اکثر ایسا ہوتی کہ سینہ اُس کے روبرو حکم ہوتی چلی گئیں، جرائم کی دنیا کے بڑے بڑے روشن نام اُس کے شاگرد بن چکے تھے قانون کے محافظوں کے لیے وہ ہیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی صعوبتیں اُس کا مقدر بنیں مگر گردش حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے، زندگی کی جہانی استاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔ حالات کی ہر نئی کروٹ اُسے اُن جانے راستوں پر گامزن کر رہی تھی اور وہ بادلِ ناخواستہ اُس سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پُر پیچ سرگزشت۔

اندر آنے والا صفدر تھا۔ لڑکی جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ صفدر کے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے۔ وہ تیزی سے بولا "ارشاد صاحب۔ دروازے پر ایک گاڑی آئی ہے۔"

پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ اصلی ارشاد احمد واپس آگیا ہے' اور ہم اس کے گھر میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے ہیں۔ لیکن پھر فوراً ملازم مصدق کی بات یاد آئی۔ وہ ایک سے زائد مرتبہ کہہ چکا تھا کہ ارشاد شادی کی جس تقریب پر گیا ہے وہ جلد ختم ہونے والی نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ وہیں بیٹھے میں ابھی آتا ہوں۔

صفدر کے ساتھ میں باہر پورچ میں آیا۔ بیرونی گیٹ بند تھا اور گیٹ کی دوسری جانب ایک پجارو کی ہیڈ لائٹس نظر آرہی تھیں۔ اسی دوران میں چرسی مصدق بھی لڑکھڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جا کر دیکھے کون ہے۔

مصدق گیٹ کی طرف گیا تو میں اور صفدر قریبی کمرے میں گھس گئے۔ کمرے میں تاریکی تھی' ادھ کھلے دروازے میں سے ہم دونوں مصدق کی کارروائی دیکھنے لگے۔ وہ پجارو کے قریب کھڑا پجارو سوار سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ پجارو میں بیٹھے ہوئے فرد یا افراد کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ اسی دوران میں کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کیا پھر ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس پر رومال رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں "ہیلو" کہا۔

"کون؟" دوسری طرف سے بھاری بھرکم مردانہ آواز آئی۔

"ارشاد بول رہا ہوں۔" میں نے کھانستے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! بندہ پہنچا کہ نہیں؟"

"کون؟"

"یار! وہی رجب جان۔"

ایک دم میرا دھیان پجارو سوار کی طرف چلا گیا۔ شاید میرا مخاطب اسی کی بات کر رہا تھا۔

میں نے کھانستے ہوئے کہا "ہاں ایک پجارو آئی تو ہے گیٹ پر۔"

"ہاں ہاں وہی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا "اس سے معاملہ طے کرلو۔ تھوڑا بہت ایڈوانس بھی دے دو۔ بندہ بالکل بھروسے کا ہے۔ صبح مجھے فون کر کے بتانا کیا بات ہوئی' باقی اور سناؤ فرزانہ والا معاملہ کیسا جا رہا ہے؟"

"بس وہ تو۔۔۔" میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر ایک دم سلسلہ منقطع کر دیا۔ دوسری طرف یہی سمجھا گیا ہوگا کہ اچانک لائن ڈراپ ہوگئی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے بات کرنے والے کو میری آواز پر شک ہو۔

صفدر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں

اس کی نظروں کو نظرانداز کرکے دروازے کی طرف بڑھا۔ پجارو اب پورچ میں آچکی تھی۔ اندر سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نکلا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ اس کے شانے بہت مضبوط اور چوڑے تھے۔ گلے میں سونے کی زنجیر دور ہی سے دمک رہی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں نے کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں اسے دیکھا ہوا ہے۔ وہ مجھے جرائم کی جانی پہچانی دنیا کا کوئی "سکہ بند" چہرہ دکھائی دیا۔ جیسے وہ میرے لیے اجنبی تھا یقیناً میں بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس کے علاوہ فون پر اطلاع دینے والے کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ رجب جان اور ارشاد ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور یہ ان کی پہلی ملاقات ہے۔

مصدق نے اسے جاکر ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔ تھوڑی دیر بعد مصدق جھومتا لڑکھڑاتا میرے پاس واپس آیا۔ پتا نہیں وہ کس ترنگ میں تھا۔ حالانکہ سو روپیہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ لیکن وہ سو روپے کی ٹپ پر صدقے واری ہوا جارہا تھا۔ اس نے جیب سے نوٹ نکال کر ایک بار پھر اسے چوما۔ تب بڑے ادب سے مجھے "آپ جناب" کا خطاب دیتے ہوئے بولا "کوئی رجب جان صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا آیا ہوں۔"

یقینی بات تھی کہ مصدق ابھی تک چرس کے نشے میں دھت تھا اور مجھے ہی ارشاد احمد ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یقیناً آنے والے مہمان کو بھی وہ یہی بتا کر آیا تھا کہ ارشاد احمد صاحب گھر میں ہیں اور وہ انہیں لینے جارہا ہے۔ چند لمحے بعد ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ رجب جان ہمیں دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے بارعب لہجے میں کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر مجھے تمہاری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ تم رجب جان ہو نا...؟"

"جی ہاں۔ کل سیٹھی صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں پہلی فرصت میں آپ سے مل لوں۔"

ہم دونوں نے ہاتھ ملایا "آپ سے مل کر خوشی ہوئی ارشاد صاحب۔" رجب جان نے رسماً کہا۔ صفدر سے مصافحے کے بعد وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر ہم تینوں بیٹھ گئے۔ میں نے مصدق کو چائے لانے کو کہا۔

رجب جان کے چہرے پر قدرے حیرت نظر آئی۔ وہ جس سوسائٹی کا بندہ نظر آرہا تھا' وہاں چائے نوشی کو بچکانا شغل سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے کہا "ہم نے ابھی ڈرنکس لیے ہیں۔ اگر تم لینا چاہو تو منگوا لیتے ہیں۔ بہت اچھی شیمپین آئی ہے میرے پاس۔"

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے مصدق کو چائے کے علاوہ شیمپین کے لیے بھی کہا پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد ہی مجھے یقین ہوگیا کہ بظاہر مناسب حلیے اور لباس میں نظر آنے والا یہ شخص چھٹا ہوا بدمعاش اور خطرناک غنڈا ہے۔ وہ چند ماہ پہلے صوبہ سرحد سے اسلحہ لاتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور جیل کاٹ کر حال ہی میں رہا ہوا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم اصل موضوع پر آگئے۔ رجب جان نے سگریٹ سلگا کر ڈرامائی لہجے میں پوچھا "آپ جس بندے کو "پار" کرانا چاہتے ہیں' اس کو ذاتی طور پر جانتے تو ہیں نا...؟"

میں نے کہا "بالکل جانتا ہوں۔"

وہ بولا "پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آپ میرے ذمے کس قدر مشکل کام لگا رہے ہیں۔"

"بڑے معاوضے' مشکل کاموں کے لیے ہی دیے جاتے ہیں۔"

وہ مسکرایا تو اس کا دائیں طرف کا ٹوٹا ہوا دانت نمایاں ہوگیا "کئی کام ایسے ہوتے ہیں جو بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی نہیں کیے جاسکتے۔ بہرحال میں آپ کے لیے یہ کام ضرور کروں گا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کے ساتھ کام کرکے مزہ آئے گا۔"

عجیب صورتِ حال تھی۔ میں ایک بندے کو قتل کرانے کے بارے میں کرایے کے قاتل سے بات کررہا تھا اور مجھے ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کسے قتل کرانا چاہتا ہوں۔ میں بڑے محتاط انداز میں گفتگو کررہا تھا اور میری کوشش تھی کہ اس معاملے کی ساری گرہیں رجب جان کی زبان سے ہی کھل جائیں۔ رجب نے بندے کو پار کرنے کی بات کی تھی' اس سے مطلب یقیناً یہی تھا کہ وہ کسی کو قتل کرنے کا ذکر کررہا تھا۔ پھر رجب سے گفتگو کے دوران میں ایک دم مجھ پر اور صفدر پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ "مقتول" کون ہے!

رجب نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے آج کل بھیس بدل رکھا ہے؟"

"کس نے؟" میں نے پوچھا۔

"استاد جہانی نے۔" رجب نے کہا۔ اور یہی لمحہ تھا جب مجھ پر اور صفدر پر انکشاف ہوا کہ رجب اب تک کس کو پار کرنے کی بات کرتا رہا ہے۔ میں نے تیزی سے سنبھلتے ہوئے کہا "ہاں حلیہ تو اس نے واقعی بدل رکھا ہے۔"

"پھر شناخت کیسے ہوئی اس بدبخت کی؟"

"بس ہوگئی کسی طرح۔" میں نے کہا۔

"سنا ہے کہ آپ کے بندوں کے ساتھ اس کی کوئی

جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جہانی نے اپنا تعاقب کرنے والوں پر فائر کیے تھے اور لکشمی چوک میں ایک "تو ڈر" بھی الٹ گئی تھی۔"

"ہاں' یہ واقعہ کل ہوا تھا' لیکن لوڈر الٹی نہیں تھی' بس اس کا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔"

"جہانی استاد کا ٹھکانا تو معلوم ہے نا... آپ لوگوں کو؟"

"آج صبح تک تو معلوم تھا' اب کا کچھ کہہ نہیں سکتے۔"

صفدر بولا "عین ممکن ہے کہ اس نے گھر بدل لیا ہو۔"

رجب مسکرایا اور اس کا ٹوٹا ہوا دانت پھر نمایاں ہوگیا۔ طنزیہ لہجے میں بولا "گویا میرا یہ اندازہ درست ہے کہ آپ لوگ شاہ جہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے یا یوں کہہ لیں کہ بہت زیادہ نہیں جانتے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خود پر ہونے والے ایک قاتلانہ حملے سے ڈر کر یا اپنے تعاقب سے خوف زدہ ہو کر وہ اپنا ٹھکانا بدل لے گا تو آپ زبردست غلط فہمی میں ہیں۔ شاہ جہاں جیسے لوگوں کے لیے اس قسم کے واقعات روزمرہ کا معمول ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک میں شاہ جہاں کو جانتا ہوں وہ اس سے سوگنا دباؤ بھی آسانی سے برداشت کرسکتا ہے۔"

اپنے منہ پر اپنی تعریفیں سن کر عجیب سا لگ رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا مزہ بھی آرہا تھا' خاص طور سے صفدر لطف اندوز ہورہا تھا۔ اب رجب کی گفتگو کسی حد تک ہماری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ یہ بات آہستہ آہستہ واضح ہورہی تھی کہ ارشاد احمد ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر خطرناک شخص ہے۔ اس کے علاوہ دو باتیں مزید واضح ہوئی تھیں' پہلی تو یہ کہ ارشاد احمد کسی غیر قانونی اور گھناؤنے دھندے میں ملوث ہے اور اسے یہ شک پڑگیا ہے کہ استاد جہانی یعنی میں اس کے پیچھے پڑگیا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ وہ مجھ سے بری طرح دہشت زدہ ہوگیا ہے اور رجب جان نامی کرایے کے قاتل سے میرا پتا صاف کرانا چاہتا ہے۔

یہاں سوچنے کی بات تھی کہ ارشاد احمد کو یہ شبہ کیونکر ہوا کہ مجھے اس کے دھندے کی ٹوہ لگ گئی ہے اور میں اس کے پیچھے پڑگیا ہوں۔ اس حوالے سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی۔ میں اور صفدر چند روز پہلے غزالہ کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے پروفیسر اللہ دتا کے کلینک پر گئے تھے' ہم میک اپ میں تھے اس کے باوجود ریچھ سی آنکھوں والے ایک شخص نے ہمیں تاڑلیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سارا چکر وہیں سے چلا تھا۔ غالباً اللہ دتا' ارشاد احمد اور اس کے کارندوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہم دونوں ان کے دھندے کی ٹوہ میں کلینک تک آئے ہیں۔ وہ ایک دم "ریڈ الرٹ" ہوگئے تھے اور پیش بندی کے طور پر مجھے جسمانی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ان کے اس فیصلے سے ایک اور بات بھی واضح ہوجاتی تھی اور وہ یہ کہ یہ بہت گہرا اور گمبھیر معاملہ تھا۔ اگر یہ کوئی چھوٹا موٹا چکر ہوتا تو عین ممکن تھا کہ مجھ سے خوف زدہ ہونے والے مجھ سے ٹکرانے کے بجائے مجھ سے کنی کترانے کا فیصلہ کرتے۔ اپنا دھندا سمیٹ کر کسی اور جگہ چلے جاتے یا اسی طرح کوئی اور طریقہ اختیار کرتے۔ لیکن ان کے ردِعمل سے ان کی طاقت اور ان کے سنگین ارادوں کا سراغ ملتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میری موجودگی کی تصدیق ہونے کے بعد وہ اپنے دھندے کے لیے معمولی سا رسک بھی لینا نہیں چاہتے اور قتل جیسے انتہائی اقدام پر آمادہ ہیں۔

رجب نے شیمپین کا پیگ چڑھانے کے بعد نیا سگریٹ سلگایا اور بولا "کراچی اور بمبئی میں ایک دو دفعہ شاہ جہاں سے میری ملاقات ہوچکی ہے۔ اس کی خوں خواری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پرلے درجے کا سفاک اور بے رحم شخص ہے۔ جس کسی سے چمٹتا ہے' بلا کی طرح چمٹتا ہے۔ جن دنوں میں بمبئی میں تھا ناجائز شراب کا دھندا کرنے والے ایک پنجابی سیٹھ سے اس کی ٹھن گئی تھی۔ کافی خون خرابا ہوا تھا' سیٹھ نے سوگند کھائی تھی کہ وہ یہ دھندا جاری رکھے گا اور اگر وہ مرگیا تو اس کا بیٹا یہ کام کرے گا بمبئی کے کئی افسر لوگ پنجابی سیٹھ سے ملے ہوئے تھے' لیکن پھر ایک دن سیٹھ یوں بمبئی سے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کئی ماہ تک کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی' پھر ایک روز پتا چلا کہ سیٹھ زبردست مذہبی شخص بن گیا ہے اور امرتسر کے دربار صاحب میں معمولی خدمت گار کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔"

"ہاں یہ واقعہ تو میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ اس سیٹھ کا نام امریش سنگھ تھا شاید۔" میں نے کہا "اور امریش کا اکلوتا بیٹا بھی اس ہنگامے میں ہلاک ہوا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی۔" رجب نے جواب دیا "اور یہ تو میں نے تمہیں صرف ایک مثال دی ہے۔ کیونکہ امریش سنگھ والا سارا واقعہ میرے سامنے ہوا تھا۔ اس طرح کی ایک سو ایک مثالیں موجود ہیں۔ کراچی' بمبئی' امرتسر اور جالندھر وغیرہ میں جرائم کے اڈوں پر ڈبل ایس کا ذکر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ہمارے خبرناموں میں روزانہ حکمرانوں کا ذکر ہوتا ہے۔"

"ڈبل ایس کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ آپ لوگ جرم کے تالاب میں رہنے والے بڑے بڑے مگرمچھوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے ہو۔ ڈبل ایس کا لفظ عام طور پر شاہ جہاں اور شنکر شکرا عرف شنکر بھارتی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں خونی نام "ایس" سے شروع ہوتے ہیں۔ شاہ جہاں کی طرح شنکر شکرا بھی سفاکی اور خونریزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ دونوں آپس میں بھی سخت دشمن ہیں۔ میرے خیال میں شاہ جہاں اگر اپنے کسی دشمن کو گنتی میں لاتا ہے تو وہ یہی شنکر شکرا ہے۔"

میں اور صفدر پوری توجہ سے رجب کی باتیں سن رہے تھے اور حسبِ موقع حیرت کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں معاملے کی بات بھی شروع ہو گئی۔ معاوضہ لے کر کسی کو قتل کرنے کے گھناؤنے فعل کو عموماً "سپاری اٹھانے" کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں رجب نامی یہ قاتل میرے نام کی سپاری اٹھانے کے لیے یہاں آیا تھا اور میرے ہی سامنے بیٹھ کر سپاری اٹھا رہا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنے کا معاملہ مجھ سے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ بڑی دلچسپ صورتِ حال تھی اور ایسی صورتِ حال سے میرا سابقہ پہلی دفعہ پڑا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہمیں یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اصلی ارشاد احمد کسی بھی وقت شادی کی تقریب سے واپس آجائے گا اور ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے چرسی ملازم صدق علی کے حواس ہی بحال ہو جائیں اور وہ جو نشے کے عالم میں مجھے ارشاد احمد بنانے پر تلا ہوا ہے مجھے ارشاد احمد ماننے سے انکار کر دے۔ پھر راجی نامی لڑکی کی پریشانی بھی تھی۔ وہ ارشاد احمد کے بیڈ روم میں موجود تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔

رجب کے ساتھ اپنے قتل کا معاملہ کافی بحث و تکرار کے بعد میں نے نو لاکھ میں طے کیا۔ "ایڈوانس" کوئی نہیں تھا، ساری رقم "کام" کے فوراً بعد ادا کی جانی تھی۔ اس سودے کے دوران میں رجب کے ساتھ ہم دونوں کی کافی بے تکلفی ہو گئی۔ درحقیقت یہ بے تکلفی میں نے جان بوجھ کر پیدا کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ رجب کے اندر کی زیادہ سے زیادہ باتیں ہمارے سامنے آجائیں۔ میں رجب جان کو "یار رجب" کہہ کر پکارنے لگا، وہ بھی بے تکلفی سے مجھے ارشاد بھائی کہنے لگا۔ زیرِ زمین ہونے والے جرائم کی باتیں ہوئیں، شراب اور لڑکیوں کی باتیں ہوئیں، دولت کمانے کے نت نئے طریقوں کا تذکرہ ہوا۔ رجب پر اب شیمپین کا نشہ پختہ ہو چکا تھا اور وہ کھل کر باتیں کر رہا تھا۔

وہ ایک آنکھ میچ کر کہنے لگا "آپ کے مطلب کا کچھ مال میرے پاس بھی ہے، میں خود لے کر مڈل ایسٹ جانا چاہتا تھا لیکن اب اس شاہ جہاں والے معاملے کی ذمے داری اٹھالی ہے، اس کے علاوہ بھی کراچی میں ایک دو کام ہیں۔ شاید جا نہ سکوں۔ مال زیادہ دیر پڑا رہے تو مسئلہ بن جاتا ہے، بلکہ ایک دفعہ تو میرا آدھا مال پڑا پڑا ضائع ہو گیا تھا۔ سوچ رہا ہوں کسی کو فروخت کر دوں۔ اگر آپ کو ضرورت ہے تو ایک نظر دیکھ لیں۔ مجھے یقین ہے آپ کو پسند آئے گا۔"

پتا نہیں تھا کہ رجب کس مال کا ذکر کر رہا ہے لیکن صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ میں اس سے کوئی سوال نہ کروں اور ہاں میں ہاں ملاتا رہوں۔ میں نے کہا "ہاں۔ یہ سارے مسئلے تو پھر ہوتے ہی ہیں، ویسے مجھے تو اس وقت ضرورت نہیں۔ نہ ہی اتنی گنجائش ہے کہ پے منٹ کر سکوں۔ تم کسی اور پارٹی سے بات کر لو۔"

"اگر پے منٹ کی بات ہے تو معاملہ طے کر لیتے ہیں۔"

رجب نے شیمپین کا پیگ چڑھاتے ہوئے کہا "دس فی صد ایڈوانس کر دیں، باقی ایک مہینے میں دے دیں۔"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "ٹھیک ہے، اگر تم اصرار کرتے ہو تو پہلے مال دکھا دو، پھر بات کریں گے۔"

وہ بولا "کسی بھی وقت غریب خانے پر حاضر ہو جائیں۔"

صفدر نے کہا "اگر دیکھنا ہے تو پھر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ بعد میں تین چار دن تو شاید فرصت نہ ملے۔"

"کہیں جانا ہے آپ کو؟" رجب نے پوچھا۔

"ہاں سنگاپور میں تھوڑا سا کام ہے۔" میں نے کہا۔

رجب بولا "تو پھر کل صبح ہی آجائیں۔ بلکہ اگر مناسب سمجھیں تو ابھی چلے چلیں میرے ساتھ۔ ابھی کوئی اتنی رات تو نہیں ہوئی۔"

"جانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھی صاحب نے آپ کو میرا ایڈریس دیا تو تھا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے جلدی سے کہا "مال وہیں پڑا ہے؟"

"جی ہاں۔ نیچے کافی بڑا بیسمنٹ ہے۔ اور محفوظ بھی بہت ہے۔"

"کوالٹی کیسی ہے مال کی؟" میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

"بالکل اے ون اور فریش۔ طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی۔"

میں چاہتا تھا کوئی ایسی بات رجب کے منہ سے نکلے کہ مال کی نوعیت کا پتا چل جائے لیکن وہ ہر بات ڈھکے چھپے انداز میں کر رہا تھا، یا شاید اس کا انداز ہی یہی تھا۔ کبھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ منشیات کی بات کر رہا ہے، کبھی نوادرات وغیرہ کا شبہ ہوتا تھا۔ یقیناً میری طرح صفدر بھی چکر میں پڑا ہوا تھا لیکن اس نازک موقع پہ ہم کوئی ایسا سوال نہیں کر سکتے تھے جس سے رجب کو ہم پر کسی طرح کا شبہ ہوتا اور وہ بدک جاتا۔

صفدر نے کہا "مسٹر رجب! ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ خراب مال ہم نہیں اٹھائیں گے۔ سیٹھی صاحب جانتے ہی ہیں ہم نے کوالٹی پر آج تک سمجھوتا نہیں کیا۔"

"اس کے بارے میں آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں آپ کو ایک ایک پیس چیک کراؤں گا۔ اگر کسی پر ذرا سا بھی شک ہو تو آپ چھوڑ دیں۔ میں تو خود اس معاملے میں بڑا شکی مزاج ہوں۔" اس کے بعد اس نے اپنے کسی "ہم پیشہ" کو بہن کی غلیظ گالی دی اور اس کے بارے میں انکشاف کیا کہ وہ پرلے درجے کا بددیانت اور فراڈیا ہے۔ اور صرف اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی بدنام ہو رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ اس شخص کا نام رجب نے فرانسس بتایا۔

ہمارے پاس وقت کم تھا۔ اس چار دیواری میں زیادہ دیر رکنا ہمارے لیے کسی طرح بھی سود مند نہیں تھا۔ میں اور صفدر، رستم خاں کے رکشے پر سوار ہو کر یہاں پہنچے تھے، رکشا اب واپس جا چکا تھا۔ اب ہمیں رجب کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر جانا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ ارشاد احمد اپنی گاڑی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے رجب سے بہانہ بنایا کہ میرے ڈرائیور کو اپنے ایک قریبی عزیز کی شادی پر جانا تھا لہٰذا وہ گاڑی لے گیا ہے۔ رجب فراخ دلی سے بولا "کوئی بات نہیں بھائی ارشاد! میں آپ کو اپنی گاڑی پر چھوڑ جاؤں گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چرسی ملازم صدق نشے کی زیادتی کے سبب کوریڈور میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے دیکھا، بے ہوشی کی حالت میں وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ شاید آلو بینگن کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں لڑکی ابھی تک میرے انتظار میں تھی۔ انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے اس نے ایک میگزین کھول رکھا تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں میگزین کے صفحات پر جمی تھیں لیکن چہرے سے عیاں تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور ہے۔ یقیناً وہ بے نام اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی جوانی اور خوب صورتی کو ایک طشتری میں سجا کر یہاں لائی تھی۔ لیکن اسے انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ امتحان سے گزر جاتی تو اور بات تھی لیکن وہ انتظار کے امتحان سے گزر رہی تھی۔ اس نے مجھے کمرے میں آتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایک بہت ضروری کام کے لیے جانا پڑ رہا ہے۔ اس سے پھر ملاقات ہو گی۔

وہ ایک دم روہانسی ہو گئی۔ ساری امیدیں، سارے خواب جیسے ایک دم دھندلا گئے تھے۔ کمزور آواز میں بولی "اگر آپ۔۔۔ جلدی آجائیں گے، تو میں آپ کا انتظار کر لیتی ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے دیر ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم گھر چلی جاؤ۔"

"مگر۔۔۔"

مجھے ایک دم اس پر طیش آگیا۔ میں نے غصیلی سرگوشی کی "تم بے حد بے وقوف لڑکی ہو۔ اپنی زندگی اور عزت کو داؤ پر لگا رہی ہو۔ میں تم پر ترس کھا کر تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں ارشاد احمد نہیں ہوں۔ میرا تعلق پولیس سے ہے۔ ارشاد کی سخت کم بختی آنے والی ہے، اگر آئندہ تم ارشاد کے آس پاس نظر آئیں تو ساتھ ہی لپیٹی جاؤ گی۔"

لڑکی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو محسوس ہوا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ میں نے اس سے کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ یہاں سے نکل جائے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی باہر نکل گئی۔ اس کے فوراً بعد میں نے رجال ساہی صاحب کو فون کیا۔ وہ تو نہیں ملے لیکن ان کا پرانا ڈرائیور حیات محمد مل گیا۔ حیات محمد ساہی صاحب کے لیے بے حد بھروسے کا آدمی تھا۔ میں نے حیات محمد کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ میں نے اسے زریں گل کا ایڈریس دیا اور کہا کہ وہ زریں گل کو میری یہ ہدایت پہنچا دے کہ زریں گل اور اس کی بیوی فوراً اپنا ٹھکانا بدل لیں۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ہم رجب کی پجارو گاڑی میں سوار لاہور کے مضافات میں واقع ایک وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے۔ کوٹھی کے چاروں طرف آم، امرود اور لیچی کے باغ تھے۔ دریائے راوی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں کھجور کے درخت بھی کثرت سے نظر آرہے تھے۔

کوٹھی کے پورچ میں چار عدد نہایت جسیم ہاؤنڈ نسل کے کتے موجود تھے۔ دیواریں اونچی تھیں اور ان پر کانچ کے ٹکڑے بڑے اہتمام سے لگائے گئے تھے۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر ایک خطرناک صورت گن مین چوکس کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر پجارو کا دروازہ کھولا اور ہم دونوں رجب کے ساتھ ایک ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ایک خوب صورت لڑکی نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ وہ رجب کی رکھیل ہے' وہ چست پتلون قمیص پہنے ہوئے تھی اور رجب کو بڑے تواتر سے ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ اگر ہم کمرے میں موجود نہ ہوتے تو وہ ابھی بے تکلفی سے رجب کی گود میں بیٹھ جاتی۔

"ڈرنک لیں گے۔" لڑکی نے ہم سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے ہم مال دیکھ لیں۔" میں نے رجب سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ ہمیں لے کر کوٹھی کے وسیع و عریض بیسمنٹ میں اتر گیا۔ یہ جگہ خوب صاف ستھری تھی۔ سیلن اور تہ خانوں کی مخصوص بو یہاں بالکل محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ابھی تک ہمیں مطلق اندازہ نہیں ہوا تھا کہ رجب ہمیں کون سا مال دکھانا چاہ رہا ہے۔ رجب کسی ماہر سوداگر کی طرح مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا "دیکھیں جی' مال کبھی بھی مہنگا نہیں ہوتا' بس اس کی ڈیمانڈ ہونی چاہیے۔ میں نے آج تک گھٹیا مال خریدا ہی نہیں۔ بیس دانوں میں سے تین چار بھی خراب نکل آئیں یا ضائع ہو جائیں تو فی دانہ قیمت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ پھر ساکھ علیحدہ خراب ہوتی ہے۔ میرا تو اس بات پر یقین ہے' بے شک چھ مہینے فارغ بیٹھے رہو لیکن کام اس وقت ہی کرو جب مال اچھا ملے۔ اب جو کھیپ میں آپ کو دکھا رہا ہوں یہ ساری کی ساری چنی ہوئی ہے۔ اصل پنجاب کا مال ہے۔ اس کو ہم پُٹر کرنل کہتے ہیں۔"

"پُٹر کرنل تو چاول کی قسم ہے۔" صفدر نے کہا۔

"اس کو بھی چاول ہی سمجھو جی۔۔۔ خوب لمبا' موٹا تازہ' سڈول اور چمک دار۔ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم ایک طویل راہداری سے گزرے۔ رجب نے "اصل پنجاب کا مال" کہا تھا۔ ان الفاظ سے مجھے ایک شبہ ہو رہا تھا۔ اس شبے کی بھول بھلیوں میں الجھتا میں ایک کوریڈور میں پہنچ گیا۔ ایک کھڑکی میں سے مجھے ایک ہال نما کمرے کا منظر نظر آیا۔ یہاں فرش پر قالین بچھا تھا۔ دو تپائیوں کے سوا کسی قسم کا فرنیچر نظر نہیں آ رہا تھا۔ قریباً بیس عدد افراد یہاں موجود تھے۔ یہ قریباً سب کے سب نوجوان تھے۔ ان میں سے کچھ نے پتلون قمیص اور کچھ نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ہال نما کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کچھ سامان پڑا تھا۔ یہ سفری بیگ اور اٹیچی کیس وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سامان کمرے میں موجود افراد کا ہے۔ ایک طرف کیرم بورڈ رکھا تھا۔ سات آٹھ نوجوان اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ وڈیو پر انڈین فلم لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے بالکل قریب دو نوجوان قالین پر ہی سو رہے تھے۔ وہ شکل و صورت اور لباس سے لاہور یا آس پاس کے کسی علاقے کے لگتے تھے۔

"کیسا لگا مال؟" رجب نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرے دماغ میں زلزلہ سا جاگ گیا تھا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اب تک رجب جس مال کا ذکر کرتا رہا ہے وہ کوئی بے جان جنس نہیں ایک زندہ جنس ہے۔۔۔ وہ اشرف المخلوقات حضرت انسان ہے۔ صفدر کے بظاہر پُرسکون چہرے کے پیچھے بھی تحیر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہی وہ نوجوان افراد تھے جن کے لیے رجب بڑی رسان سے مال۔۔۔ انہ۔۔۔ اور کھیپ جیسے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔

جہاں ہم کھڑے تھے وہاں نیم تاریکی تھی۔ ہال نما کمرا خوب روشن تھا اور وہاں کا منظر ہمیں بہ آسانی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے برعکس ہال نما کمرے کے افراد خصوصی کوشش کے بغیر ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ سارے نوجوان کافی خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ ان کی صحت بھی اچھی تھی۔ وہ سب کے سب لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ بالکل جیسے وسطی پنجاب لاہور' فیصل آباد' سیالکوٹ اور گجرات وغیرہ کے لوگ ہوتے ہیں۔

رجب کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "۳۰۰ بندوں میں سے چنے ہوئے بندے ہیں۔ سب کے سب نمبر ون۔۔۔ محنتی اور صحت مند۔ کوئی ہوشیاری چالاکی نہیں۔ آپ لوگ انہیں بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں۔"

"خیر ایسی بھی بھیڑ بکریاں نہیں یہ۔۔۔ ان میں کئی ایک چھپے رستم ہوتے ہیں۔ ایک کھیپ میں ایسا تجربہ ہو چکا ہے مجھے۔"

رجب بولا "آپ کا تجربہ بے شک مجھ سے زیادہ ہوگا' لیکن کام تو میں بھی یہی کرتا ہوں نا۔۔۔۔ "مال" کو چہرے مہرے سے نہ پہچانا تو پھر کیا کیا۔" پُرزرا توقف سے کہنے لگا "آئیں

اندر آئیں۔ بات چیت کر کے دیکھیں ان سے۔"

وہ آگے بڑھ کر ہال نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اور صفدر بھی اس کے پیچھے اندر گئے۔ نوجوانوں نے رجب کو سلام کیا۔ کئی ایک اپنی جگہ سے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ رجب نے میرا اور صفدر کا تعارف کراتے ہوئے کہا "دوستو! یہ دونوں صاحبان میرے پارٹنر ہیں۔ کل ہی امریکا سے آئے ہیں۔ آپ لوگوں سے ملنا چاہتے تھے۔"

میرے سامنے کھڑے ہوئے دو نوجوان بڑے رشک سے مجھے دیکھنے لگے۔ اور رشک کیوں نہ کرتے وہ مجھ پر۔۔۔؟ میں امریکا سے ہو کر آیا تھا۔ اس ملک سے پلٹا تھا جسے بعض لوگ جنتِ ارضی کہتے ہیں اور جہاں پہنچنے کے خواب آنکھوں میں سجا کر زندگی بھر کانٹوں پر چلتے رہتے ہیں۔ میرے اردگرد موجود نوجوانوں کی آنکھوں میں بھی ایسے ہی خواب نظر آ رہے تھے۔ کسی کی آنکھوں میں بہنوں کی شادی کا خواب تھا۔ کوئی آنکھ قرضے سے نجات کا خواب دیکھ رہی تھی' کسی آنکھ میں شادی اور خوش حال زندگی کا خواب تھا۔ کسی آنکھ میں اپنی "محبت" حاصل کرنے کی آرزو تھی۔ یہ نوجوان نجانے کس کس شہر سے اور کس کس گلی سے اٹھ کر آئے تھے۔ اپنے پیاروں سے منہ موڑ کر اپنے وطن کی خاک کو چھوڑ کر دور دیس جانے کے لیے آمادہ تھے۔ اپنے خون پسینے سے پاؤنڈ اور ڈالر کما کر اپنی ریزہ ریزہ زندگی کو جوڑنا چاہتے تھے۔ میں چشمِ تصور سے ان نوجوانوں کے بوڑھے والدین کو دیکھ سکتا تھا۔ اس ماں کو دیکھ سکتا تھا جو مصلے پر بیٹھی اپنے بیٹے کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس خمیدہ کمر باپ کو دیکھ سکتا تھا جس نے اچھے دنوں کی آس کے عوض اپنا گبرو بیٹا فاصلوں کے سپرد کیا تھا۔۔۔ اور اب وہ بیٹا اور اس کی طرح کے اور بہت سے بیٹے ایک ایسے شخص کی تحویل میں تھے جو انہیں "مال" کہہ رہا تھا اور ان کا بھاؤ تاؤ کرنے کی فکر میں تھا۔

میں نے بھوری آنکھوں اور مضبوط کاٹھی والے ایک لڑکے سے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟"

وہ سوالیہ نظروں سے رجب کو تکنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ جواب میں زبان کھولے یا نہ۔۔۔ رجب نے کہا "ہاں ہاں بھئی۔ بتاؤ انہیں۔ یہ تم لوگوں سے بات چیت کرنے ہی تو آئے ہیں۔"

نوجوان لڑکے نے کہا "میرا نام ابرار ہے۔ میں جہلم سے آیا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"کینیڈا۔۔۔ جی۔" ابرار نے ذرا شرما کر جواب دیا۔

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۳

"کیوں چھوڑ رہے ہو اپنا وطن؟"

"بس جی' خوشی سے کون چھوڑتا ہے۔ گھر میں غریبی ہے۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں بن بیاہی بیٹھی ہیں' ان کی شادیاں۔ ماں ساری زندگی کرایے کے گھر میں رہی ہے اور اپنے گھر کا خواب دیکھتی رہی ہے۔ اس کی یہ خواہش بھی پوری کرنی ہے۔"

"کیا خیال ہے تمہارا' کینیڈا جانے سے تمہاری یہ خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔"

"کیوں نہیں ہوں گی جی۔ وہاں جان مار کر کام کریں گے اور پیٹ کاٹ کر پیسہ جمع کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کس کس طرح وہاں جا رہے ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھیں' ویزے کی رقم جمع کرانے کے لیے گھر کی چیزیں تک بیچنی پڑی ہیں مجھے۔۔۔ آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس کس کے آگے ہاتھ پھیلایا ہے۔"

میں ان نوجوانوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ لاہور کے نوجوان دو تین ہی تھے' باقی سب چھوٹے شہروں اور مضافات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم واجبی سی تھی۔ بہت سوں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بیرون ملک جا کر ہر طرح کا کام کرنے پر آمادہ تھے۔ انہیں مکمل یقین تھا کہ اگلے پانچ چھ روز کے اندر وہ کینیڈا میں ہوں گے' اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے جو آج تک صرف فلموں اور تصویروں میں دیکھتے آئے ہیں اور جس کے فسانے لوگوں سے سنتے آئے ہیں' انہیں یہ بھی اعتماد تھا کہ انہیں کینیڈا بھجوانے والے کینیڈا میں انہیں چھوٹے موٹے جاب ڈھونڈنے میں بھی مدد دیں گے۔ جب ایک بار انہیں جاب مل جائیں گے تو پھر سارے دلدر۔ خود بخود دور ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک دو سال کے اندر وہ نہ صرف اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بلکہ اس قابل بھی ہو جائیں گے کہ اپنے عزیز و اقارب کو کینیڈا بلوانے کا سوچ سکیں۔

ان لوگوں سے ملنے کے بعد ہم کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ رجب کی خوب رو رکھیل ایک صوفے پر نیم دراز سو رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا ایلسیشن کتا اس کی گود میں تھا۔ ہماری آہٹ سن کر وہ اٹھ بیٹھی اور کتے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہمارے اور رجب کے درمیان معاملے کی بات چیت شروع ہوئی۔

رجب نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا "دیکھیں جی وہ استاد جہانی والا معاملہ بالکل الگ ہے۔ ہمارے اس سودے کا اس معاملے پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔"

میں نے کہا "بھئی وہ معاملہ تو طے ہے۔ موجودہ معاملے میں بھی کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے۔ یہ تو من مرضی کی بات ہے۔ تمہارا مال ہے تم جو چاہو قیمت لگاؤ۔ ہماری سمجھ میں آئے گا تو ہم مال اٹھا لیں گے' ورنہ کوئی اور سب لگ جائے گا تمہارا۔"

وہ بولا "دیکھیں جی' مال آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب جو مناسب ہے وہ آپ خود ہی بتا دیں۔ آپ سے کون سی بات ڈھکی چھپی ہے۔"

"نہیں رجب۔۔۔ تمہاری چیز ہے تم بتاؤ۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا "آپ کے ساتھ پہلا سودا ہے' میں چاہتا ہوں کہ ہم آئندہ بھی کام کریں۔ اس تعلق کو بنانے کے لیے میں تھوڑا بہت گھاٹا برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ فی بردہ ۷۵ ہزار روپیہ دے دیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس قیمت پر آپ کو ایسا بردہ کہیں سے نہیں ملے گا۔"

بردے کا لفظ میں پہلی بار رجب کی زبان سے سن رہا تھا۔ بردے کا مطلب عام طور پر بندہ یا غلام لیا جاتا ہے۔ اسی لفظ سے ایک اور معروف لفظ بردہ فروش بھی بنتا ہے۔ میں اپنے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر رجب کی صورت میں ایک بردہ فروش کو دیکھ رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ غلاموں کی سوداگری کا دور بیت چکا ہے لیکن میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے غلام دیکھے تھے اور اب ان کے سوداگر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ سوداگر مجھ کو بھی اپنے ہی جیسا ایک سوداگر سمجھ رہا تھا اور ایک کھیپ کا بھاؤ تاؤ کرنا چاہ رہا تھا۔

میں نے کہا "۷۵ ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔ آج سے صرف دو ماہ پہلے میں نے اس سے بہتر کوالٹی کا مال اس سے نصف قیمت پر خریدا ہے۔"

رجب ہنستے ہوئے بولا "ارشاد بھائی! یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ مال خریدنے سے زیادہ مشکل کام مال کو اس کے اصل ٹھکانے تک پہنچانا ہے۔ کھیپ میں اگر ایک بردہ بھی ہوشیار چالاک ہو تو ہر وقت پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ پچھلے سے پچھلے مہینے کراچی کے اسحاق جالندھری کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا آپ کو بھی معلوم ہو گا۔ صرف ایک چالاک بردے کی وجہ سے پوری لانچ میں بغاوت ہو گئی تھی۔ جالندھری کا بھائی مارا گیا' وہ خود زخمی ہوا۔ بردے بھی گئے اور ۸۰ لاکھ کی لانچ بھی پولیس کے قبضے میں گئی۔"

"ہوشیاری چالاکی کسی کی پیشانی پر تو نہیں لکھی

ہوتی۔" صفدر نے کہا۔

"لکھی ہوتی ہے بھائی' لکھی ہوتی ہے۔ صرف پڑھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"یار! اتنے گاؤدی ہم بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا "بڑا بڑا ہوشیار بردہ دیکھا ہے اور بڑا بڑا ٹیڑھا بھی۔ تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ ہم مال کو منزل تک کیسے پہنچائیں گے تم صرف مال کی بات کرو۔"

وہ بولا "اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کو سستا مال دکھا دیتا ہوں۔ آپ پینتیس چالیس ہزار کی بات کر رہے ہیں' میں آپ کو بیس ہزار میں دے دیتا ہوں۔"

"بیمار اور مریل چوہوں کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔" صفدر نے کہا۔

"بیمار اور مریل نہیں بالکل صحت مند ہیں۔ دو لڑکیاں بھی ہیں ان میں۔۔۔"

"کوئی نہ کوئی مسئلہ تو ہو گا ان کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

"مسئلہ وہی ہے جو آپ کو بتایا ہے' انہیں سپلائی کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ سب کے سب خوف زدہ اور ڈرے ہوئے بردے ہیں۔ کسی پولیس والے یا کوسٹ گارڈ کی نگاہ بھی پڑ گئی ان پر تو اسے پتا چل جائے گا کہ یہ اغوا شدہ لوگ ہیں۔۔۔ لانچ پر بٹھایا جائے گا تو چیخ و پکار شروع کر دیں گے' اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔"

"یار! تم یہ باتیں چھوڑو۔" میں نے قطع کلامی کی "تمہاری طرح یہ سارے پاپڑ ہم نے بھی بیل رکھے ہیں۔ وہ بردے اگر تمہارے پاس ہیں تو دکھاؤ۔ اگر ہماری سمجھ میں آئے گا تو ان کی بات بھی کر لیں گے۔"

"تو آئیں پھر۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میرے اور صفدر کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ ہم اپنی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ ہماری بول چال اور نشست و برخاست وغیرہ ہمارے کرداروں کے عین مطابق تھی۔ رجب ہمیں ایک طویل راہداری میں چلا کر بیسمنٹ کے بالکل عقبی حصے میں لے گیا۔ یہاں سے سیڑھیاں مزید نیچے جاتی تھیں۔ یعنی تہ خانے کے نیچے پھر ایک تہ خانہ تھا۔ اس تہ خانے کا داخلی راستہ لکڑی کے ایک موٹے دروازے سے بند کیا گیا تھا۔ دروازے پر پیتل کا مضبوط قفل پڑا تھا۔ قفل کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں ہمیں جیل کی طرز کی تین چار بیرکیں نظر آئیں۔ ایک بیرک میں کئی افراد بند تھے۔ ان کے چہرے اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ جسموں پر بوسیدہ کپڑے تھے۔ کئی ایک صرف پتلون اور بنیان میں نظر آ رہے تھے۔ ان نیم عریاں افراد کے جسموں پر ایسے نشانات تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں چھڑی یا بید وغیرہ سے ضربیں لگائی جاتی رہی ہیں۔ یہ افراد خوراک کی کمی کا شکار بھی نظر آتے تھے۔ میں نے گنا ان کی تعداد بائیس تھی۔ عمریں بیس اور اٹھائیس سال کے درمیان ہوں گی۔ ان میں لڑکی کوئی نہیں تھی۔ شاید جن دو لڑکیوں کا ذکر رجب نے کیا تھا انہیں علیحدہ رکھا گیا تھا۔ رجب کو دیکھتے ہی بیرک میں بند افراد کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ اس بیرک کے قریب ایک ہٹا کٹا راکفل بردار پہرے دار موجود تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سیاہ اور چہرے پر سفاکی جھلک رہی تھی۔ رجب کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بالکل چوکس کھڑا ہو گیا تھا۔ رجب نے بڑی بے پروائی سے بیرک کا قفل کھولا۔ دیوار کے ساتھ بید کی ایک لمبی چھڑی رکھی تھی اس نے چھڑی ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول کر بیرک کے اندر داخل ہو گیا۔ بیرک کے تمام قیدی ڈرے ڈرے انداز میں ایک طرف سمٹ گئے۔ یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ یوں لگا جیسے ہم کسی قدیم دور میں چلے گئے ہیں اور کوئی سفید فام آقا ہنٹر لے کر حبشی غلاموں کے باڑے میں داخل ہوا ہے۔ میں اور صفدر دیکھ رہے تھے کہ قیدیوں کے تاثرات عجیب سے ہیں۔ شدید خوف کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کی نفرت بھی پائی جا رہی تھی۔ نجانے کیوں ان لمحات میں وہ بائیس افراد مجھے انسانوں سے زیادہ جانور دکھائی دیے۔ ان قیدیوں کا تعلق کسی ایک علاقے سے نہیں تھا۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے قیدی بھی ان میں شامل تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے سر مونڈ دیے گئے تھے۔ چند افراد کی بھویں بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ شاید یہ عمل کسی سزا کا نتیجہ تھا۔

"چلو قطار بناؤ۔" رجب نے بید کی چھڑی ہوا میں لہرائی۔

چھڑی کی "شائیں" نے قیدیوں کے چہرے زرد کر دیے۔ وہ جلدی سے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے دیوار کی طرف تھے۔

"کپڑے اتارو۔" رجب نے دوسرا حکم دیا۔

وہ سب جلدی جلدی کپڑے اتارنے لگے۔ ان کے انداز سے بدحواسی عیاں تھی۔ جیسے وہ ڈر رہے ہوں کہ اگر ذرا سی بھی دیر ہو گئی تو کپڑوں میں آگ لگ جائے گی۔ چند ہی لمحے بعد وہ سب کے سب عریاں کھڑے تھے۔ رجب جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے توقع کر رہا ہو کہ میں

اس کے "مال" کی کوالٹی کے بارے میں کوئی رائے دوں گا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال میں کیا کہوں۔

رجب نے ایک نوجوان کی کمر پر چھڑی کی نوک ٹکائی' یہاں چند ہفتے پرانا ایک زخم نظر آرہا تھا۔ غالباً گولی کا زخم تھا۔ جسم سے گولی نکالنے کے بعد ٹانکے لگائے گئے تھے۔ رجب بولا "بس اس بردے کی پیٹھ پر یہ زخم ہے۔ یہ بھی اب ٹھیک ہو رہا ہے۔ باقی کسی کے پنڈے پر نشان تک نہیں۔ آپ خود چیک کرسکتے ہیں' کوئی بیماری' کوئی مسئلہ نہیں۔" پھر اس نے قیدیوں سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں کہا "میری طرف گھوم جاؤ۔"

وہ سب کے سب ایک ساتھ ہماری طرف گھوم گئے "ٹانگیں کھولو" رجب نے حکم جاری کیا۔ سب نے ٹانگیں اس طرح کھول دیں کہ دونوں پاؤں کے درمیان قریباً چار فٹ کا فاصلہ پیدا ہوگیا۔ وہ بے چارگی کی جیتی جاگتی تصویر نظر آرہے تھے۔ رجب چھڑی سے قیدیوں کی رانوں کو چھوتے ہوئے بولا "دیکھ لیں جی' کوئی خارش' کوئی زخم' کوئی تکلیف نہیں۔"

میں حیران ہو رہا تھا۔ یہ بائیس افراد اگر ایک دم ہم پر پل پڑے تو ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ مسلسل تشدد نے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر چھوڑا تھا۔ اپنے ہی جیسے آدم زادوں کی یہ تذلیل دیکھ کر دل گھبرانے لگا۔ میں صفدر کے ساتھ باہر آگیا۔ رجب نے بھی قیدیوں کو کپڑے پہننے کا حکم دیا اور ہمارے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل آیا۔

میں نے کہا "رجب! تم بتا رہے تھے کہ دو لڑکیاں بھی ہیں ان بردوں کے ساتھ۔"

"ہاں۔ انہیں علیحدہ رکھا گیا ہے۔ آئیں میں دکھاتا ہوں۔"

ہم سیڑھیاں چڑھ کر بالائی بیسمنٹ میں پہنچے۔ یہاں ایک کمرے میں دونوں لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک پلنگ پر بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ دوسری لیٹی ریڈیو سن رہی تھی۔ دونوں کے جسم تو بے شکن تھے۔ مگر ان کے لباس بوسیدہ تھے اور اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح وہ بھی ڈری سہمی نظر آتی تھیں۔ جونہی رجب کمرے میں داخل ہوا دونوں جلدی سے کھڑی ہوگئیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف اور بے چارگی کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے ایک خاص چیز نوٹ کی۔ دونوں لڑکیوں کی آنکھیں گہری براؤن اور بال سیاہ تھے۔ دونوں نہ صرف متوازن جسم کی تھیں بلکہ کافی خوب صورت بھی تھیں۔ دونوں کے قد لانبے اور گردنیں صراحی دار تھیں وہ جیسے دو خوش نما مورتیوں کی طرح ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ رجب نے کمال بے تکلفی سے ایک لڑکی کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ میرے عین سامنے کرتے ہوئے بولا "آپ نے ان دونوں کی آنکھیں دیکھیں۔ گہری براؤن آنکھوں کے ساتھ عموماً بال بھی براؤن یا شہد رنگ ہوتے ہیں۔ لیکن براؤن آنکھوں کے ساتھ مکمل سیاہ بال کم کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ کئی لوگ اس قسم کے چہروں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جس طرح اونیگیٹو خون مشکل سے ملتا ہے اسی طرح براؤن آنکھوں کے ساتھ سیاہ بال بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ وہ ساری خوبیاں بھی ڈھونڈنی پڑتی ہیں جو ایک خوب صورت عورت میں ہونی چاہئیں۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لڑکیوں کی یہ جوڑی کتنی مشکل سے ملی ہوگی۔"

"یہ آرڈر کا مال ہے؟" میں نے پوچھا۔

رجب نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک لڑکی کی ٹانگ اس کے گھٹنے تک اٹھا کر اس کی پنڈلی دکھائی اور بولا "دیکھیں کیسی شفاف چمڑی ہے' جیسے پالش کر رکھی ہو۔ ابھی تو یہ بند ہی پڑی ہیں۔ ذرا کھلی ہوا میں نکلیں' کھائیں پئیں تو ایسی تازگی آئے ان پر کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔" وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے لڑکیوں کے بجائے نایاب جانوروں کی جوڑی کی بات کر رہا ہو۔

اس کے بعد رجب نے ڈری سہمی لڑکیوں کو وہی حکم دیا جو اس سے پہلے بیرک میں بند مردوں کو دیا تھا۔ لڑکیوں کے ہاتھ اپنے لباس کی طرف بڑھے۔ لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا تھا۔ میں نے رجب سے کہا "بس رہنے دو ٹھیک ہے۔ ان کی جوانیاں تو کپڑوں کے اندر سے بھی چیخ چلا رہی ہیں۔"

رجب نے لوفرانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کا ٹوٹا ہوا دانت اس کی ہنسی کو کچھ اور بدصورت بنا گیا۔ ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ رائفل بردار محافظ نے دروازہ باہر سے مقفل کردیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکیاں بلوچی ہیں اور کسی دور دراز علاقے کی رہائشی ہونے کی وجہ سے اردو نہیں سمجھتیں۔ مجھے یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ شاید وہ آپس میں کزن یا رشتے دار ہیں۔

صفدر نے رجب سے پوچھا "تمہیں یہ بردے ملے کیسے؟"

رجب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ

آنکھیں نچا کر بولا "یہ وہی بردے ہیں جو تین ماہ پہلے اسحاق جالندھری کی لانچ سے فرار ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بندے کو پشت پر اسحاق کی گولی بھی لگی تھی۔ اس زخمی کو ابھی تم نے دیکھا بھی ہے۔"

اپنی دانست میں رجب نے ہم پر ایک بڑا انکشاف کیا تھا۔ ہم دونوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے چہروں پر خاطر خواہ حیرت سجالیں "لیکن یہ تمہارے پاس کیسے پہنچے؟" میں نے پوچھا۔

رجب بولا "یہ لوگ ساحل کے ساتھ ساتھ مکران کی طرف روانہ ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک مکرانی سردار نے انہیں پکڑلیا۔ اس وقت ہمارا ایک بندہ بھی علاقے میں موجود تھا۔ اس نے قبائلی سردار سے بات کی اور یہ بردے خرید لیے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ یہ وہی بردے ہیں جو اسحاق جالندھری کی لانچ سے فرار ہوئے تھے۔ اسحاق جالندھری زخمی تھا اور پولیس کے ڈر سے روپوش تھا۔ کوئی تین ہفتے بعد اس کے ساتھ میرے کارندے کی ملاقات ہوئی۔ کارندے نے ساری بات اسے بتائی' اور یہ اطلاع بھی دی کہ اس کے مفرور بردے ہمارے پاس ہیں۔ جالندھری ان دنوں بڑا مایوس تھا۔ وہ کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ دن کہیں آرام سے روپوش رہ کر گزارے۔ اس نے ہم سے کچھ رقم وصول کرلی کچھ رقم مکرانی سردار نے اسے دے دی۔ یوں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ اگر آپ اپنے طور پر اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تصدیق کرنے کی کیا ضرورت ہے' تمہاری زبان ہی کافی ہے۔ بہرحال تم اس مال کا لو گے کیا؟"

وہ بولا "چلیں ایسا کرتے ہیں یہ معاملہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ جو مناسب سمجھیں دے دیں۔ ہاں لڑکیوں کی بات علیحدہ کرلیں۔ میں آپ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ خدا گواہ ہے' میں نے مکرانی سردار کو ان لڑکیوں کا ڈیڑھ لاکھ فی کس دیا تھا۔ اس کے بعد پچاس ہزار روپیہ فی کس اسحاق جالندھری کو بھی دینا پڑا۔ پچھلے ڈھائی ماہ کا خرچا وغیرہ ڈال لیا جائے تو ایک لڑکی قریباً سوا دو لاکھ میں گھر پڑ رہی ہے۔"

صفدر نے کہا "رجب! یہ تو تم خالص سوداگروں والی باتیں کر رہے ہو۔ یہ لڑکیاں اس کیمپ میں شامل ہیں۔ ان کا معاملہ اس کیمپ کے ساتھ ہی طے کرنا ہوگا۔"

"بے شک یہ کیمپ میں شامل ہیں' لیکن میں نے آپ دونوں کو بتایا ہے نا... کہ یہ آرڈر کا مال ہے۔ ایسا مال ڈھونڈنے میں جان جوکھم میں ڈالنا پڑتی ہے۔"

"لیکن اب تو یہ آرڈر کا مال نہیں ہے نا...؟" میں نے کہا۔

"اب بھی آرڈر کا ہی سمجھیں۔ میں نے بتایا ہے نا... کہ آج کل بہت سے خریداروں میں ایسے چہروں کا کریز پیدا ہو رہا ہے۔ خاص طور سے یورپ وغیرہ میں تو ایسا چہرہ منٹوں میں بکتا ہے اور منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔ خدا گواہ ہے' آپ پھینک بھی دیں گے تو تین چار لاکھ کمالیں گے۔"

کافی دیر تک ہمارے درمیان بھاؤ تاؤ ہوتا رہا۔ اس دوران میں ڈرنکس کا دور بھی چلا۔ آخر کار رات کے آخری پہر تین چار بجے کے قریب سارا معاملہ طے ہوگیا۔ ہم نے "زبانی کلامی" ہی سہی لیکن رجب سے تمام کے تمام چوالیس بردے خرید لیے۔ ان میں سے بیس عدد بالائی بیسمنٹ کے تھے' ان کا ریٹ ساٹھ ہزار روپے فی بردہ طے ہوا۔ وہ بائیس افراد جو نیچے والی بیرک میں بند تھے' اٹھارہ ہزار روپے فی کس کے حساب سے خریدے گئے۔ اس سودے سے رجب کافی مایوس نظر آرہا تھا۔ درحقیقت سودے کی گرما گرمی میں اس کے منہ سے بیس ہزار روپے فی کس نکل گیا تھا' ورنہ میرے خیال میں وہ ان افراد کو تیس ہزار روپے فی کس سے کم میں بیچنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکیوں کے معاملے پر کافی بحث ہوئی' آخر ان کی بات تین لاکھ میں طے ہوگئی۔

سودا طے ہونے کی خوشی میں رجب ہمیں اصل رشین وڈکا پلانا چاہتا تھا لیکن میں نے حیلے بہانے سے اسے ٹال دیا۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ رجب فون سننے کے لیے باہر گیا تو صفدر نے بے ساختہ کانوں کو ہاتھ لگائے "شاہ جہاں صاحب' مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے بدہضمی کی حالت میں سو رہا ہوں اور کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اپنے ہی جیسے بندوں کی خرید و فروخت کے ایسے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ غزالہ کی تلاش میں نکلے تھے اور ڈھونڈ کچھ اور لیا ہے۔"

"آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟" میں نے کہا۔

"میرے ذہن میں تو ایک اور بات آرہی ہے۔" صفدر نے کہا "کیوں نہ لڑکیوں میں کسی ایک کو یہاں بلایا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو سمجھ ہی لیتی ہوں' کچھ تو معلوم ہوگا ان سے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا' رجب فون سن کر واپس آگیا۔ صفدر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے بازاری لہجے میں کہا "رجب صاحب! سودے کی خوشی

میں تھوڑی سی دل پشاوری ہی کروائیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں جان جگر۔ کیا چاہیے۔"

"وہ ہرے کپڑوں والی لڑکی کبھی ہوئی ہے میرے دل میں تو۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے بھیج دو یہاں۔"

رجب اتنے میری طرف دیکھ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ بولا "لگتا ہے آپ کے ساتھی کو اس ٹریڈ میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اگر ان کا تجربہ ہوتا تو ایسی بات کبھی نہ کہتے۔"

رجب کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں نے مسکرانا ضروری سمجھا۔ رجب اب صفدر سے مخاطب ہو کر بولا "محترم! آپ کی خوشی کے لیے اس سے اچھی لڑکی پیش کر دیتا ہوں۔ اس کو معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہ کنواری لڑکیاں ہیں۔ کنواری کی قیمت عام لڑکی سے تین چار لاکھ تک زیادہ ہوتی ہے۔ شاید آپ نے کبھی اس طرح کا سودا ہی نہیں کیا ہے۔ یہ تو آپ کا بکا بکایا مال ہے۔ اسے خراب کیوں کر رہے ہیں۔" پھر اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے زور سے آواز دی "جانی او جانی۔"

چند لمحے بعد درمیانے قد کا ایک بالکل گنجا شخص اندر داخل ہوا۔ اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رجب نے پوچھا "گلنار کہاں ہے؟"

گنجا بولا "سو رہی ہے۔"

"جاؤ اس کتے کی پچی کو اٹھاؤ اور تیار کر کے فوراً یہاں لے آؤ۔" ملازم باہر کی طرف گھوما "ٹھہرو" رجب نے آواز دی "اس دوسری چھمک چھلو شاہینہ کو بھی لاؤ۔ اور جلدی کرو دس منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔"

"شاہینہ۔۔۔ کا تو بچہ بیمار ہے۔" گنجے نے جھجک کر کہا۔

"بھاڑ میں جائے بچہ۔" رجب پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا "جلدی لاؤ ان کو یہاں۔"

گنجا بدک کر باہر نکل گیا۔ رجب مونچھوں کو مروڑا دے کر بولا "بچے والی ہے لیکن ہے غضب کی چیز۔ ایسا نشہ چڑھائے گی کہ دوپہر تک ہوش نہیں آئے گا آپ جناب کو۔"

میں اس کمرے میں لیٹا رہا جبکہ صفدر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک خوب رو لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھرپور جسم کی مالک تھی اور اس کے چہرے پر کشش بھی تھی مگر اس کشش کو بے چارگی اور دکھ کی پرچھائیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہی شاہینہ تھی۔ مجھے اس کی سرخ و سپید کلائیوں پر سیاہ نشان سے دکھائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ ایک پرانی مارپیٹ کا نتیجہ تھے۔ شاہینہ سہمی سہمی سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا "تمہارا بچہ بیمار ہے؟"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ شاید اسے مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو اپنی دانست میں ایک بہکے ہوئے شرابی مرد کے پاس آئی تھی جسے زبان سے زیادہ اپنے ہاتھوں سے کام لینا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولی "ہاں میرے بچے کو تکلیف ہے۔ وہ کل سے مسلسل رو رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی لڑکی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ یہ ممتا کے آنسو تھے۔ ان لمحوں میں حسن و شباب کا وہ مجسمہ سراپا "ماں" نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کہاں ہے تمہارا بچہ۔"

وہ بولی "یہاں پاس ہی پچھواڑے کے کمرے میں ہے۔"

میں لڑکی سے تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ صفدر والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رجب بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے اندازے میں وہ ضرورت سے زیادہ چڑھا گیا تھا اور اب بستر پر گر کر سو گیا تھا۔ آس پاس کوئی اور شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں شاہینہ نامی اس لڑکی کو لے کر بہ آہستگی باہر نکل آیا "کس کمرے میں ہے تمہارا بچہ؟" میں نے سرگوشی کی۔

اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم اس کمرے میں پہنچے، صرف ڈھائی تین ماہ کا ایک خوش شکل بچہ بستر پر سو رہا تھا۔ شاہینہ نے بتایا کہ جانی (گنجے) کے کہنے پر اس نے بچے کو نیند کی گولی دی ہے۔ پھول سا بچہ نیند کی حالت میں بھی چہرے پر تکلیف سجائے ہوئے تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ گاہے گاہے بسورنے والے انداز میں اینٹھ جاتا تھا۔ پھول کی پنکھڑی جیسے اس ہونٹ کی یہ حرکت تڑپا دینے والی تھی۔ میں نے شاہینہ سے پوچھا "اسے ہوا کیا ہے؟"

وہ بولی "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پیٹ درد کی دوا کھلائی ہے، پیٹھ پر بھی دوا لگائی ہے، کان میں قطرے بھی ڈالے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید اس کے بازو میں کوئی تکلیف ہے۔"

میں نے بہ آہستگی بچے کا فراک ایک طرف سے اتار کر اس کا بازو باہر نکالا۔ ہڈیوں کے اتار چڑھاؤ کی تھوڑی بہت خبر مجھے بھی تھی۔ میں نے بچے کے نازک کندھے کو آہستہ آہستہ حرکت دی۔ سوتے میں بھی اس کا جسم اینٹھ گیا اور صورت رونی ہو گئی۔ میں نے کندھے کو اچھی طرح ٹٹولا۔ اس کا کندھا اترا ہوا تھا۔ میں اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد بچے کا بازو

سیدھا اوپر لے گیا اور ذرا سا دبا کر کندھا چڑھا دیا۔ بچہ رونے لگا لیکن پھر فوراً ہی چپ ہو گیا۔

"کیا تھا؟" شاہینہ نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کندھا اترا ہوا تھا۔ اب ٹھیک ہو گیا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

اوہ مائی گاڈ۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا، پھر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا میں نے بچے کا بازو دھیرے دھیرے ہلایا، وہ بالکل پُرسکون رہا۔ میں نے کہا "اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ اطمینان سے سوئے گا۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی "اس کے پیٹ میں صبح سے کچھ نہیں گیا۔ میں اسے دودھ پلا لوں؟"

میں نے کہا "تم اطمینان سے دودھ پلاؤ۔ جب یہ سو جائے تو آ جانا۔ میں اپنے کمرے میں ہی ہوں۔"

اس نے تشکر کی نظروں سے مجھے دیکھا اور بچے پر جھک گئی۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے تین چار سگریٹ پھونکے پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ حالات کا بہاؤ عجیب و غریب تھا۔ بردہ فروش ارشاد احمد اور اس کے ساتھی مجھے رجب نامی اس غنڈے کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتے تھے۔۔۔ مگر ایک اتفاق کے تحت یہ غنڈا مجھے ہی ارشاد احمد سمجھنے لگا تھا۔ نہ صرف ارشاد احمد سمجھنے لگا تھا بلکہ بے خبری میں مجھ پر کئی راز بھی افشا کر چکا تھا، اور ان میں سے ایک راز یہ بھی تھا کہ رجب صرف کرائے کا قاتل ہی نہیں خود بھی بردہ فروشی جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے۔

کچھ دیر بعد آہٹ ہوئی اور شاہینہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ دور کہیں کسی مسجد میں موذن نے فجر کی اذان دینے کے لیے اسپیکر کھول لیا تھا اور اذان سے پہلے دعائیہ کلمات ادا کر رہا تھا۔ میں غور سے شاہینہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں اس لٹی پٹی لڑکی کے چہرے پر اطمینان کی ایک یادگار کیفیت نظر آ رہی تھی۔ یہ اطمینان یقیناً اس بات کا تھا کہ اس کا بچہ سو رہا تھا اور وہ اس کی غذا اس تک پہنچا چکی تھی۔ میں نے شاہینہ سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ تذبذب میں تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ بستر پر بیٹھے یا صوفے پر۔ میں نے اسے اس الجھن سے نکالا اور صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر حیرت اور طمانیت کے ملے جلے تاثرات نظر آئے۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیسے پہنچی ہے۔ میں نے جب اس موضوع پر بات کی تو اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ جیسے ڈر رہی ہو کہ بے دھیانی میں اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ پھسل جائے۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ کوشش قطعی ناکام رہی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی "آپ جو کوئی بھی ہیں، میں آپ کی شکر گزار ہوں اور آپ کی عزت کرتی ہوں۔ لیکن اگر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ میں آپ کو اپنے بارے میں یا یہاں کے لوگوں کے بارے میں کچھ بتا سکوں گی تو آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

لڑکی کے لہجے میں ایسی قطعیت تھی کہ میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں خاموش تھا اور لڑکی بھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔ خاموشی جب زیادہ طویل اور بے ڈھنگی ہو گئی تو لڑکی بے قراری سے پہلو بدلنے لگی۔ آخر بولی "آپ بھلے آدمی لگتے ہیں، آپ پر بھروسا کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ کاش میں آپ کو وہ زنجیریں دکھا سکتی جنہوں نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔"

میرا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ میں سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سر جھکایا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی "مم۔۔۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں، میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے۔ میں نے کہا "ایک طرف تم مجھے بھلا آدمی کہہ رہی ہو۔ دوسری طرف، یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھاؤں گا۔"

وہ زخمی انداز میں ہنسی "مجبوری۔۔۔ یہ کوئی مجبوری نہیں۔ اب تو یہ زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ اب تو اپنا آپ بہتے پانی کی طرح لگتا ہے جس میں کوئی بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔ نہ ہاتھ دھونے والے کو سوچنا پڑتا ہے نہ بہتے پانی کو کچھ فرق پڑتا ہے۔"

"یہ بچہ کس کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ دردناک لہجے میں بولی "میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ میرا بچہ ہے، اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ہاں، وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ جس طرح گندگی سے خوش نما پھول کھل اٹھتا ہے، اسی طرح اس بچے نے بھی گناہ کی دلدل سے جنم لیا تھا۔ لیکن جس طرح پھول صرف پھول ہوتا ہے اس طرح وہ بچہ بھی صرف بچہ تھا۔ فرشتہ صورت،

معصوم آنکھوں والا اور پھلجھڑی جیسے ہونٹوں والا۔ اس پر اپنی ممتا نچھاور کرنے کے لیے ماں کو صرف یہ یقین کافی تھا کہ بچے نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

سامنے میز پر اسپیشل رشین وڈکا کی چمک دار بوتل رکھی تھی۔ شاہینہ نامی اس لڑکی نے موضوع بدلنے کی خاطر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولی "آپ کے لیے گلاس بناؤں؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔ درحقیقت میں اب جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اصل ارشاد احمد فون پر یا کسی اور ذریعے سے رجب کے ساتھ رابطہ نہ کرلے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ ہوجاتا تو ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ جاتا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر صفدر کے دروازے پر دستک دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی جاگ رہا ہوگا۔ اس کے کمرے میں بھی لڑکی موجود تھی، تاہم مجھے معلوم تھا کہ میری طرح وہ بھی لڑکی سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ لڑکی کو اپنے کمرے میں بلانے سے اس کا مقصد بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ وہ اس الگ تھلگ عمارت اور یہاں کے نہایت تاریک ماحول کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ میری طرح اسے بھی ناکامی ہوئی ہوگی۔

کچھ دیر بعد صفدر باہر نکل آیا۔ میری دستک کی آواز نے رجب کے کارندے جانی کو بھی وہاں کھینچ لیا۔ وہ بولا "کیا بات ہے صاحب! آپ جارہے ہیں؟"

"سوفی صد جارہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن ماسٹر تو کہتے تھے، آپ دوپہر تک یہیں رہیں گے۔" ماسٹر سے جانی کی مراد یقیناً "رجب" تھا۔

"ہاں رہنا تو تھا لیکن ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

جانی نے مشتبہ نظروں سے شاہینہ کی طرف دیکھا اور بولا "صاحب! کیا ان لڑکیوں میں سے تو کسی نے بدتمیزی نہیں کی۔"

"نہیں بھئی! ایسی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے ماسٹر کو بلاؤ۔"

"وہ تو سورہے ہیں صاحب۔ ویسے انہوں نے کہا تھا کہ آپ دوپہر تک یہاں رہیں گے لیکن اگر پہلے جانا چاہیں تو ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہو۔"

جانی ڈرائیور کو مطلع کرنے چلا گیا۔ میں نے میز پر رکھی اسپیشل وڈکا کی بوتل اٹھائی اور کپڑے میں لپیٹ لی۔

"اس کا کیا کریں گے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یار! نایاب برانڈی کی بوتل ہے۔ کہیں کام آجائے گی۔" میں نے کہا۔

کھڑکیوں پر دن کا اجالا دستک دے رہا تھا۔ ہم باغات میں گھری ہوئی اس عمارت میں سے نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم رجب کے ڈرائیور کے ساتھ شہر کی طرف جارہے تھے۔

زریں گل کے چچازاد بھائی رستم خاں والا ٹھکانا ہمارے بدخواہوں کی نگاہ میں آچکا تھا۔ وہاں کا رخ کرنا خود کو خطرات میں جھونکنا تھا۔ میں اور صفدر اسٹیشن کے علاقے میں پجارو سے اترگئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ہم میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئے یہ سارا علاقہ چھوٹے بڑے ہوٹلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم نے درمیانے درجے کے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں ڈبل بیڈ کا کمرا لے لیا اور دروازہ بند کرکے حلوے پوری کا ناشتا کرنے لگے۔ ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ غزالہ لاہور میں ہونے کے باوجود تاحال ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ اب یہ پروفیسر اللہ دتا اور ارشاد احمد والا سنگین چکر سامنے آگیا تھا۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ ارشاد احمد براہِ راست اسمگلنگ اور بردہ فروشی میں ملوث ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس گھناؤنے کاروبار میں اور کون کون شریک ہے اور یہ جال کہاں تک پھیلا ہوا ہے بہرحال آثار بتا رہے تھے کہ صوبائی دارالحکومت میں پولیس اور قانون کی ناک کے عین نیچے نہایت سنگین قسم کے جرم کا ارتکاب ہورہا ہے۔ غالباً ہم اس معاملے کی تہہ کبھی بھی نہ لگا سکتے اگر پروفیسر اللہ دتا کے کلینک میں وہ ریچھ نما شخص مجھے میری آواز سے نہ پہچانتا۔ اس کی ہوشیاری ہی اس کے لیے اور اس کے گروہ کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ ہمیں ٹھیک سے معلوم تو نہیں تھا لیکن اندازہ یہی ہورہا تھا کہ مجھے اپنے ٹھکانے پر دیکھنے کے بعد گروہ کے ارکان میں شدید قسم کی سراسیمگی پھیل گئی۔ اس سراسیمگی کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ مجھ پر اور صفدر پر اوپر تلے دو قاتلانہ حملے ہوئے۔ اور ہم ان حملوں کی وجہ معلوم کرنے کے چکر میں رجب سے جا ٹکرائے۔

غزالہ کے بعد جس دوسرے فرد کا خیال مجھے بار بار آرہا تھا وہ مجتبیٰ کنور تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ان دنوں شدید قسم کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ وہ دفینے کے انتہائی قریب پہنچ کر اس سے دور ہوگیا تھا اور اس صورتِ حال کا وہ جس قدر بھی ماتم کرتا وہ کم تھا۔

جب ہم بھوپال سے پاکستان روانہ ہوئے تھے، مجتبیٰ کنور

جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا۔ مسٹر کلارک کی تلاش میں وہ سرپٹ بھاگا ہوا دہلی پہنچا تھا اور اس کے علاوہ بھی نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی۔ اب ہماری آخری اطلاعات کے مطابق وہ زخمی درندے کی طرح غراتا ہوا پاکستان واپس پہنچ چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ مجھ سے اور صفدر سے بھی وہ زیادہ "خوش" نہیں ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہم دونوں کے حوالے سے اس کے ذہن میں کچھ شدید بدگمانیاں بھی جنم لے چکی ہوں۔ میرے خیال میں یہ ضروری تھا کہ مجتبیٰ کنور سے ملا جائے اور اس کے ذہن میں موجود بدگمانیوں کو مکمل دشمنی میں بدلنے سے روکا جائے۔ حلوے پوری اور مرغ چنے کا ناشتا ختم کرتے کرتے میں اور صفدر اس فیصلے پر پہنچ چکے تھے کہ ہمیں آج ہی مجتبیٰ کنور کے نیاز حاصل کرنے چاہئیں۔

دوپہر کے وقت ہم مجتبیٰ کی عظیم الشان محل نما کوٹھی پر پہنچے۔ لان میں ہی مسز مجتبیٰ یعنی "زلیخا" سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک بڑی فینسی قسم کی قینچی ہاتھ میں لیے پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ وہاں چوٹوں کے نیلگوں نشانات موجود تھے۔ اس طرح کے نشانات میں اس کے چہرے پر پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ مجتبیٰ خراب موڈ میں ہو تو بیگم کی دھنائی کردیتا ہے۔ ہمیں پہلے سے اندازہ تھا کہ مجتبیٰ کا موڈ بہت خراب ہوگا، اب "زلیخا" کا چہرہ دیکھ کر اس خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔ شوہر سے مار کھانے والی عورت عام طور پر اس واقعے کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر چہرے پر چوٹ آئی ہو تو بہانہ بنا دیا جاتا ہے کہ گرنے سے چوٹ آگئی ہے یا بچے نے کوئی چیز دے ماری ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن زلیخا کے حوالے سے میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ اپنی چوٹ یا چوٹوں کو چھپاتی نہیں۔ شاید آہستہ آہستہ عزتِ نفس کا احساس ختم ہوگیا تھا اور مار کھانا اس کے لیے کھانا کھانے کی طرح معمول بن گیا تھا۔ ہم دونوں میک اپ میں تھے لہٰذا چوکیداروں کی طرح زلیخا بھی ہمیں پہچاننے میں ناکام رہی۔ ملازم میرا رقعہ لے کر اندر گیا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہمیں دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ مجتبیٰ کنور غصے سے بھرا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ کثرتِ شراب نوشی کے سبب ورم زدہ تھا۔ بال منتشر اور آنکھیں سرخ نظر آرہی تھیں۔ وہ گھریلو لباس دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا اور سراپا دیہاتی نظر آرہا تھا۔ ہمارے سلام کا جواب اس نے روکھے پھیکے انداز میں دیا اور صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا "کہاں چلے گئے تھے تم دونوں۔" اس نے پوچھا۔

"بھوپال میں رکنا بالکل بے کار نظر آرہا تھا لہٰذا پاکستان آگئے۔" میں نے کہا۔

"کم از کم مجھے اطلاع تو دی ہوتی، تم تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ہو۔ اور آج دس بارہ روز بعد شکل دکھا رہے ہو۔"

"بس صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی۔" میں نے کہا "وہاں کچھ مشکوک افراد ہمارے اردگرد گھوم رہے تھے۔ بڑا غیر یقینی سا ماحول تھا۔"

مجتبیٰ تاسف سے بولا "سب کچھ برباد ہوگیا شاہ جہاں۔۔۔ ساری محنت ساری بھاگ دوڑ۔ وہ حرامی امریکن تمہارے اعتماد کی آڑ لے کر ہم سب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا گیا۔"

"اعتماد تو ہم سب نے اس پر کیا تھا مجتبیٰ صاحب۔۔۔ یہ مجھ اکیلے کا فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ میں نے تو کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں۔ آخری فیصلہ تو ہمیشہ آپ ہی کرتے تھے۔"

"یہ بات نہ کہو شاہ جہاں۔" مجتبیٰ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا "کلارک جتنا قریب تمہارے تھا اور کسی کے نہیں تھا۔ اور یہ بات بھی تم بھول رہے ہو کہ دفینے کو بھوپال میں گولی ناتھ میڈیکوز کے اسٹور سے نکال کر "ایف ایم" کے مرکزی آفس میں پہنچانے کا فیصلہ بھی تمہارا ہی تھا۔"

"آپ فیصلے کا لفظ غلط استعمال کررہے ہیں۔ میں نے صرف رائے دی تھی۔ اس رائے کو مسترد کیا جاسکتا تھا۔ آپ کرسکتے تھے، سوچ کرسکتی تھی، اس وقت ہم سب کو اس سے بہتر کوئی اور صورت نظر نہیں آئی تھی۔"

مجتبیٰ نے خشک لہجے میں کہا "بہرحال مجھے محسوس ہورہا ہے کہ بھوپال میں مجھ سے کچھ باتیں چھپائی گئی ہیں۔ ہم سب ایک ٹیم کی طرح کام کررہے تھے اور ٹیم ورک میں اگر ایک دوسرے سے پردہ رکھا جائے تو اس سے بڑی بددیانتی اور کوئی نہیں۔"

بعین یہی الفاظ میں بھی مجتبیٰ کنور سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے بھوپال میں ٹیم اور ٹیم ورک پر لعنت بھیج دی تھی اور خفیہ خفیہ پیورو کرسی کے دو کرپٹ نمائندوں کو بھوپال بلا کر اور ان سے مل کر نوادرات کی بندر بانٹ کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر ہمیں بروقت اس پلاننگ کا علم نہ ہوجاتا تو معلوم نہیں مجتبیٰ کنور نے اب تک نوادرات اور دیگر سامان کا کیا حشر کردیا ہوتا۔ مجتبیٰ کا تمتمایا ہوا چہرہ غصے سے اور تمتما گیا تھا۔ وہ براہِ راست ہم دونوں پر اٹیک نہیں کررہا تھا لیکن اس کے اشارے کنایے ہماری ہی طرف تھے۔ وہ

میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تم لوگ اتنے دن یہاں لاہور میں کیا کرتے رہے ہو؟"

"چھپتے پھرے ہیں اور کیا کیا ہے۔"

"چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟" مجتبیٰ نے پوچھا۔

"یہاں لاہور پہنچتے ہی کچھ لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھ پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ کئی دن مسلسل نگرانی بھی ہوتی رہی ہے۔"

"لیکن تم تو میک اپ میں ہو۔"

"یہی تو حیرانی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ مجھے بہت نزدیک سے جاننے والے کسی شخص نے آواز سے پہچانا ہے۔"

"کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟" مجتبیٰ نے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

مجتبیٰ کے چہرے پر پھر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ وہ بولا "کہہ تو تم سب کچھ سکتے ہو لیکن شاید میں اس قابل نہیں کہ تم مجھے بتاؤ۔"

وہ خود پر بہت ضبط کیے ہوئے تھا مگر کسی بھی وقت اس کا ضبط جواب دے سکتا تھا اور وہ "تو تکرار" پر آ سکتا تھا۔ میں نے اس کا مزید امتحان لینا مناسب نہیں سمجھا اور مسکراتے ہوئے کہا "معلوم نہیں، آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم آپ سے کوئی بات چھپائیں گے۔ اب دیکھیں ایک خوش خبری ملی ہے اور سب سے پہلے آپ کو سنانے دوڑ پڑے ہیں۔ حالانکہ اس بات کا خطرہ بھی موجود تھا کہ کہیں ہمارا تعاقب نہ کیا جائے۔"

"کیسی خوش خبری؟" مجتبیٰ کنور نے چونک کر پوچھا۔

"آپ نے پوچھا نہیں کہ اس پلاسٹک بیگ میں میں کیا لایا ہوں؟" میں نے تپائی پر رکھے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" مجتبیٰ نے بیگ کو گھورا۔

"اصل رشین وڈکا کی اسپیشل بوتل۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو بہت پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کے ساتھ ایک خوب صورت شام منانا پسند کریں گے۔"

"تم کسی اچھی خبر کا ذکر کر رہے تھے۔"

"مسٹر جی کلارک کا فون نمبر میرے پاس موجود تھا۔ میں نے کل انہیں نیویارک میں فون کیا۔ ان کے پرائیویٹ سیکریٹری نے فون اٹینڈ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں اپنا رابطہ نمبر دے دوں، آج یا کل کسی وقت مسٹر جی کلارک مجھ سے بات کریں گے۔ میں نے یہاں موہنی روڈ پر اپنے ایک دوست کے فون نمبر دے دیے۔ کل رات نیویارک سے ان کا فون آیا۔ ان سے طویل بات ہوئی ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ تمام نوادرات اور دفینے کا دیگر سامان نیویارک میں ہے اور ان کی تحویل میں ہے، انہوں نے کہا ہے کہ دفینے کے حصول کے لیے جس جس نے جو جو کوششیں کی ہیں وہ ان کے علم میں ہیں، وہ کسی کا حق رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ٹیم کے ہر رکن کو اس کا پورا پورا حصہ پہنچائیں گے۔ وہ تمام نوادرات اور دیگر سامان بیچنا چاہتے ہیں۔ کچھ نوادر وہ خود خریدیں گے، باقی اوپن مارکیٹ میں بیچیں گے۔ یہ پراسس ایک ڈیڑھ ماہ میں مکمل ہو جائے گا اس کے بعد وہ دوبارہ ہم سے رابطہ کریں گے اور آئندہ کا لائحہ عمل بتائیں گے۔ انہوں نے زور دے کر کہا ہے کہ یہ سب زبانی جمع خرچ نہیں ہے اور ویسا ہی ہے جیسا وہ کہہ رہے ہیں۔"

مجتبیٰ نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا "اور تم ان باتوں پر یقین کر رہے ہو؟"

"یقین کرنے کی ایک چھوٹی سی وجہ ہے مجتبیٰ صاحب۔" میں نے کہا "جیسا کہ آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ مسٹر کلارک کا شمار امریکا کے گنے چنے امرا میں ہوتا ہے، ان کے وسائل لامحدود ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو کہیں اس طرح اوجھل ہوتے کہ ہم مہینوں ان سے رابطہ ہی نہ کر سکتے۔ لیکن انہوں نے از خود مجھ سے رابطہ کیا ہے اور اس دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی کا حق تلف کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے مجتبیٰ صاحب۔ مسٹر جی کلارک کو دولت کی کمی نہیں ہے۔ ان کا کریز صرف نوادرات کے حوالے سے ہے۔ وہ نوادرات اپنے ساتھ امریکا لے گئے ہیں۔ وہاں وہ اپنی من پسند اشیا... اپنے حصے میں وصول کر لیں گے یا قیمتاً اپنے پاس رکھ لیں گے۔ اس کے بعد ان کی کوئی ترجیح نہیں ہوگی۔"

مجتبیٰ بولا "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ استاد جانی بول رہا ہے۔ اس سادگی پر کون نہ مر جائے خدا کرے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ آپ یہ بات کہیں گے، لیکن مجتبیٰ صاحب! کبھی کبھی ہماری سوچوں کے بالکل الٹ کوئی ایسی بات بھی ہو جاتی ہے جو ہر منطق کو رد کر دیتی ہے۔ آپ تھوڑی دیر پہلے خود یہ بات کہہ چکے ہیں کہ میں مسٹر کلارک کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں۔ اسی جان پہچان اور مزاج شناسی کے سبب میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شاید مسٹر کلارک واقعی وہ کچھ کر گزریں جو کہہ رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور انتظار کریں کہ مسٹر کلارک کب اپنا اخلاقی

محی الدین نواب کے قلم سے ایک لازوال ناول

- ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
- ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے
ڈاک خرچ ۲۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ!

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے ہاں کرنا ہو تو بک سٹال سے طلب فرمائیں

فرض پورا کرتا ہے۔ اگر وہ فرض پورا کردے تو ہم خدا کا شکر ادا کریں اور اگر نہ کرے تو صبر شکر کرکے بیٹھے رہیں اور یہ سوچیں کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی بہتری ہی ہوگی۔" مجتبیٰ کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

میں نے کہا "غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے مجتبیٰ صاحب! اور ہم سب سے بھی ایک غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے لگیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں چند دن انتظار کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں یہ محسوس ہو کہ مسٹر کلارک اپنے وعدے سے پھر رہے ہیں تو پھر ہم پوری قوت سے حرکت میں آئیں اور جو کچھ کرسکتے ہیں کر گزریں۔"

"وہ کوئی وعدہ نہیں نبھائے گا۔ وہ صرف تاخیری حربے استعمال کررہا ہے۔" مجتبیٰ نے بے حد مایوسی سے سرہلایا۔

کافی دیر اس معاملے پر بات ہوتی رہی۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی مجتبیٰ کے ساتھ ہی کھایا۔ ہم مجتبیٰ کو مطمئن کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا مطمئن ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ اگر مسٹر کلارک کے وعدے پر یقین کر بھی لیتا تو بھی مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی نگاہ تو تمام نوادر اور تمام سامان پر تھی۔ وہ دفینے کے جز کا نہیں کل کا خواہش مند تھا۔ جتنی لمبی چوڑی خواہش اس نے کی تھی اتنی ہی وسیع و عریض مایوسی کا اسے سامنا تھا۔ بہرحال مجتبیٰ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو کسی حد تک سرد کرکے ہم وہاں سے واپس آگئے۔ ہم نے مجتبیٰ کو بتا دیا تھا کہ ہم ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ رابطے کے لیے اسے فون نمبر بھی دے دیا تھا۔

ہم سہ پہر ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجتبیٰ کنور کے گھر سے نکل آئے تھے۔ ٹیکسی پر سوار ہم مال روڈ پہنچے اور پھر لارنس گارڈن کے ایک تنہا گوشے میں جاکر بیٹھ گئے۔ درحقیقت ہم دونوں کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ جو کچھ ہم نے ٹریول ایجنٹ ارشاد احمد اور کرارے کے قاتل رجب کے گھر میں دیکھا تھا وہ ہمارے دماغ کی چولیں ہلانے کے لیے کافی تھا۔ بالکل اتفاقیہ طور پر ہم پر کچھ لرزہ خیز انکشافات ہوگئے تھے۔ سلاخوں کے پیچھے بند قیدی' ان کا بھاؤ تاؤ اور ان کی بے بسی کے مناظر ذہن سے چمٹ کر رہ گئے تھے۔ ہم بیٹھے سوچتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ایک رائے تو یہ تھی کہ رجال ساہی صاحب سے رابطہ کیا جاتا اور انہیں بتایا جاتا کہ غزالہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم بھڑوں کے کس چھتے کو ہاتھ لگا بیٹھے ہیں۔ رجال ساہی صاحب متعلقہ تھانے کو حرکت میں لاتے اور رجب کو مع اس کی انسانی کھیپ کے گرفتار کرلیتے' اس کے علاوہ فوری طور پر دونوں مشکوک بھائیوں یعنی پروفیسر اللہ دتا اور ارشاد احمد کو بھی حراست میں لے لیا جاتا۔ لیکن اس کارروائی کے حوالے سے کچھ اندیشے بھی ذہن میں آتے تھے۔ ممکن تھا کہ ہم جن لوگوں کو پکڑیں ان کی حیثیت محض مہروں کی سی ہو یا وہ جرم کے اصل دریا کا ایک چھوٹا سا دھارا ہوں۔ اس صورت میں عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ بڑے مجرم اور حقیقی کرتا دھرتا ایک دم منظر سے غائب ہوجاتے ہیں اور ساری بھاگ دوڑ بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

صفدر نے مشورہ دیا "شاہ جہاں صاحب! میری رائے تو یہ ہے کہ پولیس کو ملوث کرنے کے بجائے ہم از خود ارشاد احمد یا رجب پر ہاتھ ڈالیں۔"

"کیسے ڈالیں ہاتھ؟"

"بس اٹھا کر لے جاتے ہیں کہیں۔ جیسے اس حرام زادی مالاں کو لے گئے تھے۔ پھر الٹا لٹکا کر سب کچھ اگلوا لیں گے۔"

"چلو کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے یہ لوگ کافی خرانٹ نظر آرہے ہیں۔ خاص طور سے یہ رجب تو کتے کی دُم کی طرح ٹیڑھا نظر آتا ہے۔"

"اگر یہ زیادہ ٹیڑھا ہے تو پھر اسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ مشکل کام کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔"

"تو چلو ٹھیک ہے' پھر کرو یہ مشکل کام' تم طریقۂ کار سوچ لو' میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ بولا "آیئے' سب سے پہلے تو چلتے ہیں رجب کے دولت کدے پر۔ پھر جیسی بھی صورتِ حال بنی ویسا ہی طریقہ اختیار کرلیں گے۔"

ہم دونوں کے پاس ریوالور موجود تھے۔ ہم نے ایک ٹیکسی روکی اور شاہدرے کی طرف روانہ ہوگئے۔ پتا نہیں کیوں جی چاہتا تھا کہ انارکلی کے قریب سے ہو کر گزریں۔ حالانکہ انارکلی ہمارے راستے میں نہیں آتی تھی پھر بھی ہم اسی جانب سے لوئر مال روڈ کی طرف گئے۔ ہماری آنکھیں امید بھری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتی رہیں۔ دکانوں میں جھانکتی رہیں۔ فٹ پاتھوں پر بھٹکتی رہیں' ذہن میں یہ آس موجود تھی کہ شاید کہیں غزالہ کی شکل دکھائی دے جائے۔ انارکلی پیچھے رہ گئی لیکن آس میرے ساتھ چلتی رہی۔ شاہی مسجد کے قریب ایک ٹریفک سگنل پر ہماری ٹیکسی رکی۔ مخالف سمت سے آنے والا ٹریفک بھی رکا ہوا تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میں ٹھٹک گیا۔ نیلی پجارو جیپ میں

رجب بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہماری نظریں ملیں صفدر نے بھی رجب کو دیکھ لیا۔ رجب نے ہاتھ سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور اپنی پجارو گاڑی کو سڑک سے اتار کر کچے پر لے گیا۔ ہم نے بھی ٹیکسی سڑک سے اتار کر رکوا دی۔

صفدر اور میں پوری طرح الرٹ ہوگئے تھے۔ رجب سے جدا ہوئے ہمیں اب دس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اس چکر سے آگاہ ہوچکا ہو جو رات ہم نے چلایا تھا۔ اصل ارشاد احمد نے فون کرکے رجب سے پوچھ لیا ہو کہ وہ رات کیوں نہیں آیا تھا' یا رجب ہی دوبارہ اس کے گھر چلا گیا ہو۔ اگر ایسا ہوچکا تھا تو پھر رجب کے ساتھ ہماری یہ سرِراہ ملاقات کسی سنگین ہنگامے کا سبب بن سکتی تھی۔ بہرحال جب رجب گاڑی سے نکل کر اور سڑک کراس کرکے ہمارے قریب آیا تو اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات ہی دکھائی دیے۔ اس نے آتے ساتھ ہی ہم سے مصافحہ کیا اور قدرے حیرت سے بولا "آپ ٹیکسی پر ارشاد احب؟"

"ہاں وہ ڈرائیور بدبخت رات کا شادی پر گیا ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

"کہاں جارہے تھے؟" رجب نے پوچھا۔

"تمہاری ہی طرف جارہے تھے۔"

"ویری گڈ۔ اچھا اتفاق ہے' میں آپ کی طرف آرہا تھا۔"

"کیوں؟ خیریت تھی۔" میں نے پوچھا۔

"شاہ جہاں کے سلسلے میں ہی آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔"

"چلو آؤ پھر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"آئیں گھر چلتے ہیں۔" رجب نے کہا۔

ہم نے ٹیکسی کو فارغ کیا اور رجب کے ساتھ اس کی پجارو گاڑی میں آبیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دریائے راوی سے پار رجب کی وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہورہے تھے۔ باغات اور درختوں سے گھری ہوئی یہ کوٹھی یقیناً اس دھندے کے لیے بے حد موزوں تھی جو رجب کررہا تھا۔ عمارت کے اندر اور اردگرد خوف ناک شکلوں والے رکھوالے کتے چکرا رہے تھے۔ ہم اسی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ جہاں بیٹھ کر کل رات ہم نے "غلاموں" کے سودے طے کیے تھے۔

رجب کے رویے سے واضح طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تک اصل ارشاد احمد یا اس کے کسی کارندے سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اپیل جوس کی چسکیاں لیتے ہوئے رجب نے کہا "میرے کارندوں نے آج وہ مکان دیکھا ہے جہاں استاد جانی اور اس کے ساتھی کو آخری بار دیکھا گیا تھا۔ کچی آبادی کے اس مکان میں بس رستم خاں نام کا ایک شخص ملا ہے' وہ رکشا چلاتا ہے۔ ہاں یہ معلوم ہوا ہے کہ استاد جانی کا ایک دیرینہ ساتھی زریں گل بھی ایک روز پہلے تک اس مکان میں موجود تھا' بہرحال اب زریں گل اور اس کی بیوی یہ مکان چھوڑ گئے ہیں۔ مکان کے آس پاس بظاہر تو کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس کے سفید پوش اہلکار وہاں موجود ہیں۔"

یہ ساری اطلاعات ہمارے لیے تسلی بخش تھیں۔ میں نے رات کو ارشاد کے گھر سے ساہی صاحب کو فون پر جو مشورہ دیا تھا وہ انہوں نے قبول کیا تھا اور اس کے مطابق عمل کیا تھا۔

میں نے رجب سے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے تمہارا۔"

وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا "آپ لوگوں کے دو ناکام حملوں کے بعد استاد جانی چوکس ہوچکا ہے۔ اب اس پر کافی محنت کرنا پڑے گی۔"

میں نے کہا "ناکام حملہ تو بس ایک ہی تھا۔ لب سڑک جانی اور اس کے ساتھی پر گاڑی چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی دوسرے واقعے کو حملہ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ تو ایک تعاقب تھا جس میں تھوڑی سی مارا ماری ہوگئی تھی۔"

"جو کچھ بھی ہے' ان واقعات نے میرا کام کافی مشکل کردیا ہے۔" رجب نے کہا "کچھ دیر توقف کرکے بولا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ استاد جانی کی بہن شفقتا یہیں لاہور میں ہے اور ایس ایس پی رجال ساہی صاحب نے اسے اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ کسی طرح اس لڑکی کے ٹھکانے کا علم ہوجائے تو استاد جانی کو ٹریس کیا جاسکتا ہے۔"

"میرے خیال میں تمہاری معلومات اس سلسلے میں زیادہ نہیں ہیں۔" میں نے کہا "شاہ جہاں کی ہمشیرہ ایس ایس پی ساہی کی تحویل میں نہیں۔ میں اس سلسلے میں پوری تصدیق کرچکا ہوں۔ یقیناً تمہیں اس تنازعے کا علم ہوگا جو اس لڑکی کے رشتے کے سلسلے میں کھڑا ہوا تھا' امارات کا ایک بہت بڑا شیخ اپنے بھتیجے کی برات لے کر لاہور پہنچ گیا تھا اور مایوس ہو کر واپس گیا تھا' اس واقعے کے بعد سے شاہ جہاں نے اس لڑکی کو کہیں روپوش کردیا ہے۔ امارات کے شیخ کی سخت کوششوں کے باوجود اس لڑکی کا کچھ کھوج نہیں ملا۔"

"شاہ جہاں کے دوست صفدر کی ایک منگیتر بھی تو تھی۔

شاید انجم نام تھا اس کا۔"

صفدر بولا "وہ انجم نام کی لڑکی بھی شاہ جہاں کی ہمشیرہ کے ساتھ ہی کسی پناہ گاہ میں چھپی بیٹھی ہے۔ میرے خیال میں ان دونوں کا خیال تو تم ذہن سے نکال ہی دو۔"

"ٹھیک ہے نکال دیتے ہیں۔" رجب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا کرو گے۔"

"سچ پوچھو ارشاد صاحب! تو ہمیں بہت زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خود پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کی وجہ سے شاہ جہاں کچھ محتاط ہو گیا ہے۔ لیکن زیادہ دیر محتاط رہنا اس بدبخت کے بس میں نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق چند دن کا وقفہ دے کر وہ پھر حرکت میں آجائے گا۔ جونہی وہ اللہ دتا صاحب کے کلینک کے آس پاس نظر آئے گا یا آپ سے ملاقات کی کوشش کرے گا' موت کا فرشتہ اس کے سر پر پہنچ جائے گا۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے رجب کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک لہرائی۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک کرایے کا قاتل نظر آیا۔ وہ یقینی طور پر ایک ایسا بندہ تھا جو "ساری انجام دے سکتا تھا' لیکن اس کے باوجود وہ مجھے کچھ بہت زیادہ متاثر نہیں کر سکا تھا۔ اگر میں اس کا موازنہ شنکر شکرا' عیسیٰ جان یا شیخ عاصم جیسے قاتلوں سے کرتا تو ان میں اور رجب میں وہی فرق تھا جو کسی کلب کے کھلاڑی اور قومی کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود رجب کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کسی وقت کلب کا کھلاڑی بھی قومی کھلاڑیوں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر جاتا ہے اور آناً فاناً سپر اسٹار کہلانے لگتا ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی دروازہ کھلا اور رجب کی رکھیل رخشی اندر داخل ہوئی۔ وہ رات ہی کی طرح چست پتلون اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ سامنے سے ٹی شرٹ کے بیشتر بٹن کھلے تھے اور جسم عریاں ہو رہا تھا' لیکن اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ تیز نشے میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ بال بکھرائے ڈولتی ہوئی آئی اور اس صوفے کے ہتھے پر چڑھ کر بیٹھ گئی جہاں رجب بیٹھا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے ہمارے سامنے ہی اس نے رجب سے بوس و کنار شروع کر دیا۔ وہ سچ مچ بکی ہوئی تھی اور اگر رجب اسے ذرا ڈھیل دیتا تو شاید وہ ہماری موجودگی کو خاطر میں لائے بغیر رجب کی آغوش میں گر پڑتی۔

رجب نے ہم سے معذرت چاہی اور اسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔ رخشی کا نیڈی کتا بھی چیختا چلاتا ان دونوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ میں اور صفدر اس مادر پدر آزاد رکھیل کے بارے میں تبصرہ کرتے رہے اور ڈرائنگ روم میں رجب کی واپسی کا انتظار کرتے رہے' لیکن وہ تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا "گدھا گیا اور ساتھ رسی بھی گئی۔"

"بھئی وہ بکی ہوئی تھی اسے سنبھال رہا ہو گا۔"

"یا ساتھ خود بھی بہک گیا ہو گا۔" صفدر نے پھلجھڑی چھوڑی۔

اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی' پھر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو تین افراد وہاں آبیٹھے۔ ان میں ایک تو گنجا جانی تھا' باقی دو غالباً مہمان تھے۔ وہ اونچی آواز میں بات کر رہے تھے' ان کی گفتگو میں بار بار سیون ایم ایم۔ برٹا پسٹل اور ایم جی وغیرہ کے نام آ رہے تھے۔ وہ اسلحے کے موضوع پر اظہارِ خیال کر رہے تھے' اور خود کو ایک دوسرے سے بڑھ کر اسلحہ شناس ظاہر کر رہے تھے۔ رجب کو واپس لوٹنے میں واقعی دیر ہو گئی تھی۔ شاید صفدر سچ ہی کہہ رہا تھا۔ رجب واقعی کہیں مصروف ہو گیا تھا۔

میں اٹھا اور ٹہلنے والے انداز میں اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایک ادھ کھلی کھڑکی سے میں نے اندر جھانکا' کمرے میں صرف دو افراد تھے۔ گنجا جانی شاید ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔ دونوں افراد صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی ریچھ کی آنکھوں والا شخص تھا' جس سے چند روز پہلے پروفیسر اللہ دتا کے کلینک میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور پھیل کر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیوں میں کئی طرح کی انگشتریاں نظر آ رہی تھیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے لیکن فی الوقت کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے بعد جانی اس مسلح محافظ کو لے کر اندر داخل ہوا جو کل رات قیدیوں والی بیرک کے سامنے نظر آیا تھا۔ ریچھ کی آنکھوں والے نے اسے بے تکلفی سے غیاثا کہہ کر مخاطب کیا اور بولا "یار! کیا بات ہے' کل رات رجب صاحب آئے نہیں؟"

"کہاں نہیں آئے؟" غیاثے نے پوچھا۔

"گھر اور کہاں۔۔۔ ارشاد صاحب کے ساتھ ان کا آٹھ بجے کا وقت طے ہوا تھا۔ انتظار کر کر کے وہ دس بجے کے لگ

بھگ گھر سے نکلے۔ انہیں ایک شادی پر جانا تھا۔"

غیاث نامی محافظ کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ وہ ریچھ کی آنکھوں والے شخص سے مخاطب ہو کر بولا "میرا خیال ہے کہ کل سے تمہاری اپنے باس کے ساتھ بات نہیں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! رجب صاحب سے ارشاد صاحب کی ملاقات تو کل رات ہی ہو گئی تھی۔ بلکہ ارشاد صاحب یہاں بھی آئے تھے۔ ان کا ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ دونوں قریباً چار گھنٹے یہاں رہے۔ لمبی چوڑی گفتگو ہوتی رہی ہے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" ریچھ کی آنکھوں والا بھڑک کر بولا "میں ابھی ایک گھنٹا پہلے ارشاد صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ پریشان ہو رہے ہیں کہ رجب صاحب آئے نہیں اور نہ فون پر رابطہ کیا ہے کسی نے۔"

جانی بولا "میں آپ دونوں سے زیادہ حیران ہوں۔۔۔ اور وہ اس لیے کہ رات والے مہمان تو اب بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

ریچھ کی آنکھوں والے شخص کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا "وہ دونوں کون ہیں۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا' اگر اب بھی میں حرکت نہ کرتا تو پھر سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ میں دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ وہاں سے صفدر کو ساتھ لیا۔ ہم دونوں نے اپنے ریوالور ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ ابھی ہم رجب کی تلاش میں ڈرائنگ روم سے نکلے ہی تھے کہ وہ واپس آتا دکھائی دیا "سوری۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" اس نے کہا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کی نگاہ ہمارے ہاتھ میں پکڑے ریوالورز پر پڑی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع کا سوچتا' صفدر نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا اور پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں۔ صفدر کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کرایے کا یہ خونی قاتل منہ سے آواز تک نہیں نکال سکا۔ اسی دوران میں کوریڈور کی طرف سے تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر جانی کے علاوہ محافظ غیاثا اور ریچھ نما شخص دکھائی دیا۔ اپنے باس کو چڑیا کی طرح ایک عقاب کے پنجوں میں جکڑا دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ محافظ غیاثے نے اپنی گن سیدھی کرنی چاہی لیکن صفدر کی للکار نے اسے جہاں کا تہاں روک دیا "خبردار!" صفدر گرجا "اگر کوئی حرکت کی تو اسے یہیں ڈھیر کر ڈالوں گا۔"

تینوں افراد سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئے۔ میں دیکھ رہا تھا' ریچھ نما شخص کا ہاتھ بہ آہستگی اپنی جیب کی سمت جا رہا تھا۔ میرے ریوالور نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور ریچھ نما اپنی ٹانگ پکڑ کر پہلو کے بل گر گیا۔ خون اس کی نیلی جین کو تیزی سے بھگو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پتلون سے بریٹا پسٹل نکالا تو وہ بالکل بھی مزاحمت نہیں کر سکا۔ یہ بالکل نئے ماڈل کا پسٹل تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس ریچھ نما شخص کو اسلحے میں گہری دلچسپی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ساتھ والے کمرے میں اس کی گفتگو سنی تھی۔

صفدر نے رجب کو ایک بھاری بھرکم گالی دی اور غرا کر بولا "ان کتوں سے کہو کہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جائیں اور کوئی ہتھیار ہے تو فرش پر پھینک دیں۔"

رجب نے ہاتھ کے اشارے سے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ایسا ہی کریں۔ غیاثا اور جانی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ غیاثے نے اپنی وزنی گن فرش پر پھینک دی اور گولیوں والی بیلٹ بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ جانی کے پاس سے چاقو برآمد ہوا۔

صفدر نے رجب سے پوچھا "اس عمارت میں تمہارے اور کتنے کارندے ہیں؟"

رجب نے جواب دینے کے بجائے ایک دم اپنا آپ چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کی یہ حرکت بڑی غیر متوقع تھی۔ نہ صرف یہ کہ ریوالور رجب کی کنپٹی سے ہٹ گیا بلکہ ایک سیکنڈ کے لیے صفدر کا توازن بھی خراب ہو گیا۔ تاہم صفدر نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر فیصلہ کیا اور اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے گولی چلا دی۔ صفدر نے بھی میری طرح رجب کی ٹانگ پر گولی ماری تھی۔ رجب تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی گردن پر صفدر کی گرفت ایک بار پھر مضبوط ہو گئی۔

اب یقینی بات تھی کہ اس عمارت میں موجود تمام افراد کھنچے ہوئے یہاں چلے آئیں گے۔ دو گولیاں چل چکی تھیں اور یہ کارروائی عمارت میں موجود ہر ذی نفس کو یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ صفدر کو کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال میں اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں کا استعمال کر سکتا تھا۔ وہ رجب کو کھینچ کر ایک کارنر میں لے گیا' اب وہ دائیں بائیں اور عقب سے قریباً محفوظ تھا۔ میں نے ایک دروازے کی

اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ کان ہر لحظہ بھاگتے قدموں کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ بیس تیس سیکنڈ گزرے' پھر پورا ایک منٹ گزر گیا۔ نہ کسی کے چیخنے بولنے کی آوازیں آئیں نہ قدموں کی چاپ ابھری۔ یہاں مکمل خاموشی تھی۔ کافی تاخیر سے ایک ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ یہ کوئی اکیلا فرد تھا اور یوں سست روی سے چلا آرہا تھا جیسے فائرنگ کی آواز پر نہیں کال بیل کی آواز پر آرہا ہو۔

۔۔۔ پھر وہ موقع پر پہنچا۔ وہ مرد نہیں عورت تھی اور خاصی موٹی عورت تھی۔ شلاً جنوباً دور تک پھیلی ہوئی۔ اس کے ہاتھ گیلے آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ یہاں کی باورچن ہے۔ اس نے قدرے تعجب سے صورت حال کا جائزہ لیا' پھر تفہیمی انداز میں سر ہلا کر ایک جانب کھڑی ہوگئی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو کہ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" ریچھ نما شخص پاس ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ فریہ اندام عورت نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے جیسے معمول ہی کا حصہ تھا۔

"اس عمارت میں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟" میں نے فربہ عورت سے پوچھا۔

"اور بھی بہت سے ہیں' لیکن یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ان کے کمرے کو باہر سے قفل لگا ہوا ہے۔" عورت نے کہا۔

میں سمجھ گیا۔ عورت کا اشارہ اس تہ خانے کی طرف تھا جس میں ایک بیرک کے اندر قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا گیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ دوسرے نوجوان تو آزاد تھے جنہیں ہم نے کامن روم کے ساتھ ایک ہال نما کمرے میں دیکھا تھا۔ کل رات وہ بے فکروں کی طرح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور ٹی وی وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ غالباً وہ آج بھی وہیں تھے لیکن فائرنگ کی آواز سن کر یہاں نہیں پہنچے تھے۔

پانچ منٹ کے اندر اندر میں نے مضبوط رسی سے رجب اور اس کے دونوں ساتھیوں کی مشکیں کس دیں۔ صفدر کی چلائی ہوئی گولی رجب کی ران کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم زیادہ سنگین نہیں تھا۔ میں نے خود ہی پٹی باندھ کر اس کا خون بند کردیا۔ ہاں ریچھ نما شخص کو لگنے والی گولی اس کی ٹانگ میں ہی تھی۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔

ہم نے فربہ اندام باورچن سمیت ان تمام افراد کو ایک محفوظ کمرے میں بند کرکے دروازہ مقفل کردیا۔ اس کے بعد میں باہر گیا اور عمارت کا مین گیٹ باہر سے مقفل کردیا۔ واپس عمارت میں آنے کے لیے مجھے دیوار پھلانگنا پڑی۔ اتنی دیر میں صفدر رجب کی پجارو اسٹارٹ کرکے اسے عمارت کے ایک عقبی باغیچے میں لے جاچکا تھا۔ گیٹ پر موجود خوفناک صورت والا چوکیدار ساری رات جاگنے کے بعد اب اپنے کیبن میں گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے بڑی تسلی سے اس کی گردن کے مخصوص حصوں پر دباؤ ڈالا اور اس کی نیند کو بے ہوشی میں تبدیل کردیا۔ چوکیدار کی مشکیں کسنے کے لیے میں نے اس کی طویل پگڑی استعمال کی۔ احتیاط کے طور پر اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تاکہ وہ ہوش میں آکر واویلا نہ کرے۔ ہم نے ایک اور احتیاط بھی کی اور وہ یہ کہ ٹیلی فون کا تار کاٹ ڈالا۔ علاوہ ازیں رکھوالی کرنے والے خطرناک کتوں کا بھی "ٹھیک ٹھاک" بندوبست کردیا گیا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر میں اور صفدر اس ہال نما کمرے کی طرف گئے جہاں کل شب ہم نے بائیس عدد خواب پرست نوجوانوں کو دیکھا تھا' ہاں وہ خواب پرست ہی تو تھے جو اپنے اردگرد سے آنکھیں بند کیے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ رہے تھے اور انجام سے بے خبر تھے۔ جب ہم تہ خانے کے ہال نما کمرے میں پہنچے تو اس کا دروازہ باہر سے بند نظر آیا۔ اسے کنڈی لگا دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ احتیاط یہاں کی باورچن ریشماں نے کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فائرنگ کی آواز سن کر سارے نوجوان اس طرف بھاگے چلے جائیں۔ میں اور صفدر کھڑکی میں پہنچے تو کئی نوجوان ایک ساتھ بولنے لگے۔ انہیں اندازہ ہوچکا تھا کہ کوٹھی میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ پہلے انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں' پھر میرے اور صفدر کے گرج دار لہجے ان تک پہنچے تھے۔ ایک لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ یہاں کیا معاملہ ہوا ہے۔

میں نے کہا "کوئی خاص بات نہیں۔ ایک اُچکا گھر میں گھس آیا تھا۔ اسے پکڑلیا ہے۔"

وہ بولا "رجب صاحب کہاں ہیں؟"

"رجب صاحب معمولی زخمی ہوئے ہیں' ابھی آجاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

اتنے میں ایک لحیم شحیم نوجوان آگے آیا۔ وہ ان نوجوانوں میں عمر کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا لگتا تھا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھ سے بات کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ گونگا بہرا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کیوں ہے؟

میں نے بتایا کہ دروازے کو کسی نے باہر سے تالا لگا رکھا

ہے۔ میری یہ بات گونگے نوجوان کے ایک ساتھی نے اشاروں کے ذریعے اس تک پہنچائی۔ گونگا نوجوان جس کا نام ہمیں معلوم ہوا عدیل تھا حیران نظر آنے لگا۔ دیگر چہروں پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے۔ کمرے میں بند نوجوانوں کو چونکہ دروازہ نظر نہیں آرہا تھا لہٰذا میرا یہ جھوٹ نبھ گیا کہ دروازہ مقفل ہے۔ درحقیقت میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ نوجوان... فی الحال اس کمرے سے نکلیں اور افراتفری دیکھ کر خود بھی پریشانی کا شکار ہوں۔

میں اور صفدر ڈرائنگ روم میں پہنچے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا تھا۔ ہمیں ایک دم کھل کر سامنے آنا پڑ گیا تھا۔ اب ہمارے لیے موزوں یہی تھا کہ رجب پر بہت سخت ہاتھ ڈال دیں۔ اسے زبان کھولنے پر مجبور کریں تاکہ پتا چل سکے کہ اس دھندے کا مکمل حدود اربعہ کیا ہے۔

جس وقت صفدر اور میں مشورہ کررہے تھے چیخنے چلّانے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں جہاں ہم نے رجب اور اس کے ساتھیوں کو بند کیا تھا۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ یہ چیخ و پکار رجب ہی کررہا ہے۔ میں اور صفدر موقع پر پہنچے۔ بند کمرے کے اندر رجب گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا اور ہمیں صلواتیں سنا رہا تھا۔ اس کی آواز میں درد و کرب کی کیفیت بھی موجود تھی۔ اس کیفیت کا سبب گولی کا وہ زخم تھا جو رجب کی ران پر آیا تھا۔ میں اور صفدر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ رجب ہمیں خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ صفدر نے اس کے منہ پر چند زوردار طمانچے رسید کیے۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور ٹھوڑی خون سے رنگین ہوگئی۔ جونہی ایک بار پھر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا' صفدر نے اس کے منہ میں ایک پرانا کپڑا گھسیڑ دیا اور پھر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ اب رجب بالکل بے بس تھا۔ ہاتھ پاؤں پہلے ہی بندھے ہوئے تھے اب چیخنے چلّانے سے بھی قاصر ہوگیا تھا۔

میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ رجب کے ساتھی جشمول باورچن ریشماں کچھ ڈری ڈری نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ریچھ نما شخص ان لوگوں کو ہماری اصلیت سے آگاہ کرچکا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ ریچھ نما شخص نے رجب کو بتا دیا تھا کہ وہ کتنے بڑے دھوکے میں رہا ہے' جس شخص سے وہ استاد جہانی کے قتل کا معاملہ طے کرتا رہا ہے وہ خود استاد جہانی ہی ہے۔ میرے اشارے پر صفدر نے رجب کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ رجب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا مگر صفدر کی گرفت کافی مضبوط تھی۔

"کہاں لے جارہے ہو اسے؟" ریچھ نما شخص نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"قتل خانے میں لے جارہے ہیں۔ اس کے بعد تمہاری باری ہے۔" میں نے جواب دیا اور دروازہ پھر باہر سے مقفل کردیا۔

میں چاہتا تھا کہ ایک دو گھنٹے میں ہم رجب سے جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں کرلیں۔ اس کے بعد رجال ساہی صاحب کو اطلاع دے دی جائے اور وہ پولیس کے ہمراہ یہاں پہنچ کر خاموشی سے ٹیک اوور کرلیں۔۔۔ ہم رجب کو چکنے فوش پر گھسیٹتے ہوئے عمارت کی عقبی سمت میں لے آئے۔ یہاں باغیچے میں سرونٹ کوارٹر کی طرز کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ قریب ہی بڑے سائز کے دو کتے بھی بندھے ہوئے تھے۔ ہم رجب کو ایک کمرے میں لائے اور اسے کھردری چارپائی پر لٹا دیا۔ یہ کمرا ایک جستی ٹرنک اور دو کرسیوں کے علاوہ بالکل خالی تھا' فرش گرد آلود تھا اور ایک کونے میں جالے لگے ہوئے تھے۔

صفدر نے کہا "چلو ایک سہولت تو موجود ہے۔۔۔ بجلی مہیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سالے کو کرنٹ وغیرہ لگانے میں آسانی رہے گی۔"

رجب کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ ایک گھاگ مجرم تھا' لہٰذا یہ بات تو اسے پہلے ہی معلوم ہوچکی تھی کہ اس پر سخت وقت آنے والا ہے۔

صفدر نے اس کی زخمی ران پر ریوالور کے دستے سے ضرب لگائی تو وہ بری طرح چیخنے لگا۔ لیکن ان چیخوں کی نوے فی صد آواز اس کے حلق کی گہرائی میں ہی گونج کر رہ گئی۔ ہاں اس کے مکروہ چہرے کے تاثرات اور اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی شدت سے چلّایا ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا پروگرام ہے رجب جان صاحب! گدھے کی طرح مار کھا کر چیخنا چلانا ہے یا انسانوں کی طرح بات مان لینی ہے۔" اس کے گلے کی رگیں ایک بار پھر پھول گئیں اور چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ یقیناً وہ میرے سوال کا کوئی مثبت جواب نہیں دے رہا تھا۔ غالباً وہ مجھے اور صفدر کو بزدلی کا طعنہ دے رہا تھا اور کچھ اس قسم کی بات کہہ رہا تھا کہ ہم نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو

اسے کھول کر اس سے دو بدو مقابلہ کریں وغیرہ وغیرہ۔ یہ مخالف کو اشتعال دلانے کا ایک گھسا پٹا حربہ تھا۔ ہم ایسی بے وقوفی کیونکر کرسکتے تھے جبکہ ہم جانتے بھی تھے کہ یہ کن ٹٹا کرایے کا قاتل ہم سے دو دو ہاتھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس جیسے دو بندے ہوں تو بھی صفدر انہیں چند سیکنڈ کے اندر ناک آؤٹ کر ڈالے۔ اس نے ہمارے قتل کی سپاری اٹھا کر غلطی کی تھی۔ اور اس سے بھی بڑی غلطی اُس نے کی تھی جس نے اس کن ٹٹے سیکنڈ کلاس بدمعاش سے ہمارے قتل کی سپاری اٹھوانے کا ارادہ کیا تھا۔

صفدر نے کہا "جناب! آغا رتا رہے ہیں کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے اس سے اسی زبان میں بات کرتے ہیں جو یہ سمجھتا ہے۔"

صفدر کی طرح میرے ذہن میں بھی مکروہ صورت رجب کے لیے بے رحمی پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ ماؤں کے جگر گوشے چھین کر انہیں بیرون ملک نامعلوم جہنموں میں دھکیلنے والا رعایت کا مستحق کیسے ہوسکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر وہ زبان نہیں کھولے گا تو اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا۔ اچانک مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی جیسے کسی کا پاؤں باغیچے میں سوکھے پتوں پر پڑا ہو۔ میں نے سن گن لینے کی کوشش کی مگر آواز دوبارہ نہیں آئی۔ مگر پھر چند سیکنڈ بعد اچانک مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے ہمارے بالکل قریب ایک یا دو افراد موجود ہیں۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا۔ شام کے جھٹپٹے میں امرود کے درختوں میں دو سائے متحرک نظر آئے۔

"صفدر گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا "یہاں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔"

ہم نے بندھے ہوئے رجب کو اٹھایا اور جستی ٹرنک کا ڈھکنا کھول کر اس میں ڈال دیا۔ ٹرنک کی تہ میں ایک دو بوسیدہ لحاف بھی رکھے تھے' رجب ان میں دھنس سا گیا۔ میں نے ڈھکنا بند کردیا تاہم اس کو مکمل بند نہیں کیا بلکہ ہوا کی آمدورفت کے لیے اس میں تھوڑی سی درز رہنے دی۔

درختوں میں نظر آنے والے دونوں سائے اب اوجھل ہوچکے تھے۔ میں اور صفدر کافی دیر سن گن لیتے رہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب باغیچے کے آس پاس کوئی موجود نہیں' ہم دونوں ریوالور بدست باہر نکل آئے۔ پہلے باغیچے کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر عمارت کی سمت بڑھے۔ ہم بڑی احتیاط سے ڈرائنگ روم کی جانب سے اندر داخل ہوئے۔ چند سیکنڈ بعد شدید خطرے کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے ہمارے بالکل نزدیک ایک سے زائد افراد موجود ہیں۔ اگر واقعی لوگ موجود تھے تو کہاں سے آئے تھے؟ بیرونی گیٹ تو باہر سے مقفل تھا۔ صفدر بھی خطرے کی بو محسوس کرچکا تھا اور ریوالور پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ پھر اچانک وہ کچھ ہوگیا جس کی ہم نے ہرگز توقع نہیں کی تھی۔ ایک کمرے کا بند دروازہ دھماکے سے کھلا اور کم و بیش آٹھ افراد بھرا مار کر ڈرائنگ روم میں گھس آئے۔ ان میں سب سے آگے وہی گونگا بہرا نوجوان تھا جسے تھوڑی دیر پہلے ہم بند کمرے میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس کا نام ہمیں عدیل معلوم ہوا تھا۔ عدیل کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں گھسنے والے اس کے ساتھی ہی تھے۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر مجھ سے اور صفدر سے چمٹ گئے۔ میں نے چیخ کر انہیں خود سے دور رکھنا چاہا لیکن ناکامی ہوئی۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں ٹریگر نہیں دبا سکا۔ دبا تا بھی کیسے۔ یہ نوجوان۔۔۔ ہاں یہ نوجوان تو میرے اپنے ہی جسم کا ایک قابلِ رحم حصہ تھے۔ انہیں زخم لگانے کا مطلب خود کو زخمی کرنا تھا۔ وہ ظالم نہیں مظلوم تھے۔ آنکھوں میں خواب سجا کر انجانے راستوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے خون پسینے کو ریال پاؤنڈ اور ڈالر میں بدلنے کی تمنا رکھتے تھے۔ ان کی مائیں نجانے کہاں کہاں مصلوں پر بیٹھی ان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔۔۔ میں ان پر گولی کیسے چلا سکتا تھا۔ دو تین ہاتھ میرے ریوالور پر آئے اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی دوران میں لڑکوں کی ایک اور مشتعل ٹولی کمرے میں گھس آئی۔ مجھے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ یہ صفدر کا ہوائی فائر تھا۔ گونگا نوجوان میرے عین سامنے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ دو زوردار ٹکریں اس نے میرے چہرے پر رسید کیں اور میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ تارے ناچ گئے۔ ضربوں کی تکلیف سے جھنجلا کر میں نیچے جھکا اور پنڈلی سے خنجر کھینچ لیا۔ نوجوان مجھ پر دیوانہ وار مکے برسا رہے تھے' کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار ہے۔ میں ذرا تیزی سے خنجر استعمال کرتا تو لڑکوں کا گھیرا توڑ کر نکل سکتا تھا' لیکن مسئلہ پھر وہی تھا۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں نشانہ بناؤں۔ وہ بیس بائیس کے قریب لڑکے تھے' چند سیکنڈ کے اندر وہ ہم دونوں پر حاوی ہوگئے۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا اور قمیص تار تار ہوگئی تھی۔

ہمیں اسی کمرے میں دھکیل دیا گیا جس کمرے سے نوجوانوں کی پہلی ٹولی برآمد ہوئی تھی کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا گیا۔ یہ کمرا غالباً ٹی وی روم کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا' لیکن اب ٹی وی وہاں موجود نہیں تھا۔ صرف دو طویل صوفے اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ فرش پر اونی دری بچھی ہوئی تھی۔ صفدر کی آنکھ سُوج گئی تھی اور نتھنوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ میری قمیص تار تار ہوگئی تھی لیکن جسم پر ہی تھی جبکہ صفدر کی قمیص سرے سے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ اس کی بنیان بھی ایک طرف سے پھٹ کر نیچے لٹکنے لگی تھی۔ ہم دونوں ہنستے تھے "ہاؤ ڈو یو ڈو؟" میں نے پوچھا۔

"فائن۔۔۔ بٹ ان پین۔"

"تو پین نوگین والا مقولہ نہیں سنا تم نے؟"

"مقولہ تو سن رکھا ہے لیکن اب اس کا مطلب ٹھیک سے یاد نہیں آرہا۔ کم بختوں نے اتنی ٹھوکریں ماری ہیں سر پر کہ یادداشت والا خانہ ہی متزلزل ہوگیا ہے۔"

"بے وقوفوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔" میں نے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

صفدر اٹھ کر دروازہ پیٹنے لگا۔ لیکن کئی منٹ کی کوشش کے باوجود کوئی ہماری طرف نہیں آیا۔ غالباً وہ لوگ مختلف کمروں میں رجب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جس کمرے میں ہمیں بند کیا گیا تھا وہاں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں آہنی گرل اور جالی لگی ہوئی تھی۔ از خود کوشش کرکے کمرے سے نکلنا بے حد دشوار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے ہی کمرے سے "نوجوان" کیسے باہر نکل آئے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس کمرے میں دو روشن دان بھی موجود تھے۔ ان روشن دانوں میں جالی تو تھی لیکن گرل نہیں تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا۔ گونگے بہرے نوجوان اور اس کے ساتھیوں نے ہم پر بلّہ بول کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔۔۔ مگر ابھی انہیں اس نقصان کا علم نہیں تھا۔ وہ رجب کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ جو انہیں جادو کے قالین پر بٹھا کر کسی ایسے ملک میں پہنچانے والا تھا جہاں ان پر دولت کی بارش ہونا تھی۔ ہم نے اس "نجات دہندہ" پر ہاتھ ڈالا تھا اور اسے زخمی کرکے ایک کمرے میں بند کردیا تھا۔ یہ جوشیلے نوجوان ہمیں اپنی سنہری منزل کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے لگے تھے اور آناً فاناً اپنے "نجات دہندہ" کی مدد کو نکل آئے تھے۔

چند منٹ بعد کمرے کے دروازے کے سامنے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر مشتعل نوجوان کھڑکی کے سامنے نظر آئے۔ لمبے بالوں والا گونگا بہرا نوجوان ان میں سب سے آگے تھا۔ ایک نوجوان نے چلّا کر پوچھا "رجب صاحب کہاں ہیں؟"

"ہمیں نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم ان کے ساتھیوں کے سامنے انہیں گھسیٹ کر کمرے سے لے گئے تھے۔"

"جس نے تمہیں بتایا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے۔"

"جھوٹ تم بول رہے ہو۔ فرش پر گھسیٹے جانے کے نشان ہیں' اور اس خون کے نشان بھی ہیں جو رجب صاحب کی ٹانگ سے بہہ رہا تھا۔ بتاؤ کہاں رکھا ہے تم نے انہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اگر وہ ہمارے ہتھے چڑھا ہوتا تو ہم اب تک اسے قتل کرچکے ہوتے لیکن افسوس کہ وہ نکل گیا۔"

"وہ انسان نہیں درندہ ہے۔" صفدر نے میری بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "وہ سوداگر ہے انسانوں کا۔۔۔ تم جیسے نجانے کتنے بے وقوفوں کو بیچ کر کھا چکا ہے وہ۔۔۔ تمہیں شکر کا سجدہ کرنا چاہیے کہ ابھی تک تمہاری واپسی کا راستہ بند نہیں ہوا۔۔۔"

"تم اپنی بک بک بند رکھو تو بہتر ہے۔" ایک جوشیلا نوجوان ریوالور لہرا کر بولا "ہمیں تمہاری تقریر نہیں رجب صاحب چاہئیں۔ ابھی اور اسی وقت۔" اس نے ریوالور میری طرف سیدھا کرلیا۔ گونگے بہرے نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور کی نال جھکا دی۔ ورنہ ممکن تھا کہ ریوالور بردار جوش میں فائر ہی کردیتا۔

ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا مجمع چیر کر آگے آیا۔ سرخ انگارا چہرے کے ساتھ وہ بولا "ہم نے اپنے گھروں کا سامان بیچ کر رجب صاحب کو رقم دی ہے۔ اگر یہاں ہمارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تو ہم آگ لگا دیں گے یہاں اور خود بھی جل مریں گے۔"

ایک دم کئی نوجوان شور مچانے لگے۔ ان سب کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم انہیں رجب صاحب کے بارے میں بتائیں۔ میں نے انہیں واضح الفاظ میں بتایا کہ رجب صاحب کا ہمیں کچھ پتا نہیں وہ یہاں سے نکل بھاگا ہے یا کہیں روپوش ہوگیا ہے۔

داڑھی والا ایک پٹھان نوجوان چیخ کر بولا "اوئے خدائی خوار! تم نے کیوں جھوٹ بولنے کا قسم کھا رکھا ہے۔ رجب صاحب کا ساتھی نے ام کو خود بتایا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم دونوں رجب صاحب کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے یہاں

سے گھسیٹ کر لے گیا ہے۔"

میں نے کہا "کہاں ہے وہ شخص جس نے تمہیں یہ بتایا ہے۔"

"وہ۔ ادھر ہی ہے، تمہیں ملا دیں گے اس سے بھی۔" سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا بھڑک کر بولا۔

میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لڑکوں کے ساتھ رجب کے دونوں ساتھی یعنی جانی اور غیاثا نظر نہیں آ رہے تھے۔ ریچھ نما شخص تو چلو زخمی تھا لیکن جانی اور غیاثے کو تو نظر آنا چاہیے تھا۔ یہ بات بھی بعید از امکان تھی کہ وہ دونوں ابھی تک رسیوں سے بندھے اسی کمرے میں پڑے ہوں جہاں ہم انہیں چھوڑ آئے تھے۔ لڑکوں نے یقیناً انہیں آزاد کر دیا تھا۔ پھر وہ کہاں گئے تھے؟

ہماری طرف سے مایوس ہو کر نوجوان لڑکے ایک بار پھر رجب کو تلاش کرنے کے لیے کوٹھی کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ صرف دو چار لڑکے کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے، ان کا تعلق لاہور کے گرد و نواح سے تھا۔ وہ پنجابی بول رہے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ انہوں نے بند کمرے میں سے نکلنے کے لیے روشن دان کا راستہ ہی استعمال کیا تھا۔ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا جو ابھی مجھ سے بات کر رہا تھا کافی دبلا پتلا بھی تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے روشن دان تک پہنچا تھا۔ اس کی جالی اکھاڑی تھی اور اپنے جسم کو موڑ توڑ کر روشن دان میں سے گزر گیا تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کی کنڈی کھول دی تھی۔ یوں گونگے نوجوان "عدیل" کی سرکردگی میں تمام لڑکے باہر نکل آئے تھے۔ پہلے انہوں نے رجب کے ساتھیوں جانی اور غیاثے کو رہا کرایا تھا، پھر رجب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے لڑکوں سے پوچھا کہ رجب کے دونوں ساتھی کہاں ہیں، لڑکوں نے ایک بار پھر گول مول سا جواب دیا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ جانی اور غیاثے کے ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایک بار تو یہاں آتے۔ یہ بات جاننے کے بعد کہ ان کا واسطہ استاد جہانی اور صفدر سے پڑا ہے وہ خاصے خوف زدہ نظر آنے لگے تھے، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ بھاگ ہی نکلے ہوں۔ مگر وہ چہرے مہرے سے ایسے بزدل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ میں اور صفدر اسی سوچ بچار میں تھے کہ گونگا عدیل احمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھر آ دھمکا۔ اس مرتبہ یہ لوگ پہلے سے بھی بڑھ کر مشتعل دکھائی دیتے تھے۔ وہ بلا تردد ہمیں گالیاں دے رہے تھے اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے چند لڑکوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھسنا چاہا لیکن دوسرے لڑکوں نے انہیں اس عمل سے باز رکھا۔ اور یقیناً انہوں نے دروازہ بند رکھ کر عقل مندی کا کام کیا تھا۔ پٹھان لڑکے نے ایک بار پھر کھڑکی کے راستے مجھ پر ریوالور تان لیا۔ وہ چیخ رہا تھا کہ اگر ہم نے رجب صاحب کا پتا نہیں بتایا تو وہ ہمیں گولی مار دے گا۔ اس کی جنونی کیفیت دیکھتے ہوئے ہمیں ڈرنا چاہیے تھا مگر ہم ڈر نہیں رہے تھے، کیونکہ ہم دونوں ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ لڑکا گولی نہیں چلا سکتا۔ درحقیقت عدیل کے سوا ان میں کوئی لڑکا بھی دم خم والا نہیں تھا۔ وہ سب معمولی ہنرمند یا محنت کش لڑکے تھے، مارا ماری کے کاموں سے ان کا واسطہ نہیں تھا۔ یہاں تو سب ایک گروپ کی شکل میں تھے لہٰذا ان کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا ورنہ کسی اکیلے لڑکے کو کسی اجنبی جگہ پر کوئی تھپڑ بھی مار دیتا تو شاید وہ اس کا جواب نہ دیتا۔

لڑکے کچھ دیر تک ہمیں کھوکھلی دھمکیاں دیتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ غالباً وہ ایک بار پھر کوٹھی کے طول و عرض میں رجب کو تلاش کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اندیشوں کے سائے تھے اور چہرے زرد ہو رہے تھے۔ وہ ہماری یہ بات ماننے کو ہرگز آمادہ نہیں تھے کہ رجب بہت بڑا فراڈ ہے اور ان کی زندگیاں برباد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی دوران میں کوٹھی کی بجلی چلی گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں اور صفدر کمرے کی دری پر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ بہت سے سوال، جواب طلب تھے۔ جیسے یہ سوال کہ لڑکے رجب کو ڈھونڈ سکیں گے یا نہیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں تھی کہ رجب کو تلاش کرنے والے لڑکے سرونٹ کوارٹرز میں نہیں پہنچے ہوں گے۔ وہ یقیناً ہر کوارٹر میں جھانک کر دیکھ چکے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ جستی ٹرنک کھول کر اندر نہ جھانک سکے ہوں گے۔ تاہم یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا تھا۔ رجب جستی ٹرنک میں ضرور بند تھا لیکن ہوش و حواس میں تھا۔ وہ جستی ٹرنک کو اپنے پاؤں سے بجا کر آواز پیدا کر سکتا تھا اور کوارٹر میں آنے والوں کو متوجہ کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیوں نہیں کیا تھا؟ یہ بڑا اہم بلکہ کسی حد تک تشویش ناک سوال تھا۔ میں نے ٹرنک کا ڈھکنا پوری طرح بند نہیں کیا تھا، کہ کہیں رجب کا دم نہ گھٹے۔ اس لیے یہ اندیشہ تو نہیں تھا کہ وہ دم گھٹ کر بے ہوش یا ہلاک ہو گیا ہو گا ہاں ایک بات ہو سکتی تھی۔ رجب کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ ممکن تھا کہ زیادہ اخراجِ خون کے سبب اس پر نقاہت

طاری ہو گئی ہو جو بے ہوشی پر منتج ہوئی ہو۔ بہرحال اس صورت میں بھی ہمیں تشویش ہونا لازمی تھی۔ ہم رجب کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہمارے پاس "بردہ فروشی" کے اس گھناؤنے دھندے کا واحد سراغ تھا۔

میں اور صفدر رات تیسرے پہر تک جاگتے رہے۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تھوڑا سا حبس بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ہمیں جسم کے مختلف حصوں پر جو چوٹیں آئی تھیں وہ اب تکلیف دے رہی تھیں، تاہم یہ تکلیف ہم دونوں کے لیے قابلِ برداشت تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ صفدر اس تکلیف سے باقاعدہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مار پیٹ اس کے لیے ایک دلچسپ مشغلے سے کم نہیں تھی۔ کئی موقعوں پر تو راہ چلتے چلتے صفدر کی طبیعت مچل جایا کرتی تھی۔ وہ کہیں کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتا تھا تو صرف ہاتھ سینکنے کی غرض سے پھڈا شروع کر دیتا تھا۔ کم از کم چار پانچ ٹریفک کانسٹیبلان کو تو وہ میرے سامنے پیٹ چکا تھا۔ اب بھی وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا اور مستقبل قریب میں ہونے والے کسی ہنگامے کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی لہٰذا یہ آواز مدھم ہونے کے باوجود صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے اور صفدر کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید رجب کے دونوں ساتھیوں (یعنی جانی اور غیاثے) میں سے کوئی آیا ہے۔ لیکن ان کے دیدار کی خواہش اب بھی پوری نہیں ہوئی۔ آنے والا گونگا عدیل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی موم بتی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا چہرہ اور لمبے لمبے بال پُراسرار نظر آ رہے تھے۔ اس نے موم بتی کھڑکی کی چوکھٹ پر استادہ کی اور آہنی گرل کے پار سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں عجیب سوئی سوئی سی کیفیت تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ بستر پر بہت دیر کروٹیں بدلنے کے بعد یہاں آ گیا ہے۔ وہ مجھے اپنے تمام ساتھیوں میں سے زیادہ معاملہ فہم اور دلیر نظر آ رہا تھا۔ میں نے اشاروں کنائیوں کی زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ رجب ان کا دوست نہیں بدترین دشمن ہے۔ وہ انہیں بیرونی ملک نہیں بھیج رہا ہے ان کے پیسے کھرے کر رہا ہے۔ میں نے عدیل کو ان فاقہ زدہ قیدیوں کے بارے میں بھی بتانے کی کوشش کی جو ہمارے قدموں کے نیچے تہ خانے میں موجود تھے۔ عدیل ہاتھوں کو بار بار سوالیہ انداز میں حرکت دینے لگا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نے دونوں کلائیاں جوڑ کر "قیدی" کا اشارہ دیا پھر فرش کی طرف اشارہ کر کے تہ خانے کے بارے میں بتایا۔ اور بتایا کہ اس تہ خانے کے نیچے بھی ایک تہ خانہ موجود ہے۔ پھر انگلیوں پر گن کر بتایا کہ بائیس قیدی تہ خانے میں موجود ہیں۔ ہاتھ کو ڑا مارنے والے انداز میں لہرا کر عدیل کو بتایا کہ رجب ان سے سخت مار کرتا ہے۔

میری یہ تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ عدیل کے چہرے پر بدستور الجھن بجی ہوئی تھی۔ جو کچھ میرے اور صفدر کے ذہن میں تھا اس کا ابلاغ عدیل تک نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میری اشاراتی زبان کے جواب میں جوابی اشارے کر رہا تھا، یہ اشارے ہماری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ درحقیقت وہ تہ خانے کا اشارہ ہی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ صفدر نے اشاروں میں اس سے پوچھا کہ کیا وہ لکھ پڑھ سکتا ہے۔ صفدر کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہم بتانا چاہ رہے ہیں وہ لکھ کر بتا دیا جائے لیکن عدیل نے ہمیں یہ بتا کر مایوس کر دیا کہ وہ کورا ان پڑھ ہے۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ پہلے فرش کی طرف اشارہ کیا، پھر انگلیوں سے سیڑھیاں اترنے کا اشارہ دے کر اسے سمجھایا کہ تہ خانے کے نیچے تہ خانہ موجود ہے۔ اس مرتبہ عدیل تہ خانے کا اشارہ سمجھ گیا، مگر ساری بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ زندگی میں دوسری بار مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ان پڑھ اور گونگے بہرے شخص تک اپنا مافی الضمیر پہنچانا کس قدر مشکل ہے۔ میں نے اشاروں میں عدیل سے کہا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو بلائے تاکہ میں اسے اپنی بات سمجھا سکوں۔ اس موقع پر عدیل نے انکشاف کیا کہ اس کے تمام ساتھی اس عمارت سے جا چکے ہیں۔

میں نے ٹوٹے دانت کا اشارہ دے کر پھر رجب کا ذکر کیا اور عدیل سے پوچھا کہ اس کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

یہ بات بھی عدیل کی سمجھ میں نہیں آ سکی یا شاید اس مرتبہ وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔ معاملہ الجھتا جا رہا تھا۔ جانی، غیاث اور ریچھ نما شخص کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اب عدیل بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھی بھی یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اب ہم عدیل کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ ہماری زبان سمجھ رہا تھا اور نہ ہم پر بھروسا کر رہا تھا۔ میں اسے ان قیدیوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو تہ خانے میں رجب کے ظلم و ستم کا شکار تھے اور رجب کے مجرمانہ ارادوں کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ وہ اس بات کی تہ تک نہیں پہنچ پا رہا تھا اور مجھ سے بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا کہ رجب کہاں ہے؟ ہر بار جب وہ اپنا سوال دہراتا تھا تو اس کے لہجے میں پہلے سے کچھ زیادہ سختی آ جاتی تھی۔

اس کی پتلون کی دائیں جیب پھولی ہوئی تھی اور صاف

پتا چلتا تھا کہ اس میں ریوالور وغیرہ موجود ہے۔ وہ اس بند کمرے میں کھڑکی کے راستے ہمیں کسی بھی طرح کا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ "اب کیا کیا جائے؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

وہ بولا "اس کو غصہ دلا کر دیکھیں' شاید دروازہ کھول دے۔"

میں نے کہا "یہ دروازہ نہیں کھولے گا۔ میرا خیال ہے کہ جانی اور غیاثے نے ان لڑکوں کے سامنے ہماری کافی "تعریف توصیف" کی ہے' یہ ہمیں ہٹلر اور چنگیز خاں کا ہم نشیں سمجھ رہے ہیں۔ یہ جو بات کرے گا کھڑکی سے ہی کرے گا۔"

"اور کھڑکی سے ہی گولی مارے گا۔" صفدر نے کہا۔

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔"

"تو پھر کیا کریں' گولی کھالی جائے یا اسے رجب کا پتا بتا دیا جائے۔"

"میری تو یہ خواہش تھی کہ یہ کسی طرح ان قیدیوں تک پہنچ جائے اور ان کی حالتِ زار دیکھ لے۔"

ایک دم میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میں چونک کر عدیل کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم یہی چاہتے تھے نا... کہ عدیل اور اس کے ساتھی نچلے تہ خانے کا منظر دیکھ لیں اور انہیں رجب کی اصلیت کا اندازہ ہو جائے۔ یہ مقصد ایک اور طریقے سے بھی حل ہو سکتا تھا۔ "تہ خانے" کا اشارہ عدیل کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ رجب کا اشارہ بھی سمجھ رہا تھا۔ جب بھی میں دانت کو انگلی لگاتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا کہ میں رجب کی بات کر رہا ہوں۔ ان دونوں اشاروں کی مدد سے میں عدیل کو بتا سکتا تھا کہ رجب تہ خانے میں ہے۔ پھر کلائیاں جوڑنے والے اشارے سے اسے سمجھایا جا سکتا تھا کہ ہم نے اسے وہاں قید کر رکھا ہے۔

میں نے نئے سرے سے عدیل کے ساتھ اشاراتی زبان شروع کی۔ اس مرتبہ مجھے کامیابی ہوئی۔ میں عدیل تک یہ بات پہنچانے میں کامیاب ہو گیا کہ جس رجب کی تلاش میں وہ مرا جا رہا ہے' وہ تہ خانے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ میں نے عدیل کو یہ بھی بتا دیا کہ تہ خانے کا دروازہ بالائی تہ خانے کے شمالی گوشے میں موجود ہے۔

عدیل مولم بتی سمیت بڑی تیزی سے واپس چلا گیا۔ ہمارے کمرے میں اور اردگرد ایک بار پھر گہری تاریکی پھیل گئی۔ چند منٹ بعد روشنی دوبارہ دکھائی دی۔ عدیل تہ خانے کا مقفل دروازہ دیکھ آیا تھا اور اب مجھ سے دروازے کی چابی مانگ رہا تھا۔ یہ ایک ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ چابی میرے پاس نہیں تھی۔ وہ رجب کے پاس تھی اور ممکن تھا کہ اس کی جیب میں ہی ہو۔ میں عدیل کو رجب کے بارے میں بتا دیتا تو پھر سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا تھا۔ اس سوال کا جواب میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے عدیل کو بتایا کہ رات پہلے پہر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ہماری جو پٹائی کی تھی اس دوران میں چابی میری جیب سے کہیں گر گئی ہے۔

صفدر نے عدیل کو سمجھایا کہ وہ ڈرائنگ روم کے آس پاس چابی تلاش کرنے کی کوشش کرے' اگر چابی نہ ملے تو وہ تالا توڑ ڈالے۔

عدیل کچھ دیر تک بے یقینی کی کیفیت میں ہماری طرف دیکھتا رہا پھر ہمارے کہنے کے مطابق کمرے سے باہر اور ڈرائنگ روم کے آس پاس "چابی" تلاش کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ شمع کی روشنی چار پانچ منٹ تک ڈرائنگ روم کے آس پاس چکراتی رہی پھر دور ہوتی چلی گئی۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ عدیل مایوس ہو کر تہ خانے کے دروازے کی طرف چلا گیا ہے۔

ہمارے منصوبے کی کامیابی کا انحصار اسی بات پر تھا کہ عدیل تہ خانے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جائے اور دیکھے کہ تہ خانے کی اس نچلی منزل میں موجود لوگوں کے ساتھ رجب کا سلوک کیسا ہے۔ ہم اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ کیا سامنے آتا ہے۔ اگر عدیل اس کوٹھی میں واقعی اکیلا تھا تو پھر اسے کوئی فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آسکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ اسی گومگو کی کیفیت میں گزرے' تب ایک ساتھ برینا ہلنل کے تین دھماکے ہوئے اور عمارت کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ہمیں یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ گونگے عدیل نے تہ خانے کے دروازے کے ہضمی قفل پر فائرنگ کی ہے۔ چند منٹ بعد خود کار رائفل سے دو برسٹ مارے گئے۔ برسٹ کی آوازوں سے در و دیوار لرز گئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ فائرنگ بھی عدیل نے تہ خانے کے دروازے پر کی تھی۔ اس کے نتیجے میں دروازے کا قفل والا حصہ ٹوٹ گیا تھا اور دروازہ کھل گیا تھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ اب ہمیں عدیل کو سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تہ خانے میں نظر آنے والے مناظر اسے رجب جان کی اصلیت سے اچھی طرح آگاہ کر دیں گے۔ قریباً پندرہ منٹ تک ہم نتیجے کے منتظر رہے۔ اسی دوران میں عمارت کی بجلی بھی آگئی۔ روشنی ہونے کے چند منٹ بعد ہی کامن روم کی طرف سے ملی جلی آوازیں آئیں۔

پھر میں نے عدیل کو دیکھا' اس کے علاوہ بوسیدہ کپڑوں والے وہ مافوق چہرہ لوگ بھی نظر آئے جنہیں رجب "بروے" کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور جن کا سودا اس نے ہمارے ساتھ فی بروہ اٹھارہ ہزار کے حساب سے طے کیا تھا۔ میں نے دیکھا عدیل کے چہرے پر اب ہمیں وہ پہلے سی درشتگی نظر نہیں آرہی تھی۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں وہی کچھ ہوا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ عدیل نے ہمارے زنداں کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے رویے سے کسی حد تک ندامت کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ ندامت اس مارپیٹ کے لیے تھی جو رات پہلے پہر ہم سے کی گئی تھی۔ جو چیز دیکھ کر میں اور صفدر بری طرح چونکے وہ دو عدد لاشیں تھیں۔ یہ لاشیں برآمدے کے قریب کوریڈور کے وسط میں پڑی تھیں۔ میں نے دیکھا یہ صفا چٹ سر والے جانی اور غیاثے کی لاشیں تھیں۔ ان لاشوں کے قریب ہی کانچ کی چوڑیوں کے بہت سے ٹکڑے پڑے تھے اور ایک زنانہ جوتی دکھائی دے رہی تھی۔

گنجے سر والے جانی کے پیٹ میں گولی لگی تھی جبکہ غیاثے کے سینے اور پیٹ پر کسی تیز دھار آلے کے دو گہرے زخم تھے۔ زخموں سے بہنے والا خون کوریڈور کے فرش پر لوتھڑوں کی صورت میں جما ہوا تھا۔ ہماری سمجھ میں اب یہ بات اچھی طرح آرہی تھی کہ رات نو دس بجے کے بعد سے ہمیں جانی اور غیاثے کی صورت نظر کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک سنگین واقعے کا شکار ہو کر راہیِ عدم ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے لاشوں کی طرف اشارہ کر کے عدیل سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے ناک پر انگلی رکھ کر لڑکی کا اشارہ دیا پھر غیاثے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ شخص لڑکی کو زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا' جانی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ غیاثا باز نہیں آیا۔ دوسری طرف جانی بھی اسے روکنے سے باز نہیں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غیاثے نے جانی کو گولی مار دی۔ جواب میں جانی نے غیاثے پر چاقو سے حملہ کیا اور اسے دو مہلک زخم لگا دیے۔ کچھ دیر بعد دونوں ہی تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔

میں نے عدیل سے پوچھا کہ لڑکی کون تھی؟ اور اب وہ کہاں ہے؟

عدیل پہلے سوال کا صحیح جواب تو نہ دے سکا' بہرحال دوسرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ لڑکی صحیح سلامت ہے اور اسی عمارت کے ایک محفوظ کمرے میں ہے ہم لڑکی کو دیکھنے سے پہلے رجب کو دیکھنا چاہتے تھے' اس کے بارے میں ہم دونوں کو بجا طور پر تشویش تھی۔ میں اور صفدر تیزی سے صحن کراس کر کے سرونٹ کوارٹرز کی طرف آگئے۔ عدیل ہمارے پیچھے تھا اور اس کے عقب میں وہ سارے قیدی تھے جو ابھی ابھی اپنی طویل قید سے رہا ہوئے تھے۔ ہم سرونٹ کوارٹر کے اندر داخل ہوئے۔ صفدر نے لائٹ جلائی۔ میں نے جستی ٹرنک کا ڈھکنا اٹھایا۔ رجب اندر موجود تھا مگر۔ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہم نے اسے جستی ٹرنک میں سے باہر نکالا۔ نیچے کے غلاف خون سے بھیگے ہوئے تھے' ہمارا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ اخراج خون کی وجہ سے رجب بے ہوش ہو چکا ہے۔ بلب کی روشنی میں اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد نظر آرہا تھا اور سانس کھینچ کھینچ کر آرہی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی وہ بہت سست اور ناقابلِ محسوس تھی۔ رجب کو فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے صفدر سے مشورہ کیا۔ صفدر کا خیال تھا کہ ساہی صاحب کو اطلاع کر دی جائے۔ لیکن اگر ساہی صاحب آجاتے اور ان کے ساتھ پولیس پہنچ جاتی تو پھر رجب کو ہمارے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ ہم ذاتی طور پر اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر تو جو کچھ کرنا تھا پولیس نے ہی کرنا تھا۔ ابھی ہم سوچ بچار ہی کر رہے تھے کہ میری نگاہ عدیل کے دو ساتھیوں پر پڑی۔ وہ ڈرے ڈرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف آرہے تھے۔ یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ عدیل نے کچھ دیر پہلے اشاروں کنایوں میں ہمیں بتایا تھا کہ اس کے تمام ساتھی عمارت چھوڑ کر جا چکے ہیں' لیکن اب ان میں سے دو بالائی منزل سے اتر رہے تھے اور غالباً مزید بھی موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ دونوں لڑکے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ وہ دونوں خوف سے زرد ہو رہے تھے۔ پٹھان لڑکے نے روہانسے لہجے میں کہا "یہ امارے ساتھ کیا ہو رہا ہے صاحب۔ یہ ام سب کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ ام تو سیدھا سادہ مزدور لوگ ہے۔ اس مارا ماری سے امارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

ایک لاہوری لڑکا پنجابی لہجے میں اردو بولنے لگا "ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ ہمیں تو ہمارے پیسے مل جائیں تو ہم واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ ہمارے اندر ان چکروں میں پڑنے کی ہمت نہیں ہے۔"

میں نے لڑکے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ بولا "محمد اسلم۔ لاہور' گڑھی شاہو کا رہنے والا ہوں۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم بھی ہمیں پیٹنے والوں میں شامل تھے۔"

وہ ایک دم لرز کر رہ گیا "معاف کردیں جی۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ یہ سارا قصور گونگے عدیل کا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا رہا ہم کرتے رہے۔ ہم رجب کو اپنا خیر خواہ اور آپ کو دشمن سمجھ رہے تھے' جبکہ معاملہ الٹ نکلا۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ تہ خانے سے نکلنے والے بندوں نے سب کچھ بتادیا ہے۔ یہ تو بہت بڑا چکر چلنے والا تھا ہمارے ساتھ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم بچ گئے۔" محمد اسلم کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو تیر گئے۔

صفدر نے پوچھا "اب تک کہاں تھے تم لوگ؟"

وہ بولا "ہم اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں تھے۔"

"تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"وہ بھی سب یہیں ہیں۔ دراصل۔۔۔ دراصل دو زخمیوں اور دو لاشوں کو دیکھ کر ہم بہت ڈر گئے تھے۔ چند لڑکے تو یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ دوسروں نے انہیں بمشکل روکا کہ ہم بے قصور ہیں' بھاگ کر خود کو مجرم کیوں بنائیں۔ ایک طرف ہمیں رجب کا گم ہونا پریشان کررہا تھا۔ دوسری طرف رجب کے ساتھیوں جانی اور غیاث نے ہمیں یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ آپ دونوں (یعنی میں اور صفدر) نہایت خطرناک مجرم اور بے رحم قاتل ہیں۔ ہم سب اتنے پریشان رہے ہیں کہ ساری رات ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوسکے۔ ہم اوپری منزل کے ایک کمرے میں تھے اور دروازے کو اندر سے تالا لگا رکھا تھا۔

اسی دوران میں کچھ اور ڈرے ڈرے لڑکے بھی بالائی منزل سے اتر آئے اور سرونٹ کوارٹرز میں پہنچ گئے۔ اب صبح ہوگئی تھی اور اجالا پھیل گیا تھا۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ وہ تین سال ایک ڈاکٹر کے ساتھ کمپاؤنڈری کرتا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر اسے ایک سرنج مہیا کردی جائے اور موٹر سائیکل دے دی جائے تو وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر رجب کے لیے مطلوبہ خون مہیا کرسکتا ہے۔ اور نہ صرف مہیا کرسکتا ہے بلکہ لگا بھی سکتا ہے۔ یہ پیشکش ہماری ضرورت کے عین مطابق تھی۔ ہم رجب کو اسپتال لے جانا نہیں چاہتے تھے' دوسری طرف اسے خون کی بھی اشد ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں عمارت کے اندر سے ہی انجکشن کی سرنجیں مل گئیں۔ عاطف نام کے اس لڑکے نے چابک دستی سے رجب کا بلڈ لے لیا۔ اب اسے سواری کی ضرورت تھی۔ رجب کی پجارو کی چابی صفدر کے پاس تھی۔

میں نے صفدر سے کہا کہ وہ اس لڑکے کو جیپ پر ساتھ لے جائے اور جتنی جلدی ہوسکے بلڈ کا انتظام کرے۔ جتنی دیر میں صفدر جیپ اسٹارٹ کرکے مین گیٹ تک لایا' عاطف نامی اس لڑکے نے بڑی مہارت سے رجب کو تازہ پٹی کردی اور اس کا رستا ہوا خون بند کردیا۔

صفدر جب لڑکے کو لے کر بلڈ کا انتظام کرنے روانہ ہوگیا تو میں نے عدیل کے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا واقعہ ہوا ہے جس کے نتیجے میں رجب کے دونوں ساتھی ہلاک ہوگئے ہیں۔ لڑکوں نے اپنے اپنے انداز میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

گہری براؤن آنکھوں اور سیاہ بالوں والی جو دو لڑکیاں ہم نے کل رات دیکھی تھیں وہی اس دہرے قتل کا سبب بنی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کو شانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ رجب کا قریبی ساتھی اور گارڈ غیاثا شانی پر نظر رکھتا تھا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے سر پر شانی کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ جب رات کو اس عمارت میں افراتفری مچی اور گولیاں چلیں تو غیاثے کی نیت ڈانواں ڈول ہوگئی۔ بعد ازاں جب عدیل اور اس کے ساتھی کوشش کے باوجود "اغوا شدہ" رجب کو عمارت کے اندر سے تلاش نہ کرسکے تو غیاثے نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا۔ اس نے ڈری سہمی لڑکی کو پجارو میں لے جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر رجب کے وفادار ساتھی جانی نے غیاثے کی شدید مزاحمت کی۔ نتیجے میں غیاثے نے اسے کوریڈور میں گولی مار دی۔ جانی کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو تھا' اس نے گولی کھانے کے باوجود غیاثے پر حملہ کیا اور اسے دو مہلک زخم لگا دیے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں ٹھنڈے ہوگئے۔

وہ دونوں لڑکیاں اب بھی عمارت کے زیریں تہ خانے میں موجود تھیں۔ میں نے عدیل اور اس کے دو ساتھیوں کو بھیجا۔ وہ پانچ دس منٹ میں لڑکیوں کو اس بندی خانے سے نکال کر لے آئے۔ ایک لڑکی کا رو رو کر برا حال ہورہا تھا۔ اس کی ایک کلائی پر ٹوٹ جانے والی چوڑیوں کے زخم تھے اور قمیص بھی کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ یقیناً یہی شانی تھی۔ وہ قابل رحم حد تک خوف زدہ تھی۔ بالکل ایک ایسی ہرنی کی طرح جو تاریک جنگل میں تنہا تھی اور اپنے اردگرد شیروں کی دہاڑیں سن رہی تھی۔ لڑکی کی ظاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اغوا کی کوشش کرتے وقت غیاثے نے اسے بری طرح نوچا کھسوٹا بھی ہے۔

میں صاف دیکھ رہا تھا کہ یہاں موجود تمام افراد سخت

گھبرائے ہوئے ہیں۔ اگر بردہ فروش رجب کی زبان میں بات کی جاتی تو یہ بردوں کی دو ٹولیاں تھیں۔ ایک ٹولی یا کیمپ ان بردوں کی تھی جو اسحاق جالندھری نام کے اسمگلر کی لانچ سے فرار ہوئے تھے اور دوبارہ پکڑے گئے تھے۔ ان افراد نے چونکہ بے حد سختی دیکھی تھی اور زندگی کو موت سے بدتر ہوتے دیکھا تھا لہٰذا وہ اپنے آزاد ہوجانے کو ہی اپنی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھ رہے تھے اور جلد از جلد اپنا آپ بچا کر اس عمارت سے نکل جانا چاہتے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی اس ٹولی میں شامل تھیں۔ دوسری ٹولی ان افراد کی تھی جو اب تک یہاں بڑے عیش و آرام سے رہ رہے تھے اور مستقبل کے خواب بُنتے رہے تھے۔ ان پر رجب کا اصل روپ کل رات کھلا تھا۔ اب وہ خوف اور سکتے کی ملی جُلی کیفیت میں تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ رجب اتنا بڑا دھوکے باز ہوسکتا ہے۔ اس ٹولی میں سے کچھ لڑکے تو ہر چیز پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل بھاگنا چاہتے تھے لیکن دس بارہ لڑکے ایسے تھے جو رجب کا گریبان پکڑنا چاہتے تھے اور اس سے اپنی رقم وصولنے کے خواہش مند تھے۔ ان نوجوانوں کی دلی آرزو تھی کہ رجب کی زندگی بچ جائے۔

میں نے تقریر کرنے والے انداز میں تمام لڑکوں کو سمجھایا۔ میں نے کہا "تم لوگوں کو گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اور گھبرانے کی بات بھی کیا ہے۔ تم مجرم نہیں ہو' تم مدعی ہو۔ تمہارا حق مارا گیا ہے۔ یہ حق ہم انشاء اللہ تمہیں لے کر دیں گے۔ میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ یہاں تم میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پولیس تم سے ہمدردی کا سلوک کرے گی اور جو دو بندے یہاں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں تم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ آپ سب لوگ سکون سے رہیں۔ جو کچھ آپ پر گزری ہے وہ پوری دیانت داری کے ساتھ ہمیں بتائیں۔ ہم نہ صرف اس رجب نام کے بردہ فروش کو انجام تک پہنچائیں گے بلکہ اس کے ساتھیوں کو بھی قانون کی گرفت میں لائیں گے۔"

میرے سمجھانے بجھانے سے تمام افراد قدرے پُرسکون نظر آنے لگے۔ وہ مدقوق چہرہ افراد جو رجب کے بدترین تشدد کا شکار ہوئے تھے' آبدیدہ نظر آرہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے مجھے اپنے جسم پر تشدد کے نشانات دکھائے۔ اس خیال سے کہ ان کے جسموں پر گہرے زخم نہ آئیں اور ان کی قیمت میں کمی واقع نہ ہو انہیں کُند آلات سے ضربیں لگائی جاتی تھیں یا پھر بید کی چھڑیوں سے پیٹا جاتا تھا۔

صفدر اور عاطف نامی نوجوان کو واپس آنے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا لیکن وہ ناکام واپس نہیں آئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے خون کی گروپنگ اور کراس میچنگ وغیرہ کرالی تھی بلکہ تین بیگ بھی ساتھ لے آئے تھے۔ یہ تین بیگ (بوتل) خون رجب کے لیے کافی تو نہیں تھا تاہم اسے وقتی طور پر سنبھالا دے سکتا تھا۔ عمارت کے ایک آرام دہ کمرے میں عاطف نے رجب کو خون لگا دیا۔۔۔ ہم اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ بالکل جیسے کسی بجھتے ہوئے چراغ میں پھر سے تیل ڈال دیا جائے اور اس کی لو اونچی ہوجائے رجب کے زرد چہرے پر بھی زندگی نمودار ہونے لگی۔

دو بوتل خون لگنے کے بعد رجب کی حالت کچھ سنبھل گئی اور سانس بھی ہموار ہوگئی لیکن اس کی بے ہوشی برقرار تھی۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا نظر نہیں آتا تھا جتنا ہم سمجھے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حضرات بتاتے ہیں خون اور آکسیجن کی شدید کمی سے بعض اوقات دماغ بھی متاثر ہوجاتا ہے۔ میں نے اور صفدر نے محسوس کیا کہ رجب کو اسپتال پہنچایا جانا ضروری ہے۔ خون دینے سے فوری طور پر تو اس کی زندگی محفوظ ہوگئی تھی مگر یہ ناکافی "ٹریٹمنٹ" تھی۔ اگر فرض محال رجب ہوش میں آبھی جاتا تو ہم اس سے فوری طور پر پوچھ گچھ شروع نہیں کرسکتے تھے۔ دوسری طرف یہ مسئلہ بھی تھا کہ اب ہم زیادہ دیر اس عمارت میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس امر کا قوی امکان تھا کہ رجب کے اس کالے دھندے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے۔ اس کے علاوہ رجب کے ساتھی اور کارندے تھے' ان میں سے کوئی بھی اس عمارت تک پہنچ جاتا تو اسے محسوس ہوجاتا کہ یہاں زبردست قسم کی گڑبڑ ہوچکی ہے۔ ایسے میں ہمارے ساتھ ان تمام افراد کی زندگیوں کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوسکتا تھا جو ہمارے ساتھ یہاں موجود تھے۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ساہی صاحب کو یہاں بلا ہی لیا جائے۔

ٹیلی فون کا تار جو ہم نے رات کو کاٹ دیا تھا پھر سے جوڑا گیا۔ میں نے ساہی صاحب کو رنگ کیا۔ وہ ابھی گھر ہی میں تھے اور ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ معقول نفری لے کر یہاں پہنچ جائیں۔

قریباً پون گھنٹے بعد ہمیں کوٹھی کے نواح میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ یہ تین گاڑیاں تھیں اور ان میں دو تھانوں کے قریباً ۲۵ مسلح اہلکار موجود تھے۔ انہوں نے گاڑیوں سے اترتے ہی کوٹھی کی وسیع چار دیواری کے گرد

گھیرا ڈال لیا۔ تین چار رائفل مین کوٹھی کے داخلی دروازے پر چوکس کھڑے ہوگئے۔ ایس ایچ او نے مجھ سے بات کی اور بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ایس ایس پی صاحب بھی موقع پر پہنچ رہے ہیں۔ اپنی گاڑی کے وائرلیس سیٹ پر ایس ایچ او کو مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں ساہی صاحب راوی کا پل کراس کررہے تھے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ساہی صاحب پہنچ گئے۔ وہ وردی میں تھے۔ ان کی جیپ میں ایک انسپکٹر کے علاوہ دو تین اے ایس آئی بھی تھے۔ ساہی صاحب مجھے میک اپ کے باوجود پہچان گئے۔

ساہی صاحب مجھے اور صفدر کو لے کر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ یہاں توڑ پھوڑ کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ توڑ پھوڑ اس دھینگا مشتی کا نتیجہ تھی جو ہمارے اور عدیل وغیرہ کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے ساہی صاحب کو ذرا تفصیل کے ساتھ تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بے حد حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ قانون کی ناک کے عین نیچے کچھ لوگ اس طرح جیتے جاگتے انسانوں کی خرید و فروخت کا دھندا کررہے ہیں۔ ساہی صاحب کو تمام حالات بتانے کے بعد میں نے انہیں جانی اور غیاث کی لاشیں دکھائیں۔ یہ لاشیں رات سے جہاں کی تہاں پڑی تھیں' انہیں کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ساہی صاحب نے دیگر پولیس افسران کے ساتھ لاشوں کا معائنہ کیا۔ زخمی "ریچھ نما" بھی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا۔ گولی اس کی پنڈلی کی بڑی ہڈی میں لگی تھی۔ رات میں اس کی ٹانگ سوج کر کپا ہوچکی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ ساہی صاحب نے پولیس افسران کے ہمراہ بالائی اور زیریں تہ خانے کا بھی معائنہ کیا۔ وہ بیرکیں دیکھیں جہاں لوگوں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ ایک کمرا ایسا تھا جسے دیکھ کر دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے عقوبت خانے یاد آگئے۔ یہاں نافرمان قیدیوں کو سزا دینے کے لیے نہایت بھیانک قسم کے آلات رکھے تھے۔ آہنی شکنجے' ناخن کھینچنے کے لیے پلاس' الٹا لٹکانے کے لیے لوہے کے کڑے' جسم کو حدت پہنچانے کے لیے ہیٹر اور پتا نہیں کیا کچھ۔

پولیس پارٹی کے ساتھ فوٹو گرافر بھی موجود تھا۔ وہ ہر جگہ کی تصویریں لے رہا تھا۔ ساہی صاحب ماتحت افسران کو مسلسل ہدایات جاری کررہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موقع سے چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ وہ تمام افراد کے بیانات بھی اپنی موجودگی میں قلم بند کروانا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف رجب کا بھی مسئلہ تھا۔ اسے جلد از جلد اسپتال پہنچایا جانا ضروری تھا۔ میں نے ساہی صاحب کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ جائے واردات کا نقشہ بنانے اور بیان وغیرہ قلم بند کرانے کا کام ایک ماتحت کو سونپ کر ہمارے ساتھ روانہ ہوگئے۔ رجب کو جیپ کی پچھلی لمبی نشست پر لٹایا گیا تھا' ایک سب انسپکٹر اور ڈرائیور اگلی نشستوں پر موجود تھے۔ میں اور صفدر ساہی صاحب کے ساتھ پچھلی گاڑی میں تھے۔ اس گاڑی میں دو مسلح ہیڈ کانسٹیبل بھی موجود تھے۔

ہم رجب کو لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ساہی صاحب خاصے حیران نظر آرہے تھے۔ وہ جب میرے ٹیلی فون پر گھر سے روانہ ہوئے تھے تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی اہم خبر ان کی منتظر ہے۔ نمایت گھناؤنے کاروبار میں ملوث ایک گروہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اور مع لیڈر کے گرفتار ہوا تھا۔ (اس وقت تک ہم رجب کو ہی سرغنہ سمجھ رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ رجب تو اس وسیع کاروبار میں ایک معمولی سا مہرہ ہے نہ ہی ہمیں ابھی اس کاروبار کے صحیح حجم کا اندازہ تھا) زخمی رجب والی جیپ آگے تھی جبکہ ہماری گاڑی عقب میں آرہی تھی۔ نزدیک ترین اسپتال "لیڈی ولنگٹن" تھا۔ ہم شیخوپورہ روڈ پر تھے اور ابھی راوی کے پل سے قریباً ایک کلومیٹر دور تھے۔ اچانک ایک کوسٹر ٹائپ گاڑی نے جیپ کو اوورٹیک کیا اور پھر جیپ کو سائڈ پر دباتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر کر رکنے پر مجبور کردیا۔ یہ منظر ہم سب کو ریڈ الرٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دونوں ہیڈ کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر گاڑی سے اترے اور کوسٹر کی طرف بڑھے۔ اسی وقت کوسٹر کی اگلی کھڑکیوں سے خود کار رائفل کی فائرنگ ہوئی۔ ایک کانسٹیبل کے سینے اور سر پر گولیاں لگیں' وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرے کانسٹیبل نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کیا اور بمشکل فائرنگ سے بچایا۔ کانسٹیبل کے اچانک قتل نے ہمیں سکتے کی سی کیفیت سے دوچار کردیا۔ کوسٹر نے ترچھا کھڑا ہو کر جیپ کا راستہ بالکل مسدود کردیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے جو دراصل ساہی صاحب کا تجربہ کار ڈرائیور حیات محمد تھا' تیزی سے جیپ کو بائیں رخ پر موڑا اور کھیتوں میں اتار دیا۔ جیپ کھیتوں کے درمیان واقع کچے راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی اس کے پیچھے گرد کا ایک بادل بلند ہوا۔ کوسٹر سے جیپ پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی یہ منظر دیکھ کر ہم نے بھی پولیس موبائل کے اندر سے کوسٹر کی کھڑکیوں پر فائرنگ کی۔ کئی شیشے چھناکے سے

ٹوٹ گئے۔ کوسٹر کا انجن اسٹارٹ تھا' اس نے ٹرن لیا اور جیپ کے پیچھے دوڑی۔ موبائل کے ڈرائیور نے بھی ساہی صاحب کے اشارے پر گاڑی' کوسٹر اور جیپ کے پیچھے کچے راستے پر ڈال دی۔ اسی دوران میں ایک برسٹ آیا اور موبائل کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہوگئی۔ ایک گولی ڈرائیور نذیر محمد کے بازو میں لگی دوسری صفدر کا کندھا چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ڈرائیور نذیر محمد کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

ساہی صاحب نے بلند آواز میں پوچھا "گاڑی چلا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سر۔" اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے رفتار تیز کرو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہماری گاڑی گرد کے بادل میں قریباً چھپ سی گئی تھی۔ ہمیں یہ تسلی تھی کہ ہم پر نشانہ لے کر فائر نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اندھی گولیوں کا اندیشہ ہر لحظہ موجود تھا۔ ہم نے سر حتی الامکان حد تک نیچے جھکا لیے تھے۔ صرف ڈرائیور نذیر سیدھا بیٹھا تھا اور یہ اس کی مجبوری تھی۔ بہرحال گاڑی کو حرکت میں رکھنے کے لیے کسی ایک شخص کو تو رسک لینا ہی تھا۔ یہ رسک واقعی "رسک" ثابت ہوا۔ کوسٹر سے اندھا دھند فائرنگ ہورہی تھی۔ ایک گولی نذیر محمد کے سر میں لگی اور وہ اوندھے منہ اسٹیئرنگ پر گر گیا۔ میں نے پیچھے جھکے جھکے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام لیا۔ مگر اسی دوران میں دم توڑتے ہوئے نذیر کا پاؤں ایکسیلریٹر سے ہٹ گیا اور گاڑی دو چار جھٹکے کھا کر رک گئی۔

گولی نذیر کی پیشانی پر لگی تھی۔ اس کے بچنے کا ایک فیصد چانس بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کا جسم دھکیل کر گاڑی سے نیچے گرایا اور خود اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اس سے پہلے کہ میں انجن اسٹارٹ کرتا مجھے اندازہ ہوا کہ کوسٹر رک گئی ہے۔ گرد کے بادل میں سے اس کا ہیولا صاف نظر آنے لگا تھا۔ کوسٹر کے رکنے کی دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں' اس کے ٹائر برسٹ ہوگئے تھے یا پھر آگے جاتی ہوئی جیپ رک گئی تھی۔ ہمارا دوسرا خیال درست تھا۔ جیپ رکی ہوئی تھی۔ اور وہ جس طریقے سے رکی ہوئی تھی وہ نہایت مخدوش تھا۔ جیپ بے قابو ہو کر کچے راستے سے اتر گئی تھی اور ایک نشیبی کھیت میں گر گئی تھی۔ وہ پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کے پہیے ابھی تک گھوم رہے تھے۔ جیپ میں موجود سب انسپکٹر دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ میں سے نکل آیا تھا اور اب جیپ کی اوٹ لے کر کوسٹر والوں پر ریوالور سے فائر کررہا تھا۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن لی اور کوسٹر پر فائر کرنے لگے۔ اندازہ ہورہا تھا کہ کوسٹر میں کم از کم سات آٹھ افراد ہیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ ہمارے کانسٹیبلوں کے پاس وہی دقیانوسی رائفلیں تھیں۔ ایک تھری ناٹ تھری تھی۔ دوسری پرانے ماڈل کی سیون ایم ایم تھی مگر یہ برسٹ نہیں مار سکتی تھی۔ یہ رائفل صفدر نے لے لی اور ایک تناور درخت کی آڑ لے کر فائر کرنے لگا۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور پہلے تین چار فائرز میں ہی کوسٹر کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ کردیے۔ اسی دوران میں جیپ کی آڑ لے کر فائر کرتے ہوئے سب انسپکٹر کی بدقسمتی نے اسے آواز دی۔ اس نے تابڑ توڑ فائرنگ سے گھبرا کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک قریبی درخت کی جانب دوڑ لگائی تھی' لیکن ابھی وہ بمشکل جیپ کے عقب سے نکلا ہی تھا کہ دو گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہوگئیں اور وہ کھیت کی کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ساہی صاحب کا ڈرائیور حیات محمد کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ زخمی ہے اور جیپ کے اندر ہی ہے۔ موبائل کے وائرلیس سیٹ کا رابطہ ہیڈ کوارٹر سے تھا' کوئی چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا "یہ کیا ہو رہا ہے سر؟ یہ فائرنگ کیسی ہے۔ آپ کہاں ہیں سر۔ ہیلو ہیلو انسپکٹر بشیر کالنگ۔۔۔ آپ کہاں ہیں سر۔"

ساہی صاحب نیچے جھکے جھکے وائرلیس سیٹ تک پہنچے اور ریسیور اٹھا کر بولے "ہیلو انسپکٹر بشیر۔۔ ایس ایس پی ساہی اسپیکنگ۔۔۔ یہاں شیخوپورہ روڈ پر موڑ سے ایک کلومیٹر پیچھے پولیس مقابلہ ہوگیا ہے۔ راوی روڈ تھانے میں کال کرو۔ ایس ایچ او نفری کے ساتھ فوراً پہنچے۔۔۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "سر ایک موبائل شاہدرہ کے قریب موجود ہے' میں اسے کال کرتا ہوں۔"

اسی دوران میں ایک برسٹ گاڑی کو لگا۔ وائرلیس سیٹ اچھل کر نشست پر جا گرا اور خاموش ہوگیا۔ یہ بڑا نازک صورتِ حال تھی۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بردہ فروش رجب کے ساتھیوں۔ اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کارروائی کررہے ہیں۔ میں نے دیکھا تابڑ توڑ فائرنگ کی آڑ میں دو افراد کوسٹر کے اندر سے نکلے اور بھاگ کر ایک کچی دیوار کے عقب میں اوجھل ہوگئے۔ یہ دیوار الٹی ہوئی جیپ کے بالکل قریب تھی۔ میں جانتا تھا کہ کوسٹر والوں کا اگلا قدم اب کیا ہوگا۔ الٹی ہوئی جیپ کے پیچھے پوزیشن لینا چاہتے تھے اور رجب کو جیپ میں سے نکال کر کوسٹر میں لے جانا چاہتے

گھیرا ڈال لیا۔ تین چار رائفل مین کوٹھی کے داخلی دروازے پر چوکس کھڑے ہوگئے۔ ایس ایچ او نے مجھ سے بات کی اور بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ایس ایس پی صاحب بھی موقع پر پہنچ رہے ہیں۔ اپنی گاڑی کے وائرلیس سیٹ پر ایس ایچ او کو مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں ساہی صاحب راوی کا پل کراس کررہے تھے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ساہی صاحب پہنچ گئے۔ وہ وردی میں تھے۔ ان کی جیپ میں ایک انسپکٹر کے علاوہ دو تین اے ایس آئی بھی تھے۔ ساہی صاحب مجھے میک اپ کے باوجود پہچان گئے۔

ساہی صاحب مجھے اور صفدر کو لے کر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ یہاں توڑ پھوڑ کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ توڑ پھوڑ اس دھینگا مشتی کا نتیجہ تھی جو ہمارے اور عدیل وغیرہ کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے ساہی صاحب کو ذرا تفصیل کے ساتھ تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بے حد حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ قانون کی ناک کے عین نیچے کچھ لوگ اس طرح جیتے جاگتے انسانوں کی خرید و فروخت کا دھندا کررہے ہیں۔ ساہی صاحب کو تمام حالات بتانے کے بعد میں نے انہیں جانی اور غیاث کی لاشیں دکھائیں۔ یہ لاشیں رات سے جہاں کی تہاں پڑی تھیں' انہیں کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ساہی صاحب نے دیگر پولیس افسران کے ساتھ لاشوں کا معائنہ کیا۔ زخمی "ریچھ نما" بھی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا۔ گولی اس کی پنڈلی کی بڑی ہڈی میں لگی تھی۔ رات میں اس کی ٹانگ سوج کر کپا ہوچکی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ ساہی صاحب نے پولیس افسران کے ہمراہ بالائی اور زیریں تہ خانے کا بھی معائنہ کیا۔ وہ بیرکیں دیکھیں جہاں لوگوں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ ایک کمرا ایسا تھا جسے دیکھ کر دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے عقوبت خانے یاد آگئے۔ یہاں نافرمان قیدیوں کو سزا دینے کے لیے نہایت بھیانک قسم کے آلات رکھے تھے۔ آہنی شکنجے' ناخن کھینچنے کے لیے پلاس' الٹا لٹکانے کے لیے لوہے کے کڑے' جسم کو حدت پہنچانے کے لیے ہیٹر اور پتا نہیں کیا کچھ۔

پولیس پارٹی کے ساتھ فوٹو گرافر بھی موجود تھا۔ وہ ہر جگہ کی تصویریں لے رہا تھا۔ ساہی صاحب ماتحت افسران کو مسلسل ہدایات جاری کررہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موقع سے چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ وہ تمام افراد کے بیانات بھی اپنی موجودگی میں قلم بند کروانا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف رجب کا بھی مسئلہ تھا۔ اسے جلد از جلد اسپتال پہنچایا جانا ضروری تھا۔ میں نے ساہی صاحب کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ جائے واردات کا نقشہ بنانے اور بیان وغیرہ قلم بند کرانے کا کام ایک ماتحت کو سونپ کر ہمارے ساتھ روانہ ہوگئے۔ رجب کو جیپ کی پچھلی لمبی نشست پر لٹایا گیا تھا' ایک سب انسپکٹر اور ڈرائیور اگلی نشستوں پر موجود تھے۔ میں اور صفدر ساہی صاحب کے ساتھ پچھلی گاڑی میں تھے۔ اس گاڑی میں دو مسلح ہیڈ کانسٹیبل بھی موجود تھے۔

ہم رجب کو لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ساہی صاحب خاصے حیران نظر آرہے تھے۔ وہ جب میرے ٹیلی فون پر گھر سے روانہ ہوئے تھے تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی اہم خبران کی منتظر ہے۔ نہایت گھناؤنے کاروبار میں ملوث ایک گروہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اور مع لیڈر کے گرفتار ہوا تھا۔ (اس وقت تک ہم رجب کو ہی سرغنہ سمجھ رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ رجب تو اس وسیع کاروبار میں ایک معمولی سا مہرہ ہے نہ ہی ہمیں ابھی اس کاروبار کے صحیح حجم کا اندازہ تھا) زخمی رجب والی جیپ آگے تھی جبکہ ہماری گاڑی عقب میں آرہی تھی۔ نزدیک ترین اسپتال "میڈی و لنگٹن" تھا۔ ہم شیخوپورہ روڈ پر تھے اور ابھی راوی کے پل سے قریباً ایک کلو میٹر دور تھے۔ اچانک ایک کوسٹر ٹائپ گاڑی نے جیپ کو اوور ٹیک کیا اور پھر جیپ کو سائڈ پر دباتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر کر رکنے پر مجبور کردیا۔ یہ منظر ہم سب کو ریڈ الرٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دونوں ہیڈ کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر گاڑی سے اترے اور کوسٹر کی طرف بڑھے۔ اسی وقت کوسٹر کی اگلی کھڑکیوں سے خودکار رائفل کی فائرنگ ہوئی۔ ایک کانسٹیبل کے سینے اور سر پر گولیاں لگیں' وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرے کانسٹیبل نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کیا اور بمشکل فائرنگ سے بچایا۔ کانسٹیبل کے اچانک قتل نے ہمیں سکتے کی سی کیفیت سے دوچار کردیا۔ کوسٹر نے ترچھا کھڑا ہو کر جیپ کا راستہ بالکل مسدود کردیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے جو دراصل ساہی صاحب کا تجربہ کار ڈرائیو حیات محمد تھا' تیزی سے جیپ کو بائیں رخ پر موڑا اور کھیتوں میں اتار دیا۔ جیپ کھیتوں کے درمیان واقع کچے راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی اس کے پیچھے گرد کا ایک بادل بلند ہوا۔ کوسٹر سے جیپ پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی یہ منظر دیکھ کر ہم نے بھی پولیس موبائل کے اندر سے کوسٹر کی کھڑکیوں پر فائرنگ کی۔ کئی شیشے چھناکے سے

ٹوٹ گئے۔ کوسٹر کا انجن اسٹارٹ تھا' اس نے ٹرن لیا اور جیپ کے پیچھے دوڑی۔ موبائل کے ڈرائیور نے بھی ساہی صاحب کے اشارے پر گاڑی' کوسٹر اور جیپ کے پیچھے کچے راستے پر ڈال دی۔ اسی دوران میں ایک برسٹ آیا اور موبائل کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہوگئی۔ ایک گولی ڈرائیور نذیر محمد کے بازو میں لگی دوسری صفدر کا کندھا چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ڈرائیور نذیر محمد کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

ساہی صاحب نے بلند آواز میں پوچھا "گاڑی چلا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سر۔" اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے رفتار تیز کرو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہماری گاڑی گرد کے بادل میں قریباً چھپ سی گئی تھی۔ ہمیں یہ تسلی تھی کہ ہم پر نشانہ لے کر فائر نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اندھی گولیوں کا اندیشہ ہر لحظہ موجود تھا۔ ہم نے سرحتی الامکان حد تک نیچے جھکا لیے تھے۔ صرف ڈرائیور نذیر سیدھا بیٹھا تھا اور یہ اس کی مجبوری تھی۔ بہرحال گاڑی کو حرکت میں رکھنے کے لیے کسی ایک شخص کو تو رسک لینا ہی تھا۔ یہ رسک واقعی "رسک" ثابت ہوا۔ کوسٹر سے اندھا دھند فائرنگ ہورہی تھی۔ ایک گولی نذیر محمد کے سر میں لگی اور وہ اوندھے منہ اسٹیئرنگ پر گر گیا۔ میں نے پیچھے جھکے جھکے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام لیا۔ مگر اسی دوران میں دم توڑتے ہوئے نذیر کا پاؤں ایکسیلریٹر سے ہٹ گیا اور گاڑی دو چار جھٹکے کھا کر رک گئی۔

گولی نذیر کی پیشانی پر لگی تھی۔ اس کے بچنے کا ایک فیصد چانس بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کا جسم دھکیل کر گاڑی سے نیچے گرایا اور خود اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اس سے پہلے کہ میں انجن اسٹارٹ کرتا مجھے اندازہ ہوا کہ کوسٹر رک گئی ہے۔ گرد کے بادل میں سے اس کا ہیولا صاف نظر آنے لگا تھا۔ کوسٹر کے رکنے کی دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں' اس کے ٹائر برسٹ ہوگئے تھے یا پھر آگے جاتی ہوئی جیپ رک گئی تھی۔ ہمارا دوسرا خیال درست تھا۔ جیپ رکی ہوئی تھی۔ اور وہ جس طریقے سے رکی ہوئی تھی وہ نہایت مخدوش تھا۔ جیپ بے قابو ہو کر کچے راستے سے اتر گئی تھی اور ایک نشیبی کھیت میں گر گئی تھی۔ وہ پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کے پہیے ابھی تک گھوم رہے تھے۔ جیپ میں موجود سب انسپکٹر دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ میں سے نکل آیا تھا اور اب جیپ کی اوٹ لے کر کوسٹر والوں پر ریوالور سے فائر کررہا تھا۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن لی اور کوسٹر پر فائر کرنے لگے۔ اندازہ ہورہا تھا کہ کوسٹر میں کم از کم سات آٹھ افراد ہیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ ہمارے کانسٹیبلوں کے پاس وہی دقیانوسی رائفلیں تھیں۔ ایک تھری ناٹ تھری تھی۔ دوسری پرانے ماڈل کی سیون ایم ایم تھی مگر یہ برسٹ نہیں مار سکتی تھی۔ یہ رائفل صفدر نے لے لی اور ایک تناور درخت کی آڑ لے کر فائر کرنے لگا۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور پہلے تین چار فائرز میں ہی کوسٹر کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ کردیے۔ اسی دوران میں جیپ کی آڑ لے کر فائر کرتے ہوئے سب انسپکٹر کی بدقسمتی نے اسے آواز دی۔ اس نے تابڑ توڑ فائرنگ سے گھبرا کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک قریبی درخت کی جانب دوڑ لگائی تھی' لیکن ابھی وہ بمشکل جیپ کے عقب سے نکلا ہی تھا کہ دو گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہوگئیں اور وہ کھیت کی کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ساہی صاحب کا ڈرائیور حیات محمد کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ زخمی ہے اور جیپ کے اندر ہی ہے۔ موبائل کے وائرلیس سیٹ کا رابطہ ہیڈ کوارٹر سے تھا' کوئی چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا "یہ کیا ہورہا ہے سر؟ یہ فائرنگ کیسی ہے۔ آپ کہاں ہیں سر۔ ہیلو ہیلو انسپکٹر بشیر کالنگ۔۔۔ آپ کہاں ہیں سر۔"

ساہی صاحب نیچے جھکے جھکے وائرلیس سیٹ تک پہنچے اور ریسیور اٹھا کر بولے "ہیلو انسپکٹر بشیر۔۔ ایس ایس پی ساہی اسپیکنگ۔۔۔ یہاں شیخوپورہ روڈ پر موڑ سے ایک کلو میٹر پیچھے پولیس مقابلہ ہوگیا ہے۔ راوی روڈ تھانے میں کال کرو۔ ایس ایچ او نفری کے ساتھ فوراً پہنچے۔۔۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "سر ایک موبائل شاہدرہ کے قریب موجود ہے' میں اسے کال کرتا ہوں۔"

اسی دوران میں ایک برسٹ گاڑی کو لگا۔ وائرلیس سیٹ اچھل کر نشست پر جاگرا اور خاموش ہوگیا۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بردہ فروش رجب کے ساتھیوں نے اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کارروائی کی ہے۔ میں نے دیکھا تابڑ توڑ فائرنگ کی آڑ میں دو افراد کوسٹر کے اندر سے نکلے اور بھاگ کر ایک کچی دیوار کے عقب میں اوجھل ہوگئے۔ یہ دیوار الٹی ہوئی جیپ کے بالکل قریب واقع تھی۔ میں جانتا تھا کہ کوسٹر والوں کا اگلا قدم اب کیا ہوگا۔ وہ الٹی ہوئی جیپ کے پیچھے پوزیشن لینا چاہتے تھے اور زخمی رجب کو جیپ میں سے نکال کر کوسٹر میں لے جانا چاہتے تھے۔

ہمیں جیپ کی دوسری سمت نظر نہیں آرہی تھی۔ ممکن تھا کہ ڈرائیور حیات محمد یا زخمی رجب میں سے کوئی ایک جیپ سے باہر گرا پڑا ہو۔

میں نے بلند آواز میں کہا "صفدر! یہ لوگ رجب کو اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔ یہ رانی خاں کے سالے بھی ہوں گے تو ایسا نہیں کرسکیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی صفدر نے بڑی دلیری سے اپنی پوزیشن چھوڑی اور چند گز آگے ایک بیل گاڑی کے عقب میں بیٹھ گیا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو یہ بیل گاڑی کھیت کی کیچڑ میں پھنسی ہوئی تھی اور چند افراد اسے نکالنے کی کوشش کررہے تھے۔ فائرنگ اور ہنگامے سے خوف زدہ ہوکر وہ لوگ کھیتوں میں نکل بھاگے تھے۔ بیل گاڑی کی اوٹ سے صفدر بہ آسانی اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا جو جیپ کی طرف آنے کی کوشش کرتا۔ نشانہ لگانے میں صفدر کی صلاحیت تسلیم شدہ تھی۔ اس نے کفایت شعاری سے گولیاں چلائیں اس کے باوجود دیوار کے پیچھے پوزیشن لینے والے دونوں افراد کو واپس کوسٹر کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔

جب وہ دونوں افراد کوسٹر میں واپس پہنچے تو ایک دم نقشہ بدل سا گیا۔ کوسٹر والوں نے ہم پر فائرنگ کرنے کے بجائے جیپ کو نشانہ بنانا شروع کردیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ لوگ رجب کو چھیننے میں ناکام ہوکر اسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ جیپ الٹی ہوئی تھی، ممکن تھا کہ اس کا ڈیزل وغیرہ بہہ رہا ہو، ایسے میں ایک گولی جیپ کو جہنم بنا سکتی تھی۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو تابڑ توڑ فائرنگ سے حیات محمد اور رجب اندر ہی ہلاک ہوسکتے تھے۔

میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا۔ ہماری گاڑی ذرا ڈھلوان پر کھڑی تھی۔ میں اور کانسٹیبل گاڑی کو بہ آسانی نشیبی کھیت کی طرف دھکیل سکتے تھے۔ میں نے کانسٹیبل کو بتایا کہ ہمیں گاڑی نشیب کی طرف دھکیلنی چاہیے اور خود بھی اس کی اوٹ میں حرکت کرکے نشیب میں پہنچ جانا چاہیے۔ ہم نے گاڑی کو ڈھلوان پر دھکیلا اور اس کے پیچھے ہی پیچھے دوڑتے ہوئے نشیبی کھیت میں پہنچ گئے۔ ساہی صاحب وہیں چند درختوں کی اوٹ میں کھڑے رہے تھے۔

ہماری گاڑی کھیت میں پہنچی تو جیپ سے اس کا فاصلہ بمشکل آٹھ دس گز رہ گیا۔ ہم زور لگا کر گاڑی کو تھوڑا مزید آگے لے گئے۔ کھیت میں کیچڑ تھی اور ہمارے پاؤں بار بار پھسل رہے تھے۔ بہرحال گاڑی کی اوٹ میں ہم بالکل محفوظ تھے۔ کوسٹر میں سے گاڑی پر مسلسل فائرنگ ہورہی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ گاڑی دوسری جانب سے چھلنی ہوگئی ہے۔ جیپ سے ہمارا فاصلہ اب چند قدم رہ گیا تھا جیپ کا پچھلا دروازہ ادھ کھلا تھا اور اس میں سے مجھے رجب کا ایک پہلو صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائیور حیات کی نیلی قمیص کی ایک جھلک بھی مجھے دکھائی دی۔ میں اوندھا لیٹ گیا اور کرالنگ کرتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے، کوسٹر قدرے بلندی پر تھی، وہاں سے فائر ہونے والی کوئی بھی اندھی گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ جیپ کے نزدیک پہنچ کر میں نے رجب کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہورہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر گولی لگی ہے اور وہاں سے خون رس رہا ہے۔ غالباً اس میں خون ہی اتنا تھا کہ بہہ نہیں سکتا تھا بس رس سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کا بالائی دھڑ جیپ میں سے نکل آیا، مگر اس کی ٹانگیں خبر نہیں کہاں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں کھینچ رہا تھا مگر ٹانگیں نکل نہیں پارہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اندھا دھند فائرنگ سے کسی بھی وقت جیپ کو آگ لگ جائے گی اور ہم تینوں جل کر بھسم ہوجائیں گے۔

"حیات محمد!" میں نے ڈرائیور کو آواز دی۔

جواب میں ایک کراہ سنائی دی۔ میں نے گردن لمبی کرکے دیکھا۔ حیات محمد نشستوں کے درمیان بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر کارتوس کے باریک چھرے لگے تھے اور پورا چہرہ زخمی نظر آرہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ حیات محمد۔۔۔ رجب کو جیپ سے نکالنے میں میری مدد کرے لیکن وہ بے چارہ تو خود قابلِ رحم حالت میں تھا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور کچھ کہا لیکن میں سمجھ نہیں سکا۔ جیپ کا وائرلیس سیٹ ابھی تک آن تھا اور اس میں سے کئی افراد کے بولنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے رجب کی پھنسی ہوئی ٹانگیں چھڑانے کے لیے ایک بار پھر زور لگایا۔ یہی وقت تھا جب میرے نتھنوں میں ایک خوف ناک بو گھسی۔ یہ ڈیزل کی بو تھی۔ جیپ کا ڈیزل بہنا شروع ہوگیا تھا۔ اب کسی بھی لمحے یہ جیپ آگ کا گولا بن سکتی تھی۔ مجھے صفدر کی پکار سنائی دی۔ وہ مجھ سے فریاد کررہا تھا کہ میں جیپ سے پیچھے ہٹ جاؤں۔ چند لمحے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ چیخ و پکار کیوں کررہا ہے۔ انجن کی سمت جیپ میں آگ لگ گئی تھی۔ اب جیپ کے قریب ٹھہرنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے رجب کا بازو چھوڑا اور

پیچھے کی جانب حرکت کی۔ ایک دم دھماکا ہوا اور پوری جیپ آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ میں جھک کر بھاگتا ہوا موبائل کی اوٹ میں آگیا۔ ایک ہی لمحے میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔ اس احساس کے ساتھ شعلوں کو دیکھنا کہ ان میں دو افراد زندہ جل رہے ہیں، بڑا کرب ناک تھا۔ کوسٹر والے اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے، وہ رجب کو پولیس سے چھین تو نہیں سکے تھے تاہم وہ اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

یہی وقت تھا جب مجھے ایک بڑی لینڈ کروزر جیپ نظر آئی۔ وہ کچے پکے راستے پر بڑی تیزی سے اچھلتی ہوئی ہماری طرف آرہی تھی۔ پہلے تو ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید ہمیں کمک پہنچی ہے لیکن پھر اس خیال کو رد کرنا پڑا۔ جیپ سیدھی کوسٹر کی طرف گئی اور اس جانب جاکر رک گئی جو ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جیپ، کوسٹر کے اگلے دروازے (ڈرائیور کے دروازے) کے پاس جاکر رکی تھی۔

صفدر کی چلاتی ہوئی آواز آئی "شاہ جہاں صاحب! وہ فرار ہورہے ہیں۔" صفدر کا اشارہ یقیناً کوسٹر والوں کی طرف تھا۔

میں نے گاڑی کی اوٹ سے دیکھا، صفدر کی اطلاع درست تھی۔ ڈرائیور والے دروازے کی سمت ہلچل نظر آرہی تھی۔ فضا میں جلتے ہوئے گوشت کی بھیانک بو تھی اور یہ بو ہمیں پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم کوسٹر والوں کو نہ جانے دیں۔ صفدر کے پاس ایمونیشن ختم ہوگیا تھا۔ وہ ان افراد کو نشانہ نہیں بنا سکتا تھا جو بڑی تیزی سے کوسٹر میں سے نکل کر جیپ میں سوار ہورہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہماری گاڑی یعنی پولیس موبائل کا کوئی ٹائر برسٹ نہیں ہوا تھا۔ میں نے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور انجن اسٹارٹ کردیا۔ صفدر دوڑتا ہوا آیا اور گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی کی طرف آتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے کانسٹیبل کی ڈیڈ باڈی کے پاس رکا تھا اور اس کی جیب میں سے سیون ایم ایم کے دو بھرے ہوئے میگزین نکال لیے تھے۔ کانسٹیبل نے بھی اپنی تھری ناٹ تھری سمیت گاڑی میں چھلانگ لگادی۔ میں نے گاڑی کو ریورس کرنا چاہا۔ کھیت کی کیچڑ میں پہیے بے تحاشا رفتار سے گھومتے چلے گئے۔ گاڑی کئی بار لہرانے کے بعد کھیت میں سے نکل آئی۔ اس وقت تک دیوہیکل لینڈ کروزر جیپ حرکت میں آچکی تھی۔ ہم جیپ کے پیچھے لپکے۔ ساہی صاحب نے ہمیں پکارا "ٹھہر جاؤ شاہ جہاں" یقیناً وہ ہمارے ساتھ لینڈ کروزر کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے۔ میں نے سنی ان سنی کردی۔ صفدر نے بھی ان کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

ہم انہیں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ چند قدم ہمارے پیچھے آئے پھر گرد و غبار کے بادل میں گم ہوگئے۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر چپک رہے تھے۔ یہ ڈرائیور رنذیر کا خون تھا۔ ہم نے رنذیر، ڈرائیور رنذیر اور کانسٹیبل کی لاشوں کے پاس سے گزر کر ہم لینڈ کروزر کے پیچھے گئے۔

"صفدر! اس کے ٹائر پھاڑنے کی کوشش کرو۔" میں نے اپنا ریوالور صفدر کو دیتے ہوئے کہا۔

صفدر نے نشانہ لے کر تین گولیاں چلائیں۔ مگر تینوں رائگاں گئیں۔ ایک تو دیوہیکل لینڈ کروزر سے ہمارا فاصلہ زیادہ تھا دوسرے گرد و غبار نے لینڈ کروزر کو ہماری نگاہوں سے تقریباً اوجھل کررکھا تھا۔ یہ صبح نو دس بجے کا وقت تھا دور تک کھیتوں میں چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ کاشت کاروں کی ٹولیاں یہاں وہاں کھڑی حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے یہ ہنگامہ آرائی دیکھ رہی تھیں۔ میں نے تیسرا اسپیئر لگا کر کلچ چھوڑا تو "بارہ سو سی انجن" کی گاڑی کمان سے نکلے تیر کی طرح لینڈ کروزر کی طرف بڑھی۔ ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین کے ٹکڑے ہر جھٹکے کے ساتھ ہمارے قدموں میں بکھر رہے تھے۔ صفدر نے لینڈ کروزر کا نشانہ لینے کے لیے سیون ایم ایم رائفل تھام لی۔ نیا میگزین رائفل سے اینچ کرنے کے بعد وہ فائرنگ کے لیے بالکل تیار ہوگیا۔

"صفدر! ان لوگوں نے چار بندے مارے ہیں۔ ان کو نکلنا نہیں چاہیے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔" صفدر نے بڑے عزم سے کہا۔

بمشکل صفدر کا فقرہ پورا ہوا تھا کہ لینڈ کروزر کی طرف سے "ایم جی" کے برسٹ کی آواز آئی۔ ہم نیچے جھک گئے۔

گولیاں گاڑی کی باڈی میں لگیں۔ تاہم شکر کا مقام تھا کہ کسی ٹائر کو نقصان نہیں پہنچا۔ لینڈ کروزر کچے پکے راستے پر قریباً ساٹھ ستر میل کی رفتار سے اڑی جارہی تھی۔ اس کی تیز رفتاری کے سبب اس کے عقب میں گرد و غبار کا بادل بلند ہورہا تھا۔ یہ گرد و غبار ہمارے حق میں اس لحاظ سے بہتر تھا کہ لینڈ کروزر سے ہمیں ٹھیک ٹھاک نشانہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف یہی فائدہ لینڈ کروزر والوں کو بھی حاصل تھا۔ صفدر ماہر ترین نشانہ باز ہونے کے باوجود لینڈ کروزر کے ٹائر کو اپنی رائفل کا نشانہ بنا نہیں پارہا تھا۔ قریباً دو تین کلو میٹر تک یہ اندھا دھند دوڑ جاری رہی۔ اونچے نیچے راستوں پر ہلکی گاڑی کے مقابلے میں لینڈ کروزر بہت اچھے طریقے سے دوڑ رہی تھی۔

اس کے علاوہ لینڈ کروزر کا ڈرائیور بھی خاصا مشتاق نظر آتا تھا۔ ہمارا درمیانی فاصلہ دم بدم بڑھتا جارہا تھا۔ یہ مایوس کن صورتِ حال تھی۔ لینڈ کروزر والوں کا پکڑا جانا ضروری تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک فرد بھی گرفتار ہوجاتا تو کئی سنسنی خیز انکشافات ہوسکتے تھے۔

جب ہمارا اور لینڈ کروزر کا فاصلہ زیادہ بڑھ گیا تو مجبوراً میں نے شارٹ کٹ لگانے کے لیے کار ایک کھیت میں ڈال دی۔ اس کھیت میں چارا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ہم قریباً ایک فرلانگ تک کھیتوں میں سفر کرکے دوبارہ نیم پختہ راستے تک پہنچ جائیں گے...اور لینڈ کروزر سے ہمارا فاصلہ خاصا کم ہوجائے گا لیکن یہ امید بر نہیں آئی۔ کھیتوں کے درمیان ایک جگہ زمین خاصی نرم تھی۔ ہماری گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی اور پہیے گھوم کر رہ گئے۔ چند سیکنڈ تک کوشش کرنے کے بعد میں نے انجن بند کردیا اور گہری آہ بھر کر پشت سے ٹیک لگالی۔

صفدر بھی اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یہ بات اب بالکل واضح تھی کہ ہم لینڈ کروزر کو کھو چکے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کاشتکار بھاگم بھاگ ہم تک پہنچے۔ جس کاشت کار کے کھیت میں سے ہم نے گاڑی گزاری تھی' وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا مگر وہ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ اس کے کھیت میں گھسنے والی گاڑی پولیس کی ہے۔ اس کے علاوہ باوردی پولیس کانسٹیبل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اپنے نقصان پر تلملانے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم کچھ خطرناک مجرموں کا تعاقب کررہے تھے' کاشتکاروں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوگئی تھیں۔ موقع پر اکٹھے ہوجانے والے کھیت مزدوروں نے مل جل کر ہماری گاڑی کو کیچڑ میں سے نکالا۔ لینڈ کروزر کے تعاقب میں جانا اب بیکار تھا۔ کار میں موجود وائرلیس سیٹ فائرنگ کے دوران میں ناکارہ ہوچکا تھا ورنہ اس موقع پر ہم لینڈ کروزر کے حوالے سے پولیس کے لیے کوئی پیغام نشر کرسکتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ اب ہم واپس روانہ ہوں۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کے ساتھ ہم موقع واردات کی طرف واپس چل دیے۔

موقع واردات پر اب پولیس کی چار پانچ گاڑیاں جمع ہوچکی تھیں۔ کھیتوں میں دور تک لوگوں کی ٹولیاں نظر آرہی تھیں۔ ہر چہرے پر خوف و ہراس پایا جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا موقع واردات پر کئی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور جلے ہوئے گوشت کی سڑاند فضا کو بوجھل کررہی تھی۔ پولیس جیپ ابھی تک سلگ رہی تھی۔ اس کے اندر ڈرائیور حیات محمد اور رجب کی لاشیں جل کر کوئلا ہوگئی تھیں۔ رجب کی مسخ لاش میں نے سونے کی اس چمکتی زنجیر سے پہچانی جو اس کی گردن میں بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ اس خوب صورت زنجیر کا کچھ نہیں بگڑا تھا لیکن اسے پہننے والا موت کے رخش پر سوار نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہوگیا تھا اور روانہ ہونے والا یہ شخص وہی تھا جس نے چند دن پہلے میرے قتل کی سپاری اٹھائی تھی۔

ڈرائیور نذیر محمد اور ہیڈ کانسٹیبل کی لاشیں کھیت سے باہر زمین پر پڑی تھیں' انہیں چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ دو لاشیں کوسٹر کے اندر سے بھی ملی تھیں۔ یہ دونوں لاشیں حملہ آوروں کی تھیں۔ وہ دونوں مقامی تھے اور صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے' تاہم عام بدمعاشوں کے برعکس ان کے جسموں پر قیمتی لباس تھے اور ان کے قریب پائے جانے والے ہتھیار بھی اعلیٰ کوالٹی کے تھے۔ ایک برٹش ماؤزر تھا جو کوسٹر کی دو نشستوں کے درمیان پھنسا رہ گیا تھا۔ ایک ۳۸ بور پسٹل تھا۔ میں نے غور کیا اور مجھ پر ایک توجہ طلب انکشاف ہوا۔ ہلاک ہونے والوں میں سے ایک شخص کے جسم پر سیون ایم ایم کی گولیوں کے دو زخم آئے تھے لیکن جو زخم اس کی فوری ہلاکت کا سبب بنا تھا وہ ایم جی کی گولی کا تھا اور یہ گولی بہت کم فاصلے سے عین اس کی پیشانی پر ماری گئی تھی۔

صورتِ حال بالکل واضح تھی۔ حملہ آوروں کا یہ ساتھی' پولیس فائرنگ سے شدید زخمی ہوا تھا۔ بھاگتے وقت حملہ آور اسے ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے' انہوں نے بہتر سمجھا تھا کہ گولی مار کر اسے ختم کردیں... یہ بہت توجہ طلب بات تھی۔ اس سے پہلے وہ رجب کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کرچکے تھے۔ پہلے انہوں نے رجب کو پولیس پارٹی سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی تھی' ناکام ہوکر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ پولیس کو اپنا سراغ دینے کے سلسلے میں بے حد محتاط ہیں اور اس حوالے سے معمولی سا رسک بھی لینا نہیں چاہتے۔

اچانک میرا دھیان رجب کی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں ہم کم از کم ایک فرد ایسا ضرور چھوڑ آئے تھے جو ہمارے لیے معلومات کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ میری مراد اس ریچھ نما شخص سے ہے جس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی اور وہ عمارت کے ایک کمرے میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ درحقیقت یہی شخص اس سنسنی ہنگامے کی بنیاد تھا۔ اس نے پروفیسر اللہ دتا کے کلینک میں مجھے شناخت کیا تھا اور پھر ہنگامہ خیز واقعات

کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ میں نے ساہی صاحب کی توجہ ریچھ نما شخص کی طرف دلائی تو وہ بھی فکرمند نظر آنے لگے۔

میں نے کہا "کہیں ایسا نہ ہو جناب کہ اسے بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں فوراً اس تک پہنچنا چاہیے۔"

"تو ٹھیک ہے چلو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہم ایک جیپ میں آبیٹھے۔ اس میں وائرلیس سیٹ موجود تھا۔ رجب کی رہائش کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہی ساہی صاحب نے اپنے ایک انسپکٹر سے رابطہ کرلیا یہ انسپکٹر اپنے تھانے کی نفری کے ساتھ رجب کی رہائش گاہ پر موجود تھا۔ ایس ایس پی صاحب نے باسط نامی اس انسپکٹر سے پوچھا کہ مجرمان میں سے زخمی ہونے والا شخص کہاں ہے۔

انسپکٹر باسط نے جواب دیا "وہیں' انیکسی کے ساتھ والے کمرے میں پڑا ہے جناب۔ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔"

ساہی صاحب نے کہا "اس پر کڑی نگاہ رکھو۔ وہ بہت اہم شخص ہے۔ اسے کسی صورت اوجھل نہیں ہونا چاہیے اور نہ کوئی نقصان پہنچنا چاہیے۔ ہم پانچ دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے ہمیں پوری طرح تسلی دی' لیکن جب دس منٹ بعد ہم باغات میں گھری ہوئی رجب کی رہائش گاہ پر پہنچے تو انسپکٹر باسط علی کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آئیں۔

"کیا ہوا انسپکٹر؟" میں نے اس کے تیور بھانپ کر پوچھا۔

وہ تھوک نگل کر بولا "بہت... گڑبڑ ہوئی ہے سر۔ وہ بندہ بلڈنگ میں موجود نہیں ہے۔"

"تو پھر کہاں ہے؟" ساہی صاحب دہاڑے۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب! آپ کا پیغام آتے ہی میں اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ بے ہوش پڑا تھا۔ کمرا خالی تھا۔ فرش پر گھسٹنے کے نشان ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ بے ہوش نہیں تھا صرف مکر کیے پڑا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ اپنی زخمی ٹانگ گھسیٹتا ہوا نکلا اور انیکسی کی جانب سے باہر چلا گیا۔"

"وہ انسان تھا کہ چھلاوا تھا۔" ساہی صاحب غرائے "دن دہاڑے وہ تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ کہیں نہیں گیا' مجھے یقین ہے کہ وہ اس چار دیواری میں کہیں چھپا ہوگا۔ اسے ڈھونڈو۔ ہر صورت میں ڈھونڈو اس کا ملنا اشد ضروری ہے۔"

انسپکٹر نے سر جھکا کر کہا "ہم نے ہر جگہ دیکھا ہے جی۔"

ساہی صاحب غرائے "اگر وہ یہاں نہیں ہے تو پھر... تم لوگوں میں سے ہی کوئی قصوروار ہے۔ میں یہ بات کسی صورت نہیں مان سکتا کہ وہ بھاگا ہے۔ اسے بھگایا گیا ہوگا۔"

انسپکٹر سمیت عملے کے کئی ارکان کے چہرے بجھ گئے۔ ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ریچھ نما شخص کو رکھا گیا تھا۔ گرد آلود فرش پر گھسٹنے کے نشانات موجود تھے' اب یہ تو کوئی ماہر ہی بتا سکتا تھا کہ وہ از خود گھسٹتا ہوا باہر نکلا تھا یا کسی نے گھسیٹ کر اسے نکالا تھا۔ گھسٹنے کے نشانات انیکسی کے پورچ سے ہوتے ہوئے گیٹ کی طرف چلے گئے تھے اور پھر اوجھل ہوگئے تھے۔ حتمی رائے تو قائم نہیں کی جاسکتی تھی تاہم ایک امکان یہ بھی تھا کہ مضروب جان بوجھ کر "بے ہوش" بنا پڑا رہا ہو اور جب اس نے پولیس اہلکاروں کو ادھر اُدھر مصروف پایا ہو' خاموشی سے کھسک گیا ہو۔

صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "جناب' مجھے اندیشہ ہے کہ اس گینگ تک پہنچنے کے رہے سہے سراغ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ میرا مطلب ارشاد احمد اور اس کے بھائی پروفیسر اللہ دتا سے ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دونوں برادران بھی گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوجائیں۔"

میرا ذہن خود بھی اسی لائن پر سوچ رہا تھا۔ میں نے ساہی صاحب کو مطلع کیا' ہم فوراً گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ عمارت کے احاطے میں وہ تمام افراد موجود تھے جنہیں رجب کی قید سے رہائی ملی تھی۔ ان میں وہ نوجوان بھی تھے جو اپنے اپنے سفری بیگوں کے ساتھ امریکا اور یورپ جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے اور وہ مفلوک الحال افراد بھی تھے جنہوں نے ایک بردہ فروش کی لالچ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اب رجب کے اس زمین دوز قید خانے میں اذیت ناک قید جھیل رہے تھے۔ مسلسل تشدد نے ان کی ذہنی حالت دگرگوں کر رکھی تھی اور وہ انسانوں سے زیادہ' خوف زدہ..... بکریوں کا ریوڑ نظر آتے تھے۔ بکریاں جو نامعلوم خوف کے سبب ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھی ہوئی تھیں اور ذرا سی آواز پر بدک اٹھتی تھیں۔ براؤن آنکھوں اور سیاہ بالوں والی دونوں خوب رو لڑکیاں بھی دیگر قیدیوں کے ساتھ موجود تھیں۔ انہیں گراسی لان کے بجائے کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ کرسیوں پر یوں بیٹھی تھیں جیسے یہ کرسیاں لکڑی کی بجائے کاغذ کی بنی ہوئی ہیں اور ذرا سا بوجھ پڑتے ہی زمین بوس ہوجائیں گی۔ پولیس کا ماتحت عملہ حسبِ عادت لڑکیوں کو دُزدیدہ نگاہوں سے گھور رہا تھا اور حسبِ توفیق تبصرے بھی کررہا تھا۔

لانچ کے قیدی مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھ آئے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے اور مجھ سے درخواست کرنے لگے کہ میں انہیں جلد از جلد ان کے گھروں میں جانے کی اجازت دے دوں۔ غالباً وہ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ میں بھی سادہ لباس میں کوئی پولیس اہلکار ہی ہوں۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی اور کہا کہ قانونی کارروائی مکمل کرنے کے فوراً بعد انہیں گھروں تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے گا۔ اسی دوران میں پولیس والوں کی گفتگو سے چند قیدیوں کو پتا چل گیا کہ رجب پولیس مقابلے کے دوران میں مارا گیا ہے اور اس کی لاش پولیس جیپ کے اندر ہی جل گئی ہے۔

یہ خبر کئی قیدیوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو لے آئی اور ان کے چہروں پر منڈلاتے ہوئے خوف کے سائے قدرے سمٹ گئے۔ انسپکٹر باسط علی کو دونوں لڑکیوں کے بارے میں خصوصی احتیاط کا حکم دے کر ساہی صاحب ہمارے ساتھ ایک پرائیویٹ کار میں آبیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ کار برق رفتاری سے انارکلی کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔ اس کار میں دو مسلح پولیس اہلکار موجود تھے' اس کے علاوہ ایک اور پرائیویٹ کار بھی ہمارے عقب میں آرہی تھی۔ اس میں بھی سادہ کپڑوں میں پولیس کی نفری موجود تھی۔ ہم سب سے پہلے ارشاد احمد کے گھر پر چھاپا مارنا چاہتے تھے۔

ہم ارشاد احمد کے گھر پہنچے تو اب وہاں مسلح گارڈ موجود تھا۔ تاہم جب اس گارڈ کو معلوم ہوا کہ آنے والے "مہمانوں" کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ "خوش آمدید" نہ کہے جانے کی صورت میں اس کی چمڑی بھی ادھیڑ سکتے ہیں تو وہ پولیس پارٹی کے راستے سے ہٹ گیا۔ ہم کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری ملاقات اسی چرسی مصدق سے ہوئی جس نے مجھ سے سو روپے کا نوٹ لے کر مجھے بڑے خلوص سے ارشاد احمد کا درجہ دے دیا تھا' اور پھر پروانے کی طرح میرے آگے پیچھے گھومتا رہا تھا۔ اس نے آلو بینگن کی شان میں کبھی چوڑی ہجو پڑھی تھی اور میری سخاوت مندی کے صدقے واری گیا تھا۔ وہ آج بھی نشے میں نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے سو کا نوٹ دیا تو وہ ایک بار پھر کتے کی طرح میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ وہ عجیب خصلت کا شخص تھا یا پھر شاید نشے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو جاتی تھی۔ آج اس نے بلا تردد مجھے "ڈی آئی جی صاحب" کا رتبہ دے دیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بار بار مجھے سلیوٹ کرنے لگا۔ میں نے پوچھا "تمہارا مالک ارشاد احمد کہاں ہے؟"

وہ بولا "ڈی آئی جی صاحب! اگر مجھے پتا ہوتا تو خدا کی قسم آپ کو ضرور بتا دیتا۔" پھر اپنے لہجے کو سرگوشی میں بدلتے ہوئے بولا "بے شک یہ شخص میرا مالک ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں گرائے جانے کا حق دار ہے۔ اس شخص نے ہم نوکروں کو آلو بینگن اور ٹینڈے کدو کھلا کھلا کر ہماری زندگی عذاب کر دی ہے۔ خود اس کے لیے کڑاہی گوشت اور سیخ کباب بنتے ہیں جبکہ ہمیں سبزیوں کے شوربے میں ڈبکیاں دی جاتی ہیں' یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ خدا کسی دشمن کو ایسے بینگن۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ایسی زندگی نہ دے۔ آپ ذرا انصاف کریں کہ۔۔۔"

"انصاف تو انشاء اللہ ضرور ہوگا۔" میں نے اس کی بات کاٹی "لیکن فی الحال یہ بتاؤ کہ ارشاد احمد مل کہاں سکتا ہے۔"

وہ میرے پاؤں کو ہاتھ لگا لگا کر بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا "ڈی آئی جی صاحب' مجھے میرے بچوں کی قسم' مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بس تھوڑی دیر پہلے وہ آندھی کی طرح آئے اور ایک اٹیچی کیس لے کر طوفان کی طرح گھر سے نکل گئے۔ وہ بڑی پسوڑی میں نظر آتے تھے۔۔۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کہاں گئے ہوں گے؟"

"شاید بازار گئے ہوں گے' کسی ریڑھی پر انہیں بڑے سستے آلو بینگن نظر آئے ہوں گے۔ اٹیچی کیس بھر کر لے آئیں گے ہمارے لیے۔"

مصدق نشے میں اول فول بک رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ گھر کی بالائی منزل پر ارشاد احمد کی بیمار والدہ رہتی ہے۔ شاید وہ عورت اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ بتا سکتی۔ میں اور صفدر پولیس والوں کے ہمراہ بھاگم بھاگ بالائی منزل پر پہنچے۔ یہاں ایک دو ملازم موجود تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔

ہم سیدھے اس کمرے میں پہنچے جہاں ایک شان دار پلنگ پر ایک جسیم عورت چادر اوڑھے نیم دراز تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک دم خوف ابھر آیا۔ اس پر پہلے تو سکتے کی سی کیفیت طاری ہوئی پھر اس نے زور زور سے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ میں نے اور ساہی صاحب نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل چیختی چلی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ خود کو ہم سے چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر ہم چند لمحے مزید اس کمرے میں رہے تو یہ عورت بے ہوش ہو جائے گی یا پھر اسے دل کا دورہ وغیرہ پڑ جائے گا۔ میں نے ساہی صاحب کو اشارہ کیا اور ہم اس ادھیڑ عمر عورت کے بیڈ روم سے نکل آئے۔ دو گھریلو ملازماؤں نے عورت کو سنبھال لیا اور اسے لٹا کر دوا

وغیرہ پلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

ساہی صاحب کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے کوٹھی کی تلاشی شروع کر دی۔ گھر میں چوکی دار سمیت کل چار ملازم تھے' انہیں ایک کمرے میں اکٹھا کر لیا گیا۔ کوٹھی کی تفصیلی تلاشی کے نتیجے میں ایک گودام سے ولایتی شراب کے دو کریٹ برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ تین خود کار رائفلیں' ایک ریوالور اور ان ہتھیاروں کا ایمونیشن ملا۔ ایک کمرے کی الماری میں بہت سے جعلی پاسپورٹ' شناختی کارڈز اور غیر ملکی سفارت خانوں کی مہریں برآمد ہوئیں۔ اس الماری کے دو خانے کھلے ہوئے ملے۔ ان اندرونی خانوں میں کوئی شے موجود نہیں تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ افراتفری میں یہاں سے کچھ کاغذ سمیٹے گئے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ کاغذ اسی اٹیچی کیس میں رکھے گئے ہوں جو بوقتِ رخصت ارشاد احمد کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ ایک الماری سے ہمیں ایک خطرناک قسم کا اسپرے بھی ملا۔ اس اسپرے سے کسی شخص کو کئی گھنٹوں کے لیے اعصابی طور پر مفلوج کیا جا سکتا تھا۔ ارشاد احمد کی خواب گاہ میں ایسے آثار نظر آئے' جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی اکثر راتیں رنگین جلوؤں کے نرغے میں گزرتی ہیں۔

ارشاد احمد تو راہِ فرار اختیار کر چکا تھا' اب ہمارے ہاتھ میں آخری "کلیو" پروفیسر اللہ دتا رہ گیا تھا۔ خدشات تو اس کے بارے میں بھی موجود تھے مگر عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک پولیس کے چھاپوں سے بے خبر ہو یا پھر اپنے مریضوں میں گھرا ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ پھرتی نہ دکھا سکا ہو اور ہم اسے گردن سے جا دبوچیں۔ ساہی صاحب نے وائرلیس پر اپنی ایک موبائل سے رابطہ کیا اور موبائل میں موجود پولیس پارٹی کو ہدایت کی کہ وہ پروفیسر اللہ دتا کے کلینک کو اپنی نگرانی میں لے لیں۔ یہ پولیس پارٹی مال روڈ کے جی پی او چوک سے گزر رہی تھی' پانچ منٹ کے اندر پرانی انارکلی میں پروفیسر کے کلینک پر پہنچ گئی۔ پولیس پارٹی کی طرف سے ہمیں یہ خوش کن اطلاع ملی کہ پروفیسر اللہ دتا صاحب کلینک میں ہی موجود ہیں اور مریضوں کا معائنہ فرما رہے ہیں۔

ہم بھی تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ پروفیسر کے کلینک پہنچ گئے۔ حسبِ معمول کلینک کے سامنے کاروں اور موٹر سائیکلوں کی قطاریں موجود تھیں' خوب رش نظر آرہا تھا' یا تو پروفیسر اللہ دتا ابھی تک ہنگامۂ محشر سے بے خبر تھا یا جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا۔ ساہی صاحب نے مجھ سے کہا "شاہ جہاں' تم اور صفدر اندر جاؤ۔ ساتھ میں ایک مسلح سفید پوش کو لے جاؤ۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں اور صفدر ایک سادہ پوش ایس آئی کے ساتھ کلینک میں داخل ہوئے۔۔۔ سامنے ہی بڑا سا بورڈ آویزاں تھا "بچوں کے ضدی امراض کی واحد علاج گاہ" اندر مریضوں کا ہجوم تھا۔ زیادہ تعداد خواتین اور بچوں کی تھی۔ پروفیسر اللہ دتا کے کمپاؤنڈر اور ملازمین بے حد مصروف تھے۔ میں اور صفدر دندناتے ہوئے مشورہ گاہ میں گھس گئے۔ مشورہ گاہ کے دروازے پر موجود چوکیدار نے ہمیں روکنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ میں پروفیسر کی میز کے سامنے پہنچ گیا' پروفیسر کے سامنے بیٹھی ہوئی مریضہ خاصی جوان اور خوب رو تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونکا' وہ فلم انڈسٹری کی ایک جانی پہچانی ہیروئن تھی۔ میں یہاں اس کا اصل نام نہیں لکھوں گا۔ آپ اس کا فرضی نام نوشین تصور کر لیں۔ اس نے ایک سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی اور چہرے کا صرف بالائی حصہ نظر آرہا تھا۔ مجھے یوں اندر گھستے دیکھ کر پروفیسر کے ساتھ ساتھ نوشین کے چہرے پر بھی ناگواری کی شکنیں ابھریں۔

پروفیسر نے بھنا کر کہا "کیا بات ہے۔ کیوں بدتمیزی کر رہے ہو؟"

صفدر نے کہا "بدتمیزی ابھی ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی ہے اور اگر آپ کے مریضوں کے سامنے ہوئی تو یہ بڑے نقصان کی بات ہوگی۔ بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے ہمارے ساتھ باہر آجائیں۔"

"تم ہو کون؟"

"ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" پروفیسر اللہ دتا نے اکڑ کر بولا۔

ایس آئی نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا۔

پروفیسر نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے میز پر پھینک دیا "تم جیسے دو ٹکے کے پولیس والے کی یہ ہمت کہ مجھ پر حکم چلائے۔ جاؤ اپنے کسی بڑے کو بھیجو۔" پروفیسر نے سب انسپکٹر کو باقاعدہ دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"بڑے بھی آجائیں گے اور وارنٹ بھی آجائیں گے لیکن فی الحال تم باہر چلو ہمارے ساتھ۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"اگر میں نہ جاؤں تو؟" پروفیسر اللہ دتا سینہ تان کر بولا۔

"تو میں گردن سے دبوچ کر لے جاؤں گا۔" میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت میری آنکھوں کے سامنے پھلجھڑی سی

چھوٹ گئی۔ میرے پہلو میں کھڑی فلم ایکٹریس نوشین نے بڑے زور سے میرے منہ پر طمانچہ رسید کردیا تھا۔ مجھے یا صفدر کو اس حرکت کی ذرا سی بھی توقع نہیں تھی' لہٰذا ہم دونوں حیران رہ گئے پھر جیسے ایک دم صفدر کا میٹر گھوم گیا۔ وہ نوشین پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ اس کا بھرپور جوابی تھپڑ نوشین کے گال پر پڑتا' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "نہیں صفدر۔" میں نے چیخ کر کہا۔

صفدر غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے نوشین کے لیے گالیوں کا طوفان اُبل پڑا۔ وہ خود کو میری گرفت سے نکالنے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا اور نوشین کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ نوشین چند لمحے تو بڑبڑ کرتی رہی' پھر ایک دم ڈر کر خاموش ہوگئی۔ شاید اسے صفدر کی طرف سے ایسے زبردست ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ صفدر کو اگر کسی دوسرے نے سنبھال رکھا ہوتا تو وہ یقیناً اب تک خود کو چھڑا چکا ہوتا اور مجھے طمانچہ رسید کرنے کی پاداش میں نوشین نامی اس ایکٹریس کا حشر خراب کرچکا ہوتا لیکن میری گرفت بہت مضبوط تھی اور صفدر کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ میں نے ڈری ہوئی نوشین سے چیخ کر کہا "دفع ہوجا یہاں سے۔"

وہ ایک لمحہ تذبذب میں رہی پھر خبر نہیں کہ کیا بکواس کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شور سن کر پروفیسر کے کئی کارندے مشورہ گاہ میں گھس آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ یہ کارندے پروفیسر کے حکم پر میری اور صفدر کی جانب متوجہ ہوتے' ساہی صاحب اپنے عملے کے ساتھ اندر داخل ہوگئے۔ مسلح اہلکاروں کو دیکھ کر پروفیسر اینڈ کمپنی کی سٹی گم ہوگئی۔ سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تاہم پروفیسر قدرے حوصلے میں نظر آتا تھا۔ وہ ابھی تک گردن اکڑائے کھڑا تھا اور تیز لہجے میں بول رہا تھا "مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔" اس نے ساہی صاحب کو باقاعدہ وارننگ دی۔

ساہی صاحب نے کہا "میں ایس ایس پی ساہی ہوں۔ تمہیں تحویل میں لینا ضروری ہے۔"

ساہی صاحب کا عمدہ جان کر اس کا رویہ ذرا سا نرم ہوا لیکن ظاہری تن فن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بولا "میں ایک ٹیلی فون کرنا چاہتا ہوں۔" پھر ساہی صاحب کی اجازت کا انتظار کیے بغیر اس نے ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنا شروع کردیے۔ چند لمحے بعد وہ بولا "ہیلو سلیمان صاحب! میں اللہ دتا بول رہا ہوں۔ جی ہاں۔ خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ آپ کا کوئی ساہی نام کا ایس ایس پی کلینک میں گھس آیا ہے۔ اس کے عملے نے سخت بدتمیزی کی ہے اور مجھے پکڑنا چاہ رہے ہیں۔ جی جی۔ یہ تو آپ ان سے ہی پوچھیے۔ بالکل بالکل۔ میرے سامنے کھڑا ہے۔"

اس کے بعد اللہ دتا نے ریسیور ساہی صاحب کو تھما دیا۔ ساہی صاحب دوسری طرف سے کی جانے والی بات مؤدب انداز میں سنتے رہے اور "ہوں ہاں" میں جواب دیتے رہے۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے کوئی اعتراض کرنے کی کوشش کی مگر دوسری طرف سے غالباً تند و تیز لہجے میں بات کی جارہی تھی لہٰذا وہ خاموش رہ گئے۔ آخر میں انہوں نے "بہت اچھا" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ چہرے پر مایوسی واضح نظر آرہی تھی۔ انہوں نے عملے کو اشارہ کیا۔ سادہ پوش اہلکار پروفیسر اللہ دتا کے اردگرد سے پیچھے ہٹ گئے۔ اللہ دتا کے کارندوں میں سے ایک کے سوا سب کو چھوڑ دیا گیا۔ اس کے پاس سے ریوالور برآمد ہوا تھا۔

اللہ دتا اپنے زیرِ حراست کارندے کی طرف اشارہ کرکے گرجا "اسے بھی چھوڑو۔"

"ریوالور کا لائسنس دیکھ کر چھوڑ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں لائسنس دکھا دیتے ہیں۔" اللہ دتا نے کہا پھر اپنے کسی سجاد نامی کارندے کو آواز دے کر کہا "ایس ایس پی کو ریوالور کا لائسنس دکھایا جائے۔"

ہم سب اللہ دتا کی مشورہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ ہنگامہ دیکھ کر بہت سے مریض کھسک گئے تھے' جو موجود تھے وہ بھی حیران پریشان نظر آرہے تھے۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کس کا فون تھا؟"

"ہوم سیکریٹری کا۔" انہوں نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا "لگتا ہے کہ حرام زادے کی پہنچ کافی اوپر تک ہے۔"

اسی دوران میں ایک انسپکٹر واکی ٹاکی لیے ہوئے ساہی صاحب کے پاس پہنچ گیا "آئی جی صاحب کا فون ہے جناب۔" اس نے مشینی لہجے میں کہا۔

ساہی صاحب نے اپنے افسرِ اعلیٰ کا فون سنا اور چند بار "یس سر۔ یس سر!" کہہ کر رہ گئے۔

آئی جی صاحب نے بھی پروفیسر اللہ دتا کے حوالے سے ہی بات کی تھی اور ساہی صاحب کو مطلع کیا تھا کہ پروفیسر کی شنوائی کافی اوپر تک ہے' لہٰذا اس پر بلا کسی بہت ٹھوس ثبوت کے ہاتھ ڈالنا از حد خطرناک ہے۔ ابھی ساہی صاحب ہم سے آئی جی کے فون کے بارے میں ہی بات کررہے تھے کہ ایک شان دار مرسیڈیز کار کلینک کی تنگ سڑک پر رکتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے ایک خاکستری جیپ بھی تھی۔ میں اس گاڑی

اور جیپ کو پہچانتا تھا' یہ مقامی ایم این اے کی گاڑیاں تھیں۔ ایم این اے صاحب بنفسِ نفیس مرسیڈیز میں موجود تھے۔ وہ توند منکاتے ہوئے باہر تشریف لائے اور سیدھے ساہی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے رائفل بردار کارندے ادب سے عقب میں چلے آرہے تھے۔ میں ان ایم این اے صاحب کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ چند سال پہلے وہ لندن کے ایک فلیٹ سے اس حالت میں پکڑے گئے تھے کہ بیک وقت تین عدد برہنہ لڑکیوں کے ساتھ کشتی فرما رہے تھے اور نشے میں انہیں ماں بہن کا درجہ بھی دے رہے تھے اور یہ تو ایک مثال ہے' ایسی بہت سی روشن مثالوں کے تمغے ان کے سینے پر سجے ہوئے تھے۔

ایم این اے صاحب بے تکلفی سے ساہی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور تھوڑی دیر گفتگو فرماتے رہے۔ یقیناً یہ گفتگو عزت مآب پروفیسر اللہ دتا کے حوالے سے ہی تھی۔ ایم این اے صاحب پروفیسر صاحب کی سفارش کررہے تھے اور ڈھکے چھپے الفاظ میں ساہی صاحب کو وہ بات سمجھا رہے تھے جو حکمران اور طاقت ور طبقہ اپنے ماتحت اور کم اختیار والے لوگوں کو ہمیشہ سے سمجھاتا آیا ہے۔ طاقت کے دریا میں روڑے اٹکانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ تیز بہاؤ میں پتھر لڑھک لڑھک کر اپنی شناخت کھو دیتے ہیں اور بالآخر ریت بن کر بکھر جاتے ہیں۔ ایم این اے کے الفاظ کچھ بھی رہے ہوں لیکن ان کا اصل مفہوم اس سے ملتا جلتا ہی رہا ہوگا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ساہی صاحب کو درجنوں فون آگئے' جن میں ساہی صاحب سے کہا گیا تھا کہ وہ پروفیسر اللہ دتا کی شان میں گستاخی کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ساہی صاحب نے اپنے اعلیٰ افسران کو تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ سب سے پہلے انہیں شیخوپورہ روڈ لے جاکر موقع واردات دکھایا گیا۔ پولیس کی جلی ہوئی جیپ جس میں گولیوں کے سیکڑوں سوراخ تھے' حملہ آوروں کی جارحیت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ چار پولیس اہلکاروں کی لاشیں بھی ابھی موقع سے ہٹائی نہیں گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بردہ فروش رجب اور اس کو چھڑانے کے لیے آنے والوں کی دو لاشیں بھی موقع پر موجود تھیں۔ جائے وقوعہ کا ہر ہر چپا گواہی دے رہا تھا کہ یہاں ایک زوردار اور حقیقی پولیس مقابلہ ہوا ہے۔ اس کے بعد افسران کی ٹیم کو رجب کی رہائش گاہ کا دورہ کرایا گیا۔ افسران نے غیر قانونی طور پر محبوس رکھے جانے والے قریباً چوالیس افراد سے ان کے بیانات لیے' اور وہ تہ خانے بھی دیکھے جہاں قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ یہاں افسران نے رجب کے ساتھیوں جانی اور غیاث کی لاشوں کا معائنہ بھی کیا۔ اس امر میں شک شبے کی ہلکی سی گنجائش بھی نظر نہیں آتی تھی کہ رجب منظم طریقے سے بردہ فروشی کا کام کررہا تھا۔

میرا اور صفدر کا خیال تھا کہ اب پولیس کو اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی۔ رجب کی رہائش گاہ پر وہ اسکوٹر موجود تھا جس پر سوار ہوکر ارشاد احمد کا کارندہ یعنی ریچھ نما شخص یہاں پہنچا تھا۔ اس اسکوٹر کی رجسٹریشن ارشاد احمد کے نام پر تھی۔ ارشاد احمد کے اسکوٹر کی یہاں موجودگی اس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ رجب اور ارشاد احمد میں کوئی نہ کوئی ربط ہے۔ ارشاد احمد خطرے کی بو سونگھ کر فرار ہوگیا تھا اور اس کا مفرور ہونا اس کی حیثیت کو مزید مشکوک بناتا تھا۔ ساہی صاحب نے اپنے ساتھی افسران کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ انہوں نے کہا "مزید تفتیش کے مطابق' پروفیسر اللہ دتا کے بھائی ارشاد احمد اور بردہ فروش رجب جان کے درمیان بردوں کے لین دین کا معاملہ چل رہا تھا۔ یہ اسکوٹر سوار جو ارشاد احمد کا قریبی ساتھی ہے' اسی لین دین کے سلسلے میں

مشتاق احمد قریشی کے سحر کار قلم سے نیا ناول

پاتال

فطرت کے باغی شخص کا فسانۂ عبرت

ڈاکٹر عمران

۳۰ روپے

قیمت جلد اوّل: ۱۷۵ روپے

قیمت جلد دوم: ۱۷۵ روپے

- ایک جینئس سائنسدان کی انوکھی داستان' وہ انسانی ذات کی پاتال کے رازِ بے نقاب کرنے چلا تھا۔
- دلکش، منفرد اور انوکھے موضوع کی حامل اور گرد کے اطول سے جگمگا کر دینے والی تحریر
- ہر صفحہ تحیر سے ہوئے ..... اعصاب شکن سسپنس سے بھرپور ناول

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر علی میاں پبلیکیشنز ۳۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۳۱۳

اسٹاکسٹ علی بک سٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۳۲۳۸۵۳

یہاں آیا تھا۔ یہاں بردہ فروشوں اور قیدیوں میں گولی چل گئی۔ اسی ہنگامے میں یہ شخص بھی زخمی ہوا اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ یہ آٹھ پہر زخمی حالت میں یہاں پڑا رہا پھر موقع دیکھ کر فرار ہوگیا۔"

ایک اعلیٰ افسر نے ساہی صاحب سے سوال کیا "آپ کو یہ ساری باتیں کس ذریعے سے معلوم ہوئیں؟"

ساہی صاحب نے بڑے اعتماد سے مجھے اور صفدر کو پولیس افسران کے سامنے پیش کردیا۔ انہوں نے پولیس افسران کو میرا نام احمد' اور صفدر کا شجاع بتایا اور انہیں آگاہ کیا کہ ہم دونوں ان کے لیے مخبر کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہم دونوں میک اپ میں تھے لہٰذا قانون کی آنکھ ہمیں دیکھنے اور پہچاننے سے قاصر تھی۔ اگر یہ میک اپ ہمارا پردہ نہ ہوتا تو اب تک ہم دونوں کو ہتھکڑیاں لگ چکی ہوتیں' اور مجھے تو غالباً بیڑیاں بھی پہنائی جاچکی ہوتیں۔ پولیس افسران میں سے سی آئی اے کے ایک انسپکٹر نے ہم دونوں سے بھی چند سوالات کیے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس گھاگ انسپکٹر کے سامنے کم سے کم جھوٹ بولا جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح چند روز پہلے میں پروفیسر کے بھائی ارشاد احمد سے ملنے اس کی کوٹھی پہنچا تھا اور کس طرح ارشاد کے ایک چرسی ملازم نے مجھ سے سو کا نوٹ وصول کرکے مجھے ارشاد احمد بنادیا۔ میں نے بتایا کہ اس کے بعد رجب جان کی بدقسمتی اسے ارشاد کی رہائش گاہ پر کھینچ لائی۔ رجب اور ارشاد کی وہ پہلی ملاقات تھی۔ رجب بھی مجھے ہی ارشاد سمجھا۔ وہ مجھ سے باتوں باتوں میں کافی بے تکلف ہوگیا۔ اس نے روانی میں اس راز سے پردہ اٹھادیا کہ وہ بھی ارشاد احمد کی طرح بردہ فروشی کے دھندے میں ملوث ہے۔ وہ مجھے بردوں کی ایک کھیپ فروخت کرنے کے لیے اپنی رہائش گاہ پر لے آیا۔ اس کے بعد کے واقعات بھی میں نے تفصیل سے انسپکٹر کے گوش گزار کر دیے کہ کس طرح ارشاد کا ساتھی ریچھ نما شخص اپنے اسکوٹر پر رجب کی رہائش گاہ پر پہنچا اور اس کی آمد کے سبب یہ بھانڈا پھوٹ گیا کہ میں ارشاد احمد نہیں۔

سی آئی اے کے انسپکٹر نے ساہی صاحب کی موجودگی میں میرا اور صفدر کا طویل بیان قلم بند کیا۔ ساہی صاحب کی موجودگی کے سبب انسپکٹر نے زیادہ تند تیز سوال پوچھنے سے گریز کیا تھا۔ بیانات سے فارغ ہوکر میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "اب کیا خیال ہے آپ کا؟ پروفیسر اللہ دتا پر ہاتھ ڈالا جاسکے گا یا نہیں؟"

ساہی صاحب کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں مزید گہری ہوگئیں۔ وہ بولے "پروفیسر اللہ دتا کا اثر و رسوخ ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ بیشتر مریض جن لوگوں کو اس سے ٹکانے

پہنچا ہے یا پہنچ رہا ہے ان میں اعلیٰ افسران اور انتظامیہ کے عہدے دار بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ شدومد سے پروفیسر کی حمایت کررہے ہیں اور اس کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ اسے ایک زبردست معالج ہی نہیں ایک زبردست انسان بھی قرار دے رہے ہیں۔"

"لیکن اب تو بات واضح ہوگئی ہے جناب۔" میں نے کہا "بردہ فروش رجب جان اور پروفیسر کے بھائی کا تعلق ثابت ہورہا ہے۔ بھائی کے مفرور ہونے کے بعد ظاہر ہے پولیس پروفیسر پر ہی ہاتھ ڈالنا ہوگا۔"

ساہی صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "پہلی بات تو یہ ہے شاہ جہاں! کہ بردہ فروش رجب اور پروفیسر کے بھائی ارشاد کا تعلق ابھی واضح طور پر ثابت نہیں ہوا۔ ہمارے پاس فی الحال واحد ثبوت اسکوٹر کی وہ رجسٹریشن کاپی ہے جس پر ارشاد احمد کا نام موجود ہے۔ یہ ایک کاغذی ثبوت ہے اور اس میں سے بہ آسانی سقم برآمد ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر "اسکوٹر سوار زخمی" رجب کی رہائش گاہ میں سے مل جاتا تو کیس مضبوط ہوجاتا تھا۔ اس شخص سے یہ بات اگلوائی جاسکتی تھی کہ ارشاد احمد سے اس کا کیا تعلق ہے اور ارشاد نے اسے رجب کے پاس کس کام سے بھیجا تھا۔"

صفدر نے کہا "ارشاد کا چرسی ملازم مصدق بھی اپنے مالک کی سیاہ کاریوں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے' اس کے علاوہ وہ ارشاد اور رجب کے تعلق کے بارے میں بھی تصدیق کرسکتا ہے۔"

ساہی صاحب نے کہا "بالفرض یہ تصدیق ہو بھی جائے تو ہمارا مقصد فی الفور حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ پروفیسر اللہ دتا ایک کائیاں شخص نظر آتا ہے۔ اپنے بھائی کے ریکروٹنگ بزنس سے اس نے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھا ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ بھائی سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ اب اگر ہم اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اپنے بھائی کے قول و فعل سے اس کا کوئی تعلق نہیں' لہٰذا اسے بدنیتی کی بنا پر اس معاملے میں گھسیٹا جارہا ہے۔ یہاں کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے کا مالک بھی پروفیسر صاحب کے بہی خواہوں میں شامل ہے۔ اب تک تین دفعہ اس کا فون آچکا ہے۔ وہ اور اس جیسے دوسرے لوگ شور مچادیں گے کہ پولیس اصل مجرموں کو تو پکڑ نہیں سکی اور اب بے گناہ شہریوں کی گردنیں دبوچ رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی خبروں کو کتنا اچھالا جاتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ اتنی انسانی جانوں کے زیاں کے باوجود ہم خاموش ہوکر بیٹھ جائیں۔" ایک انسپکٹر نے کہا۔ "مرنے والے ہمارے ساتھی اور دوست تھے۔ ہم ان

کا خون رائگاں نہیں جانے دیں گے۔" ایک سب انسپکٹر جوش سے بولا۔

"حوصلہ رکھو بھئی۔ سب کچھ ہوگا لیکن ذرا انتظار کرنا پڑے گا۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہم دونوں خاموشی کے ساتھ اپنے ہوٹل واپس آگئے۔ متوسط درجے کے اس ہوٹل میں ہمارے ٹھکانے کا علم بجز ساہی صاحب کے سوا ابھی کسی کو نہیں تھا۔ صفدر بے حد برہم دکھائی دیتا تھا۔ اس کی برہمی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم اتنی مار دھاڑ اور خون ریزی کے باوجود ایسے کسی ایک شخص پر بھی ہاتھ نہ ڈال سکے تھے جو ہمیں بردہ فروشی کے اس ٹھکانے کے دھندے کے بارے میں کوئی سراغ دے سکتا۔ اس کی برہمی کی دوسری اور زیادہ اہم وجہ وہ واقعہ تھا جو پروفیسر اللہ دتا کی مشورہ گاہ میں پیش آیا تھا۔ ایکٹریس نوشین نے بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھے تھپڑ جڑ دیا تھا۔ اس تھپڑ کے بعد صفدر کا جو حال ہوا تھا وہ میں ہی جانتا تھا۔ غصے نے اسے بے دم پاگل کردیا تھا۔ اگر میں اسے نوشین پر جھپٹنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا تو وہ یقیناً اس کا بہت برا حشر کرتا۔ اس واقعے کو بڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے مگر وہ اب بھی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ قسم کھا کر کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! میں اس کتیا سے اس تھپڑ کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ ایسا ذلیل کروں گا اسے کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ الو کی پٹھی' دو دو ٹکے میں بکنے والی ایکٹریس اور یہ مجال۔۔۔ حرام زادی کو سرِعام ننگا کرکے نہ گھسیٹا تو صفدر نام نہیں میرا۔"

صفدر ایک تحمل مزاج اور روشن دماغ شخص تھا۔ میں نے کبھی اسے جذبات میں فیصلہ کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن آج وہ سراپا جذباتی ہورہا تھا۔ میں نے کہا "یار صفدر! سچ پوچھتے ہو تو مجھے تمہارا رویہ دیکھ کر مایوسی ہوئی ہے۔ تم ایک کانجیٹ لڑکے جیسا ردِعمل پیش کررہے ہو۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لڑکی نے مجھے انجانے میں تھپڑ مارا ہے اور یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ شاید اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔ پروفیسر کے لیے اس کی عقیدت ایک دم ہی اس کے غصے کا سبب بن گئی۔ میں اس لیے بے عزتی محسوس نہیں کررہا کہ میں اس کے لیے انجان تھا۔ ہاں اگر میں اس کے لیے شناسا ہوتا' وہ میرے کوائف سے واقف ہوتی اور پھر ایسا کرتی تو شاید مجھے قلق ہوتا۔"

صفدر بولا "آپ میں اتنا حوصلہ ہوگا لیکن مجھ میں نہیں۔ میں اسے یہ تھپڑ معاف نہیں کرسکتا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم ایک اور بات بھول رہے ہو پیارے۔ ہم دونوں اپنی اصل صورتوں میں نہیں۔ لہٰذا تھپڑ بھی میرے چہرے پر نہیں لگا اس چہرے پر لگا ہے جو میک اپ کے بعد بنا ہے۔"

صفدر جھنجلایا ہوا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اتنی دیر میں ویٹر نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ویٹر نے بتایا کہ میرا فون ہے' میں استقبالیہ کاؤنٹر پر جاکر سن لوں۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ساہی صاحب ہیں۔" ویٹر نے جواب دیا۔

میں فوراً چپل گھسیٹ کر نیچے کاؤنٹر پر پہنچا۔ ساہی صاحب نے کہا "بھئی! کوئی ملنا چاہ رہا ہے تم سے۔"

"کون ہے؟"

"ملک کی ایک بڑی فلم اسٹار۔۔۔ مس نوشین!"

میں چونک گیا "اسے مجھ سے کیا کام ہے؟"

"یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔ پہلے دو مرتبہ اس کے سیکریٹری نے رابطہ قائم کیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ خود بات کررہی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اس کے پاس تمہارا اتا پتا نہیں ورنہ وہ یقیناً اسی وقت تم پر چڑھ دوڑتی۔"

"کچھ اندازہ تو لگایا ہوگا آپ نے کہ کیا مسئلہ ہے اس کا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اللہ دتا کے کلینک میں پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے وہ کوئی بات کرنا چاہ رہی ہے۔ شاید تم سے معذرت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"لیکن مجھے اس کی معذرت کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ساہی صاحب ہلکے پھلکے انداز میں بولے "خدا کا خوف کرو بھئی۔ اتنی بڑی فلم اسٹار ہے۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اسٹوڈیو کے گیٹ پر کھڑے رہتے ہیں۔۔۔ اور تم اس سے ملنا نہیں چاہ رہے ہو۔"

"میرے خیال میں وقت ضائع کرنے کے اس سے بہتر طریقے بھی ہیں۔" میں نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

ساہی صاحب قدرے سنجیدہ لہجے میں بولے "مجھے محسوس ہورہا ہے کہ شاید وہ پروفیسر اللہ دتا کے حوالے سے بھی کوئی بات کرے۔ اگر تم اس سے ایک مختصر ملاقات کرلو تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' اگر آپ کہتے ہیں تو کرلیتا ہوں۔"

ساہی صاحب نے کہا "اگر تمہارا یہ ہوٹل والا ٹھکانا پوشیدہ ہی رہے تو بہتر ہے۔ ملاقات کے لیے کوئی اور جگہ مقرر کرلو۔ انٹرنیشنل ہوٹل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم پانچ بجے تک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ جانا۔ آج شام کی چائے تم مشہور و معروف فلم اسٹار نوشین کے ساتھ پیو گے۔"

میں نے کہا "جناب! اس مشہور و معروف فلم اسٹار کے ساتھ مجھے ملنا کس حیثیت سے ہے؟"

"احمد کی حیثیت سے۔ تم باقاعدہ طور پر پولیس میں شامل نہیں ہو۔ تاہم پولیس کے لیے مخبر کے فرائض انجام دیتے ہو۔ اعلیٰ پولیس افسران سے تمہارے تعلقات ہیں۔ تمہارے ساتھی (صفدر) کا نام شجاع ہے اور وہ تمہاری ہدایات کے تحت کام کرتا ہے۔"

ساہی صاحب نے مزید کچھ باتیں بتانے کے بعد سلسلہ منقطع کردیا۔ میں واپس کمرے میں آکر سوچنے بیٹھ گیا۔ یہ فلمی پری مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ صرف معذرت کرنا چاہ رہی ہو لیکن یہ کسی قسم کی چال بھی ہوسکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی اور شخص فلمی پری کو استعمال کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ بہرحال اصل بات تو اس سے ملنے کے بعد ہی کھل سکتی تھی۔

میں نے کمرے کی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ صفدر ہوٹل کے برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ وہ بظاہر ایک میگزین دیکھ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی نگاہیں اور دماغ کہیں اور ہیں۔ وہ اندر سے آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ میرے چہرے پر فلمی ہیروئن کے طمانچے کو اس نے اپنی اور میری بہت بڑی بے عزتی تصور کیا تھا اور اب اس لڑکی کو سبق سکھانا چاہ رہا تھا۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ دل ہی دل میں ایورنیو یا شاہ نور اسٹوڈیو کے اندر گھسنے اور فلمی پری کو سرِعام ذلیل کرنے یا اٹھالے جانے کا پروگرام بنا چکا ہو اور اگر سنجیدگی سے سوچا جاتا تو صفدر جیسے شخص کے لیے یہ سب کچھ کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ کسی نگار خانے میں گھس کر فلمی پری کے درجنوں محافظوں کی موجودگی میں بھی اسے کٹنی کا ناچ نچا سکتا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے اندر بلا کر تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کروں۔

میں نے کھڑکی کھول کر اسے آواز دی۔ وہ پژمردہ قدموں سے اندر آگیا۔

○☆○

شام کو میں اکیلا ہی انٹرنیشنل ہوٹل کے لیے روانہ ہوا۔ صفدر میں سب کچھ بتا چکا تھا اور وہ قدرے مطمئن نظر آرہا تھا، بہرحال اس کے دل میں مختلف شکوک بھی موجود تھے۔ اس کا اصرار تھا کہ فلمی ہیروئن سے میری ملاقات کے دوران میں وہ بھی میرے آس پاس موجود رہے گا لہٰذا مجھ سے ایک گھنٹا پہلے ہی وہ ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو صفدر کو گوشے کی ایک میز پر بیٹھے پایا۔ وہ اخبار دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہال میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور ساہی صاحب کی ہدایت کے مطابق ایک میز پر جاکر بیٹھ گیا۔ یہ میز ہمارے لیے پہلے سے مخصوص تھی۔ ہم بیٹھے بمشکل تین چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ فلمی پری ہال میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ میں نے اسے اس کی چال ڈھال، قدوقامت سے پہچانا۔ وہ ایک چلتی پھرتی "دلکش قیامت" تھی۔ قد لانبا تھا، شانے چوڑے، نقوش بھی خوب صورت تھے۔ مگر اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کا دودھیا رنگت اور انتہائی ملائم و نفیس جلد تھی۔ لگتا تھا کہ اپنے حسن و شباب کی دیکھ بھال کے حوالے سے اس کا ماہانہ بجٹ لمبا چوڑا ہے۔ وہ ہال میں داخل ہوئی تو اس کا سراپا ایک طویل چادر میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں پر ہلکی رنگ دار عینک تھی۔ زریں چہرہ چادر کے پلو نے چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہال میں نگاہ دوڑائی اور پھر سیدھی میری میز پر آگئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔

"السلام علیکم" اس نے نہایت کھنک دار آواز میں کہا۔

میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک نفیس ہینڈ بیگ تھا۔ سرخ و سپید ہاتھ میں ہیرے کی دو انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ چند لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ بولی "ایس ایس پی ساہی صاحب سے مجھے آپ کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی میرے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو جانتے ہوں گے۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اقرار میں سر ہلایا۔ حالانکہ میں نے پوسٹروں اور اخباروں میں صرف اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ ہاں زریں گل یہاں موجود ہوتا تو یقیناً اس کا پورا شجرہ نسب بیان کردیتا۔

اس نے عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔ چند لمحے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں موڑتی رہی پھر دبی ہوئی آواز میں بولی "مسٹر احمد، آج دوپہر پروفیسر صاحب کے کلینک پر جو واقعہ ہوا میں اس کے لیے بے حد شرمندہ ہوں۔ اور آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

اس کے حسین چہرے پر ندامت بارش کی طرح برس

رہی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں اضطراری کیفیت میں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔

میں نے کہا "اگر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ انسان کو تحمل کا دامن کسی حال میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی "پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں پروفیسر صاحب سے بہت عقیدت رکھتی ہوں۔ وہ میرے معالج ہی نہیں، ایک طرح سے میرے پیر و مرشد بھی ہیں، میں اس قدر جذباتی ہوئی کہ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ بہرحال اس کے بعد آپ نے جس برداشت اور صبر کا ثبوت دیا اور جس طرح اپنے مشتعل ساتھی کو روکے رکھا، اس نے مجھے بہت متاثر کیا، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔"

اسی دوران میں ویٹر آگیا۔ ہم نے اسے چائے کا آرڈر دیا۔ میں نے نوشین سے پوچھا "آپ کتنے عرصے سے پروفیسر کے پاس آرہی ہیں؟"

وہ بولی "قریباً دو سال ہوئے میری بہن صادقہ کا بیٹا جو صرف دو سال کا تھا، سیڑھیوں سے گرا اور پانچ روز اسپتال میں رہا۔ بعد میں اس پر وقتاً فوقتاً غشی کے دورے پڑنے شروع ہوگئے۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن وہ دن بدن لاغر اور بیمار ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے ایک خاص قسم کا اعصابی مرض لاحق ہے۔ یہ مرض ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں وقتے وقتے سے مریض کے اعضا... شل ہوجاتے ہیں اور وہ انہیں اپنی مرضی سے حرکت نہیں دے سکتا۔ میں اپنے بھانجے کو دو مرتبہ امریکا بھی لے کر گئی لیکن وہاں سے بھی صرف تسلی تشفی ہی مل سکی۔ انہی دنوں میرے ایک ملازم نے مجھے پروفیسر اللہ دتا صاحب کے بارے میں بتایا۔ مصیبت میں انسان ہر قسم کے سہارے تلاش کرتا ہے۔ میں اُن کو ایلیفاٹ معالجوں پر یقین نہ رکھنے کے باوجود بھانجے کو پروفیسر صاحب کے پاس لے آئی اور پھر یہ معجزہ ہوا کہ میرا دو ڈھائی سالہ بھانجا جو موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا، پھر سے جی اٹھا۔ ڈیڑھ دو ہفتے اس کی حالت جوں کی توں رہی، پھر وہ تیزی سے سنبھلنے لگا۔ صرف دو ماہ بعد وہ بھلا چنگا تھا۔

"ان واقعات کے چند ماہ بعد مجھے جلد کی تکلیف ہوگئی۔ میرے ہاتھوں کی پشت اور کمر کے نچلے حصے میں سفید داغ سے نظر آنے لگے۔ ہلکی خارش بھی ہوتی تھی۔ میں نے لاہور کے بہترین ڈاکٹروں کو دکھایا۔ وقتی طور پر آرام آجاتا تھا پھر تکلیف ہوجاتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا، یہ طویل عرصے تک چلنے والی تکلیف ہے۔ دوا وغیرہ کھانے سے کنٹرول رہے گی مگر مکمل طور پر ختم ہونے میں وقت لگے گا۔ آپ کو تو پتا ہے شوبز میں رہنے والوں کو اپنی ظاہری حالت کا کتنا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی مسئلہ ہوجائے تو پورا کیریئر برباد ہوجاتا ہے۔ میں اپنا پرابلم لے کر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچی اور پھر دوسرا معجزہ ہوا۔ پروفیسر صاحب نے صرف سٹراتی روپے میں ایک مرہم بنا کر دیا اور اس نے میری تکلیف کو چند ہفتوں میں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

"اس واقعے نے مجھے اور میری فیملی کو پروفیسر صاحب کا مستقل عقیدت مند بنا دیا۔ میں اکثر یہاں آتی جاتی رہتی ہوں۔ کبھی دوا لینے کے لیے آنا پڑتا ہے، کبھی یوں ہی چلی آتی ہوں۔ پروفیسر صاحب کی شخصیت یوں تو عام سی نظر آتی ہے لیکن ان سے دو چار بار ملنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اندر سے بہت بڑے اور "کرنی والے" ہیں۔"

میں نے کہا "بہت بڑے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ وہ بہت اچھے اور نیک انسان ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر کس میں شک ہے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ برا مان جائے گی لیکن پھر ایک دم یوں رُ وہ اپنے آپ میں ہی کہیں کھوگئی ہے۔ شاید میرا سوال اتنا رائگاں نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

"آپ کچھ پریشان ہوگئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔"

"لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ میری بات اتنی بے موقع نہیں تھی۔ بے شک آپ پروفیسر صاحب سے بھرپور عقیدت رکھتی ہیں اور ان پر بہت اعتماد بھی کرتی ہیں پھر بھی ان کے حوالے سے کوئی چیز آپ کو الجھن میں ڈالتی ہے۔"

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن یہ نشانے پر لگا۔ نوشین کے خوب صورت چہرے پر ایک بار پھر سوچ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ وہ کچھ دیر بے خیالی میں گلاس کے کنارے پر انگلی پھیرتی رہی پھر اپنے خیالات جھٹک کر میری جانب دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ میں گہرائی اور کھوج تھا۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ میری توقعات سے مختلف نکلی تھی۔ دیکھنے میں وہ سراپا فلمی پری نظر آتی تھی لیکن اس کی بول چال اور اداؤں میں ایک خاص قسم کا رکھ

رکھاؤ اور دھیما پن تھا۔ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ اس کے شرمانے کا انداز' اس کی مسکراہٹ' اس کا لہجہ' یہ سب کچھ اسے عام فلمی پریوں سے جُدا ثابت کرتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے فلمی حسیناؤں کے بارے میرے تمام منفی تصورات کو دھڑام سے زمیں بوس کردیا تھا۔

وہ نزاکت سے بولی "ایس ایس پی ساہی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ پولیس کے خاص الخاص "انفارمر" ہیں۔ آپ کو اعلیٰ افسروں کی طرف سے اہم کام سونپے جاتے ہیں' کیا میں آپ کو پرائیویٹ جاسوس قسم کی چیز سمجھوں؟"

میں نے کہا "محترمہ! یہ پرائیویٹ جاسوس اور ان کی جاسوسیاں صرف مغربی ملکوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ مجھے تو آپ سیدھے سادے لفظوں میں انفارمر ہی کہیں۔"

وہ بولی "میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ وہ نہیں جو خود کو ظاہر کررہے ہیں۔ بہرحال جو بھی ہے آپ نے اور آپ کے ساتھی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ خاص طور سے آپ پر میرا دل اعتماد کرنے کو چاہتا ہے۔"

نوشین کی گفتگو میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ مجھے اپنی عمر سے کہیں زیادہ معاملہ فہم اور زیرک نظر آرہی تھی۔ میں نے کہا "آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ میں شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"آپ بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ باقاعدہ مجھے تھپڑ بھی مار سکتے ہیں۔" وہ ہنسی تو اس کی آواز نے ماحول کو جگمگا دیا۔

میں نے کہا "جو واقعہ بیت گیا' اسے بھول جائیں۔"

"ٹھیک ہے بھول گئے۔" وہ ادا سے بولی۔

"کوئی نئی بات کریں۔"

اس کے چہرے پر ایک دم گہری سنجیدگی چھاگئی اور حسین آنکھیں کچھ سوچنے میں مصروف ہوگئیں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' ہال میں موجود لوگ اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ملک کی مشہور و معروف ایکٹرس ان کے درمیان موجود ہے۔ صفدر اپنی گوشے والی میز پر موجود تھا۔ وہ کافی پی رہا تھا۔ اس نے رخ تھوڑا سا پھیر کر رکھا تھا۔ نوشین کے لیے ممکن نہیں تھا کہ آسانی سے اسے دیکھ سکتی اور پہچان سکتی۔

نوشین کے پُرسوچ انداز کا اختتام ایک سرد آہ پر ہوا۔ وہ بولی "کیا کل پھر یہیں پر ہماری ملاقات ہوسکتی ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں' یونہی۔ آپ سے مل کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ آپ ضرور کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"ہاں شاید ایسا بھی ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میں پھر آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

میں واضح طور پر محسوس کررہا تھا کہ نوشین شدید تذبذب میں ہے۔ وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی۔ شاید وہ سوچنے کے لیے مزید کچھ وقت چاہتی تھی۔ اسی دوران میں آٹھ دس سال کی ایک بچی ہمارے پاس آئی۔ وہ چند لمحے شرائی شرائی سی نوشین کی طرف دیکھتی رہی' پھر بولی "میرے ممی پاپا نے آپ کو پہچان لیا ہے' آپ فلم اسٹار نوشین ہیں نا؟"

نوشین نے ایک سرد آہ بھری پھر مسکراتی نظروں سے بچی کو دیکھ کر بولی "ہاں' نوشین ہی ہوں میں۔۔۔ فرمایئے۔"

بچی نے جھٹ سے آٹوگراف بُک آگے کی "آٹوگراف پلیز۔"

نوشین نے آٹوگراف دیے۔ بچی کے والدین کچھ فاصلے پر بیٹھے مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے "تھینک یو باجی۔" بچی نے کہا اور لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اب کچھ اور لوگ بھی کھوجی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے تھے۔ نوشین نے کہا "ہم لوگوں کے ساتھ یہ بہت پرابلم ہوتا ہے۔ پرائیویٹ لائف ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔ اب دیکھیے' چادر میں منہ چھپا رکھا ہے' پھر بھی پہچانی گئی ہوں۔"

"ہاں شہرت کے ساتھ یہ چھوٹے چھوٹے مسائل تو ہوتے ہی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ کل ایمبیسیڈر ہوٹل میں ملیں۔ وقت یہی آج والا مناسب رہے گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد ہم ڈائننگ ہال سے اٹھ گئے۔

اگلے روز کے اخبارات میں کل کے واقعات کی دھواں دھار خبریں شائع ہوئی تھیں۔ پولیس مقابلے کی تفصیلات بھی آئی تھیں۔ رجب کا نام ایک بردہ فروش کے طور پر شائع ہوا تھا تاہم ارشاد احمد اور اس کے بھائی پروفیسر اللہ دتا کے بارے میں کوئی خاص خبر نہیں آئی تھی۔ صرف ایک اخبار نے اتنا لکھا تھا کہ ہلاک ہونے والے بردہ فروش رجب جان کے گھر سے ایک اسکوٹر برآمد ہوا ہے' جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ یہ پروفیسر اللہ دتا کے بھائی ارشاد احمد کے نام رجسٹرڈ ہے۔

اس روز میرے اور صفدر کے پاس کافی فرصت تھی۔

ہم دونوں نے قریباً تین گھنٹے آئینے کے سامنے گزارے اور اپنے اپنے میک اپ کو "ری پیئر" کیا۔ جو میک اپ ہم نے کر رکھا تھا اس میں ایک کیمیکل ایسا تھا جس میں سوڈیم کی کافی مقدار تھی۔ بھیگنے سے اس کی رنگت تبدیل ہوجاتی تھی لہٰذا ضروری تھا کہ ہر سات آٹھ روز بعد اسے مخصوص ٹریٹ منٹ دی جائے۔

اس روز ایمبیسیڈر ہوٹل میں پری چہرہ نوشین سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس مرتبہ نوشین نے لمبی چوڑی تمہید کے بغیر ہی بات شروع کردی۔ وہ بولی "اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ میں اور میری فیملی پروفیسر صاحب سے غیر مشروط عقیدت رکھتے ہیں' لیکن ایک بات ایسی ہے جو پچھلے کچھ ماہ سے مجھے مسلسل پریشان کررہی ہے۔ میرے ایک دور کے انکل رب نواز کا بیٹا شاہد بی اے کے بعد بے روزگار تھا۔ وہ فلموں میں قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روکا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اسے باہر بھجوادوں گی' اور ہوسکتا ہے کہ امریکا سیٹل کروا دوں۔ ایک روز باتوں باتوں میں پروفیسر صاحب سے شاہد کا ذکر ہوا تو میں نے اس کا مسئلہ بیان کیا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا کہ وہ یہ کام بہ آسانی کرسکتا ہے۔ غرض میں نے شاہد کو پروفیسر کے چھوٹے بھائی ارشاد صاحب کے سپرد کردیا۔ انہوں نے بہت کم اخراجات لے کر شاہد کو کینیڈا بھجوا دیا اور وہاں ایک ملازمت بھی دلوا دی۔ دو تین ماہ تک تو کینیڈا سے شاہد کے خطوط آتے رہے۔ اس نے اپنے والدین کو کچھ پیسے بھی بھیجے پھر اچانک خطوط آنا بند ہوگئے۔ اس کے والدین نے سمجھا کہ وہ امریکا جانے کے لیے تگ و دو کررہا تھا' شاید اسی چکر میں کہیں چلا گیا ہو۔ مگر پھر کوشش کے باوجود اس سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ ان لوگوں نے پروفیسر کے بھائی ارشاد احمد سے رابطہ کیا' انہوں نے کینیڈا اور امریکا میں اپنے جاننے والوں سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ شاہد کا پتا چلائیں' مگر یہ ساری کوششیں ناکام گئیں۔ ایک ماہ پہلے میں اپنی اردو فلم کی شوٹنگ کے لیے امریکا گئی تو میں نے بھی شاہد کا کھوج لگانے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اب یہ مسئلہ یوں اور بھی گمبھیر ہوگیا ہے کہ شاہد کی والدہ کو دل کی تکلیف ہوگئی ہے اور وہ رات دن بیٹے کی واپسی کی دعائیں مانگ رہی ہیں۔"

میں نے کہا "آپ نے ایک ایسی اطلاع دی ہے جس کی میں پہلے سے توقع کررہا تھا' بلکہ میں اس سے زیادہ کی توقع کررہا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ میری توقع درست ہو۔ آپ کے پاس اس سے بھی بڑی کوئی اطلاع ہو۔"

وہ میری تفتیشی نظروں سے گھبرا کر میز کی سطح کو گھورنے لگی۔ آخر بولی "اس سے بڑی اطلاع تو نہیں' لیکن اس جیسی ہی ایک اطلاع ضرور ہے۔"

"کیا میں سن سکتا ہوں؟"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ ہو یا نہ ہو' لیکن نقصان نہیں ہوگا۔ یہاں جو بھی بات ہوگی صرف میرے اور آپ تک رہے گی۔"

اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "کل پروفیسر صاحب کے کلینک میں اتفاقاً میری ملاقات خانیوال سے آنے والی ایک مائی سے ہوگئی۔ شریفاں نامی یہ مائی بھی پروفیسر صاحب کی پرانی عقیدت مند ہے۔ پانچ چھ ماہ پہلے اس کی بیٹی کو ارشاد صاحب نے آیا کی حیثیت سے ابوظہبی پہنچایا تھا۔ دو ماہ تک نجمہ نامی اس لڑکی کے خط آتے رہے ہیں اور پیسے وغیرہ بھی ملتے رہے ہیں۔ اب اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ اس کا کفیل بھی غائب ہے' بلکہ اب معلوم ہوا ہے کہ اس نام کا شخص کہیں موجود ہی نہیں تھا۔ لڑکی جوان اور اچھی شکل و صورت کی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں بھٹک رہی ہے اور کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ اصل بات کا پتا تو تب ہی چل سکتا ہے جب وہ ملے یا اس کا خط وغیرہ آئے۔ مائی بے حد پریشان ہے اور رو رو کر بینائی ضائع کررہی ہے۔ وہی شاہد کے مسئلے سے ملتا جُلتا مسئلہ ہے۔"

وہ خاموش ہوکر سوچ میں کھوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ پروفیسر صاحب کے لیے اس کی عقیدت اس "تلخ حقیقت" سے دست و گریباں ہے جو پچھلے چند ہفتوں میں اس کے سامنے آئی ہے۔

میں نے کہا "نوشین صاحبہ! مجھے ایک بات کی خوشی ہے۔ آپ نے اپنے دل کی سچائی کو عقیدت کی بھینٹ نہیں چڑھایا ہے۔ پروفیسر کو اپنا مسیحا ماننے کے باوجود آپ نے وہ بات بیان کی ہے' جو آپ کے دل میں کھٹک رہی تھی۔۔۔ اب میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا ذاتی خیال کیا ہے؟ اگر ارشاد احمد نے واقعی کسی قسم کا غیر قانونی کام کیا ہے تو کیا یہ صورتِ حال پروفیسر صاحب کے علم میں ہوگی؟"

نوشین نے اضطراب کے عالم میں اپنا سر دائیں بائیں ہلایا "میرا دل یہ بات کسی طور نہیں مانتا۔ پروفیسر صاحب کے بارے میں' میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر ان کے بھائی ارشاد احمد نے کوئی ایسا کام کیا بھی ہے تو وہ یقیناً پروفیسر صاحب کے علم میں نہیں ہوگا۔ پروفیسر صاحب اپنے کام سے

کام رکھنے والے شخص ہیں۔ انہیں اپنے مریضوں اور ان کے مسئلوں سے ہی فرصت نہیں۔ جو وقت بچتا ہے وہ اپنی فارمیسی میں صرف کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ذاتی دواخانے کی دوائیں ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک اتنا بڑا اور وقت طلب کام ہے کہ پروفیسر صاحب کو اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اور تو اور وہ اپنی بیٹی تک کو توجہ نہیں دے سکتے حالانکہ اس ایک بیٹی کے سوا ان کا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان کو اپنے بھائی کی مصروفیات کے بارے میں زیادہ معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ پروفیسر صاحب پر کوئی دباؤ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے بھائی کی طرف سے یا کسی اور طرف سے۔ کوئی بلیک میلنگ وغیرہ کا سلسلہ؟"

نوشین کچھ دیر سوچ میں گم رہ کر بولی "مجھے تو اس قسم کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کو کوئی کیوں بلیک میل کرے گا۔ بلیک میلنگ کی وجہ تو عموماً کسی کی کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ بلیک میلر اس کمزوری کو دھمکی بنا لیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب تو بطورِ انسان اتنے اچھے ہیں اور اتنی صاف ستھری زندگی گزار رہے ہیں کہ سب کچھ شیشے کی طرح صاف نظر آتا ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ صاف نظر آنے اور "صاف ہونے" میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر نوشین بولی "کل والے واقعات کے بعد سے ارشاد احمد صاحب روپوش ہیں۔ ان کی روپوشی کی وجہ سے میرے شبے کو تقویت مل رہی ہے اگر وہ بے گناہ تھے تو انہوں نے پولیس کا سامنا کیوں نہیں کیا۔"

"آپ کا ذاتی خیال ارشاد احمد صاحب کے بارے میں کیا ہے۔ کیا وہ بھی پروفیسر صاحب جیسا مزاج رکھتے ہیں یا کچھ مختلف ہیں؟"

نوشین بولی "پروفیسر صاحب اور ان کے بھائی کے مزاج میں نمایاں فرق ہے۔ میں زیادہ تو نہیں جانتی لیکن اتنا معلوم ہے کہ وہ طبیعت کے سخت ہیں۔ ان کی وائف ایک سال پہلے روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ صرف اپنی بیمار والدہ کے ساتھ تنہا مکان میں رہتے ہیں۔ کچھ رنگین مزاج بھی سمجھے جاتے ہیں۔ پچھلے برس جب ان کا ریکروٹنگ کا کام مندا تھا' پروفیسر صاحب بڑے بھائی کی حیثیت سے ان کی مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے' لیکن اس کے باوجود ارشاد صاحب کے کام میں انہوں نے کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ دلچسپی لی۔"

نوشین اور میں تادیر اس بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ نوشین کی دلی خواہش تھی کہ میں یہ ساری باتیں فی الحال اپنے تک محدود رکھوں اور ہو سکے تو اپنے ذرائع سے ارشاد احمد کے بارے میں ٹوہ لینے کی کوشش کروں۔ آخر میں اس نے پھر ملتجیانہ لہجے میں کہا "میں نہیں چاہتی کہ اس معاملے میں کسی بھی حوالے سے پروفیسر صاحب کا نام آئے۔ وہ پہلے ہی بڑے دکھی شخص ہیں۔ ان کو زخموں کی نہیں مرہم کی ضرورت ہے۔"

میں نے نوشین سے وعدہ کیا کہ میں اپنے طور پر ارشاد احمد صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور میں یہ کارروائی صرف اپنے تک محدود رکھوں گا۔ وہ میری بے حد مشکور نظر آنے لگی۔

عجب بات تھی کہ ایمبیسیڈر ہوٹل کے ہال میں بھی نوشین کو پہچان لیا گیا۔ تین چار نوجوان لڑکے جو صورتوں سے ہی اوباش نظر آتے تھے' نوشین کے اردگرد منڈلانے لگے۔ کبھی اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتے' کبھی کوئی گانا گنگنانے لگتے۔ میں اور نوشین اٹھ کر باہر پارکنگ میں آگئے۔ نوشین اپنی ٹویوٹا گاڑی پر آئی تھی۔ باوردی ڈرائیور دروازہ کھولے تیار کھڑا تھا۔ نوشین نے مجھے اپنے فون نمبرز دیے اور کہا کہ ہماری اگلی ملاقات اب اس کے گھر میں ہوگی۔

میں ہوٹل میں واپس پہنچا تو صفدر بے قرار سا ٹہل رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع یا خبر ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور مسکرا کر بولا "کافی دیر لگا دی آپ نے' کہیں کوئی فلمی کہانی سننے تو نہیں بیٹھ گئے تھے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم نرم لفظ استعمال کر رہے ہو' ورنہ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کہیں میں کوئی فلمی کہانی "بنانے" تو نہیں بیٹھ گیا تھا۔"

وہ بولا "آپ پر تو پورا اعتماد ہے جناب لیکن یہ فلمی پریاں بڑی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہیں۔ اچھے بھلے بندے کی مت مار دیتی ہیں۔"

"اب تو مت ماری ہی جائے تو بہتر ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں' یادِ ماضی عذاب ہے یارب' چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ نے غزالہ کی تلاش کے حوالے سے مایوس ہونا شروع کر دیا ہے۔"

"میں بھی انسان ہوں' پتھر تو نہیں۔ بے شک میں مایوس ہو رہا ہوں اور مایوس ہونا گناہ ہے۔ اس گناہ سے بچنے کے لیے سوچا ہے کہ اگر ایک چھوٹی سی پارٹ ٹائم محبت کر لی

جائے تو کیا مضائقہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

صفدر نے میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں یونہی بے پر کی اڑا رہا ہوں۔ ورنہ غزالہ کی یاد سے پیچھا چھڑا لینا میرے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا زندگی کی موجودگی میں سانسوں کی آمد و رفت سے یا دل کی دھڑکن سے پیچھا چھڑا لینا۔ فلم ایکٹریس نوشین بہت خوب صورت تھی لیکن اس جیسی درجنوں لڑکیوں کی خوب صورتی اور نسوانیت کو بھی یکجا کر لیا جاتا تو میرے لیے غزالہ کی ایک مسکراہٹ ان پر بھاری تھی لیکن وہ اپنی مسکراہٹ لے کر نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ ہمارے آس پاس ہونے کے باوجود ہم سے بہت دور تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ وہم ہونے لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر مجھ سے دور ہے۔ سب کچھ اس کے علم میں ہے پھر بھی وہ خود کو مجھ سے چھپاتی رہی ہے۔

صفدر نے مجھے میرے خیال سے چونکایا "آج کی ملاقات کا کیا نتیجہ رہا؟" اس نے پوچھا۔

"نوشین کے نزدیک پروفیسر اللہ دتا ایک بے قصور شخص ہے۔ اگر اس کا کوئی قصور ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ ارشاد احمد کا بڑا بھائی ہے لیکن میں نوشین سے متفق نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ پروفیسر کی بہت سی خامیوں کو نظرانداز کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پروفیسر کا اپنے بھائی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن کچھ ایسے شواہد بھی ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر اپنے عقیدت مندوں کو مختلف مسائل کے حل کے لیے اپنے بھائی ارشاد احمد کی طرف بھیجتا تھا۔ ان میں ایک اہم مسئلہ بیرون ملک جانے کا بھی ہوتا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس اندھے اعتماد کا فائدہ اٹھا رہا تھا جو لوگ اس پر کرتے تھے۔ خاص طور سے عورتیں اور لڑکیاں پروفیسر پر بے حد بھروسا رکھتی تھیں' عین ممکن ہے کہ اسی بھروسے کے سبب بہت سی لڑکیاں اور عورتیں ارشاد احمد کے جال میں جا پھنستی ہوں۔"

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ایسا شخص زیادہ دیر اپنی نیک نامی برقرار نہیں رکھ سکتا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں اور میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ ہر طبقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو پروفیسر کو بے حد عزت و احترام دیتے ہیں' اور اب یہی لوگ پولیس اور پروفیسر کے درمیان دیوار بنے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "عوام الناس میں توہم پرستوں اور کمزور عقیدے والوں کی کمی نہیں۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پروفیسر اور اس کے بھائی نے اپنی کارستانیوں کا سلسلہ حال ہی میں

کشمیر کے سُلگتے موضوع
پر
علیم الحق حقی کی ناقابلِ فراموش
لہو رنگ تحریر
طوفان کے بعد
قیمت :- /۱۵۰ روپے
بھارت کی سرزمین پر جنم لینے والے ایک طوفان کی رگوں میں لہو کی گردش تیز کرنے والی سنسنی خیز کہانی۔
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

شروع کیا ہو۔ جس طرح بڑے جہازوں کو ڈوبتے ہوئے کچھ دیر لگتی ہے' ایسے ہی بہت مشہور لوگوں کی شہرت کا خاتمہ ہوتے کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

صفدر نے سگریٹ سلگایا اور دبے دبے جوش سے کہا "ایک تحفہ ہے آپ کے لیے۔"

"کیسا تحفہ؟"

"ابھی دیکھ لیجیے گا۔" وہ باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ باتھ روم کے اندر کوئی گنگنا رہا ہے۔ پھر باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ گنگنانے کی آواز واضح ہوگئی "تمہی ہو محبوب میرے۔ ام کیوں نہ تمہیں پیار کرے۔"

پھر دروازہ کھلا اور زریں گل بڑی بے نیازی سے اپنی شلوار کے بل درست کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے گانے کو بریک لگ گئے۔ چہرے پر خوشی کی سرخی لہرائی اور وہ لپک کر مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔

میں نے حیران ہو کر صفدر سے پوچھا "بھئی! یہ خانِ اعظم کہاں سے ٹپک پڑا۔"

صفدر بولا "ٹپکا تو یہ آج سے اٹھائیس تیس سال پہلے تھا' اب تو یہ احمقوں کے فرقے کا ایک جانا پہچانا شخص ہے۔ یہ حضرت آج شام گلستان سینما سے فلم "پردے میں رہنے دو" دیکھ کر نکلے تھے اور عین لکشمی چوک میں سڑک کے کنارے لکڑی کی چوکی پر بیٹھے نان حلیم کھا رہے تھے۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا اتفاقاً میری نگاہ پڑ گئی بس پکڑ کر ادھر لے آیا۔"

"تو کیوں لے آئے یہاں؟"

"آپ نے ایک بالکل بے موقع سوال کیا ہے۔" صفدر نے کہا "آپ کو یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ خان ابن خان محترم زریں گل صاحب' جو اکثر ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے' فرشِ خاک پر بیٹھ کر نان حلیم کیوں تناول کر رہے تھے۔"

"کیوں بھئی' کیوں تناول کر رہے تھے؟" میں نے زریں سے پوچھا۔

زریں بولا "استاد صیب! آپ جانتے نہیں صیدر صیب حسبِ عادت بات کو ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ وہ کوئی ایسا گیا گزرا ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اچھے خاصے لکڑی کے بینچ رکھے ہوئے تھے' کھانا بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھا اور سب سے بڑا بات یہ ہے کہ ام کو وہاں کھانا اچھا لگ رہا تھا۔ ام کئی سال پہلے جب لاہور میں تھا اور لکڑی کے ٹال پر کام کرتا تھا تو اکثر اس ہوٹل میں کھانا مرحمت فرماتا تھا۔"

"شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ نوش فرماتا تھا۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں بالکل یہی بات۔ اس ہوٹل سے امارا بہت یادیں۔۔۔"

"اوئے خدا کا خوف کرو۔" صفدر نے زریں کی بات کاٹتے ہوئے اس کی گردن پر دوہتڑ مارا "تم اسے ہوٹل کہہ رہے ہو۔ اس کے سامنے تو بھٹیار خانہ بھی فائیو اسٹار ہوٹل دکھائی دیتا ہے۔۔۔"

زریں نے ذرا زچ ہو کر کہا "اچھا صیدر صیب! ام مانتا ہے کہ ام نے ایک سستی جگہ پر کھانا کھایا تھا۔۔۔ تو اب ام میں ایسا کون سا قیامت برپا ہوگیا۔ کچھ دن پہلے آپ دونوں نے بھی تو جین مندر کے قریب سڑک کے کنارے لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھ کر دال چاول مرحمت فرمایا تھا۔۔۔ امارا مطلب ہے کہ نوش فرمایا تھا۔"

زریں گل نے بات تو ٹھیک کہی تھی لیکن صفدر بھی کہاں چوکنے والا تھا' فوراً بولا "وہ اور بات تھی۔ ہم نے وہاں دال چاول فیشن کے طور پر مرحمت فرمائے تھے' لیکن تم آج کل تنوروں اور بھٹیار خانوں پر تین تین روپے میں کھانا کھا رہے ہو' وہ اس لیے کہ تمہارا ہاتھ آج کل تنگ ہے۔ ایک آنے پائی کو دانتوں سے پکڑ رہے ہو' اور اپنی اس حالت کو دوستوں سے چھپا رہے ہو۔ اگر ہمیں اتنا ہی غیر سمجھتے ہو تو پھر لعنت ہے تم پر اور تمہاری سوچ پر۔۔۔ کیا اتنے طویل عرصے کے ساتھ کے بعد اتنا بھی حق نہیں ہے ایک دوسرے پر ہمارا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی کھڑکی سے نیچے پھینک کر پٹاخا دوں تمہارا۔۔۔ لیکن پھر پیاری سی بہن گل نوم کا خیال آتا ہے کہ وہ بیوہ ہو جائے گی۔"

زریں گل نے ہنستے ہوئے کہا "ام آپ کے جذبات کی قدر فرماتا ہے لیکن امارا ہاتھ اتنا بھی تنگ نہیں ہے جتنا آپ غصہ فرما رہا ہے۔ تھوڑا بہت تنگی ترشی تو آتا ہی رہتا ہے۔ رنگیلا صیب کا گانا نہیں سنا آپ نے۔ کبھی ہے غم اور کبھی خوشی کبھی سر اسر فاقہ مستی ہے۔ بتا اے دنیا والے یہ کیا تو بستی ہے۔" پھر زریں نے مسکراتے ہوئے اپنے ہونٹ میں نسوار کی چٹکی رکھی اور مزاحیہ انداز میں بولا "ویسے بھی اب امارا دن پھرنے ہی والا ہے صیدر صیب۔۔۔ دفینہ مل گیا تو کس نے پاکستان میں رہنا ہے اور کس نے لکشمی چوک کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر نان حلیم کھانا ہے پھر تو ہم ہوگا اور پیرس لاہور نیویارک کا فرنگی لوگ ہوگا۔ ام نے تو ارادہ کر رکھا ہے کہ غریب فرنگیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو بھیک دے گا اور ان کا

الٹو نی خاک میں ملا کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کرے گا۔"

زریں گل جانتا نہیں تھا کہ جو بات وہ ہنسی ہنسی میں کر رہا ہے' وہ حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔ وہ عن قریب ایک بہت بڑے اثاثے کا بلا شرکتِ غیرے مالک بننے والا ہے۔ وہ واقعی پیرس اور نیویارک جا سکتا ہے اور وہاں گلیوں میں پھرنے والے بھک منگوں کو خیرات دے کر ثواب دارین حاصل کر سکتا ہے۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "خیر چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنے چچا زاد رستم خاں کے اڈے سے اڑنے کے بعد کس چھتری پر جا کر بیٹھے ہو۔"

"شاید آپ یہ پوچھ رہا ہے کہ ام کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "ام رستم خاں کے گھر سے زیادہ دور نہیں گیا۔ دراصل ام اس ڈاکٹر سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا' جس سے کلثوم اپنا چیپ اک (چیک اپ) کراتا ہے۔ وہیں گلشن روڈ پر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا لے رکھا ہے ام نے آپ کی طرح۔"

صفدر بولا "ویسے شاہ جہاں صاحب! مذاق تو مذاق رہا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ زریں گل کا یہاں پہنچنا ہمارے لیے بڑا سود مند ثابت ہوا ہے۔ اس نے یہاں آتے ہی ایک اتنی شان دار تجویز پیش کی ہے اور اس تجویز کا اتنا اچھا نتیجہ نکلا ہے کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔"

"کیا پہیلیاں بجھوانے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں پہیلی ہی سمجھیں۔۔۔ اور پہیلی یہ ہے کہ ہم دونوں ابھی تھوڑی دیر پہلے پرانی انارکلی میں تھے۔۔۔ اور وہاں ایک ایسے حکیم صاحب سے گفتگو فرما رہے تھے جو پرانی انارکلی اور اردگرد کے علاقے میں سب سے پرانے معالج مانے جاتے ہیں۔ چند برس پہلے جب ابھی پروفیسر اللہ دتا صاحب نے اس علاقے میں قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا' حکیم صاحب کا کام بہت زوروں پر تھا۔ یعنی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ بہ الفاظِ دیگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم قبلہ اللہ دتا صاحب کے ایک کاروباری رقیب سے مل کر آ رہے ہیں۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔"

"اور یہ امارا آئیڈیا ہے جناب۔۔۔ دراصل ام کو اس کا تجربہ کئی سال پہلے پشاور میں ہوا تھا جب ام وہاں تکا کباب لگاتا تھا۔ جس بازار میں ام نے تکا کباب لگانا شروع کیا وہاں پاس ہی پاک باز خاں کا دکان تھا۔ وہ بھی تکا کباب لگاتا تھا اور امارا بڑا پکا دوست تھا۔ لیکن جب ام نے تکا کباب لگایا اور خدا تعالیٰ کے کرم سے امارا کام چلنا شروع ہوا تو پاک باز خاں کا آنکھیں بدلنے لگا' جوں جوں امارا کام چلتا گیا وہ خدائی خوار ام سے دور ہوتا گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچا کہ اس نے ام پر الزام لگا دیا کہ ام اپنے کبابوں میں بھنگ کا نشہ ملاتا ہے اور لوگوں کو نشے پر لگا رہا ہے۔ اگلے روز ہمارے اڈے پر چھاپا پڑا اور پولیس والا ام کو گوشت سمیت اٹھا کر لے گیا۔ خیر امارا کیا بگڑنا تھا۔ امارا دامن چاندنی کے مافق صاف تھا۔ ام چھوٹ کر واپس آگیا اور ساتھ میں امارا فائدہ بھی ہوگیا۔"

"فائدہ کیسے ہوگیا؟" صفدر نے پوچھا۔

"فائدہ یہ ہوگیا صیدر صیب کہ آہستہ آہستہ امارا کام اور زیادہ چلنا شروع ہوگیا۔ کچھ لوگ تو امارے پاس اس لیے آتا تھا کہ انہیں امارا کباب مزے دار لگتا تھا۔۔۔ کچھ لوگ امارے پاس اس لیے آنے لگا کہ وہ بھنگ والے کباب کھانا چاہتا تھا۔ ام بھنگ ونگ تو ملاتا نہیں تھا لیکن نہ انکار کرتا تھا اور نہ اقرار۔۔۔ جو صرف کباب کھانا چاہتا تھا ان کو بھی مزہ آتا تھا' جو بھنگ والے کباب کھانا چاہتا تھا ان کو بھی مزہ آتا تھا۔ بلکہ ام نے کئی شوقین لوگوں کو تو کباب کھانے کے بعد باقاعدہ نشے میں جھومتے ہوئے بھی دیکھا۔ کوئی لنک لنک کر گانے لگتا۔ کوئی ڈگمگاتا ہوا اٹھ کر چلا جاتا حالانکہ ام خدا کا قسم کھا سکتا ہے کہ ام نے کبھی بھنگ کا ایک پتی بھی قیمے میں نہیں ملایا۔"

صفدر نے کہا "تمہاری باقی بات تو سمجھ میں آتی ہے' لیکن۔۔۔ بغیر بھنگ کے کسی کو نشہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

زریں بولا "صیدر صیب! آپ یہ کیوں بھول رہا ہے کہ کباب کھانے والا بھی امارا پٹھان بھائی ہی تھا۔ ان کو بغیر وجہ کے بھی سرور آنے لگتا تھا۔"

میں نے کہا "اوئے زریں کے بچے! بات کہاں کی تھی اور تم کہاں لے گئے ہو۔ وہ حکیم صاحب کیا کہہ رہے ہیں جن سے مل کر آئے ہو؟"

صفدر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "حکیم صاحب کا نام محمد ادریس انبالوی ہے۔ انہوں نے پروفیسر اللہ دتا کے بارے میں کئی اہم انکشافات باقاعدہ ثبوتوں کے ساتھ کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ارشاد احمد جو بھی دھندا کرتا ہے اس میں پروفیسر اللہ دتا برابر کا شریک ہے۔ اس نے صرف اپنے ہاتھ پاؤں بچانے کے لیے خود کو بھائی کے کام سے لاتعلق ظاہر کیا ہوا ہے۔ اگر تھوڑا سا کھوج لگایا جائے تو صاف صاف پتا چل جائے گا کہ اللہ دتا کا کلینک درحقیقت ارشاد احمد کے شکار کے لیے جال کا کام دیتا ہے۔ کلینک میں عورتیں اور لڑکیاں کثرت سے آتی ہیں۔ یہ خواتین اللہ دتا پر اندھا دھند

اعتماد بھی کرتی ہیں۔ اللہ دتا ان میں سے اپنے مطلب کی خواتین ڈھونڈ لیتا ہے اور انہیں کسی نہ کسی طرح ارشاد احمد کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اپنے مسئلوں کے حل کے لیے ارشاد احمد سے ملتی جلتی رہتی ہیں۔ آخر اس کے دام میں پھنس جاتی ہیں۔ ارشاد احمد ان خواتین کے کسی قریبی عزیز، بھائی یا بیٹے وغیرہ کو باہر بھجوانے کا جھانسا دیتا ہے یا ان خواتین کو ہی بیرون ملک جانے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ خاص طور سے مڈل ایسٹ میں اس نے کافی لوگ بھجوائے ہیں۔ سنا ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر مصیبت میں ہیں، ان کے سفری کاغذات آجروں کے قبضے میں ہیں اور وہ بہت کم معاوضے پر سخت محنت کرنے پر مجبور ہیں۔ بعض لوگ لاپتا بھی ہوگئے ہیں۔ یوں تو ارشاد احمد ڈیڑھ دو سال سے یہ کام کررہا ہے مگر پچھلے آٹھ دس ماہ میں اس نے کھل کھلا کر کام کیا ہے اور بیسیوں لوگوں کو مڈل ایسٹ اور یورپ امریکا میں بھیجا ہے۔ چونکہ پروفیسر اللہ دتا کی ساکھ ہے اس لیے لوگ اس کے بھائی پر بھی فوراً بھروسا کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی۔ پروفیسر کا علاج معالجے کا کام بھی کافی وسیع ہے۔ اس کی اپنی فارمیسی ہے جس میں تیار ہونے والی دوائیں نہ صرف اس کے اپنے کلینک میں بے تحاشا استعمال ہوتی ہیں بلکہ مارکیٹ میں بھی فروخت ہوتی ہیں۔ لوگوں کے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر کے ہاتھ میں شفا بھی ہے، اگر یہ سب کچھ ہے، اور اپنے روشن حال کی طرح پروفیسر کو اپنا مستقبل بھی روشن تر نظر آرہا ہے تو پھر اسے بردہ فروشی جیسے گھناؤنے کام میں اپنے ہاتھ گندے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"دولت کی ہوس۔۔۔ اور کیا۔" صفدر نے جواب دیا۔

"مجھے یہ معاملہ بہت الجھا ہوا نظر آتا ہے۔"

"جتنا الجھا ہوا ہے، اتنا ہی گمبھیر بھی ہے۔ اب یہی دیکھیے، حکیم محمد ادریس کے پاس سے یہ خط ملا ہے۔ یہ خط چند ماہ پہلے پروفیسر کے بھائی ارشاد احمد نے ملتان کی ایک خاتون کو لکھا تھا۔ یہ جواں سال خوب رو خاتون پچھلے دنوں اپنی کسی تکلیف کے سلسلے میں حکیم محمد ادریس سے ملی تو اس نے شکوے شکایات کے دفتر کے ساتھ ساتھ یہ خط بھی حکیم صاحب کو دکھایا۔"

یہ خط کی فوٹو اسٹیٹ تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا، ارشاد احمد نے اپنے ہاتھ سے یہ تحریر لکھی تھی۔ خاتون کو مسز چوہدری کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ ارشاد نے لکھا تھا۔

"مسز چوہدری! آپ کا خط ملا احوال سے آگاہی ہوئی۔ میں نے آپ کے بچے کے سلسلے میں بھائی اللہ دتا صاحب سے خود بھی بات کی ہے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ بچے کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے اور پاکستان میں اس کے علاج کی کوئی امید نہیں۔ میری بہن! آپ جانتی ہی ہیں کہ بیرون ملک علاج کی قدر مہنگا اور دشوار ہے۔ ایک دن میں ہزاروں روپیہ خرچ ہوجاتا ہے۔ سفر اور ویزے وغیرہ کے اخراجات الگ ہیں۔ بہرحال بڑے بھائی صاحب کا حکم ٹالنا بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ میں انشاء اللہ اپنی بساط سے بڑھ کر آپ کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔

"بھائی صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کے شوہر حیات نہیں ہیں۔ کوئی بھائی یا دیور وغیرہ بھی نہیں جو ساتھ جاسکے، لامحالہ آپ کو خود ہی بیٹے کے ساتھ جانا پڑے گا۔ اس کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیں۔ کسی بھی سوموار یا جمعرات کے روز لاہور تشریف لے آئیں۔ نکاح نامہ، شناختی کارڈ اور پراپرٹی کی ایک دو رجسٹریاں بھی ہمراہ لے آئیں۔ فوری طور پر ڈیڑھ دو لاکھ کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد دو تین ماہ میں کم از کم اتنے ہی اور درکار ہوں گے۔ جس وقت انتظام ہوجائے آپ لاہور تشریف لے آئیں۔ میں آپ کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ فی الحال بچے کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی اور بات دریافت کرنی ہو تو میں نیچے لکھا فون نمبر درج کررہا ہوں۔"

میں مکمل خط پڑھ چکا تو صفدر نے کہا "یہ بدقسمت بچہ ایک ماہ بعد ہی فوت ہوگیا تھا، تاہم اس سے پہلے ارشاد احمد دکھیاری ماتا سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد وصول کرچکا تھا۔ ان واقعات کو چار پانچ ماہ گزر چکے ہیں۔ مذکورہ خاتون کئی مرتبہ ارشاد احمد سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرچکی ہے لیکن وہ پہلے ٹال مٹول سے کام لیتا رہا ہے، اب صاف انکاری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رقم اسپتال کے پیشگی اخراجات اور ویزے وغیرہ کے چکر میں لگ گئی ہے۔

"حکیم ادریس صاحب کا کہنا ہے کہ ارشاد احمد اور اس کے پروفیسر بھائی نے شروع سے آخر تک فراڈ کیا ہے۔ حکیم صاحب نے بھی وہ بچہ دیکھا تھا۔ اس کی حالت علاج کے قابل تھی ہی نہیں۔ کوئی بھی معالج اسے ایک نظر دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ علاج کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ ارشاد احمد نے اس بچے کے بیرون ملک علاج کے لیے ٹوٹل ڈھائی تین لاکھ روپیہ طلب کیا تھا۔ اس سے بھی اس کی بدنیتی واضح ہوجاتی ہے۔ ایسے سفر اور علاج کے لیے چودہ پندرہ لاکھ روپے کی رقم بھی تھوڑی سمجھی جاتی ہے۔ ارشاد احمد مجبور عورت سے

صرف رقم اینٹھنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی ارشاد احمد کا کوئی پروگرام ہو۔ بچے کی ماں خوب صورت اور جوان تھی۔ وطن سے ہزاروں میل دور اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ فلم ایکٹریس نوشین کے چچازاد کی طرح وہ بھی دیارِ غیر میں عدم پتا ہوسکتی تھی۔"

پھر صفدر نے مجھے اخبار کا ایک تراشہ دکھایا۔ یہ تراشہ بھی اسے حکیم محمد ادریس ابنالوی کے پاس سے ملا تھا۔ اس تراشے میں چار پانچ ماہ پرانی ایک خبر تھی۔ اس خبر میں درج تھا "کل صبح منہ اندھیرے ایک نوجوان دوشیزہ مسلم ٹاؤن روڈ پر ایک تیز رفتار مزدا لوڈر کے نیچے آکر کچلی گئی اور موقع پر ہی دم توڑ گئی۔۔۔ لوڈر کا ڈرائیور لوڈر بھگالے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ تفصیل کے مطابق، آج علی الصباح چار بجے کے قریب ایک لڑکی اسٹریٹ نمبر اٹھارہ کی طرف سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے جسم کے صرف بالائی حصے پر لباس تھا۔ وہ حواس باختہ تھی اور چیخ رہی تھی۔ چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس نے خود کو چھڑا کر سڑک پار کرنے کی کوشش کی اسی اثنا میں مزدا لوڈر اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ بعد ازاں ہونے والی تفتیش سے پتا چلا کہ لڑکی گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں کی رہنے والی ہے اور علاج کرانے کے لیے لاہور آئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ تین چار دن سے داتا دربار میں مقیم تھی۔ متوفیہ کی والدہ کے پاس سے پروفیسر اللہ دتا صاحب کے کلینک، واقع انارکلی کی پرچی برآمد ہوئی ہے جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ وہ پروفیسر کے زیرِ علاج تھی۔ اس بات کی تصدیق کے بعد پولیس کا دھیان اس طرف چلا گیا کہ کہیں یہ نیم برہنہ لڑکی ارشاد احمد کی کوٹھی سے ہی نہ نکلی ہو۔ ارشاد احمد کی کوٹھی مسلم ٹاؤن روڈ کی اسٹریٹ نمبر گیارہ میں ہی واقع ہے۔ پولیس پوچھ گچھ کے لیے ارشاد احمد کے گھر پہنچ گئی۔ اسی دوران میں فونوں کی گھنٹیاں کھڑکنے لگیں اور درجنوں سفارشیں پہنچ گئیں کہ پروفیسر کے بھائی صاحب کو شاملِ تفتیش نہ کیا جائے۔"

صفدر اور زریں گل جو کچھ بتا رہے تھے۔۔۔ اور دکھا رہے تھے اس سے یہ شک پختہ ہورہا تھا کہ پروفیسر کے حوالے سے بھی دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ بے شک وہ ہر دل عزیز تھا اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر ہر دل عزیز ہونا اور عزت کی نظر سے دیکھا جانا اس بات کی گارنٹی نہیں ہوتا کہ ایک شخص واقعی اُجلے کردار کا مالک بھی ہے۔ ہم حکیم محمد ادریس کے بیانات پر کاروباری رقابت کا لیبل لگا سکتے تھے اور یہ کہہ سکتے تھے کہ اس نے بات کو اچھالنے کی کوشش کی ہے، لیکن جو کچھ ٹھوس ثبوتوں کی شکل میں تھا اس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے صفدر اور زریں گل کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ ہم پروفیسر اللہ دتا کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کریں گے۔

اب میرے پاس دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ رات کے کسی پہر زبردستی پروفیسر کی رہائش گاہ میں گھسا جاتا اور گن پوائنٹ پر اسے سب کچھ صاف صاف بتانے پر آمادہ کیا جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ فلم اسٹار نوشین کے ذریعے پروفیسر سے رابطہ کیا جاتا اور نسبتاً پُرامن ماحول میں بیٹھ کر پروفیسر کے مسائل سنے جاتے اور اپنے سنائے جاتے۔ صفدر اور زریں سے مشورے کے بعد مجھے دوسرا طریقہ زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ ویسے بھی میں نوشین سے وعدہ کرچکا تھا کہ اس کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے پروفیسر پر کوئی "آفت" نہیں آئے گی، لہٰذا بہتر تھا کہ پروفیسر کا "انٹرویو" نوشین کی رضامندی اور وساطت سے ہوتا۔ میں نے اسی وقت نوشین سے فون پر بات کی۔ وہ اپنے گھر میں تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں پروفیسر سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم پریشانی کے اس دور میں پروفیسر کی کوئی مدد کرسکیں۔۔۔ اور اگر میرے خدشے کے مطابق وہ واقعی کسی دباؤ میں ہیں تو انہیں اس دباؤ سے نکالا جاسکے۔

نوشین رضامند ہوگئی۔ اس نے کہا "میں ابھی یا کل صبح پروفیسر صاحب سے فون پر رابطہ کرلیتی ہوں پھر ان سے جو بھی وقت ملا وہ فون پر آپ کو بتادوں گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میں علی الصباح آپ کو فون کرلوں گا۔ آپ کی "علی الصباح" کتنے بجے ہوتی ہے؟"

وہ ہنسی اور ادا سے بولی "ساڑھے دس بجے۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے کہا "ٹھیک ہے میں فون کرلوں گا۔"

وہ بولی "یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ مجھے اپنا فون نمبر نہیں دیں گے۔ کہیں آپ واقعی کوئی پرائیویٹ جاسوس قسم کی چیز تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی سیکرٹ ایجنٹ۔۔۔ زیرو زیرو سیون، ڈی سینٹ، شرلاک ہومز، کولمبس۔۔۔ وغیرہ۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو صرف پولیس کا "انفارمر" ہوں۔ آپ کسی فلم میں چانس وغیرہ دلا دیں تو شاید کچھ کر گزروں۔"

وہ ہنسی تو گھنٹیاں سی بجنے لگیں "طمانچے کا اتنا سخت انتقام لے رہے ہیں آپ؟" تھوڑی دیر تک خود ہی ہنستی رہی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "خیر یہ تو ایک مذاق تھا۔۔۔ اگر آپ

فلموں میں آنا چاہیں تو واقعی آسکتے ہیں۔ آج کل تو لمبے قد والوں کی بہت کمی ہے انڈسٹری میں۔"

میں نے کہا "اگر فلموں میں قد کو ناپ کر داخلہ ملتا ہے تو پھر ہمارے کمرے کا ویٹر آپ لوگوں کو زیادہ سوٹ کرے گا اور آپ کی انڈسٹری میں دُھومیں مچادے گا۔"

کچھ دیر ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

اگلے روز ساڑھے دس بجے میں نے فون کیا تو نوشین کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پروفیسر صاحب ملاقات پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ انہوں نے دوپہر دو بجے کا وقت دیا ہے۔

"کہاں ملیں گے؟"

"اپنے گھر میں۔۔۔ وہ ان کے آرام کا وقت ہوتا ہے' ہمارے لیے خود کو بے آرام کررہے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے کہ یہ تھوڑی سی بے آرامی ان کے لیے زیادہ آرام کا سبب بن جائے۔ بہرحال مجھے بتادیں کہ کتنے بجے مجھے کہاں آنا ہے؟"

وہ بولی "ایورنیو اسٹوڈیو میں آج میری شوٹنگ ہے۔ آپ ایک بجے تک ایورنیو اسٹوڈیو ہی پہنچ جائیں' وہاں سے میری گاڑی میں پروفیسر صاحب کی طرف نکل جائیں گے۔"

"لیکن مجھے اسٹوڈیو میں گھسنے کون دے گا؟"

"آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ ہنسی "میں چوکی دار کو چٹ پہنچا دوں گی۔ اگر وہ روکے تو آپ صرف اپنا نام بتا دیجئے گا۔ دوسرا فلور ہے۔ شہزاد پروڈکشن کی فلم ہے۔"

زریں گل میرے پاس ہی کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے گفتگو ختم کی تو اس نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ کون بات کررہا تھا؟ کس فلم کی شوٹنگ ہورہی ہے؟ یہ نوشین فلم اسٹار خود بول رہی تھی یا اس کی کوئی سیکریٹری وغیرہ تھی؟ میں نے ان سوالوں کے جواب دیے لیکن زریں کی بے تابی برقرار رہی۔ وہ فلموں کا عاشق تھا۔ اور اس عشق کے سبب اسے فلم اسٹوڈیو' شوٹنگ اور فلم اسٹاروں کی دید سے بھی عشق تھا۔ یہ علم ہونے کے بعد کہ میں دوپہر کو ایورنیو اسٹوڈیو جارہا ہوں' جہاں نوشین شوٹنگ کررہی ہے' وہ کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگا "ام آپ کے ساتھ جائے گا جناب!" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بھئی! میں وہاں کام سے جارہا ہوں۔ نوشین کو لے کر پروفیسر صاحب سے ملنے جانا ہے۔"

"خود تو آپ چلے جائیے گا پروفیسر سے ملنے۔ ام وہاں اسٹوڈیو میں گھومے پھرے گا۔ جب آپ نوشین صاحبہ کو واپس اسٹوڈیو چھوڑنے آئے گا تو ام آپ کے ساتھ واپس ہوٹل آجائے گا۔"

میں نے کوشش کی کہ زریں گل کو ساتھ نہ لے جانا پڑے مگر وہ اڑیل ٹٹو کی طرح اڑا رہا۔

صفدر کو ضروری ہدایات دے کر میں اور زریں گل بارہ بجے ہوٹل سے روانہ ہوئے اور بذریعہ ٹیکسی اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ ہم ذرا جلدی ہی پہنچ گئے تھے' یعنی ابھی صرف ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی زریں کے چہرے پر خوشی سے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ پاگل یوں محسوس ہوا جیسے مچھلی خشکی سے پھسل کر پانی میں آگئی ہے۔ راستے میں ایک دو جگہ جانے پہچانے فلمی چہرے نظر آئے' زریں گل نے باقاعدہ آگے بڑھ کر اور ادب سے جھک کر مصافحہ کیا اور ان کا حال احوال پوچھا (حالانکہ وہ بے چارے ثانوی قسم کے اداکار تھے) ایک راہداری میں زریں کی نظر معروف اداکارہ نغمہ پر پڑگئی۔ وہ ایک بار پھر خوشی سے کبوتر کی طرح پھڑکنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر خوش شکل اداکارہ سے مصافحہ کرے بلکہ بڑے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اسے گلے بھی لگالے۔ معروف اداکارہ کے اردگرد خطرناک صورت ملازم موجود تھے۔ اگر زریں گل اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے پر اُتر آتا تو یقیناً اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچانا پڑتا' نگاہوں نگاہوں میں نغمہ صاحبہ کی قدم بوسی کرکے زریں گل میرے ساتھ آگے بڑھا اور فلور نمبر ۲ میں داخل ہوگیا۔ یہاں خواب کا سیٹ لگا ہوا تھا اور کورس فلم بند ہورہا تھا۔ خواب کے اس سیٹ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری فلموں کے ہیروز اور ہیروئنیں پچھلے بیس تیس سال سے بڑے اتفاق کے ساتھ ایک ہی قسم کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ طویل سیڑھیاں تھیں جو اوپر جاکر کہیں بادلوں میں گم ہوگئی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر رُوئی کے سفید سفید گالے پڑے تھے۔ سیٹ پر پہلی یا دوسری تاریخ کا بہت بڑا چاند بنایا گیا تھا۔ اس چاند کے اردگرد نیلے آسمان پر بے شمار تارے ٹمٹما رہے تھے۔ نیچے ایک فوارہ تھا جس میں سے رنگ دار پانی نکلتا تھا۔ فوارے کے اردگرد بہت سے پھول پودے تھے۔ بارش میں بھیگی ہوئی لڑکیوں کی ایک لمبی قطار ان پودوں کے درمیان جذبات انگیز انداز میں کولھے مٹکا رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو زریں گل یقیناً اس معیوب منظر اور عاقبت نا اندیش لڑکیوں کو برا بھلا کہتا لیکن اس وقت تو وہ اتنا خوش تھا کہ اسے "نیک و بد" کی پہچان یاد نہیں تھی۔

نوشین سیٹ پر موجود تھی۔ اس نے ہمیں فلور میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا' وہ سیدھی ہماری طرف آئی اور خوش دلی سے ہمارا استقبال کرنے کے بعد ہمیں فلم کے ہدایت کار اور فوٹوگرافر وغیرہ کے پاس لے آئی۔ یہ لوگ روشنیوں سے ہٹ کر ایک جانب کرسیوں پر بیٹھے تھے اور گپ شپ کررہے تھے۔ زریں گل ان لوگوں میں بیٹھ کر بہت فخر محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا سینہ لقے کبوتر کی طرح پھول گیا۔ جب میں نے اس کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ زریں صاحب اپنی سادگی سے قطع نظر ایک نہایت مالدار شخص ہیں اور فلم پروڈیوس کرنے کا سوچ رہے ہیں تو زریں کا سیوں خون بڑھ گیا اور گردن اسیل مرغ کی طرح اکڑ گئی۔۔۔ اور میں نے کوئی اتنا بڑا جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ زریں ایک مال دار شخص بن چکا تھا یہ اور بات ہے کہ ابھی اسے خبر نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ مالدار ہونے کے بعد وہ فلم بھی بنا سکتا تھا اور ایک فلم کیا درجنوں بنا سکتا تھا۔

کورس میں نوشین کا کام ختم ہوچکا تھا۔ وہ قریباً فارغ ہی تھی لیکن اس کا سیکریٹری گاڑی لے کر گھر گیا ہوا تھا کیونکہ وہ اگلی شوٹنگ میں استعمال ہونے والا لباس گھر ہی بھول آئی تھی۔ اب سیکریٹری کے واپس آنے تک ہمیں وہیں بیٹھنا تھا۔۔۔ زریں گل تھوڑی دیر تو دبا دبا رہا پھر اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔۔۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فلم کے ہدایت کار صاحب بھی خیر سے پشتو داں پٹھان نکل آئے تھے۔ وہ اس سے پہلے پشتو فلمیں بناتے رہے تھے' یہ ان کی دوسری اردو فلم تھی' ان کا نام بہار خان تھا۔ زریں گل ان سے پشتو آمیز اردو میں باتیں کرکے بہت خوش ہورہا تھا۔ میرے مالدار ساتھی کا کردار نبھاتے ہوئے اس نے ہدایت کار کو باقاعدہ مشورے دینے شروع کردیے۔ "بہار خان صاحب! چھوٹا منہ بڑی بات ہے' ام فلم وغیرہ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن یہ بات بہت دفعہ امارے دل میں آتا ہے کہ ام کو اب عام ڈگر سے ہٹ کر فلم بنانا چاہیے۔ نیا نیا کہانی ہو۔ نیا نیا سوچ ہو۔ اب ضروری نہیں کہ ہر فلم کے آخر میں شادی ہو۔ شادی فلم کے شروع میں بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ ہر فلم کے اینڈ میں سائڈ ہیرو مرجائے۔"

"بے شک" میں نے تائید کی "سائڈ ہیرو فلم کے شروع میں بھی مرسکتا ہے بلکہ شروع ہونے سے پہلے بھی مرسکتا ہے۔"

ہدایت کار خان صاحب اور ہیروئن نوشین دونوں مسکرانے لگے مگر زریں اپنی دُھن میں مسلسل بولتا چلا جارہا تھا۔ اس نے ہدایت کار کو مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ لوگ پرانے کرداروں پر فلمیں بناتا ہے' آپ کو نئے کرداروں پر بھی بنانا چاہیے۔"

"نئے کرداروں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" ہدایت کار بہار خان نے پوچھا۔

زریں نے ڈبیا سے نسوار کا چونڈا نکال کر ہونٹ میں رکھا۔ پھر ایک شریر نگاہ مجھ پر ڈال کر بولا "پاکستان میں بھی بڑے بڑے کردار ہیں۔ اس وقت امارے ذہن میں نہیں آرہا۔ آپ بشیر ساربان پر فلم بنائیں' مجنّی کنور پر بنائیں' سیٹھ عابد پر بنائیں' بھولو پہلوان پر بنائیں۔۔۔ اور پھر شکر شکرا اور شاہ جہاں پر بنائیں۔ شاہ جہاں کو جانتے ہیں نا آپ۔۔۔ استاد جہانی۔"

"ہاں کافی بدنام نام ہے۔" ہدایت کار خان نے کہا۔

"بدنام بھی اور نیک نام بھی۔" زریں گل نے کہا "آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا جس کی وجہ سے شاہ جہاں کو جرم کی دنیا میں کودنا پڑا۔"

ہدایت کار خان مسکرایا "بھئی' اس قسم کا ایک واقعہ تو ہر چھوٹے بڑے مجرم کے ساتھ نتھی ہوتا ہے۔"

"خوچے۔۔۔ لیکن یہ واقعہ تھوڑا سا مختلف ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے بھی کچھ سنا تو ہوا ہے۔" نوشین نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "شاید امارات سے شکار کے لیے آنے والے کسی شہزادے کا چکر تھا۔ اس نے شاہ جہاں کی بہن سے بدتمیزی کی تھی۔ کچھ ایسی ہی بات تھی نا؟"

جواب میں زریں گل نے پورا واقعہ سنا دیا۔ بلکہ اس کے بعد اور بھی کئی واقعات سنا دیے۔ گاہے گاہے وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔ آخر میں وہ بولا "ام تو آپ کو مشورہ دے گا کہ ایسے کرداروں پر زبردست قسم کا فلمیں ضرور بننا چاہیے۔"

ہدایت کار خان نے کہا "بھئی! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ مزدوری پر کام کرتے ہیں۔ فلمیں تو آپ جیسے سیٹھ لوگ بناتے ہیں۔ آپ جب حکم دیں گے ہم فلم شروع کردیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" زریں گل نے کہا "اگر ام استاد جہانی پر فلم بنائیں گے تو اور بھی آسانی رہے گا۔"

"وہ کیوں؟" نوشین نے پوچھا۔

"آپ نے استاد جہانی کو دیکھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ شاید ایک دو سال پہلے اخبار میں تصویر دیکھی تھی۔"

"تصویر کا بات چھوڑیں جی۔ ام نے بقلم خود استاد جہانی کو دیکھا ہوا ہے۔ اسی لیے ام فرما رہا ہے کہ استاد جہانی پر فلم بنانے میں ام کو ایک دم آسانی رہے گا۔ ام کو فلم کا ہیرو بنا بنایا مل جائے گا۔ یہ احمد صاحب کو دیکھو۔ بالکل یہی قد کاٹھ' یہی عمر۔ یہ بہت ملتا جلتا ہے اس کردار سے۔"

ہدایت کار خان زیرِ لب مسکرانے لگا' میں نے بھی مسکرانے میں اس کا ساتھ دیا۔ ہدایت کار خان کو اب شک ہونا شروع ہو گیا تھا کہ زریں گل واقعی ایک کھاتی پیتی اسامی ہے یا میں نے یونہی "بز" ماری ہے۔ خوش قسمتی سے اسی وقت نوشین کا سیکریٹری مع ڈرائیور اندر آتا دکھائی دیا اور ہم سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔

زریں گل ادھر ہی سیٹ پر موجود رہا' میں اور نوشین ڈرائیور کے ساتھ پروفیسر اللہ دتا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اللہ دتا کا گھر پرانی انارکلی کی بھول بھلیوں سے دور گلبرگ کے علاقے میں واقع تھا۔ اللہ دتا کی کوٹھی میری توقعات سے زیادہ شان دار تھی۔ گیٹ پر ایک گارڈ بھی موجود تھا۔ اللہ دتا کی شان دار ٹویوٹا کرونا گیراج میں موجود تھی۔ بے شک میں پروفیسر اللہ دتا کو ایک عطائی کا درجہ دے رہا تھا لیکن کسی بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر کا گھر بھی ایسا شان دار کیا ہو گا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وال ٹو وال قالین نظر آئے۔ کوٹھی ڈیکوریشن پیسز سے سجی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا فارن کے ٹور وغیرہ بھی لگا چکا ہے۔ بہرحال اس کی کوٹھی کی سج دھج دیکھ کر کچھ زیادہ حیرانی کی ضرورت نہیں تھی۔ پروفیسر کے کلینک اور فارمیسی کی اتنی آمدن ضرور تھی کہ وہ ایسی کوٹھی کا مالک بن سکتا تھا۔

ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب ظہر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ پانچ دس منٹ بعد دروازے پر پروفیسر کی صورت نظر آئی۔ صفاچٹ داڑھی مونچھ اور پتلون قمیص کے ساتھ وہ ایک عام سا شخص نظر آ رہا تھا' تاہم اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کشش تھی اور بولنے کا انداز دل پذیر تھا۔

ہم کچھ دیر رسمی گفتگو کرتے رہے۔ پھر پروفیسر نے سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا "پولیس کو تو شریفوں کی پگڑیاں اچھالنے کا شوق ہے۔ اب دیکھو' دو دن سے کیسی کیسی لایعنی باتیں کی جا رہی ہیں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو میں تو ہتکِ عزت کا دعویٰ کروں گا۔"

میں نے ذرا دبے لہجے میں کہا "پروفیسر صاحب! ایک بات ہمیں ماننا پڑے گی۔ اگر ارشاد صاحب یوں اچانک روپوش نہ ہوتے تو معاملہ اتنا نہ الجھتا۔ جب ان کا دامن صاف تھا تو انہیں حالات کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔"

پروفیسر نے ناراض لہجے میں کہا "بھئی ابھی تو ٹھیک سے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ خود کہیں گیا ہے یا اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔ میں تو خود حیران ہوں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا ہے۔"

نوشین نے کہا "پروفیسر صاحب! وہ اسکوٹر کا کیا چکر ہے؟"

"کون سا اسکوٹر؟"

"اخبار میں لکھا تھا کہ رجب کی کوٹھی پر پولیس ایکشن کے وقت ایک اسکوٹر بھی ملا ہے اور پولیس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی رجسٹریشن ارشاد صاحب کے نام پر تھی۔"

"اسکوٹر۔۔۔ اسکوٹر۔۔۔ اسکوٹر۔ میرے تو کان پک گئے ہیں یہ بات سن سن کر۔ بھئی وہ اسکوٹر بے شک ارشاد احمد کے نام پر تھا لیکن اس کا یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ارشاد بردہ فروشی کے کام میں ملوث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی کارندہ اپنے طور پر وہاں گیا ہو یا اسکوٹر چوری ہوا ہو۔"

اسی دوران میں ملازم نے اطلاع دی کہ مولوی رحمان صاحب آئے ہیں۔ پروفیسر کے چہرے پر چند لمحے تک تذبذب کے آثار نظر آئے' پھر اس نے کہا "بھیج دو۔" چند لمحے بعد درمیانی عمر کے ایک مولانا صاحب ایک جوان سال عورت کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ عورت کا بیشتر چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ دونوں نے بے حد عقیدت کے ساتھ پروفیسر کو سلام کیا۔ پروفیسر نے کہا "اب کیا حال ہے مولانا؟"

"بہت بہتر ہیں جی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔"

پروفیسر اللہ دتا نے ہمارے سامنے ہی عورت کی چادر میں ہاتھ ڈال دیا' بڑی بے تکلفی سے اس کے پیٹ اور کمر وغیرہ کو ٹٹولتا رہا۔ پھر بولا "بہن جی! اب آپ بہت بہتر ہیں۔ دوائی جاری رکھیں۔ ایک ہفتے بعد کلینک آ کر دکھا لیں۔"

مولانا صاحب اور ان کی وائف نے ایک بار پھر پروفیسر سے بھرپور عقیدت کا اظہار کیا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اب تک بہت سے لوگوں سے سنا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا کے ہاتھ میں شفا ہے' اب میں اپنی آنکھوں سے بھی اس قسم کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ یوں بھی پروفیسر صوم صلوٰۃ کا پابند اور اصول پسند شخص نظر آتا تھا' لیکن دوسری طرف منفی بات یہ تھی کہ وہ اپنے بھائی ارشاد احمد کی غیر مشروط حمایت کر رہا تھا' حالانکہ ارشاد احمد کے "شان دار" کردار کی جھلک میں اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ راجی نامی وہ لڑکی مجھے اچھی طرح یاد تھی جو

چند روز پیشتر' مجھے ارشاد احمد سمجھ کر میرے پاس اپنا کوئی مسئلہ لائی تھی اور اس مسئلے کے حل کے لیے اپنی عزت آبرو سب کچھ ارشاد کی بھینٹ چڑھانے پر تلی ہوئی تھی۔ نجانے ایسی کتنی عورتیں اور لڑکیاں اپنے مسائل کے حل کے لیے یہی راستہ اختیار کر چکی تھیں اور ارشاد احمد کے شیطانی ہاتھوں میں کھیل چکی تھیں۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ملازم ایک بار پھر اندر آیا اور پروفیسر کے کان میں کوئی سرگوشی کر کے اسے باہر لے گیا۔ ہم نے پانچ دس منٹ پروفیسر کا انتظار کیا' لیکن وہ نہیں آیا۔ نہ ہی کوئی ملازم آیا اور اس نے بتایا کہ پروفیسر صاحب کتنی دیر میں تشریف لائیں گے۔ نوشین کے پاس وقت محدود تھا' وہ بے قراری سے پہلو بدل رہی تھی۔ اسے واپس جا کر شوٹنگ میں حصہ لینا تھا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور پروفیسر کا فربہ اندام ملازم اندر آیا۔ اس نے مؤدب انداز میں کہا "میڈم! آپ ایک منٹ کے لیے تکلیف کریں۔ پروفیسر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

نوشین نے الجھن آمیز انداز میں میری طرف دیکھا' پھر مجھ سے ایکسکیوز کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوشین کے جانے کے بعد دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔ پانچ دس منٹ بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ابھی میں اپنا لائحہ عمل سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ پھر کھلا۔ اس مرتبہ پروفیسر کی صورت دکھائی دی "معاف کرنا۔ مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔" اس نے کہا۔

"مس نوشین کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی آ رہی ہے۔" پروفیسر بولا۔

پروفیسر کے پیچھے ہی پیچھے دو مزید افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے اپنی چادر کے اندر سے طاقت ور "اے کے ۵۶" رائفل نکالی اور تین چار فٹ کی دوری سے مجھے نشانے پر لے لیا "خبردار!" وہ درندگی سے بھرپور آواز میں غرایا "اڑا ڈالوں گا۔"

میں نے حیرانی سے دیکھا۔ یہ وہی ریچھ نما شخص تھا' جو اس سارے فساد کی جڑ تھا اور جو تین روز پہلے شدید زخمی حالت میں رجب کی رہائش گاہ سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز' اس کے تیور' اس کا لب و لہجہ' سب کچھ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ ایک بےحد کار آمد "شوٹر" ہے اور گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی ریوالور نظر آ رہا تھا۔ اس نے یہ ریوالور نیچے جھکا رکھا تھا' تاہم اس کے تیوروں سے بھی ظاہر تھا کہ وہ موقع پڑنے پر ایک لمحے میں گولی چلا سکتا ہے۔

ریچھ نما شخص نے خوف ناک لہجے میں کہا "اپنا ریوالور نکال کر فرش پر رکھ دو۔ بالکل آہستہ آہستہ۔ تمہاری ایک تیز جنبش تمہیں موت کا مزہ چکھا سکتی ہے۔"

میں نے رائفل بردار کی ہدایت پر عمل کرنے میں بہتری سمجھی۔ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے چھوٹے سائز کا انگلش ریوالور فرش پر رکھ دیا۔

"اسے ٹھوکر مار کر میری طرف بڑھا دو۔" ریچھ نما شخص نے دوسرا حکم جاری کیا۔ میں نے اس پر بھی عمل کیا۔

"تمہاری پنڈلی کے ساتھ رام پوری خنجر بھی موجود ہے۔ وہ بھی اتار کر فرش پر رکھو۔"

میرا یہ قیافہ بالکل درست ثابت ہو رہا تھا کہ ریچھ نما شخص مجھے نہ صرف جانتا ہے بلکہ میرے بہت قریب بھی رہ چکا ہے۔ میں نے اس کی دوسری ہدایت پر بھی عمل کیا۔ ریوالور کی طرح خنجر بھی ریچھ نما کے قبضے میں پہنچ گیا۔

پروفیسر اللہ دتا جو مجھ سے دور ہٹ کر کمرے کے گوشے میں چلا گیا تھا' احتیاط کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے غیر مسلح ہونے کے بعد اس کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جانب سے نوشین بھی نمودار ہوئی اور دروازے سے باہر کھڑی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے انتہائی حسین چہرے پر سراسیمگی کے علاوہ حیرانی بھی نظر آ رہی تھی "یہ سب کیا ہے پروفیسر؟ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہے میڈم۔۔۔ سونی صدیقی ہے۔" پروفیسر کے بجائے ریچھ نما شخص نے جواب دیا "اس نے بہروپ بھر رکھا ہے۔ یہ شاہ جہاں عرف جہانی استاد ہے۔ نہایت خطرناک قاتل اور بدنام ترین مجرم۔۔۔ آپ کی خوش بختی ہے کہ اس نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا' ورنہ یہ تو وہ آگ ہے جس کے پاس سے گزرنے والا بھی محفوظ نہیں رہتا ہے۔"

"لل۔۔۔ لیکن ان کی صورت۔۔۔" نوشین نے ہکلا کر کہا۔

"پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس نے اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ تاہم اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں تو اس کے چہرے میں آپ کو استاد جہانی کی شباہت نظر آ جائے گی۔"

نوشین کے ساتھ ساتھ اب پروفیسر کی سراسیمہ نظریں بھی میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ نوشین نے لرزاں آواز میں پوچھا "یہ میں کیا سن رہی ہوں آپ کے بارے میں۔۔۔ مم میرا مطلب ہے کہ آپ۔۔۔ کیا واقعی آپ شاہ جہاں ہیں۔"

ریچھ نما شخص گرجا "یہ بدبخت کیا بتائے گا آپ کو۔۔۔ یہ

کچھ نہیں بتائے گا۔ ہم اس کو بتانے پر مجبور کریں گے۔"

میری خاموشی نے نوشین کو سمجھا دیا تھا کہ رائفل بردار کا انکشاف حقیقت پر مبنی ہے۔ اس احساس کے بعد نوشین کے چہرے پر بے شمار حیرت سمٹ آئی تھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی نادر عجوبہ دیکھ رہی ہو۔ ابھی قریباً ایک گھنٹا پہلے وہ اسٹوڈیو میں اپنے ہدایت کار اور فوٹو گرافر وغیرہ کے ساتھ بیٹھی شاہ جہاں عرف استاد جہانی کی باتیں سن رہی تھی۔ زریں گل ان لوگوں کو مشورہ دے رہا تھا کہ شاہ جہاں جیسے کرداروں پر "ہالی ووڈ" کے معیار کی فلمیں بنائی جانی چاہئیں۔ اب وہی استاد جہانی اس کے روبرو کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے بے تحاشا مرعوب نظر آرہی ہے۔

ریچھ نما شخص نے مجھے کمرے سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ بڑی احتیاط سے مجھے کور کیے ہوئے تھا اور معمولی سی غلطی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت میرے لیے تسلی بخش تھی۔ جب کوئی شخص بے حد محتاط ہوتا ہے تو وہ ٹینس بھی ہوتا ہے۔ اس ٹینشن میں وہ کسی بھی وقت۔۔۔ جلد یا بدیر کوئی غلطی کرسکتا ہے۔ ریچھ نما شخص نے بھی یہ غلطی کی۔ اس کی ایک ٹانگ رجب کی رہائش گاہ پر ہی شدید زخمی ہوچکی تھی۔ اب بھی وہ بری طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا میرے عقب میں آیا' جب ہم دروازے میں سے گزرے تو ایک لمحے کے لیے ریچھ نما کا ساتھی میرے اور رائفل کے درمیان آگیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گھوم کر اسے دھکا دیا۔ وہ ریچھ نما شخص پر گرا۔۔۔ اس بالکل غیر متوقع افتاد کے سبب ریچھ نما کی انگلی ٹریگر پر دب گئی۔ "اے کے ۵۶" رائفل "برسٹ" پر سیٹ کی گئی تھی۔ دس گولیوں کا طویل برسٹ اس میں سے نکلا اور ریوالور بردار کی پشت پھاڑتا ہوا کمرے کی مختلف دیواروں میں لگا۔ اس امر میں ایک فی صد شبہ بھی نہیں رہ گیا تھا کہ ریچھ نما شخص کا ساتھی فرش پر گرنے سے پیشتر ہی جہنم واصل ہوچکا ہے۔ جسم میں دس روشن دان کھلنے کے بعد بقیدِ حیات رہنا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ریچھ نما شخص پر جست لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کی رائفل پر آیا۔ میں نے رائفل کی نال اوپر اٹھا دی۔ اب اگر وہ ٹریگر دباتا بھی تو پگھلا ہوا سیسا کسی کو نقصان نہ پہنچا سکتا۔ ریچھ نما شخص کسی ریچھ ہی کی طرح مضبوط تھا' پھر بھی میں اس پر بہ آسانی قابو پاسکتا تھا' اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ زخمی تھا۔ وہ اپنی جدوجہد میں صرف ایک ٹانگ استعمال کرسکتا تھا' لیکن جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اڑ گئیں۔ میری گردن پر کسی وزنی شے سے زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے حواس معطل سے ہوگئے۔ یہ ایک لمحہ میرے گھاگ قدِ مقابل کے لیے بہت تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ میری گرفت سے نکلا۔ اس کوشش میں "اے کے ۵۶" اس کے ہاتھ سے نکل کر راہداری کے چکنے فرش پر گری اور پھسل کر ایک صوفے کے نیچے چلی گئی۔ اسی دوران میں میری نگاہ اپنے رام پوری خنجر پر پڑی۔ خنجر ریچھ نما کے لباس میں کہیں تھا۔ جب وہ میرا دھکا کھا کر گرا تو خنجر کسی جیب میں سے نکل آیا۔ میرا ہاتھ خنجر تک پہنچا تو ریچھ نما شخص حواس باختہ ہوکر سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکنا چاہتا تھا مگر مجھے کسی نے عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ یہ پروفیسر کی کوٹھی کا گارڈ تھا' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' میری گردن پر پختہ اینٹ کی زوردار ضرب بھی اسی گارڈ نے لگائی تھی۔ میں نے گھوم کر گارڈ کی تنومند گردن اپنے بازو میں جکڑی اور مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر اسے دم بخت کردیا۔ ایک ہی سیکنڈ میں وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گرا۔ ریچھ نما شخص اس وقت تک لنگڑاتا ہوا سیڑھیاں عبور کرچکا تھا۔ میں تین تین زینے پھلانگتا ہوا اس کے عقب میں گیا۔ میں چھت پر پہنچا تو ریچھ نما شخص ایک عقبی کوٹھی کی چھت پر کودتا نظر آیا۔ میں اس چھت پر پہنچا تو وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ریچھ نما شخص کے تعاقب میں ٹاک ٹوئیاں مارنے سے اور محلے داروں میں خوف و ہراس پھیلانے سے بہتر ہے کہ جو مل رہا ہے وہ حاصل کرلیا جائے' یعنی پروفیسر اللہ دتا۔۔۔ وہ ابھی تو کوٹھی میں موجود تھا۔ آئندہ چند منٹوں میں کیا ہوجائے گا' کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں واپس پروفیسر اللہ دتا کی چھت کی طرف دوڑا۔ اس وقت تک اللہ دتا کا ایک ہوشیار ملازم چھت کا وہ دروازہ اندر سے بند کرچکا تھا جو نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔

میری سمجھ میں سب سے پہلی بات یہی آئی کہ پروفیسر کے فون کا تار کاٹ دینا چاہیے۔ یہ تار چھت کی منڈیر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ چھت پر ایک طرف گملوں کے پاس باڑ کاٹنے والا ایک زنگ آلود کتیرا (بڑی قینچی) پڑا تھا۔ میں نے اس کی مدد سے تار کاٹ دیا۔ پھر منڈیر کے جھٹکے سے لٹک کر نیچے کھڑکیوں کے شیڈ پر کودا اور وہاں سے کود کر کوٹھی کی بغلی راہداری میں آگیا۔ اسی وقت میری نگاہ پروفیسر کے ایک ہٹے کٹے ملازم پر پڑی' وہ راہداری کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہی دروازہ اب کوٹھی کے اندر داخل ہونے کا واحد راستہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ملازم دروازے کو مکمل بند کردیتا میں نے زوردار دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا اور ملازم الٹ کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر

مخصوص انداز کا مُکا (راؤنڈ پنچ) رسید کیا۔ مہارت سے رسید کیا گیا ایسا صرف ایک ہی مُکا اچھے بھلے قدِ مقابل کو بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میرا یہ قدِ مقابل بھی آدھ پون گھنٹے کے لیے اپنے مسائل اور گرد و پیش سے بے خبر ہوگیا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ پروفیسر اللہ دتا پر پڑی۔ اس نے فون کا ریسیور کان سے لگا رکھا تھا اور بڑے اضطراب میں "ہیلو۔۔۔ ہیلو" پکارتا چلا جارہا تھا۔ مجھے خنجر بدست اپنے سامنے دیکھ کر پروفیسر نے ریسیور ہاتھ سے چھوڑا اور پورچ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہ تو اتنا پھرتیلا تھا اور نہ اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت تھی۔ میں نے چند گز آگے راہداری میں اسے جالیا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ شاید اس طرح وہ اڑوس پڑوس والوں کو اپنے مصائب سے آگاہ کرنا چاہتا تھا' لیکن اس سے پہلے کہ چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوتی' میں نے خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا اور میرے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی نے اس کے جبڑوں کو بڑی مضبوطی سے ڈھانپ لیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ کوٹھی میں اس وقت کوئی اور ملازم یا کارندہ موجود نہیں تھا ورنہ اب تک اس نے ضرور شور مچا دیا ہوتا۔ جس رائفل سے برسٹ مارا گیا اس پر بھی زبردست قسم کا سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ توقع یہی تھی کہ پڑوس کی کوٹھیوں والے اس ہنگامے سے بے خبر رہے ہوں گے جو پروفیسر کی کوٹھی میں برپا ہوا تھا۔

اچانک میرا دھیان فلم اسٹار نوشین کی طرف چلا گیا۔ وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ تو کیا وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ کوٹھی سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر پورچ کی طرف دیکھا۔ نوشین کی نیلگوں پردوں والی شاندار مرسیڈیز پورچ میں ہی موجود تھی۔ فاصلہ زیادہ تھا تاہم غور سے دیکھنے پر مجھے ڈرائیور بھی نظر آگیا۔ وہ شیشے چڑھائے آرام سے سو رہا تھا اور اس اچکل سے قطعی بے خبر رہا تھا جو کوٹھی کے اندرونی حصے میں برپا ہوئی تھی۔۔۔ تو پھر نوشین کہاں تھی؟ صرف دو تین سیکنڈ بعد مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ نوشین مجھے کمرے کے دروازے پر نظر آئی۔ اس کا سفید چہرہ سفید تر ہو رہا تھا اور میں اسے دور سے دیکھ کر ہی جان سکتا تھا کہ وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔ تاہم وہ اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کی بھرپور کوشش کررہی تھی۔

"پلیز مسٹر جہانی۔" وہ کپکپاتی آواز میں بولی "پ۔۔۔ پروفیسر صاحب کو چھوڑ دیں۔"

"چھوڑ دوں گا۔ لیکن پہلے ان کا انٹرویو کرنا ہے۔ ان سوالوں کے جواب پوچھنے ہیں جو میرے ذہن میں ہیں' اور ان سوالوں کے جواب بھی جو آپ کے ذہن میں ہیں۔"

"م۔۔۔ میرے ذہن میں کوئی سوال نہیں۔ بس۔۔۔ آپ انہیں چھوڑ دیں۔"

"اگر نہ چھوڑوں تو؟" میں نے اطمینان سے کہا۔

نوشین نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے پرس میں سے چھوٹے سائز کا لیڈیز پسٹل نکال لیا "میں کہتی ہوں' آپ چھوڑ دیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"میں گولی چلا دوں گی۔"

"آپ کبھی بھی نہیں چلا سکتیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

میرے لب و لہجے نے نوشین کو مزید کنفیوز کردیا۔ اس نے پرس پھینک کر دونوں ہاتھوں میں پسٹل تھام لیا تھا' مگر میں جانتا تھا کہ وہ دس ہاتھوں سے بھی پسٹل تھام لے تو گولی نہیں چلا سکتی۔ یہ فلم کی شوٹنگ نہیں تھی' حقیقی زندگی کی ایک حقیقی پچویشن تھی۔ یہاں "وقت" ہدایت کار تھا اور ری ٹیک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میرا خنجر پروفیسر اللہ دتا کی شہ رگ کاٹ ڈالتا تو اس منظر میں ردوبدل نہیں ہوسکتا تھا' اگر نوشین کی انگلی ٹریگر پر دب جاتی اور گولی میرے سینے سے پار ہوجاتی تو اس منظر کی ایڈیٹنگ بھی ناممکن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نوشین بے حد محتاط نظر آرہی تھی۔ پسٹل اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر کانپ رہا تھا اور اس کی زبان بار بار خشک ہونٹوں پر حرکت کررہی تھی۔

میں بڑے سکون سے پروفیسر کو دھکیل کر صوفے تک لے آیا۔ پروفیسر مجھے نہایت خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ پہلے اس نے پولیس کے دو تین اعلیٰ افسران کے نام لیے' پھر ایک وزیر کا ڈراوا دیا' پھر اس سے بھی آگے بڑھا اور چیف منسٹر تک آگیا "تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں تمہارے اگلے پچھلوں کا خانہ خراب کرا دوں گا۔ تمہاری ساری بدمعاشی پیشاب کے راستے نہ نکلوا دی تو اللہ دتا نام نہیں۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔۔۔ تم ہیجڑوں کو ڈرا دھمکا کر بدمعاش بن گئے ہوگے' اب تمہارا واسطہ مرد سے پڑا ہے۔" اللہ دتا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

پھر وہ نوشین سے مخاطب ہوکر چیخا "تم دیکھتی کیا ہو۔ چلا دو اس پر گولی۔۔۔ میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ توڑ دو اس کا کھوپڑا۔"

میں نے کہا "نوشین صاحبہ! آپ نے میرا کھوپڑا نہ توڑا تو پروفیسر صاحب کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ ٹریگر دبا ہی دیں۔"

"میں۔۔۔ میں سچ مچ دبا دوں گی۔ آپ۔۔۔ انہیں چھوڑ دیں۔"

"میں تو خود چاہتا ہوں کہ آپ دبا دیں۔ آپ کی فلم

انڈسٹری کو ایک اچھی اور مکمل اسٹوری مل جائے گی۔"

میں نے پروفیسر کو صوفے پر اوندھا گرا دیا اور ایک ٹائی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھنے شروع کر دیے۔ پروفیسر سینے کی پوری قوت سے چیخنے لگا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یہ چیخ و پکار اس کے پڑوسیوں کو ہوشیار کر سکے گی۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ یہ کوٹھی کا اندرونی کمرا تھا۔ ویسے بھی یہ کوٹھیاں تین تین کنال میں تھیں۔ ایسی وسیع کوٹھیوں کے مکینوں کی چیخ و پکار پڑوسیوں تک پہنچنی ممکن نہیں ہوتی۔ ہاں ایک خطرہ تھا کہ کہیں گاڑی میں محو خواب ڈرائیور بیدار ہو کر اندر نہ آ جائے لیکن اگر ایسا ہوتا بھی تو ڈرائیور پر قابو پانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پروفیسر کے ہاتھ باندھنے کے بعد میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

نوشین کی بے بسی انتہا پر تھی۔ اپنی دھمکیوں کا کھوکھلا پن اب اس پر بھی آشکار ہو چکا تھا۔ اس نے تھک ہار کر پسٹل ایک طرف رکھ دیا اور التجائیہ لہجے میں پروفیسر کے لیے اپیل کرنے لگی۔

میں نے اسے کمرے سے باہر لے جا کر کہا "دیکھیں نوشین صاحبہ! مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ جو وعدہ میں نے آپ سے کیا ہے' وہ ہر صورت نبھاؤں گا۔ پروفیسر کے ساتھ میری طرف سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ میرا رویہ اس کے ساتھ ہمدردی کا ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک وہ مجرم ثابت نہیں ہو جاتا۔ اگر اس کے ہاتھ صاف ہیں تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ میں اس سے صرف چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کی اجازت دیں گی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے' اگر آپ مداخلت کریں گی تو پھر ضرور کوئی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

نوشین کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں اور نوشین واپس کمرے میں آئے۔ میں نے نوشین سے کہا کہ وہ اپنے ڈرائیور کو سمجھا آئے کہ ابھی قریباً ایک گھنٹا اسے یہاں مزید رکنا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ بیرونی گیٹ کو بھی اندر سے مقفل کر آئے۔

نوشین نے اطاعت مندی سے سر ہلایا اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے ہلاک ہو جانے والے شخص کی لاش اٹھا کر ایک غسل خانے میں بند کر دی۔ اس لاش کو دیکھ دیکھ کر نوشین کا "نروس بریک ڈاؤن" ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے بے ہوش گارڈ کو بھی موقع سے ہٹا لیا۔ چند لمحے بعد نوشین اپنے دونوں کام نمٹا کر واپس آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہے۔ پروفیسر کے ساتھ اس کی "بے پناہ عقیدت" اپنی جگہ تھی تاہم اصل صورت حال جاننے کی خواہش مند وہ بھی تھی۔

پروفیسر کا منہ میں نے کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا تھا' اس کے باوجود وہ حلق سے غوں غاں کی "شدید" آوازیں نکال رہا تھا۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے مسلسل اپنے وسیع تعلقات کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ خود پر قابو پائے اور احمقانہ حرکات نہ کرے' کیونکہ جب تک وہ ہمیں حقیقت حال سے آگاہ نہیں کرے گا' اس کا چھٹکارا ممکن نہیں۔ غالباً میرے لب و لہجے نے پروفیسر پر اثر کیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا' شدید قسم کا تذبذب اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ پھر ایکا ایکی اس کے چہرے نے رنگ بدلا' غیظ و غضب کی جگہ خوف اور سنگین قسم کی فکرمندی نے لے لی۔

میں نے یہ تبدیلی دیکھ کر اس کے منہ میں سے کپڑا نکال لیا۔ اسے نجانے کیا ہوا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کا پورا وجود خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پھر وہ گھگیانے لگا "خدا کے لیے۔۔۔ خدا کے لیے رحم کرو اپنے آپ پر اور مجھ پر۔ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔۔۔ بہت بے رحم۔۔۔ اتنے بے رحم کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟" میں نے استفسار کیا۔

"کچھ مت پوچھو۔۔۔ کچھ بھی مت پوچھو۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ زندگی میں موت کا مزہ چکھ لو گے اور سو بار مر کر بھی موت نہیں آئے گی۔" وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کا یہ روپ میرے لیے بالکل نیا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ پروفیسر کی ایک بیٹی بھی تو تھی۔ اصولی طور پر اس لڑکی کو یہاں ہونا چاہیے تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ نہ کہیں ایسے آثار نظر آئے تھے جن سے پتا چلتا کہ اس گھر میں کوئی خاتون بھی رہتی ہے۔ میں نے اللہ دتا سے پوچھا "تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

پروفیسر اللہ دتا نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ بدستور خوف اور دہشت کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور عالم بے بسی میں پھڑپھڑا رہا تھا "تم لوگ میری بات آخر کیوں نہیں سنتے ہو؟ کیوں خود کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہو۔۔۔ میری بات دھیان سے سنو' جہانی استاد۔۔۔ تم کسی غلط فہمی میں نہ رہو۔ تم نے بڑے بڑے بُرے لوگ دیکھے ہوں گے۔۔۔ لیکن جن کی میں بات کر رہا ہوں' وہ انسان ہیں ہی نہیں۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں تمہیں کچھ بتا سکوں۔ بس تم دونوں چلے جاؤ

یہاں سے۔ جو بندہ یہاں مرا ہے اس کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔ خدا کے واسطے۔" وہ ایک بار پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

وہ جس انداز میں آہ و بکا کر رہا تھا وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی تھا۔ اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹی کچھ سفاک قسم کے لوگوں کے قبضے میں ہے اور وہ ان کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ کہیں وہ سفاک شخص پروفیسر کا بھائی ہی تو نہیں تھا؟ میں نے سوالیہ نظروں سے نوشین کی طرف دیکھا۔ وہ بولی "پروفیسر صاحب کی بیٹی شائستہ اسلام آباد میں پڑھتی ہے اور ہاسٹل میں رہتی ہے۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" میں نے زیر لب کہا۔

اسی دوران میں پروفیسر کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ یکایک اس کی سانس الجھ گئی اور جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ نوشین خوف زدہ آواز میں بولی "پروفیسر صاحب کو دل کی تکلیف بھی ہے۔"

پروفیسر کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آ رہے تھے اور وہ بار بار اپنے پہلو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نوشین روتے ہوئے بولی "کچھ کریں جہانی صاحب۔"

پروفیسر اپنی پتلون کی جیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے' مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جیب سے کچھ نکالنا چاہ رہا ہے' شاید کوئی گولی وغیرہ تھی۔

میں نے جلدی سے اس کی جیب ٹٹولی۔ سو سو کے چند نوٹ نکلے۔ ایک چھوٹی سی تسبیح نکلی اور زبان کے نیچے رکھنے والی دو گولیاں نکلیں۔ میں نے جلدی سے ایک گولی نکال کر اللہ دتا کی زبان کے نیچے رکھی۔ تاہم گولی رکھنے سے پہلے ہی وہ سنبھل چکا تھا۔ میں نے اس کے پاؤں اور ہاتھوں کی بندش کچھ ڈھیلی کر دی۔ اس کی گردن سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ نڈھال سا ہو گیا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے پوچھ گچھ کی جا سکتی۔ اس کے ہونٹوں سے مسلسل کراہیں نکل رہی تھیں۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اس کی بیمار والدہ یاد آ گئی جس سے ارشاد کے گھر بالائی منزل پر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح بے تحاشا خوف زدہ تھی اور ہمیں دیکھ کر اس نے دیوانوں کی طرح چلانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے پروفیسر کو سمجھایا کہ وہ شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا' الٹا اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا' غالباً اس میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ ہاں یا نہ میں جواب دے سکتا۔

پروفیسر کو کمرے میں مقفل کرنے کے بعد میں نے کوٹھی کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ پروفیسر کے بیڈ روم سے مجھے چابیوں کا ایک گچھا مل گیا۔ اس گچھے کی مدد سے میں اور نوشین جلدی جلدی مختلف کمروں کے دروازے کھولنے لگے۔ ایک اندرونی کمرے کے اندر سے کسی کے بولنے کی مدھم آوازیں آئیں۔ اب تک تو ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ ایک گارڈ اور ایک ملازم کے سوا کوٹھی میں کوئی بھی موجود نہیں لیکن اس آواز نے ہمارے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے کر بہ آہستگی دروازے پر دباؤ ڈالا' وہ مقفل نہیں تھا اور نہ ہی اندر سے بند کیا گیا تھا۔ دروازہ نرمی سے کھل گیا۔ اندر ایک بوڑھا مسہری پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ نیچے قالین پر جائے نماز بچھا ہوا تھا۔ قریب ہی تپائی پر دواؤں کی مختلف شیشیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ میں نے بوڑھے کی نگاہ پڑنے سے پہلے ہی ریوالور دوبارہ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ بوڑھے کی سفید براق داڑھی اور بال بکھرے بکھرے تھے۔ وہ شکل سے ہی مخبوط الحواس نظر آتا تھا۔ وہ آگے پیچھے جھول رہا تھا اور بار بار ایک ہی جملہ ادا کر رہا تھا "مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔ مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔"

بوڑھا وسطی پنجاب کا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور ہر جھری میں غم کی کہانی تھی۔ میں نے کہا "کیا بات ہے بابا جی؟"

وہ بولا "مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی نہیں آتا۔" اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی اور وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ نوشین اس بزرگ کو پہچانتی ہے۔ وہ مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی "یہ کچھ نہیں بتائے گا۔"

"آپ اسے جانتی ہیں؟"

"ہاں ایک دو بار میں نے اسے پروفیسر صاحب کے کلینک میں دیکھا ہے' بس ہر وقت یہی فقرہ دہراتا رہتا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی "چالیس پینتالیس سال پہلے اس کا بچہ گم ہو گیا تھا' اسی کے غم میں حواس کھو بیٹھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کی جیب میں بچے کی تصویر بھی دیکھی تھی۔"

"لیکن یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ بات تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہوگی۔ شاید انہوں نے ترس کھا کر یہاں رکھ لیا ہے۔ لگتا ہے کہ علاج معالجہ بھی کر رہے ہیں۔"

بوڑھے نے لرزتے ہاتھوں سے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر ہمارے سامنے کر دی۔ کسی خدا ترس نے تصویر کو محفوظ رکھنے کے لیے

اسے لیمینیشن کرا دیا تھا۔ تصویر میں چار پانچ سال کا ایک پھول سا بچہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گیس سے بھرا ہوا غبارا تھا۔ اسے ایک جواں سال شخص نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچہ بڑی ادا سے جواں سال شخص کے رخسار کو چومنے کی کوشش کررہا تھا۔ ذرا غور کرنے سے صاف پتا چل گیا کہ جواں سال شخص یہی نیم پاگل بوڑھا ہے۔ بوڑھے کا دردناک جملہ ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجا اور دل دہل گیا۔ یوں لگا جیسے اس جملے میں ان سیکڑوں ہزاروں والدین کی آہ وبکا شامل ہوگئی ہے جو زندگی کے کسی موڑ پر اس بوڑھے جیسے المیے کا شکار ہوئے ہیں۔ کسی "خوشہ چیں ہاتھ" نے ان کے گلشنِ بہار سے کسی پھول کو نوچا ہے اور ہمیشہ کے لیے اوجھل کیا ہے۔ ماؤں کی برستی آنکھیں۔۔۔ اداس کھلونے۔۔۔ الماریوں میں ٹنگے رہ جانے والے رنگ برنگے کپڑے' ادھ پڑھی کتابیں' کسی معصوم کے انتظار میں دن رات کھلے رہنے والے دروازے۔۔۔ ایک ہی لمحے میں نجانے کیا کچھ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

میں نے تصویر بوڑھے کو واپس کی اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل آیا' میں نے نوشین کے ساتھ مل کر مختلف کمروں کی الماریاں کھولیں' درازیں دیکھیں۔۔۔ کاغذات الٹ پلٹ کیے لیکن کوئی خاص چیز ہاتھ نہیں لگی۔ دواؤں کے نسخے تھے۔ حکمت اور ہومیوپیتھک وغیرہ کی کتابیں تھیں۔ مختلف کیمیائی مرکبات اور تیار شدہ ادویات بھی یہاں وہاں پائی گئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا کو اپنے پروفیشن سے واقعی گہری دلچسپی ہے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں پروفیسر کے لیے غیر محسوس طور پر ہمدردی کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔

چابیوں کے گچھے میں ایک بڑی اسپیشل چابی بھی موجود تھی۔ یہ کسی بیش قیمت تالے کی چابی تھی۔ اس کے چار پہلو تھے۔ یعنی چابی کے چار کناروں پر دندانے موجود تھے۔ مجھے اس چابی کے تالے کی تلاش ہوئی۔ یہ تلاش بالآخر بالائی منزل کے ایک پُرسکون کمرے کے سامنے جاکر ختم ہوئی۔ راہداری میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے یہ کمرا پروفیسر خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ چار پہلو والی چابی کے ذریعے دروازے کا لاک کھولنے میں کافی وقت پیش آگیا۔ چابی کو پہلے دو مرتبہ بائیں طرف گھمانا پڑا پھر ایک دفعہ دائیں جانب گھمانے کے بعد دروازہ کھل سکا۔ میں اور نوشین کمرے میں داخل ہوئے۔ سوئچ بورڈ تلاش کرکے میں نے لائٹ آن کی اور ششدر رہ گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے نوشین بھی دو چار ہوئی تھی۔ پورا کمرا تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تصویریں کمرے کی چاروں دیواروں پر لگی تھیں' اس کے علاوہ چھت پر بھی چسپاں کی گئی تھیں۔ یہ کیمرے سے کھینچی گئی رنگین تصویریں تھیں۔ ان میں سے کچھ پوسٹر سائز تھیں اور کچھ پوسٹر سے بھی بڑی تھیں۔ یہ کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویریں نہیں تھیں' نہ ہی قدرتی مناظر کی منظر کشی تھی۔ یہ بے حد عجیب تصویریں تھیں۔ قریباً ہر تصویر میں پروفیسر اللہ دتا نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور گرانڈیل شخص بھی تھا تاہم اس نے اپنا چہرا وانی نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کی گرم ٹوپی تھی جس میں سے صرف آنکھیں ہی نظر آسکتی تھیں۔ تصویر میں آنکھوں پر بھی عینک نظر آرہی تھی۔

یہ بڑی لرزہ خیز تصویریں تھیں' اور ہر تصویر پروفیسر اللہ دتا کی بے بسی اور لاچاری کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کسی تصویر میں وہ نقاب پوش سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ کسی تصویر میں اس نے اپنا نیم گنجا سر نقاب پوش کے پاؤں میں رکھا ہوا تھا اور گڑگڑا رہا تھا۔ ایک جہازی سائز کی تصویر میں اللہ دتا کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان دکھائی دے رہے تھے' وہ زمین پر گرا ہوا تھا اور دو پاؤں اسے ٹھوکریں رسید کرنے میں مصروف تھے۔ یقیناً یہ نقاب پوش کے پاؤں ہی تھے۔ پورے کمرے میں اسی طرز کی تصویریں تھیں۔ انہیں جدید کیمرے سے کھینچا گیا تھا اور بڑی مہارت سے انلارج کیا گیا تھا۔ تصویروں میں نقاب پوش کے جسم کا صرف ایک حصہ نظر آتا تھا اور وہ اس کے ہاتھ تھے۔ اس کے ہاتھوں کی رگیں تھوڑی سی ابھری ہوئی تھیں۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ محسوس ہوتی تھی۔ ہاتھوں کی رنگت سے وہ سفید فام نظر آتا تھا۔

ان تصویروں میں ایک تصویر بڑی ہی لرزہ خیز تھی۔ اس جہازی سائز کی تصویر کو چھت سے چسپاں کیا گیا تھا۔ اس میں پروفیسر اللہ دتا مادر زاد برہنہ نظر آرہا تھا' وہ کسی چوپائے کی طرح اپنی کہنیوں اور گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ اس تصویر میں دو سیاہ بوٹ بھی نظر آرہے تھے۔ یہ نقاب پوش ہی کے بوٹ تھے۔ پروفیسر نے اپنا اشک بار چہرہ ان بوٹوں پر جھکا رکھا تھا اور جانور کی طرح زبان نکال کر بوٹوں کو چاٹ رہا تھا۔ تصویر میں اس بدنصیب شخص کے تمام ظاہری و پوشیدہ اعضا۔۔۔ صاف نظر آرہے تھے۔ تصویر کی کوالٹی ایسی تھی کہ جسم کا ہر مسام دکھائی دیتا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر نوشین کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا اور خوف سے اس کی خوب صورت آنکھیں پھیل گئیں۔

یہ کمرا یقیناً پروفیسر خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر اس کی عینک رکھی تھی اور آج کا اخبار بھی رکھا تھا۔ یہ سوچ ہی دل ہلا دینے والی تھی کہ پروفیسر

اللہ دتا اس کمرے میں سوتا ہوگا۔ اس کمرے میں جو ایک اور چیز عجیب و غریب نظر آئی وہ ایک زنانہ لباس تھا۔ ایک کڑھائی دار قمیص تھی' ایک شلوار تھی' ایک دوپٹا تھا اور ایک مخصوص زنانہ لباس تھا۔ یہ سارے کپڑے بیڈ کے سامنے والی دیوار کے نچلے حصے میں بڑے اہتمام سے ٹنگے ہوئے تھے' جیسے انہیں کسی شوکیس میں ڈسپلے کیا گیا ہو۔ یہ تمام "سجاوٹ" اور آرائش ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ بہرحال میرا دل اس بات کی گواہی ضرور دے رہا تھا کہ ان تصویروں اور کپڑوں وغیرہ کا کوئی نہ کوئی تعلق پروفیسر کی بیٹی شائستہ سے ہے۔ عین ممکن تھا کہ پروفیسر کو ذہنی ٹارچر دینے کے لیے یہ اشیا۔۔۔ جان بوجھ کر اس خواب گاہ میں سجائی گئی ہوں اور پروفیسر کو زبردستی یہاں سونے پر مجبور کیا جاتا ہو یا اس قسم کی کوئی اور بات ہوسکتی تھی۔

اسی اثنا میں نیچے والے کمرے سے پروفیسر کے واویلے کی دردناک صدا بلند ہونے لگی۔ یقیناً پروفیسر بڑی شدت سے چیخ رہا تھا' تبھی یہ مدھم آواز ہم تک پہنچ پا رہی تھی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر مفہوم ہمارے علم میں تھا۔ پروفیسر اللہ دتا جن نامعلوم لوگوں سے دہشت زدہ تھا انہی سے ہمیں بھی دہشت زدہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی آواز کسی آسیبی گونج کی طرح در و دیوار میں چکرا رہی تھی۔ وہ بظاہر ایک بلند حوصلہ اور مضبوط شخص تھا' اخلاق کے حوالے سے بھی لوگ اسے اچھا سمجھتے تھے اور عوام الناس کی ایک بڑی تعداد اس کی گرویدہ تھی لیکن ان لمحات میں یہ مضبوط اور جہاں دیدہ شخص ایک خوف زدہ بچے کی طرح ایکٹ کررہا تھا' اور بلک بلک کر رو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سا ایسا خوف تھا جس نے اسے نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے نوشین سے کہا "میرا خیال ہے آپ پروفیسر کے پاس جائیں۔ انہیں سنبھالنے کی کوشش کریں۔ میں باقی کی تلاش مکمل کرکے آتا ہوں۔"

"جلدی آیئے گا۔" نوشین نے کہا "مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"پروفیسر صاحب جس انداز میں آہ وبکا کررہے ہیں' اس سے میرا دل دہلنے لگا ہے۔ وہ اتنے کم حوصلہ نہیں ہیں۔ اگر وہ۔۔۔ اس قدر ڈرے ہوئے ہیں تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔"

"وجہ ہی تو ڈھونڈنا چاہ رہے ہیں ہم۔" میں نے کہا۔

نوشین میری ہدایت کے مطابق نیچے پروفیسر کے پاس چلی گئی۔ پروفیسر کی آہ وبکا کچھ دیر تو جاری رہی' پھر مدھم پڑ گئی۔ غالباً نوشین اسے سمجھانے میں مصروف ہوگئی تھی۔

میں نے سن رکھا تھا اور کسی حد تک میرا تجربہ بھی تھا کہ یہ فلمی حسینائیں اکثر ناقابلِ اعتبار ثابت ہوتی ہیں لیکن پتا نہیں کیوں نوشین پر اعتبار کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے فلمی مزاج کی لڑکی نہیں لگی تھی۔ عجیب سا دھیما پن اور سادگی تھی اس میں۔۔۔ اگر تو یہ ایکٹنگ تھی تو پھر بہت باکمال تھی۔

پروفیسر کی اس بالائی خواب گاہ کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد میں ساتھ والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ کمرا پروفیسر اسٹڈی کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ یہیں مجھے پروفیسر اللہ دتا کی تعلیمی اسناد وغیرہ بھی ملیں۔ میری توقعات کے برخلاف اس اُن کوالیفائڈ معالج نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رکھا تھا۔ اسٹڈی میں کیمسٹری کے علاوہ طب و حکمت وغیرہ کے موضوع پر بھی بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ اچانک کچھ مدھم نسوانی چیخوں نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ چیخیں زیریں منزل سے بلند ہوئی تھیں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے' یہ نوشین کی چیخیں تھیں۔ میں نے ریوالور جیب سے نکالا اور دوڑتا ہوا سیڑھیوں پر آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے کانوں میں عجیب سی غراہٹیں گونجیں۔ یہ غراہٹ کسی جانور کی نہیں تھی لیکن انسان کی بھی نہیں تھی۔ ایسی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ غراہٹیں راہداری کی طرف سے ابھر رہی تھیں' میرے نیچے اترتے اترتے وہ آہستہ ہوئیں اور معدوم ہوگئیں۔ تاہم نوشین کی چیخیں مسلسل بلند ہورہی تھیں۔ میں خواب گاہ کے دروازے کے سامنے پہنچا اور سناٹے میں رہ گیا۔ قالین پر نوشین کے ڈرائیور رمضان علی کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ نوشین اسے اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چلانے لگی "جمالی صاحب' یہ شدید زخمی ہے' یہ مرجائے گا۔ خدا کے لیے اسے اسپتال پہنچائیں۔ پلیز جلدی کریں۔" اس کی آواز دہشت سے پھٹی ہوئی تھی۔

میں نے جھک کر ڈرائیور کو دیکھا۔۔۔ خدا کی پناہ۔۔۔ اس کی گردن پر ایک گہرا گھاؤ تھا۔ ادھڑے ہوئے گوشت میں سے گردن کی ہڈی تک صاف نظر آرہی تھی۔ جیسے کسی درندے نے اس کا نرخرا ادھیڑ ڈالا ہو۔ نوشین اسے اسپتال پہنچانے کی بات کررہی تھی' لیکن وہ مرچکا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں جو تھوڑی بہت جنبش تھی وہ جان کنی کی تھی۔ چند لمحے میں یہ جنبش بھی ختم ہوگئی۔ ڈرائیور کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے تاثرات منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ سفید وردی والا وہی صاف ستھرا شخص ہے جو تھوڑی دیر پہلے ائرکنڈیشنڈ گاڑی کی آرام دہ نشست پر سویا ہوا تھا۔

میں نے ڈرائیور کی لاش فرش پر ڈالی اور ریوالور سمیت

اردگرد کے کمروں میں تیزی سے گھوم گیا۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ بس خواب گاہ میں پروفیسر موجود تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا "وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ اور مجھے بھی۔ چلے جاؤ یہاں سے خدا کے لیے دفعان ہو جاؤ۔"

دہشت کی ایسی کیفیت تھی اس کی آواز میں کہ روح تک لرز رہی تھی۔

نوشین اپنے ڈرائیور کو مسلسل جھنجھوڑ رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ میں نے کہا "نوشین، کوئی فائدہ نہیں۔ یہ۔۔۔ مرچکا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں" وہ ہیجانی انداز میں چیخی "آپ جھوٹ بول رہے ہیں، یہ زندہ ہے۔۔۔ آپ اسے اٹھائیں۔ اسے اسپتال لے کر چلتے ہیں۔"

"نہیں یہ مرچکا ہے۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ دیکھیں۔۔۔ یہ ہل رہا ہے۔"

"میں نے کہا نا، یہ مرچکا ہے۔ اسے چھوڑ دیں۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔"

"نہیں یہ زندہ ہے۔ یہ میرا نہیں ہے۔"

وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی اور میرے سینے پر مکّے چلانے لگی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ میں نے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا۔ اس کا ہانڈی کی طرح ابلتا ہوا ہیجان کچھ سرد پڑا۔ میں نے پوچھا "کس نے حملہ کیا ہے اس پر؟"

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی "مجھے نہیں معلوم، میں پروفیسر سے باتیں کر رہی تھی۔ کمرے سے باہر آئی تو یہ تڑپ رہا تھا۔"

بات سمجھ میں آرہی تھی۔ پروفیسر کی آہ و بکا سن کر ڈرائیور گاڑی میں سے نکلا تھا اور تجسس کی انگلی تھام کر اندر آگیا تھا۔ یہاں نامعلوم حملہ آور نے اس پر جان لیوا حملہ کیا تھا اور شہ رگ ادھیڑ کر بھاگ گیا تھا۔ یقیناً وہ ابھی کو ٹھی کے اندر ہی تھا۔ انہی دیواروں میں اور اسی چھت کے نیچے موجود تھا۔ اور یہ احساس بڑا لرزہ خیز تھا۔ نوشین شدید صدمے سے نڈھال ہو کر ایک گوشے میں بیٹھ گئی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی چلی جارہی تھی۔ اس کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید تھا۔

چیخ چیخ کر پروفیسر اللہ دتا کی آواز بالکل بیٹھ گئی تھی۔ وہ آہ و بکا تو اب بھی کر رہا تھا لیکن یہ آواز سرگوشیوں کی طرح تھی اور مزید مدھم ہو رہی تھی۔ ہر بار جب وہ زور سے کوئی جملہ ادا کرتا تھا تو اس کی گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں نے بڑے دھیان سے اردگرد کی آہٹوں پر کان لگائے تو چھت پر کسی متنفس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک ہلکی سی چاپ تھی جو بالائی منزل کے شمالی گوشے کی طرف سے ابھر رہی تھی "خدا کے لیے جہانی صاحب! یہاں سے نکلیں۔" نوشین روتے ہوئے بولی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرایا اور ایک بار پھر غور سے آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز موجود تھی اور اب چھت کے وسطی حصے کی طرف آگئی تھی "پلیز جہانی صاحب! آپ مجھے باہر جانے دیں۔ میں صحن میں نکل کر شور مچاتی ہوں۔ لوگ آجائیں گے، پھر وہ جو بھی ہے پکڑا جائے گا۔"

میں نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے سختی سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ قدموں کی آواز اب چھت کے وسطی حصے میں چکرا رہی تھی۔

یہ کوئی بھاری بھرکم شخص تھا اور دونوں پاؤں گھسیٹ کر چلتا تھا۔ میں نے کہا "نوشین! آپ کا پسٹل کدھر ہے؟" پھر نوشین کے جواب دینے سے پہلے ہی میری نظر اس کے پسٹل پر پڑ گئی۔ وہ کمرے کے اندر پڑا تھا۔ میں نے پسٹل نوشین کے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ وہ چوکس ہو کر بیٹھے، میں اوپر جارہا ہوں۔

اس نے میرا بازو تھام لیا "پلیز جہانی صاحب، ایسا مت کریں۔ یہاں دو جانیں پہلے جاچکی ہیں۔ خدا کے لیے نکل جائیں یہاں سے۔۔۔ تھانہ یہاں پاس ہی ہے، ہم دو منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"دیکھیں۔۔۔ آپ فی الحال مجھے ہدایت کار سمجھیں اور جو میں کہتا ہوں وہ کریں۔"

میرے لہجے کی سختی نے نوشین کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صرف دو گھنٹے پہلے وہ بڑی تمکنت سے اسٹوڈیو میں موجود تھی اور بڑی آن بان کے ساتھ شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی، اس کی شامتِ اعمال اسے میرے ساتھ اس منحوس چار دیواری میں کھینچ لائی تھی اور یہاں اوپر تلے سنسنی خیز واقعات پیش آرہے تھے۔ وہ کورس گانا فلم بند کرانے کے لیے جو لباس پہنے ہوئے تھی اس کی قیمت کم و بیش پچیس تیس ہزار روپے تھی۔ اب یہ لباس خون سے داغ دار ہو چکا تھا۔ نہایت قیمتی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں، میک اپ کا تیا پانچا ہو گیا تھا اور اس کے ایک رخسار پر میرے طمانچے کا نشان تھا۔

میں نے تیزی سے سمجھا بجھا کر اسے پروفیسر کے قریب رہنے پر رضامند کرلیا، پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے گراؤنڈ فلور سے باہر جانے کے واحد راستے کو اندر سے مقفل کردیا اور چابی جیب میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ

میرے سیڑھیاں چڑھتے ہی نوشین خوف زدہ ہو کر باہر صحن میں نکل جائے اور اپنے منصوبے کے مطابق شور مچا کر اڑوس پڑوس کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرے۔

بے آواز قدموں سے میں سیڑھیوں کی طرف گیا۔ راستے میں وہ کمرا بھی پڑتا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے مخبوط الحواس بڈھے کو بستر پر بیٹھ کر آگے پیچھے جھولتے دیکھا تھا۔ بوڑھا وہیں بستر پر موجود تھا، اور آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ اپنے کمرے سے باہر ہونے والے ہنگامے کی اسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ میں بوڑھے کو نظرانداز کرتا ہوا دوسری منزل پر آگیا۔ طاقت ور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اپنی پشت راہداری کی دیوار کے ساتھ ٹکائی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ایک نامانوس سی حیوانی بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ یہ کسی جانور کی بو تو نہیں تھی۔ شاید کسی بدبودار انسان کا گزر ہوا تھا یہاں سے۔ سیڑھیوں سے دس بارہ قدم آگے مجھے قالین پر خون کے دو تین قطرے نظر آئے۔ یہ بالکل تازہ خون تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ نوشین کے بدنصیب ڈرائیور کا خون ہے۔ میں نے انگلی سے خون کو چھوا۔ یہی لمحے تھے جب مجھے ایک مدھم آواز سنائی دی، یہ چینی کا گلدان ٹوٹنے کی آواز تھی۔ آواز نیچے کی راہداری سے آئی تھی۔ فرش پر ہر طرف دبیز قالین موجود تھے، گلدان گر کر نہیں ٹوٹ سکتا تھا، یقیناً اسے دیوار پر پٹخا گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے ایک بار پھر زیریں منزل کی طرف کھینچا۔ میں واپس مڑا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے پھر وہی خوفناک غراہٹ میرے کانوں سے ٹکرائی تھی جو میں چند منٹ پہلے سن چکا تھا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا۔ غراہٹ موجود تھی اور میرے بالکل قریب تھی۔ پھر میں خواب گاہ کے سامنے پہنچا اور میری آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر کسی بھیانک خواب کا شبہ ہوتا تھا۔ ایک ہیبت ناک حبشی جس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور جسم کسی پہاڑ کی طرح مضبوط تھا، خوب صورت نوشین سے چمٹا ہوا تھا۔ حبشی کے جسم پر ایک انڈرویئر کے سوا اور کچھ نہیں تھا، اس کا بالوں سے بھرا ہوا جسم اس کی سیاہ رنگت کو سیاہ تر بنا رہا تھا۔ حبشی نے نوشین کا لباس تار تار کردیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ نوشین کی گردن کے گرد بل کھا کر اس کے ہونٹوں پر اتنی مضبوطی سے جما ہوا تھا کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکتی تھی۔ کچھ بھی تھا، وہ ایک جواں سال صحت مند لڑکی تھی۔ حبشی کے خلاف نوشین کی مزاحمت نظر آنی چاہیے تھی۔ مگر یوں لگتا تھا کہ وہ ایک خوفناک آکٹوپس کے چنگل میں ہے اور موت کو سامنے دیکھ کر سکتے میں چلی گئی ہے۔ وہ چیخ ضرور رہی تھی لیکن یہ چیخیں اس کی مزاحمت کا حصہ نہیں تھیں۔ یہ چیخیں صرف اس اذیت کے سبب تھیں جو اس کے جسم کو پہنچ رہی تھی۔ خوفناک حبشی نوشین کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ وہ بدنصیب ڈرائیور کے جسم کی طرح اس کے جسم سے بوٹی تو علیحدہ نہیں کر رہا تھا لیکن جہاں کاٹتا تھا اتنی زور سے کاٹتا تھا کہ خون رس آتا تھا۔ خاص طور سے وہ اس کے "بالائی جسم" کو نشانہ بنا رہا تھا۔ تاہم اس کے انداز میں جنسیت کے بجائے خالص درندگی نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے نوشین کو زور سے دھکا دیا۔ اس کی یہ حرکت اتنی اچانک تھی اور اس حرکت کے پیچھے اتنی زیادہ طاقت تھی کہ میں بالکل اپنا دفاع نہ کرسکا۔ نوشین مجھ سے ٹکرائی۔ اس کے سر کا تصادم میری ٹھوڑی کے نچلے حصے سے ہوا تھا، پھر وہ لہراتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور چیخ کر بے سُدھ ہو گئی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں بھی پشت کے بل فرش پر گرا تھا اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بڑے گلدان کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ گلدان نوشین نے ٹانگ مار کر گرایا تھا تاکہ گلدان ٹوٹنے کی آواز مجھے اس کی طرف متوجہ کرسکے۔

دیو ہیکل حبشی ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں فرش سے اٹھنے کی کوشش میں تھا، ایک بار پھر زمین بوس ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں یک لخت کئی ٹن فولادی بوجھ کے نیچے آگیا ہوں۔ بدبو کا ایک جھونکا میرے دماغ میں گھسا اور چہرے پر ناگوار سانسوں کی بو محسوس ہوئی۔ وہ آدم خور جبڑا جس نے کچھ دیر پہلے بدنصیب ڈرائیور رمضان علی کا نرخرا ادھیڑا تھا، میرے بالکل قریب تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح ہاتھ چلائے اور مدِمقابل کے گھونگریالے بال مٹھی میں جکڑنے میں کامیاب ہوا۔ پورا زور لگا کر میں نے حبشی کا چہرہ خود سے دور کیا اور پھر اپنے پاؤں کے زور سے اسے پیچھے اچھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ گرانڈیل حبشی کے ایک کان میں نیلے رنگ کا بڑا سا بالا نظر آرہا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکے کے ساتھ ایک فلم سی چل گئی۔ جن دنوں میں بمبئی میں تھا، میں نے ایک بہت بڑے مصری تاجر کے پاس ایک عجوبۂ روزگار غلام دیکھا تھا۔ اس دیو ہیکل حبشی غلام کے کان میں بھی ایسا ہی بالا تھا اور اس کے گلے میں ہر وقت لوہے کی زنجیر رہتی تھی۔ مصری تاجر نے انکشاف کیا تھا کہ اس شخص کا تعلق مشرقی افریقہ کے جنوب میں بسنے والے ایک نہایت خطرناک اور "آدم خور" قبیلے سے ہے جسے "مسا" کہا جاتا ہے۔ تاجر نے بتایا تھا کہ افریقہ کے جنگل جو وحشی قبائل بھی مسائیوں کی دہشت اور بربریت سے کانپتے

ہیں اور انہیں جنات کا نطفہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی باتیں مجھے ان مسائی حبشیوں کے بارے میں معلوم ہوئی تھیں۔ میرے سامنے جو حبشی کھڑا تھا وہ ہو بہو اسی حبشی جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ عام نیگروز کے برعکس اس کے ہونٹ کچھ پتلے تھے اور ناک مخروطی تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے خوفناک چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ آنکھیں انسانی آنکھیں ہونے کے باوجود انسانی نہیں تھیں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اپنی زندگی کے ایک کٹھن ترین مرحلے سے دوچار ہو گیا ہوں۔ میرے سامنے انسان نہیں تھا' افریقہ کے تاریک جنگلوں سے آیا ہوا ایک درندہ تھا' مگر مشکل یہ تھی کہ وہ فقط درندہ ہی نہیں تھا' اس میں انسان کی ذہانت اور عیاری بھی موجود تھی۔ اس نے اپنے دونوں قوی ہیکل بازو خوفناک انداز میں پھیلا رکھے تھے اور حملے کے لیے تیار تھا۔ میری نگاہ اس کے نہایت سفید دانتوں پر پڑی' ان دانتوں پر رمضان علی اور نوشین کے خون کی سرخی موجود تھی اور یہ سرخی اس کے ہونٹوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بالکل سفید آنکھوں میں جھانکنے سے جسم میں جھرجھری پیدا ہوتی تھی' یہ آنکھیں پیاس پیاس پکار رہی تھیں اور یہ گوشت اور خون کی پیاس تھی۔ مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا جب میں نے دیکھا کہ حبشی مجھ پر حملہ آور ہونے کے بجائے ایک بار پھر نیم عریاں نوشین پر جھپٹ پڑا ہے۔ اس مرتبہ نوشین کے لیے اس کا انداز زیادہ جارحانہ تھا۔ شاید وہ اپنے دانتوں سے اس کا گوشت نوچ لینا چاہتا تھا۔ اگلے ہی لمحے بے ہوش نوشین اس کے شکنجے میں تھی' یہ لمحوں کی مہلت تھی۔ میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت "حبشی درندے" کے دانت نوشین کی شہ رگ میں پیوست ہو سکتے ہیں۔ میں نے چھلانگ لگائی اور مسائی حبشی کی نہایت توانا گردن اپنے بازو میں جکڑلی۔ یہ میرا سب سے خطرناک داؤ تھا اور مسائی اس داؤ کی زد میں تھا۔ میں نے اس کی گردن کو مخصوص جھٹکا دیا۔ میں نے کافی طاقت صرف کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے دم ہو کر میری بانہوں میں جھول جائے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ میری توقع سے بہت کم تھا۔ حبشی ذرا سا لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ نہ صرف سنبھل گیا بلکہ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے میری آنکھوں میں انگلیاں دے ماریں۔ یہ اندھا کر دینے والا بے رحم وار تھا۔ میری دونوں آنکھوں پر ضرب آئی لیکن ایک آنکھ سے تو باقاعدہ خون کا فوارہ نکل پڑا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ میری ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے' ذہن میں نیلی پیلی چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ میں نے داہنی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر زخمی آنکھ سے دیکھنے کی اضطراری حرکت کی۔ خون کی سرخی کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ اسی دوران میں ایک فولادی ہتھوڑا سا میرے سر سے ٹکرایا۔ یہ مسائی حبشی کا مُکا تھا۔ میں تیورا کر فرش پر گرا۔ حبشی کی کئی زوردار ٹھوکریں میرے پیٹ کے بالائی حصے میں پسلیوں کے درمیان لگیں۔ محسوس ہوا کہ بس ابھی پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ یوں لگتا تھا کہ اس درندہ نما انسان کو انسانی جسم کے نازک حصوں پر ضربات لگانے میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن بدمقابل یہ مہلت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھا' اس نے مجھے کھینچ کر دیوار سے دے مارا۔ یہ میری زندگی کے کٹھن ترین مواقع میں سے ایک موقع تھا۔ درحقیقت آنکھوں پر لگنے والی ضرب نے میری مزاحمت کو چند ہی لمحوں میں مسمار کر کے رکھ دیا تھا۔ اب عقل مندی یہ نہیں تھی کہ حبشی سے مقابلہ جاری رکھا جاتا اور نتیجے میں خود کو موت کے منہ میں دھکیلا جاتا' لڑائی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب حکمت عملی کے تحت پسپائی اختیار کرنا ضروری ہوتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ اس درندہ نما حبشی کی جان لیوا لپیٹ سے نکلنے کی کوشش کروں' لیکن پھر فوراً میرا دھیان نوشین کی طرف چلا گیا۔

میں حبشی کے تیور دیکھ چکا تھا۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ میں یہاں سے باہر نکلا تو حبشی میرے پیچھے نہیں آئے گا' وہ فوراً نوشین کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اس کا کومل بدن دانتوں سے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اور یہ مجھے کسی صورت منظور نہیں تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ جب بھی کوئی ایسا نازک موقع آتا تھا' نواب زادی شاہین کی صورت میری نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ میں اسے درندہ صفت عیسیٰ جان سے بچا نہیں سکا تھا۔ یہ پچھتاوا کسی وقت میرا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ خاص طور سے جب کوئی شخص میری وجہ سے جان کے خطرے کا شکار ہوتا تھا' ماضی کا وہ خونی واقعہ اپنی تمام تر تلخی کے ساتھ میرے ذہن میں اودھم مچا دیتا تھا۔ میں نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ ایک بار پھر حبشی پر حملہ کیا' میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اڑنگا لگا کر نیچے گرا دیا۔ جب ستاروں کی گردش ساتھ نہ دے رہی ہو تو سیدھے کام سے بھی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔ حبشی میری کوشش سے گرا ضرور مگر وہ بے ہوش نوشین کے اوپر گرا۔ وحشت اور دیوانگی کے عالم میں اس نے ایک بار پھر اپنے دانت نوشین کے جسم میں گاڑ دیے۔ اس مرتبہ نوشین کے جسم کا نازک ترین حصہ اس کی زد میں تھا۔ وہ اس کی گردن پر دانت جمائے ہوئے تھا۔ سوچنے کے لیے ایک لمحے کی مہلت بھی نہیں تھی' میں نے تڑپ کر اپنی انگلیاں حبشی کی باچھوں میں گھسیڑ دیں۔ اپنی پوری قوت صرف کر کے میں اس کا خونی جبڑا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے پہلی

مرتبہ انسانی جبڑے کی بے پناہ قوت کا احساس ہوا۔ کسی طاقت ور ہائیڈرالک پریس کی طرح جبڑا میری انگلیوں کو پیستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا زور حبشی کی باچھوں کی طرف منتقل کیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اسے نوشین سے پیچھے ہٹا لیا۔ بالکل جیسے کوئی درندہ ایک شکار کو چھوڑ کر دوسرے پر جھپٹتا ہے' حبشی مجھ پر جھپٹا۔ ایک بار پھر اس نے میری آنکھوں میں انگلیاں گھسیڑنے کی بے رحمانہ کوشش کی' اس مرتبہ میں نے یہ کوشش ناکام بنائی۔ حبشی نے بھنا کر میری ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ ایسی نازک ضربات لگانے میں اس وحشی کو یقیناً خصوصی مہارت حاصل تھی۔ یہ "ضرب" میری قوت مزاحمت کو ایک بار پھر صفر پر لے آئی۔ مجھے فرش پر نیم بسمل چھوڑ کر حبشی تیسری مرتبہ نوشین پر جھپٹا' اس کے منہ کو نوشین کا خون لگ گیا تھا۔ اس نازک بدن کے نرم ملائم گوشت کی بھوک' جیسے حبشی کے پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں شاید نوشین کو بچا نہیں سکوں گا۔ مگر جب تک میرے حواس کام کر رہے تھے' میں اس لڑکی کو درندے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے میں پھر اٹھا اور حبشی پر جھپٹ پڑا۔ میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا کہ کاش میرا خنجر میری پنڈلی کے ساتھ ہوتا۔ کسی ہتھیار کے بغیر میں خود کو بالکل بے کار محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ادراک ہو رہا تھا کہ میرے بازوؤں میں اتنی سکت نہیں رہی کہ میں اس شہ زور درندے کو من مانی سے روک سکوں۔ میں نے دونوں ہاتھ حبشی کی کمر میں ڈال دیے اور اسے پیچھے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ حبشی کے جسم پر ایک انڈرویئر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ یہ انڈرویئر پھسل کر اس کے گھٹنوں پر آ گیا ہے۔ حبشی اب بالکل عریاں تھا مگر اس عریانی کی اسے مطلق پروا نہیں تھی اور ہوتی بھی کیوں؟ وہ انسان سے زیادہ درندہ تھا' اور درندے کے لیے لباس بے معنی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور پھر جب بدمقابل ایسا کمینہ ہو اور ہر اوچھا ہتھکنڈا استعمال کر رہا ہو تو حدود کا خیال رکھنا کبھی کبھی حماقت کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ میں نے حبشی کے جسم کے نازک حصے پر دو تین بے رحم ضربیں لگائیں' وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اسے عقب سے کھینچ کر دیوار سے دے مارا۔ وہ ایک واش بیسن سے ٹکرایا اور اسے آئینے سمیت چکنا چور کر گیا۔ تاہم اس نے دوبارہ اٹھنے میں ایک ساعت کی تاخیر نہیں کی۔ ٹانگوں میں الجھے ہوئے انڈرویئر کو اس نے اتار کر دور پھینک دیا اور حلق سے ایک جنگلیوں جیسی غصیلی آواز برآمد کر کے مجھ پر جھپٹا۔ چند ساعتوں میں اس نے میرے جسم پر درجنوں ضربیں لگائیں اور نیم جان کر دیا۔ شکر شکرا سے دو بدو مقابلوں کے دوران میں مجھ پر چند ایک "سخت مقامات" آ چکے تھے لیکن یہ صورت حال ان سب سے زیادہ سنگین تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جسم کے کئی حصوں سے خون نکل رہا ہے' سب سے زیادہ پریشان کن اور حوصلہ شکن چوٹ آنکھ کی تھی۔ میں یہ چوٹ دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم اس وقت مجھے اتنی فی صد یقین تھا کہ میری ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ درحقیقت یہی چوٹ تھی جس نے مجھے ناک آؤٹ ہونے کے بالکل قریب کر دیا تھا۔

مجھے نیم جان کر کے مسائی حبشی حسب سابق پھر نوشین کی طرف بڑھا تو میں نے آخری کوشش کے طور پر اس کا ٹخنا پکڑ لیا۔ ساتھ ساتھ میں چیخ رہا تھا "کوئی ہے۔۔۔ کوئی ہے؟" پروفیسر چند گز دور تھا لیکن اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے باندھا تھا' وہ میری مدد کو کیسے آ سکتا تھا۔ اور اگر کھلا بھی ہوتا تو کیا معلوم کہ آتا یا نہیں۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید قریبی کمرے میں بیٹھا مخبوط الحواس بوڑھا متوجہ ہو جائے اور کوٹھی کے صحن میں نکل کر چیخ و پکار شروع کر دے۔ لیکن یہ خیال بھی خام ہی ثابت ہوا۔ مسائی حبشی نے میرے زخمی چہرے کو تین چار ٹھوکروں سے مزید زخمی کیا اور خود کو چھڑا لیا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ میں قالین پر اوندھا پڑا تھا۔ اچانک میری نگاہ صوفے کے نیچے چلی گئی۔ یہاں وہ طاقت ور "اے کے ۵۶" رائفل موجود تھی جو ریچھ نما کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔ یہ سائیلنسر لگی رائفل میرے اور نوشین کے لیے زندگی کا پیام بن سکتی تھی۔ میرے نیم جان بدن میں ایک

قریبی نواب محی الدین نواب کا مالی ضمیر کر جھنجھوڑ دینے والا ناول

اجازت

+ روزی کی تلاش میں سات سمندر پار جانے والوں کا المیہ۔
+ دو محبت کرنے والوں کی انوکھی داستان۔

قیمت -/150 [illegible] ڈاک خرچ -/20

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر [illegible]

بار پھر حوصلے کی لہر دوڑ گئی۔ میرا اور رائفل کا فاصلہ چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے معطل ہوتے ہوئے حواس کو سنبھالا دیا اور صوفے کے نیچے ہاتھ ڈال کر رائفل نکال لی۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کا میگزین نصف سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا' رائفل دس گولی کے برسٹ پر سیٹ تھی۔ میگزین پر اپرل اپیچ تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے رائفل درندہ نما حبشی کی طرف سیدھی کی۔

"ادھر دیکھو کالے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ مادر زاد برہنہ میری طرف گھوما۔ میری ٹھوڑی سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ رائفل کے نقرئی دستے پر گر رہا تھا۔ میرے اور حبشی کے درمیان نوشین کے قیمتی لباس کی دھجیاں بکھری ہوئی تھیں' اور اس گلدان کے ٹکڑے تھے جو نوشین نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے توڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر حبشی کے چہرے پر ذرا سا تردد نظر آیا' پھر اس کے ہونٹوں سے وہی لرزہ خیز غراہٹ نکلی جس میں کانگو کے تاریک ترین جنگلات کی وحشت چھپی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ مجھ پر جھپٹنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے جسم میں جنبش پیدا ہوتی' میں نے ٹریگر دبا دیا۔ پہلا برسٹ حبشی کے سینے پر لگا اور وہ اس کے دھکے کے سبب دیوار سے جا ٹکرایا۔ رائفل کے دوسرے برسٹ نے اس کی تناور گردن چھلنی کی اور کھوپڑی کا ایک حصہ اڑا کر رکھ دیا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح ڈرائیور رمضان علی کی لاش کے پہلو میں گر گیا۔ اس کے خون سے کمرے کا سرخ قالین سرخ تر ہونے لگا۔

میں نے رائفل قالین پر رکھ دی اور اوندھے منہ لیٹے لیٹے اپنا سر زمین سے ٹکا دیا۔ جسم کے ہر حصے سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ قریباً ایک منٹ اسی طرح گزرا۔ پھر میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ راہداری میں واش بیسن کے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے ایک ٹکڑا اٹھایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آنکھ کی حالت کیا ہوگی۔۔۔ میں اپنی آنکھ دیکھوں گا؟ اس کی جگہ ایک گھاؤ دیکھوں گا؟ یا آنکھ کے ڈھیلے کو زخم زخم دیکھوں گا؟ نجانے کیوں ایک بے معنی اور بے موقع سا خیال میرے ذہن میں آنے لگا۔ یہ غزالہ کا خیال تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں ایک آنکھ سے معذور ہو کر اس کے سامنے جاؤں گا؟

میں نے شیشے کا ٹکڑا چہرے کے سامنے کیا۔ بائیں آنکھ کے مقام پر خون کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ پلکوں پر بھی گہرا زخم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹھیک آنکھ ہاتھ سے بند کر کے زخمی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی۔۔۔ خون کی سرخی اور روشنی و تاریکی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آنکھ مکمل تباہی سے بچ گئی ہے۔

میں نے باتھ روم میں گھس کر شاور کھول دیا اور نیچے کھڑا ہوگیا۔ کتنی ہی دیر میں سرد پانی کے نیچے کھڑا رہا۔ زخموں اور خراشوں سے خون دُھل دُھل کر بہتا رہا۔۔۔ پھر میں نے تولیے سے چہرہ صاف کیا۔ زخمی آنکھ کی بینائی پہلے سے بہتر محسوس ہونے لگی' تاہم درد پہلے سے شدت اختیار کر گیا۔ میں نے نوشین کا نیم عریاں جسم ایک چادر سے ڈھانپا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر چوٹ آئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ نہایت خوب صورت شفاف گردن پر مسائی حبشی کے دانتوں کے مدھم نشان موجود تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے اور ہاتھ پاؤں کی مالش کی۔ وہ مکمل ہوش میں تو نہیں آئی لیکن اس کی سانس بہتر ہوگئی اور نبض معمول کے مطابق چلنے لگی۔ میں نے اسے اٹھا کر خواب گاہ کے بستر پر لٹا دیا۔

یہیں صوفے پر پروفیسر اللہ دتا بندھا پڑا تھا۔ اللہ دتا دروازے میں سے وہ طویل اور خونی جدوجہد دیکھتا رہا تھا جو میرے اور مسائی حبشی کے درمیان ہوئی تھی۔ اس دوران میں اللہ دتا یقیناً چیختا چلاتا بھی رہا ہوگا لیکن اس کا گلا چونکہ بالکل بیٹھ چکا تھا لہٰذا یہ آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے دیکھا' پروفیسر اللہ دتا جو بہت سے لوگوں کے لیے مسیحا تھا' اب خود برسوں کا مریض دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی رنگت بالکل مٹی ہو رہی تھی اور آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا اور بڑے دُکھی انداز میں میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دل میں نجانے کیا بات آئی۔ میں نے اس کی ٹانگوں کی بندش کھول دی اور ہاتھ بھی کھول دیے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ بالکل غیر متوقع طور پر اس نے بازو پھیلائے اور روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

"میں نے تمہارے بارے میں بہت سنا تھا شاہ جہاں صاحب۔۔۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تم ایک باہمت شخص ہو۔ تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ میں۔۔۔ میں تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بناوٹ یا خوشامد کا شائبہ تک نہیں تھا۔

وہ بے ساختہ میرے کندھے پر بوسا دیتے ہوئے بولا "میں۔۔۔ میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا شاہ جہاں۔۔۔ ایک ایک بات بتاؤں گا۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے' کچھ نہیں چھپاؤں گا۔۔۔ ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

اس کی آواز لرز رہی تھی' اور آواز کی یہ عجیب لرزش بتا رہی تھی کہ وہ کچھ حیرت انگیز انکشافات کرنے جا رہا ہے۔

"وہ حیرت انگیز انکشافات کیا ہو سکتے ہیں؟"

یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گونج رہا تھا مگر اس سوال کا جواب اسی وقت مل سکتا تھا جب پروفیسر اللہ دتا اپنی زبان کو حرکت دیتا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک دل دوز ہچکی اس کے سینے کو دہلا جاتی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی پروفیسر اللہ دتا ہے جسے لوگ مسیحا مانتے ہیں' جس کے پاؤں چھوتے ہیں اور جس کے ایک ٹیلی فون پر کمشنر تک بھاگا چلا آتا ہے۔ نجانے ایسا کون سا ظلم ہوا تھا پروفیسر پر کہ جس نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور یہ ایسا ظلم تھا جس کی مزاحمت کرنا پروفیسر جیسے بارسوخ شخص کے بس میں بھی نہیں تھا۔

پروفیسر کی نگاہ میری زخمی آنکھ پر پڑی تو وہ کچھ دیر کے لیے رونا دھونا بھول گیا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی دونوں ٹیوب لائٹس جلا دیں' ان کی روشنی میں بڑے غور سے میری آنکھ کا معائنہ کیا۔ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "تمہیں ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے' آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مجھے لے کر ایک قریبی کمرے میں پہنچا۔ یہ کمرا چھوٹی سی ڈسپنسری کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میری آنکھ پر مرکوز کر دی۔ پہلے اس نے کسی محلول سے میری آنکھ اور ٹھوڑی کو صاف کیا' پھر کوئی دوا لگانے میں مصروف ہوگیا۔

کہنے لگا "مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تمہارے چہرے پر پلاسٹک میک اپ موجود ہے لیکن اب میں خود دیکھ رہا ہوں۔ ٹھوڑی کے کٹ پر میک اپ کی فالتو جھلی صاف نظر آ رہی ہے۔"

وہ قریباً آدھ گھنٹا میری آنکھ اور ٹھوڑی کے ساتھ مصروف رہا۔ اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی اور ٹھوڑی پر روئی کا پھاہا رکھ کر میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ جسم کے دیگر حصوں پر بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ پروفیسر نے جہاں جہاں ضروری سمجھا' دوا لگا دی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ایلوپیتھک یا ہومیوپیتھک دوا نہیں تھی بلکہ پروفیسر کی اپنی فارمیسی کی تیار کردہ تھی۔

مجھے ٹریٹ کرنے کے بعد پروفیسر نوشین کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے سر اور گردن کا زخم دیکھا۔ ان زخموں پر اس نے چابک دستی سے مرہم پٹی کر دی۔ نوشین کے "بالائی جسم" پر بھی کاٹنے کے نشانات موجود تھے۔ میں نے نوشین کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ پروفیسر نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ان زخموں پر مرہم وغیرہ لگایا۔ پھر ایک ایلوپیتھک انجکشن اس کے بازو میں لگا دیا۔ نوشین سے فارغ ہو کر ہمیں ان دو ملازموں کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو بے ہوش پڑے تھے۔ ان میں سے ایک گارڈ تھا جسے میں نے گردن دبا کر بے ہوش کیا تھا' دوسرا گھریلو ملازم تھا جو ٹھوڑی پر میرا "راؤنڈ پنچ" کھانے کے بعد انٹا غفیل ہوا تھا۔ جس وقت پروفیسر اللہ دتا ان دونوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا' میں نے فون کا کٹا ہوا تار دوبارہ سے جوڑا اور ساہی صاحب کو کال کر دی۔

ساہی صاحب صرف پندرہ منٹ کے اندر اپنی نفری کے ساتھ کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ان پندرہ منٹ کے اندر میں نے صرف ایک کام کیا تھا۔ میں بالائی منزل کے اس کمرے میں پہنچا تھا جہاں پروفیسر کی شرمناک تصویریں لگی تھیں اور زنانہ کپڑے دیوار سے ٹنگے ہوئے تھے (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کپڑے پروفیسر کی اکلوتی بیٹی کے تھے) میں نے تمام تصویریں دیواروں سے اتار لیں اور کپڑے بھی لپیٹ کر ایک صندوق میں بند کر دیے۔ تصویریں میں نے صحن میں جا کر نوشین کی گاڑی میں چھپا دیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس کی خانہ تلاشی کے دوران میں یہ سب کچھ منظرِ عام پر آ جائے اور پروفیسر کی جگ ہنسائی ہو۔

○☆○

پروفیسر نے جن انکشافات کا ذکر کیا تھا وہ اس نے اگلے روز دوپہر کے وقت کیے۔ ہم پروفیسر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازے بند تھے اور کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کل جو معاملات اس چار دیواری میں پیش آئے تھے' انہیں ساہی صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔ ڈرائیور رمضان علی اور مسائی حبشی کے قتل کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ ایف آئی آر پروفیسر کی طرف سے درج ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ نیم پاگل غیر ملکی نیگرو ان کی کوٹھی میں گھس آیا تھا۔ اس وقت مس نوشین کا ڈرائیور اتفاقاً کوٹھی میں موجود تھا۔ نامعلوم نیگرو نے اس پر اچانک حملہ کر کے گردن ادھیڑ دی۔ رمضان علی نے شدید زخمی ہونے کے باوجود رائفل سے حبشی پر فائرنگ کی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعد ازاں ڈرائیور رمضان خود بھی ڈھیر ہوگیا' اخبار والوں کو اس واردات کی تفصیل سے حتی الامکان دور رکھا گیا تھا۔

پروفیسر نے اپنا گلا صاف کرنے کے لیے منہ میں کوئی گولی رکھی اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا "میں سمجھتا ہوں

کہ نوشین نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ تمہیں میرے بارے میں نہ بتاتی تو تم اس کوٹھی میں نہ آتے' اور اگر تم یہاں نہ آتے تو میں کل اپنی آنکھوں سے وہ منظر بھی نہ دیکھ پاتا جس نے میرے دل و دماغ کو تبدیل کیا ہے اور میں اپنی زبان کھولنے پر آمادہ ہوا ہوں۔"

"آپ کس منظر کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہی۔۔۔ کل حبشی کے ساتھ تمہاری لڑائی کا منظر۔ زخمی ہونے کے باوجود تم نے جس طرح کوشش جاری رکھی اور آخر تک حوصلہ نہیں ہارا' وہ نہ بھولنے والا واقعہ ہے۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر تم اس خونی سے پیچھا چھڑا کر باہر نکل جاتے تو وہ بھی تمہارے پیچھے نہ جاتا۔ وہ نوشین پر جھپٹ پڑتا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ پھر اس کے بعد وہ شاید۔۔۔ میری طرف آجاتا۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔" میں نے کہا "بہرحال اب تو یہ سب کچھ بیت گیا۔ اب یہ تذکرہ چھیڑ کر پریشان ہونے سے کیا فائدہ!"

پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔ چند لمحے تک اس کے چہرے پر شدید تذبذب نظر آیا پھر اس نے ڈرامائی لہجے میں بولنا شروع کیا "تمہیں معلوم ہے' کچھ عرصہ پہلے علاقہ مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر ہلاک ہوگیا تھا؟ ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ چھانگا مانگا کے نزدیک دونوں کی گاڑی الٹ گئی تھی۔ ویران جگہ پر میاں بیوی کی لاشیں ساری رات پڑی رہی تھیں اور جنگلی جانور انہیں نوچتے کھسوٹتے رہے تھے۔"

مجھے یاد آگیا' یہ واقعہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ مجسٹریٹ درجہ اول شیر محمد ڈوگر اور اس کی بیوی کی المناک موت کی خبر اخبارات میں تفصیل سے چھپی تھی۔ میں نے کہا "ہاں پروفیسر صاحب' میں نے یہ نیوز پڑھی تھی۔ یہ تو کوئی دس گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔"

وہ بولا "اور ڈی ایس پی کمانڈو کے بارے میں کچھ پتا ہے؟ وہ پنجاب پولیس کے بہت نڈر اور دلیر افسروں میں سے ایک تھا۔ کئی اصلی پولیس مقابلے اس کے کھاتے میں ہیں۔"

"وہ شاید کچھ عرصے سے غائب ہے۔ ایک اخباری خبر میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اسے کسی نے گاڑی سمیت اغوا کرلیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اور وہ گاڑی بعد میں پولیس کو ایک ویران مقام سے مل بھی گئی تھی۔"

"کیا یہ دونوں واردتیں ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں؟"

"بے شک ایسا ہی ہے۔" پروفیسر اللہ دتا کی آواز ڈرامائی ہوتی چلی جارہی تھی "ان دونوں نہایت بااثر افراد کو ایک ہی بندے نے قتل کیا ہے۔"

"کیا مطلب' ڈی ایس پی کمانڈو بھی ہلاک ہوچکا ہے؟"

"ہاں' وہ بھی مرچکا ہے۔"

"کس نے مارا ہے؟"

"میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا شاید تم اس پر یقین نہ کرسکو مگر یہ ہے بالکل سچ۔" پروفیسر کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا "مرنے والے یہ دونوں افراد میرے دوستوں میں سے تھے اور ان کی ہلاکت کی وجہ بھی میں ہی ہوں۔ مجھ سے دوستی کا رشتہ ہی ان کی موت کا سبب بن گیا۔"

میری سوالیہ نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پروفیسر نے کہا "اس کہانی کا آغاز آج سے قریباً ڈھائی سال پہلے ہوا تھا۔ میرا بھائی ارشاد ایک ریکروٹنگ ایجنسی چلا رہا تھا' ایک روز ایک شخص اس سے ملا اور اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہے' اس غیر ملکی سیاہ فام شخص نے اپنا نام مائیکل بتایا۔ اس کا تعلق ماریطانیہ سے تھا۔ وہ بظاہر بے حد مہذب اور شائستہ نظر آتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ارشاد احمد پر اس کے جوہر کھلنے لگے۔ وہ ایک نہایت بے رحم اور سفاک قسم کا بردہ فروش ثابت ہوا۔ وہ انسانوں کا سوداگر تھا اور پاکستان میں اس کی موجودگی بھی اسی پیشے کے سلسلے میں تھی۔ اس نے ارشاد احمد کو بھی آہستہ آہستہ اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ مائیکل کے ساتھ مل کر کام کرنے پر رضامند ہوگیا۔ مجھے اس صورت حال کا پتا چلا تو سخت پریشانی ہوئی۔ میں نے ارشاد احمد کو نہایت سخت لفظوں میں سمجھایا بلکہ اسے وارننگ دی کہ اگر وہ اس معاملے سے الگ نہیں ہوا تو میں پولیس میں اطلاع دوں گا۔ ارشاد احمد مجھ سے تو یہی کہتا رہا کہ وہ مائیکل سے الگ ہوگیا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کام میں اور بری طرح ملوث ہوتا جارہا تھا۔ وہ بے راہ روی کا شکار بھی ہورہا تھا۔ اس نے شراب پینا شروع کردی تھی اور اکثر نوجوان لڑکیاں اس کے دفتر میں دیکھی جاتی تھیں۔ انہی حالات سے دل برداشتہ ہوکر ارشاد احمد کی بیوی بھی اس سے روٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ وہ میرے ساتھ اسی گھر میں رہا کرتا تھا مگر اس کا رہن سہن دیکھتے ہوئے میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست کرلے۔ انہی دنوں اس نے مسلم ٹاؤن والی کوٹھی بنوائی اور وہاں شفٹ

ہوا۔ بہرحال وہ اکثر یہاں بھی آتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایک دو روز میرے پاس رہتا تھا۔ گھر کا ایک کمرا اب بھی اسی کے پاس تھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ارشاد احمد سادہ لوح لوگوں کو ڈنمارک ایسٹ اور یورپ بھجوانے کا جھانسا دے کر مائیکل کے ہاتھ فروخت کررہا ہے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ارشاد ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بھی اس گھناؤنے کاروبار کی طرف مائل کرنے لگا۔ ایک روز مشتعل ہوکر میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ پولیس کو تمام صورت حال سے آگاہ کردوں گا۔ اسی روز مائیکل نامی وہ شخص ارشاد احمد کے ساتھ میرے گھر آیا اور اس نے مجھے میری بیٹی سمیت یرغمال بنالیا۔ مائیکل ایک لمبے چوڑے شخص کا نام ہے۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے زائد ہے۔ ہر وقت تھری پیس سوٹ میں نظر آتا ہے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگاتا ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک نہایت مہذب شخص دکھائی دیتا ہے لیکن اس کی اصل کچھ اور ہے۔ اس جیسا بے رحم اور بے خوف شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ شاید آئندہ دیکھوں۔"

ایک لمحہ توقف کرکے پروفیسر اللہ دتا نے ایک طویل آہ کھینچی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تمہارے خیال میں افریقہ کے دور دراز جنگلوں میں بسنے والے آدم خور قبائلی کیسے ہوتے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"آدم خور قبائلیوں کا حلیہ تمہارے خیال میں کیسا ہوتا ہے؟"

"وہ ننگ دھڑنگ لوگ ہوتے ہیں یا بہت مختصر لباس پہنتے ہیں۔ چہرے پر دھاریاں وغیرہ بناتے ہیں۔ بلند آواز میں چیختے چلاتے ہیں یا صرف مقامی زبان بولتے ہیں۔"

پروفیسر نے کہا "لیکن میں ایک ایسے وحشی آدم خور کو جانتا ہوں جو انگلش میں بات کرسکتا ہے۔ آنکھوں پر چشمہ لگاتا ہے اور تھری پیس سوٹ پہنتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہوگے۔" ایک لمحہ رک کر پروفیسر نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "مائیکل ایک آدم خور ہے۔ میں نے خود۔۔۔ اپنی آنکھوں سے اسے انسانی گوشت کھاتے دیکھا ہے۔"

کمرے میں چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ پروفیسر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "مائیکل نے جب میرے ہی گھر میں مجھے اور میری بیٹی کو یرغمال بنایا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک خطرناک کام کررہا ہے۔ میں اسے جیل میں بھجوا کر دم لوں گا۔ میری اس بات پر مائیکل بے حد غصے میں آگیا۔ پھنکار کر کہنے

خون آشام

مصنف: ایم اے راحت

قیمت -/۵۰ روپے
ڈاک خرچ -/۲۰ روپے

ایک ایسے بوڑھے سادھو کی داستان جس کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہوگیا۔ وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتال میں جھانک سکتی تھیں۔

اُس بہادر نوجوان کی پُراسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پر روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی

پبلشرز
علی میاں پبلی کیشنز غزنی مارکیٹ اردو بازار لاہور

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

لگا کہ تمہیں اپنے تعلقات پر بڑا بھروسا ہے' میں تمہیں تمہارے تعلقات کی حیثیت بتاتا ہوں۔ اس بات کے صرف دو گھنٹے بعد ڈی ایس پی کمانڈو اور علاقہ مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر میرے سامنے پہنچ گئے۔ ڈی ایس پی مختار عرف کمانڈو کو مائیکل کے کارندوں نے اس کے گھر سے اٹھایا تھا جبکہ شیر محمد ڈوگر اپنی بیوی کے ساتھ سیر پر نکلا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ مائیکل نے مجھ سے کہا کہ تمہارے فرینڈز میں سے جو دو سب سے بڑے پھنے خاں تھے انہیں میں اٹھا لایا ہوں۔ اگر کسی اور کو بلانا چاہتے ہو تو اسے بھی بلا لو۔ اگر وہ لاہور میں ہے تو دو گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد ان تینوں کے ساتھ جو سلوک ہوا میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ شخص بلا دریغ قتل کرتا ہے اور قتل بھی ایسے سفاکانہ کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کوٹھی کے نیچے ایک تہ خانہ ہے۔ دراصل یہ اس پرانی عمارت کا تہ خانہ ہے جو پہلے اس جگہ پر موجود تھی۔ ہم نے نئی عمارت بنالی مگر تہ خانہ موجود رہا۔ مائیکل ہم سب کو اس تہ خانے میں لے گیا۔ اس نے شیر محمد ڈوگر' اس کی بیوی اور ڈی ایس پی کمانڈو کو میرے سامنے قتل کیا۔ وہ ایک ایسا منظر تھا جسے میں مر کر بھی نہیں بھول سکوں گا اور نہ میری بیٹی بھول سکے گی۔ اور تو اور' یہ منظر دیکھنے کی تاب اس جہنمی ارشاد احمد میں بھی نہیں تھی جو مائیکل کا دست راست بنا ہوا ہے۔"

پروفیسر نے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرلیں اور کتنی ہی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے رس رہے تھے۔ ایک آہ بھر کر بولا "مائیکل اپنے تین ساتھیوں کو لے کر آیا تھا۔ یہ ویسے ہی لمبے تڑنگے حبشی تھے جیسا تم نے کل دیکھا تھا۔ ان کے جسم پر بس واجبی سا لباس تھا۔ یہ تینوں مائیکل ہی کے قبیلے سے تھے اور آدم خور تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ ان تینوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پہلے شیر محمد ڈوگر کو لایا گیا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔ وہ ایک بانس کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ بالکل جیسے کسی سالم بکرے کو کوئلوں پر روسٹ کرنے کے لیے باندھا جاتا ہے۔ یہ بانس قریباً نو دس فٹ کی بلندی پر افقی رخ پر یوں رکھ دیا گیا کہ شیر محمد ڈوگر کی بلندی فرش سے قریباً سات فٹ تھی۔ تینوں حبشی بھوکے کتوں کی طرح شیر محمد ڈوگر پر ٹوٹ پڑے۔ بانس چونکہ بلندی پر تھا لہٰذا وہ اچھل اچھل کر شیر محمد ڈوگر کے جسم سے بوٹیاں نوچنے لگے۔ ڈوگر کی چیخیں کرب ناک تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میری بیٹی بے ہوش ہوگئی لیکن تماشا جاری رہا۔ حبشی اچھل اچھل کر شیر محمد ڈوگر کے جسم سے گوشت کے لوتھڑے علیحدہ کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے دانتوں کی مدد سے شیر محمد ڈوگر کے جسم سے جھول جاتے تھے۔ ان کے چہرے خون رنگین تھے۔ وہ تھوڑا گوشت چبا رہے تھے اور زیادہ تر ادھیڑ کر پھینک رہے تھے۔ کمرے کا خون آلود فرش کرب آمیز منظر پیش کر رہا تھا۔ بدنصیب شکار کو بلندی پر باندھنے کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ حبشی ایک ہی بار میں اس کا تیا پانچا نہ کردیں بلکہ آہستہ آہستہ گوشت نوچ نوچ کر اسے مارا جائے۔ شیر محمد ڈوگر قریباً دس منٹ میں مر گیا لیکن سیاہ فام دیر تک اسے نوچتے رہے۔

"اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے شیر محمد ڈوگر کی جوان سال بیوی اور ڈی ایس پی کمانڈو کے ساتھ بالکل یہی سلوک کیا گیا۔ میری بیٹی شائستہ کو بار بار غش آ رہا تھا۔ اسے ہوش میں لایا جاتا تھا اور میرے ساتھ یہ منظر دیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ شیر محمد ڈوگر کی بیوی تو پانچ منٹ میں ہی دم توڑ گئی تاہم بدنصیب کمانڈو جو صحت مند جسم کا مالک تھا' دیر تک تڑپتا اور چیختا چلاتا رہا۔ وہ بار بار التجا کر رہا تھا کہ اسے گولی مار دی جائے لیکن آدم خور سیاہ فاموں کی لذت چیخوں میں اس کی پکار نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ پھر ایک سیاہ فام نے چھلانگ لگا کر دانتوں سے اس کا گلا ادھیڑا اور اسے ناقابلِ بیان اذیت سے رہائی ملی۔ اس کے بعد جب مائیکل نے یہی سلوک میری بیٹی کے ساتھ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اسے میرے سامنے بے لباس کیا گیا تو میں مائیکل کے قدموں میں گر پڑا۔ میں نے گڑگڑا کر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور قسم کھائی کہ زندگی بھر اس کا غلام بن کر رہوں گا۔ وہ میری بیٹی کی جاں بخشی کردے۔ مائیکل سفاکانہ انداز میں ہنستا رہا اور مجھے ٹھوکریں رسید کرتا رہا۔ اس نے مجھے جی بھر کر ذلیل کیا اور میری بے بسی کی تصویر کشی بھی کی۔ بہت دیر کے بعد اس نے میری گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی کہ ارشاد احمد کی سفارش پر وہ مجھے معافی دے رہا ہے۔ اس نے کہا کہ جب تک میں اس کے اور ارشاد احمد کے احکامات پر بلا چون و چرا عمل کروں گا' میری معافی برقرار رہے گی۔ جہاں کہیں میں نے ذرا سی سرکشی دکھائی' میری بیٹی کو اذیت دے کر مار دیا جائے گا۔ میری تصویریں کھینچی گئی تھیں وہ شائستہ کے لباس سمیت میرے خواب گاہ میں لگا دی گئیں اور مجھے پابند کیا گیا کہ میں اسی خواب گاہ میں سویا کروں گا۔ درحقیقت مائیکل چاہتا تھا کہ میری بے بسی کا منظر ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہے اور شائستہ کی مزاحمت کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس خواب گاہ میں سونا میرے لیے کتنا دشوار تھا لیکن مجھے سب کرنا پڑتا تھا۔ وہ خواب گاہ نہیں عذاب گاہ تھی لیکن میں

کیا کرتا؟ کہاں جاتا؟ میں ان لوگوں کی وحشت اور درندگی دیکھ چکا ہوں اور مجھے یقین ہے جو ایک بار یہ درندگی دیکھ لیتا ہے پھر زندگی بھر بھول نہیں سکتا۔ میں نے پچھلے ایک سال میں وہی کچھ کیا جو ارشاد اور مائیکل نے مجھ سے کہا۔ میں اپنے عقیدت مندوں کو دھوکا دیتا رہا۔ ان کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ میں نے ایک سال میں کم از کم دو ڈھائی سو افراد کو ارشاد احمد کے چنگل میں پھنسایا ہے۔ لوگ مجھ پر اندھا دھند اعتماد کرتے ہیں اور میرے حوالے سے وہ ارشاد احمد پر بھی بھروسا کرنے لگتے تھے۔ بلکہ بوقتِ ضرورت ارشاد احمد کے کسی شکار کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے اپنی ضمانت بھی دینا پڑتی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ پچھلے چند ماہ میں' میں نے کتنی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ خدا سے رو رو کر باعزت موت اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا ہوں۔ اس دوران میں' میں نے کئی بار سوچا کہ خودکشی کرلوں لیکن یہ حرام موت مر کر بھی میں اپنی نصیبوں جلی بیٹی کا کچھ بھلا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً درندوں کے چنگل میں تھی اور میں اسے اس حال میں چھوڑ کر مر بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے مائیکل نے اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ لاہور ہی میں کسی جگہ ایک کوٹھی میں بند ہے۔ پچھلے قریباً ایک سال میں مائیکل اور ارشاد نے صرف تین مرتبہ مجھے اس کی صورت دکھائی ہے۔ تینوں مرتبہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا اور ایک مختصر ملاقات کے بعد وہ لوگ مجھے واپس لے آئے۔ اپنی بدنصیب شائستہ سے میری آخری ملاقات کوئی تین ہفتے پہلے ہی ہوئی ہے۔" پروفیسر کی آنکھوں میں ایک دم آنسو رواں ہوگئے اور کتنی ہی دیر اس کے ہونٹ تھرتھراتے رہے۔ تب وہ حوصلہ جمع کر کے بولا "آخری ملاقات میں مجھے پتا چلا کہ شائستہ امید سے ہے۔ وہ بیمار بھی تھی۔ زرد پتے جیسی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ بے رحم مردوں کے چنگل میں تھی۔ کب تک اس کی آبرو محفوظ رہتی۔ مجھے تو اب لگتا ہے کہ یہی صورت حال رہی تو وہ وہیں گھٹ کر مر جائے گی۔ اتنے لوگوں کی زندگیاں برباد کرکے اور انہیں بردہ فروشوں کے چنگل میں پھنسا کر بھی مجھے میری شائستہ واپس نہیں ملے گی۔ مجھے نہیں ملے گی میری شائستہ واپس۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا پروفیسر۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ اور شدت سے رونے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوگیا تو میں نے پوچھا "پروفیسر! ایک سال پہلے جن تین افراد کو تہ خانے میں قتل کیا گیا' ان کی لاشوں کا کیا بنا؟"

پروفیسر نے کہا "مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر اور اس کی بیوی کی لاش کو گاڑی سمیت ویرانے میں لے جایا گیا۔ گاڑی کو ایک نشیب میں اس طرح پھینکا گیا کہ یہ ایک اتفاقیہ حادثہ نظر آئے۔ لوگوں کو یہی معلوم ہوا کہ ڈوگر اور اس کی اہلیہ حادثے میں ہلاک ہوئے۔ ان کی لاشیں رات بھر جنگل میں پڑی رہیں۔ پولیس نے یہی سمجھا کہ جنگلی جانور انہیں نوچتے رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق ڈی ایس پی مختار عرف کمانڈو کی لاش کو پھینکا نہیں گیا تھا بلکہ کسی اور طریقے سے ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔"

"مائیکل سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہی تین ہفتے پہلے جب میں نے شائستہ کو دیکھا تھا۔ ارشاد احمد بھی وہیں موجود تھا۔"

"آپ نے اپنے ملنے جلنے والوں اور اہل خانہ کو شائستہ کے بارے میں کیا بتایا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟"

"ہمارے کوئی زیادہ رشتے دار یہاں ہیں نہیں۔ صرف دو تین دور پار کے لوگ ہیں۔ انہیں میں نے کہہ دیا تھا کہ شائستہ اسلام آباد میں پڑھتی ہے اور ہاسٹل میں رہ رہی ہے۔ صرف میری والدہ کو معلوم تھا کہ شائستہ کسی سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔ جس روز اس چار دیواری میں مائیکل نے ڈی ایس پی کمانڈو' مجسٹریٹ شیر محمد اور اس کی اہلیہ کو قتل کیا' میری والدہ بھی یہیں موجود تھیں۔ انہوں نے مرنے والوں کے ساتھ ساتھ اپنی پوتی شائستہ کی چیخیں بھی سنی تھیں۔ پچھلے ایک برس سے وہ مسلسل مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ شائستہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ میں انہیں کچھ نہیں بتا سکا۔ صرف ان کے سر کی قسم کھا کر اتنا یقین دلایا ہے کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ پوتی کے غم میں وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بیمار ہوگئی ہیں۔ ارشاد احمد انہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ ابھی تک اسی کے گھر میں ہیں۔"

مجھے وہ بیمار بوڑھی عورت یاد آگئی جو ارشاد کے گھر کی بالائی منزل پر رہتی تھی۔ میں صرف ایک بار اس سے ملا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہسٹریائی انداز میں چیخیں مارنے لگی تھی۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ کل جو مسائی حبشی میرے ہاتھوں ہلاک ہوا وہ کون تھا اور یہاں کیسے موجود تھا۔

پروفیسر نے جواب دیا۔ "اس خوں خوار کتے کا نام سائن تھا۔ مائیکل نے اسے یہاں صرف مجھے ہراساں کرنے

کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ صرف اشاروں کی زبان سمجھتا تھا اور صرف ارشاد کا حکم مانتا تھا۔ جنگلی ہونے کے باوجود وہ بے حد ذہین اور شاطر تھا۔ اس کی خطرناکی تم کل دیکھ ہی چکے ہو۔"

کل کی باتیں یاد کر کے پروفیسر کو ایک بار پھر جھرجھری سی آگئی۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر بن گیا۔

میں نے پوچھا "کیا یہ انہی تین سیاہ فاموں میں سے ایک تھا جنہوں نے ڈوگر' اس کی اہلیہ اور کمانڈو کو قتل کیا؟"

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں۔۔۔ لیکن اس جیسے کم و بیش دو اور درندے مائیکل کے پاس موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے زیادہ ہوں لیکن ارشاد نے مجھے یہی بتایا تھا کہ مائیکل کے پاس اس قسم کے تین بندے ہیں۔ وہ انہیں اپنے ساتھ ہی ماریطانیہ سے یہاں لایا تھا۔"

میں نے پروفیسر سے کہا "کوئی اور خاص بات جو آپ اس سلسلے میں مجھے بتانا چاہتے ہوں؟"

پروفیسر آنسو پونچھتے ہوئے بولا "نہیں۔۔۔ جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا' میں نے بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا "ارشاد احمد کے بارے میں کوئی بات؟"

"ارشاد احمد کا رویہ عجیب سا ہے۔ وہ جب مجھ سے ملتا ہے تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تمام ہمدردیاں میرے اور شائستہ کے ساتھ ہیں لیکن چونکہ وہ مائیکل کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے لہٰذا اس کی بات ماننے پر مجبور ہے۔ وہ اب بھی کبھی کبھی آکر یہاں رہتا ہے' پچھلے دنوں بھی وہ چار پانچ روز یہاں آکر رہا تھا۔ کہتا تھا کہ یہاں سے جا کر بھی اس کا دل اسی گھر کے در و دیوار میں اٹکا رہتا ہے۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بات ہونٹوں میں ہی رہ گئی۔ کوٹھی میں رہائش پذیر غم زدہ بوڑھے باپ کی آواز قریبی راہداری میں گونج رہی تھی "مرجائے تو صبر آجاتا ہے۔۔۔ گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔ مرجائے تو صبر آجاتا ہے۔۔۔"

یہ آواز نہیں ایک نوحہ تھا جو دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ بچھڑے ہوؤں کا غم اس آواز میں یوں شامل تھا کہ سنتے ہی آنکھ نم ہو جاتی تھی۔ پروفیسر نے دو تین بار زیر لب "استغفراللہ" کہا۔ آواز پہلے قریب آئی پھر آہستہ آہستہ کوٹھی کے کسی اور حصے میں چلی گئی اور معدوم ہو گئی۔

میں نے کہا "مجھے ایک بات بتائیں پروفیسر صاحب' ہم مائیکل نام کے اس افریقی سے مل کیسے سکتے ہیں؟"

"یہ بہت ٹیڑھا سوال ہے۔" پروفیسر نے کہا "مجھے اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں۔ وہ جتنی بار مجھ سے ملا ہے خود ہی ملا ہے۔ ارشاد کو اس کا ٹھکانا معلوم تھا۔ میں نے ایک دو بار پوچھا بھی لیکن ارشاد نے نہیں بتایا۔ اسے معلوم تھا کہ میں پولیس کو اطلاع کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔ ارشاد کے علاوہ صرف ایک شخص کو معلوم ہے کہ مائیکل لاہور میں کہاں رہتا ہے اور یہ وہی شخص ہے جس نے تم پر کل "اے کے ۵۶" سے فائر کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر گن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کا نام کاربین ہے۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ پروفیسر اللہ دتا اسی ریچھ نما شخص کی بات کر رہا تھا جو اس سارے فساد کی جڑ تھا اور جس نے مجھے پروفیسر کے کلینک میں شناخت کیا تھا۔ پروفیسر نے اس کا نام کاربین بتایا تھا۔ کاربین کا نام سنتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ریچھ نما آنکھیں کس کی ہیں اور یہ ریچھ کون ہے۔ واقعات کی ایک فلم سی ذہن میں چل گئی تھی۔ کاربین نامی اس خطرناک بدمعاش کا تعلق مرحوم جاگیردار قادر زماں سے تھا۔ اس شخص سے دو تین مرتبہ میرا معرکہ ہو چکا تھا۔ کاربین کو میں نے آخری مرتبہ کئی ماہ پہلے جاگیردار قادر زماں کی حویلی میں ہی دیکھا تھا۔ انہی دنوں حویلی میں قادر زماں قتل ہو گیا تھا اور پھر حویلی میں ہونے والے خوفناک بارودی دھماکوں نے حویلی کے ایک حصے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔۔۔ اب پروفیسر اللہ دتا مجھے کاربین کے متعلق بتا رہا تھا لیکن کاربین کی شکل تو میں بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

پروفیسر نے میری الجھن دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں' لیکن اس کا چہرہ؟"

"یہ چند ماہ پہلے جل گیا تھا۔ کراچی سے چہرے پر پلاسٹک سرجری کرائی ہے اس نے۔"

ایک دم واقعات کی کڑیاں مل گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ قادر زماں کی حویلی میں بھڑکنے والی شدید آگ میں کاربین زخمی ہوا ہو گا۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ اس آتشزدگی میں کاربین کا ایک بازو اور چہرے کا ایک رخ بری طرح جل گیا تھا۔ قادر زماں کے بھائی نے اس کا علاج معالجہ کرایا تھا اور پلاسٹک سرجری بھی کروائی تھی۔ اس سرجری نے کاربین کی شکل قریباً ستر فی صد بدل ڈالی تھی۔ اس کی شکل بدل گئی تھی لیکن چھوٹی چھوٹی کینہ پرور آنکھیں تو وہی تھیں۔ یہی آنکھیں تھیں جو میرے ذہن کو بار بار بچوں کے لگاتی تھیں اور کچھ یاد دلاتی تھیں۔ آج پروفیسر کی زبان سے ادا ہونے والے صرف ایک فقرے نے ساری الجھن دور کر دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کینہ

دشمن کاربین جاگیردار قادر زماں کی حویلی سے بردہ فروش ارشاد احمد تک کیسے پہنچا لیکن یہ بات بہرحال ثابت ہو چکی تھی کہ پروفیسر کے کلینک میں مجھے آواز سے پہچاننے والا اور ارشاد کو خبردار کرنے والا یہی کاربین تھا۔

پروفیسر نے کہا "یہ شخص ارشاد احمد کا ہرکارہ تھا۔ مائیکل اور ارشاد احمد نے میری نگرانی کے لیے اسے میرے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ یوں سمجھو کہ یہ چوبیس گھنٹے مجھ سے چپکا رہتا تھا۔"

"میرے خیال میں کل اسی نے مجھے پہچانا تھا۔"

"ہاں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میرا ملازم مجھے تمہارے پاس سے اٹھا کر باہر لے گیا تھا' تھوڑی دیر بعد ہم نے قلم اشار نوشین کو بھی باہر بلا لیا تھا۔ اسی وقت کاربین نے ہمیں بتایا تھا کہ اندر کمرے میں جو شخص خود کو پولیس کا افسر ظاہر کر رہا ہے اور اپنا نام احمد ظاہر کر رہا ہے وہ درحقیقت شاہ جہاں المعروف بہ استاد جہانی ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے پروفیسر۔ کیا کاربین دوبارہ آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا؟"

"میرے خیال میں نہیں۔ وہ بے حد محتاط رہتا ہے۔ خاص طور سے رجب کی موت کے بعد سے تو وہ بے حد چوکنا ہے۔ اسے یقیناً معلوم ہو چکا ہو گا کہ اس کوٹھی کے گرد سادہ پوش پولیس موجود ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو وہ اب اس علاقے میں ہی نہیں پھٹکے گا!"

میں نے کہا "میری رائے میں یہی بات اب مائیکل نامی اس افریقی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" پروفیسر نے تائید کی "اغوا شدہ افراد کی دو کھیپوں کا پکڑے جانا ہی چھوٹا صدمہ نہیں تھا۔ اوپر سے رجب بھی پولیس کی حراست میں ہلاک ہو گیا۔ مائیکل نامی وہ درندہ اب یقیناً سمجھ چکا ہے کہ پولیس پوری طاقت سے اس کے خلاف حرکت میں آگئی ہے۔ اب وہ کسی پناہ گاہ میں گھس کر بیٹھ گیا ہو گا۔"

"میں ایک نازک سوال آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں' معلوم نہیں آپ جواب دینا پسند کریں گے یا نہیں۔"

پروفیسر نے حوصلہ افزائی کے انداز میں کہا "پوچھو بھئی۔"

"آپ جانتے ہی ہیں کہ پولیس کارروائی کے بعد ارشاد احمد اپنے گھر سے غائب ہے۔ کیا آپ اس کی موجودہ "لوکیشن" کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہیں؟"

پروفیسر نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے اسے نازک سوال کیوں کہا؟"

"کچھ بھی ہے' ارشاد احمد آپ کا بھائی ہے۔"

پروفیسر نے بڑی نفرت سے انکار میں سر ہلایا "وہ جو کردار ادا کر چکا ہے اس کے بعد میں اسے اپنے ہاتھوں سے دس بار قتل کرنے کو تیار ہوں۔ وہ کیسا بھائی ہے جو ایک سال سے ایک بے رحم درندے کے ساتھ مل کر مجھے بدترین عذاب دے رہا ہے۔ اس کی سگی بھتیجی کو ایک سال سے خطرناک قاتلوں نے یرغمال بنا رکھا ہے اور اسے آہستہ آہستہ مار رہے ہیں لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر میں اس کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو تمہیں بتانے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ کرتا۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے سوال میں واقعی کچھ زیادہ وزن نہیں تھا۔ غالباً مایوسی کے عالم میں یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ پروفیسر نے دیر تک کھنکارنے کے بعد گلا صاف کیا اور بولا "میرا قیافہ تو یہی ہے کہ وہ بدبخت اپنے جہنمی پارٹنر کے پاس پہنچ چکا ہو گا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔۔۔ افریقی مائیکل کے پاس؟"

"بالکل۔۔۔ وہ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا ہے۔ ایک شیطان کی طرح اس کے اندر گھس چکا ہے۔ اس نے ارشاد کو ایسی راہ پر لگایا ہے کہ وہ خود بھی پورا شیطان بن چکا ہے۔ ضرورت مندوں کو ان کی جمع پونجی سے محروم کرنا' غریب مسکین لڑکیوں کو بیرون ملک بھجوانے کا جھانسا دے کر ان کی عزتوں سے کھیلنا' ہنستے بستے گھروں کو برباد کرنا' یہ سب کچھ اس کے لیے روز مرہ کا معمول ہے۔"

میں اور پروفیسر دیر تک اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ پروفیسر حقیقتاً ایک نہایت دکھی شخص تھا۔ بے راہ رو بھائی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مائیکل نامی درندہ صفت غیر ملکی کے ہاتھوں اس بری طرح بلیک میل ہو رہا تھا کہ تصور کرنا بھی محال تھا۔ آدم خور وحشیوں کے بارے میں صرف کہانیوں میں پڑھا اور سنا جاتا ہے لیکن پروفیسر نے ان درندوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کی بربریت کا نظارہ کیا تھا۔ اب اس کی لاڈلی بیٹی انہی درندوں کے چنگل میں تھی اور یہ کوئی چند دنوں کی بپتا نہیں پورے ایک سال کا ماجرا تھا۔ اگر میں نے پروفیسر کی روداد دو چار روز پہلے سنی ہوتی تو شاید کئی واقعات پر یقین کرنے میں مجھے دشواری ہوتی لیکن کل کوٹھی میں ہونے والے ہنگامے کے بعد میرے لیے شک شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے ساڑھے چھ فٹ لمبے اس خونی درندے کو اپنی گناہ گار

آنکھوں سے دیکھا تھا جسے انسان کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی تھی۔ اس نے میرے سامنے ظلم اشارنوشین کے نازک جسم کو دانتوں سے بھنبوڑا تھا اور اس سے پیشتر وہ نوشین کے ڈرائیور رمضان کا نرخرا ادھیڑ چکا تھا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو پھر یقیناً تھری پیس سوٹ والا وہ "انگلش داں" آدم خور بھی سچ تھا جس کا تذکرہ ابھی پروفیسر نے مجھ سے کیا تھا لیکن انسانی لباس میں چھپا ہوا وہ درندہ کہاں تھا؟ اس وقت یہی سوال سب سے اہم تھا۔ بقول پروفیسر' صرف دو افراد اس کے ٹھکانے سے آگاہ تھے اور وہ دونوں غائب تھے۔ یعنی پروفیسر کا بھائی ارشاد احمد اور اس کا کارندہ ریچھ نما کاربین۔

میری زخمی آنکھ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے ایک ہاتھ سے آنکھ کو دبایا' دوسری آنکھ سے پروفیسر کو دیکھا۔ ایک دم مجھے پروفیسر کے چہرے پر چونکنے کے آثار نظر آئے۔ اسے کچھ یاد آیا تھا' وہ بولا "شاہ جہاں! تم اپنے ایک دوست کے ساتھ چند روز پہلے میرے کلینک آئے تھے۔ تم نے مجھ سے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھا تھا' وہ کوئی لیڈی ڈاکٹر تھی' اس کا نام غزالہ تھا اور اس کے ساتھ "محمد تابی" نام کا کوئی بچہ بھی تھا۔"

میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اقرار میں سرہلاتے ہوئے کہا کہ ہاں ہم آئے تھے۔

پروفیسر اللہ دتا نے کہا "تم میری مجبوریاں جان ہی چکے ہو۔ میں نے مجبوری کے تحت اس وقت تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں اس لڑکی کے بارے میں جانتا ہوں۔"

میرا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ میں سراپا سماعت پروفیسر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ بولا "غزالہ نام کی وہ لیڈی ڈاکٹر اپنے بچے کے ساتھ دو تین دفعہ میرے پاس آئی تھی۔ وہ بچے کی بیماری کے سلسلے میں کافی مایوس نظر آتی تھی۔ پہلے خود اس کا علاج کرتی رہی تھی' پھر کئی اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔ تمام ٹیسٹ وغیرہ بھی صحیح تھے لیکن بچے کا بخار اترنے میں نہیں آتا تھا۔ دو تین روز بخار ہوتا تھا پھر ایک روز کا وقفہ پڑجاتا تھا' اس ہلکے لیکن مسلسل بخار نے بچے کو ادھ موا کر چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ٹیسٹ رپورٹس اور ایکسریز وغیرہ کا پورا پلندہ لے کر آئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ سب کچھ صحیح ہے لیکن بچہ صحیح نہیں ہے' میں نے اسے تسلی دی کہ بچہ بھی صحیح ہوجائے گا۔ میری تسلی تشفی پر وہ آبدیدہ ہوگئی۔ اس قسم کے ایک دو مریضوں سے میرا پہلے بھی پالا پڑچکا تھا۔ میں نے اسے اپنی فارمیسی کی دو دوائیں دیں اور کہا کہ وہ چند روز بعد بچے کو دوبارہ دکھائے۔

اگلی مرتبہ وہ آئی تو قدرے مطمئن تھی۔ اس نے بتایا کہ بہتری کے آثار پیدا ہورہے ہیں۔ وہ بار بار خدا کا شکر ادا کررہی تھی۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ میرے کلینک میں آکر وہ کتنی بڑی مصیبت کا شکار ہوگئی ہے۔"

ایک بار پھر پروفیسر اللہ دتا کے چہرے پر غم واندوہ کے بادل چھاگئے۔ وہ آہ بھر کر بولا "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ مائیکل اور ارشاد احمد کا کارندہ کاربین سائے کی طرح میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ کلینک میں بھی میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میری نگرانی کے علاوہ اس کا ایک کام یہ بھی ہوتا تھا کہ میرے مریضوں میں سے مناسب شکار کا انتخاب کرے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ارشاد احمد خود بھی کلینک آتا تھا اور ایسے لوگوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا جو اس کے "مقصد" میں کام آسکتے تھے۔ اتفاق سے جس دن وہ لیڈی ڈاکٹر غزالہ کلینک میں آئی' ارشاد احمد خود بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا اور منتخب کرلیا۔ کاربین کے ذریعے اس نے مجھے لیڈی ڈاکٹر کے بارے میں ہدایت جاری کردی۔ اس ہدایت کے مطابق مجھے لڑکی کو بچے کے علاج کے لیے بیرون ملک بھجوانے کا جھانسا دینا تھا' اور اس کام کے لیے لڑکی کو ارشاد احمد کے پاس بھیجنا تھا۔ میں نے کاربین کو بتایا کہ یہ کوئی عام لڑکی نہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ یہ لوگ اثر ورسوخ رکھتے ہیں' اگر انہوں نے بچے کو باہر لے جانا ہوگا تو از خود لے جائیں گے۔

"کاربین نے میرا پیغام ارشاد تک پہنچا دیا۔ وہ خبیث اگلے روز خود میرے پاس آیا۔ کہنے لگا "مائیکل اس لڑکی کو ہر صورت اپنی اگلی کھیپ میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ سمجھو کہ وہ "آرڈر" کا مال ہے۔ اگر یہ کھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا تو پھر ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑے گا۔"

"میں نے کہا کہ اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔ لڑکی دو دفعہ میرے کلینک میں آئی تھی۔ تیسری مرتبہ وہ دو ہفتے کے بعد آئی۔ اتفاقاً اس وقت دو تین بڑے اہم لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں لڑکی سے تفصیلی بات نہ کرسکا۔ اس کے بعد ارشاد احمد چند روز کے لیے اسلام آباد چلا گیا۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ جب وہ واپس آیا تو دوسرے تیسرے روز سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا۔ رجب پولیس مقابلے میں ہلاک ہوا۔ اس کے گھر سے کاربین کا اسکوٹر برآمد ہوا اور یوں ارشاد کو افراتفری میں روپوش ہونا پڑگیا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ غزالہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"نہیں۔ پھر نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "میں اس لڑکی سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔"

پروفیسر اللہ دتا نے پوچھا "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرے سگے چچا کی بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں تفصیل سے میں پھر کبھی بتاؤں گا' فی الحال میں جلد سے جلد اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"اللہ کرے وہ ابھی تک سلامتی سے ہو۔" پروفیسر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور جلدی سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نیلی جلد والی ایک ڈائری تھی۔ اس ڈائری میں بہت سے مریضوں کے نام پتے لکھے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے کہا "جب چند روز پہلے تم کلینک آئے تھے تو تم نے میرے رجسٹر میں غزالہ یا اس کے بچے کا نام ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ یہ نام رجسٹر میں نہیں ملے تھے۔ یہ نام دراصل اس ڈائری میں تھے۔ جن لوگوں پر ارشاد کی نظر پڑجاتی تھی' مجھے ان کے نام علیحدہ سے لکھنے پڑتے تھے۔ اس کام کے لیے یہی منحوس ڈائری استعمال ہوتی تھی۔"

پروفیسر اللہ دتا نے جلدی جلدی ڈائری کی ورق گردانی کی اور ایک صفحے پر انگلی رکھ دی۔ یہاں غزالہ کا نام' مریض بچے محمد تابی کا نام اور غزالہ کا مکمل پتا لکھا تھا۔ یہ پتا میرے لیے ایک بہت بڑے انکشاف سے کم نہیں تھا۔ لکھا تھا "معرفت سیّد اکبر علی۔ ذیشان پارک' اسٹریٹ نمبر۸' ہاؤس نمبر۲' صدر لاہور۔"

○☆○

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں اور صفدر ذیشان پارک کی اسٹریٹ نمبر۸ میں کھڑے تھے۔ ہم دونوں ایک سوزوکی کار میں تھے۔ یہ کار میرے لاہوریے دوست عالم قریشی نے مہیا کی تھی۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مکان نمبر۲ ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گیٹ پر سیّد اکبر علی کی نیم پلیٹ بھی دور سے نظر آرہی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس گیٹ کے پیچھے اور ان دیواروں کے عقب میں وہ ہستی بھی موجود ہے یا نہیں جسے ہم پچھلے کئی ہفتوں سے دیوانہ وار ڈھونڈ رہے ہیں۔ ذہن میں ان گنت اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ مائیکل' ارشاد احمد اور کاربین جیسے خطرناک لوگوں کی موجودگی میں غزالہ کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اب تک اس مکان سے لاپتا ہوچکی ہو اور کسی چار دیواری میں مجبور و بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی ہو اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کا دشمنِ اوّل شیخ عاصم ہی اس تک پہنچ گیا ہو اور ایک ظالم شوہر کی طرح اسے گھسیٹ کر واپس امارات لے گیا ہو۔ غرض ان گنت اندیشے تھے جو بڑے بڑے منہ پھاڑے میرے چاروں طرف گردش کررہے تھے اور میں مکان نمبر۲ کے سفید گیٹ کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ ہم عالم قریشی کے ایک ملازم کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے یا صفدر نے جاکر کال بیل بجائی تو ہوسکتا ہے کہ غزالہ باہر آنے سے انکار کردے بلکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ گھر کے کسی عقبی دروازے سے نکل جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں لہٰذا پروگرام کے مطابق عالم قریشی کے ملازم کو جاکر بیل دینا تھی اور باہر آنے والے کو یہ بتانا تھا کہ وہ پروفیسر اللہ دتا کے کلینک سے آیا ہے اور مسز غزالہ سے ملنا چاہتا ہے۔ ایک بار غزالہ دروازے پر آجاتی تو پھر میں اور صفدر اس کے سامنے آسکتے تھے۔

ہم نے سوزوکی کار اس انداز سے کھڑی کی کہ عقب نما آئینے میں مکان نمبر۲ کا گیٹ نظر آتا رہے۔ ملازم اتر کر گیٹ کی طرف گیا۔ ہم نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ ذیشان پارک صدر کا ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ اسٹریٹ کے سامنے ایک کشادہ بازار تھا۔ رکشا ٹیکسی تانگا ہر قسم کی سواری یہاں موجود تھی۔ مکان دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں متوسط طبقہ رہائش پذیر ہے۔

کال بیل کی آواز پر ایک ادھیڑ عمر خاتون گیٹ پر نظر آئی اور ملازم سے باتیں کرنے لگی۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ اچانک صفدر نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں نے چونک کر پہلے صفدر کی طرف اور پھر ونڈ اسکرین سے باہر دیکھا۔ حسیات سمٹ کر آنکھوں میں جمع ہوگئیں۔ چند لمحوں کے لیے جیسے گردش دوراں تھم گئی تھی۔ سامنے سے غزالہ آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت بچہ گاڑی تھی جسے وہ دھکیلتے ہوئے لارہی تھی۔ غزالہ نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور ساکت وجامد کھڑی ہوگئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ پلٹے گی اور شاید بھاگ جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں خوف' حیرت اور اندیشے ایک ساتھ نظر آئے تھے۔ وہ پتھرا سی گئی تھی۔ میں اور صفدر تیزی سے باہر نکلے اور غزالہ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

"مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔" صفدر نے کانپتی آواز میں کہا۔

جواب میں غزالہ خاموش رہی۔ اس کے ہونٹ بس تھرا کر رہ گئے تھے۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "غزالہ بہت دکھ دیا

ہے تم نے۔ تمہیں معلوم نہیں ہم تمہارے لیے کہاں کہاں خوار ہوئے ہیں۔"

اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ بچہ گاڑی کی ہتھی کو اس نے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اتنی مضبوطی سے کہ اس کے ہاتھوں کی جلد کھچ سی گئی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں عجیب انداز سے بولی "پلیز۔ پلیز آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مت تلاش کریں مجھے۔"

وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ صفدر آگے بڑھ کر بولا "غزالہ! یہ کیا بات کہہ رہی ہو تم۔ تمہیں معلوم نہیں کتنے خطرات میں ہو تم۔"

"میں اب عادی ہو چکی ہوں خطروں کی۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" وہ عجیب بے رخی کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں اور صفدر منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر میں ہمت کر کے تیزی سے غزالہ کے پیچھے گیا "غزالہ!" میں نے ذرا سخت آواز میں کہا "تم کا لجیئٹ لڑکیوں کی طرح BEHAVE مت کرو۔ یہاں لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ہم کہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہیں۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ ہم کتنی مشکلوں سے تم تک پہنچے ہیں۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"تمہیں سننا پڑے گا۔ اپنی سلامتی کے لیے' اس بچے کی سلامتی کے لیے۔"

اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔ اس نے فیروزی چادر سے اپنا منہ ڈھانپا۔ چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ تب ایک بار پھر آگے بڑھ گئی۔ گھر کا مین گیٹ کھلا تھا۔ وہ بچہ گاڑی دھکیلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ادھیڑ عمر عورت حیرت سے ہمیں دیکھتی رہی' پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

میری طرح صفدر بھی الجھن میں تھا' تاہم میری طرح اس کی آنکھوں میں بھی امید کی کرن موجود تھی اور امید یہ تھی کہ شاید غزالہ اندر جا کر سوچے اور اپنا رویہ تبدیل کر لے۔ میں' صفدر اور ملازم گاڑی کے قریب کھڑے رہے۔ ہر سیکنڈ' گھنٹے کی سست رفتاری سے حرکت کر رہا تھا' پھر میرے ذہن میں یہ خدشہ جاگا کہ کہیں غزالہ گھر کے کسی عقبی دروازے سے یا چھت کے ذریعے اس چار دیواری سے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیں اچانک دیکھ کر اتنی ہراساں نظر آئی تھی کہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے عالم قریشی کے ملازم کو ہدایت کی کہ وہ مکان کی عقبی سمت میں چلا جائے۔ وہ میری ہدایات کے مطابق چلا گیا۔ میں اور صفدر وہیں کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اچانک مکان کا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک دبلے پتلے ملازم نما شخص کی صورت نظر آئی۔ شکل اور حلیے سے وہ لکھنؤ ٹائپ نظر آ رہا تھا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا اور شائستگی سے بولا "آیئے اندر تشریف لے آیئے۔"

"اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔" ہم نے فوراً گاڑی لاک کی اور اپنے مہربان کے ساتھ اندر چلے گئے۔ چھوٹے سے صحن سے گزر کر ہم ایک ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ڈرائنگ روم مختصر تھا تاہم سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ہم صوفے پر گم صم بیٹھ گئے اور غزالہ کا انتظار کرنے لگے۔ آنکھ کے زخم کی وجہ سے میں نے تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم میں روشنی تھی مگر پھر بھی عینک کے سبب مجھے تاریکی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر غزالہ کی صورت نظر آئی۔ وہ پھول دار شلوار قمیص میں تھی۔ سر پر چادر تھی' وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر اندوہ کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے کہا "غزالہ! میں پچھلی باتوں کو چھیڑنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ ابو ظہبی میں تم اچانک ہمیں کیوں چھوڑ گئی تھیں۔ اب تک کہاں رہی ہو اور پاکستان کیونکر پہنچی ہو؟ تم ہر لحاظ سے اپنی مرضی کی مالک ہو۔ اگر بتانا چاہو تو تمہاری صوابدید ہے۔ نہ بتانا چاہو تو ہم مجبور نہیں کر سکتے۔ فی الوقت میں اور صفدر صرف اس لیے یہاں پہنچے ہیں کہ تمہیں ایک شدید خطرے سے آگاہ کر سکیں اور یہ خطرہ کوئی اندیشہ نہیں ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اگر ہم پر بھروسا نہیں تو پروفیسر اللہ دتا بھی اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

پروفیسر کے نام پر غزالہ چونکی "آپ کو میرا پتا پروفیسر سے ملا ہے؟"

"ہاں۔" صفدر نے کہا "اور شکر کا مقام ہے کہ مل گیا ہے۔"

اس کے بعد صفدر نے شروع سے آخر تک ساری کہانی غزالہ کے گوش گزار کر دی۔ وہ حیرت زدہ سی سنتی رہی۔ کبھی اس کا چہرہ زرد ہو جاتا' کبھی وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتی۔ پروفیسر کے بھائی ارشاد اور رجب کے بارے میں وہ بھی اخبارات میں خبریں دیکھ چکی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ پروفیسر کا بھائی ارشاد ایک گھاگ بردہ فروش ہے۔ یہ بات جان کر کہ یہ گھاگ بردہ فروش پروفیسر اللہ دتا کو بلیک میل کرنے میں مصروف تھا اور پروفیسر کے ذریعے وہ بے شمار شکار

پھانس کر ان کے پیسے کھرے کر چکا ہے' غزالہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

صفدر نے کہا "غزالہ! جس روز تم پہلی مرتبہ پروفیسر کے کلینک پر گئیں وہاں اتفاقاً ارشاد احمد موجود تھا۔ اس کی بدنگاہ تم پر پڑی اور اس نے پروفیسر کو حکم جاری کر دیا کہ اس لڑکی کو ہر صورت میں پھانسا جائے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی تمہارے لیے بہتری کی شکل نکل آئی۔ ایک بردہ فروش رجب پکڑا گیا اور نتیجے میں پولیس ارشاد احمد کے پیچھے بھی لگ گئی لیکن پروفیسر کا کہنا ہے کہ تم اب بھی خطرے میں ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ اب ارشاد احمد یا اس کے کارندے کسی اور طریقے سے تم تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ بقول پروفیسر' وہ ایک بار جس کے پیچھے لگتے ہیں اسے مشکل سے ہی چھوڑتے ہیں۔ اگر ریکروٹنگ ایجنسی کے ذریعے شکار قابو میں نہ آئے تو پھر اسے اغوا بھی کرا لیا جاتا ہے۔ وہ لوگ بہ آسانی اس چار دیواری تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"لیکن کس طرح؟" غزالہ نے پوچھا۔

"جس طرح ہم پہنچے ہیں۔" میں نے جواب دیا "تمہارا ایڈریس پروفیسر کی پرائیویٹ ڈائری میں درج ہے اور یہ ڈائری ارشاد کے لیے بھی اتنی ہی پرائیویٹ تھی۔ پروفیسر نے بتایا ہے کہ ارشاد اس ڈائری کے ہر انداز سے آگاہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے پاس تمہارا ایڈریس بھی موجود ہو۔"

غزالہ کے چہرے پر پریشانی نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اور صفدر غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے وعدے کے مطابق غزالہ سے کوئی غیر متعلقہ بات نہیں کی۔ نہ یہ پوچھا کہ وہ ابو ظہبی میں ہمیں ایک دم چکما دے کر کیوں نکل گئی تھی۔ نہ اس خط کے بارے میں کوئی بات کی جو وہ جاتے جاتے کار میں چھوڑ گئی تھی۔ نہ ان مشکلات کا ذکر کیا جو ہم اب تک اس کی تلاش کے سلسلے میں اٹھاتے رہے تھے۔ اس کے موجودہ حالات کا ذکر بھی ہم نے نہیں چھیڑا۔ کہ وہ لاہور کیونکر پہنچی ہے۔ چچا چچی کو اس کی یہاں موجودگی کا علم ہے یا نہیں۔ وہ یہاں کس کے مکان میں اور کس حیثیت سے رہ رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ صرف بچے محمد تابی کی خیر خیریت ہم نے دریافت کی اور اس کی صحت کی تازہ ترین صورتِ حال کے متعلق پوچھا۔

غزالہ نے بتایا "تابی اب کافی بہتر ہے۔ بخار میں شدت نہیں رہی اور دفقہ بھی طویل ہو گیا ہے۔ میں اسے کل پروفیسر کے پاس لے جانے کا سوچ رہی تھی۔"

"کوئی فائدہ نہیں اب وہاں جانے کا۔" میں نے کہا "پروفیسر کا کلینک بند پڑا ہے اور پتا نہیں کب تک بند پڑا رہے۔ پروفیسر صاحب پولیس کی تحویل میں ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ مختلف جرائم کے سلسلے میں انہیں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔"

غزالہ کی پیشانی پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ دیر تک اپنے پاؤں کی انگلیوں کو گھورتی رہی پھر بولی "آپ دونوں کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے ایک سنگین خطرے سے آگاہ کیا۔ میں آج ہی اس کا سدِباب کرتی ہوں۔ ممکن ہے کہ میں یہ گھر چھوڑ جاؤں۔ لاہور ہی میں میری ایک دوست کئی مرتبہ مجھے اپنے پاس آنے کا کہہ چکی ہے۔ میرے خیال میں اب میرے لیے اس کا گھر مناسب ٹھکانا رہے گا۔"

"لیکن اگر ہم تمہیں اس طرح بے سہارا نہ چھوڑنا چاہیں تو؟" صفدر نے کہا۔

"بے سہارا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ بدستور غیریت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم ایک تنہا عورت ہو اور بہت سے خطروں میں گھری ہوئی ہو۔ ان میں سے ایک بڑا بلکہ بہت بڑا خطرہ خود تمہارا شوہر ہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈنے اور عبرت نگاہ بنانے کے لیے اپنے تمام ذرائع استعمال کر رہا ہے۔ غزالہ! شیخ عاصم سے بغاوت کر کے تم نے ایک بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ بے شک یہ قدم اٹھانے میں تم نے بہت تاخیر کی ہے پھر بھی تمہاری جرأت اور دلیری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے مگر اب دلیری کے ساتھ ساتھ عقل مندی کی ضرورت بھی ہے۔ تم تنہا بہت دیر تک شیخ عاصم کی بدخواہی کی مزاحمت نہیں کر سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں سچے دوستوں اور مخلص ساتھیوں کی ضرورت ہے۔"

صفدر دیر تک غزالہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ سنتی رہی۔ کبھی اس کے چہرے پر شدید اضطراب نظر آتا' کبھی وہ غم کی تصویر بن جاتی۔ اس طویل گفتگو میں غزالہ نے بس ایک جملہ چند بار ادا کیا "میں گزری باتوں کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔ میں ہر ایک سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔"

صفدر جب تھکا تھکا نظر آنے لگا تو میں نے ایک اور زاویے سے بات کی۔ میں نے کہا "دیکھو غزالہ! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم اپنی مرضی کی خود مالک ہو۔ ہم تمہیں کسی بھی بات پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن یہ پروفیسر اللہ دتا والا معاملہ ایسا نہیں جسے تم آسانی سے نظر انداز کر دو۔ بے شک تم ان خطرات کو اہمیت مت دو جو تمہاری ذات اور بچے کی ذات کو

لاحق ہیں لیکن ان خطرات کو تو اہمیت دو جو بے شمار معصوم اور بے گناہ لوگوں کو لاحق ہیں۔ اگر اس گینگ کے سرغنہ ارشاد احمد اور افریق مائیکل پکڑے نہیں جاتے تو سوچو کہ کتنے لوگوں کی آزادی اور زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ یہاں سے رفوچکر ہو جائیں' کسی اور شہر یا پھر کسی اور ملک کا رخ کرلیں۔ وہاں بھی تابی جیسے معصوم بچے ہوں گے اور راجی جیسی ضرورت مند لڑکیاں ہوں گی۔ یہ لوگ ان شکاریوں کے جال میں پھنسیں گے اور زندگی بھر کے لیے سسک سسک کر جینے پر مجبور ہوں گے۔ تمہیں اور ہم سب کو اس گینگ کے مکمل خاتمے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور میں سمجھتا ہوں غزالہ! کہ اس وقت تم ہماری واحد امید ہو۔"

"وہ کس طرح؟" وہ ذرا دبی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میری تقریر دل پذیر نے اس پر زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت اثر ضرور کیا ہے۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "رجب مر چکا ہے' ارشاد احمد لاپتا ہے اور کارین بھی غائب ہے' ان تینوں کے سوا کوئی بھی مائیکل کے اتے پتے سے آگاہ نہیں۔ اگر کوئی ہے بھی تو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس وقت مکمل اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ اگر اس وقت امید کی کوئی مدھم سی کرن ہے تو وہ یہ ہے کہ ارشاد احمد جو ہر صورت تمہیں اپنی تازہ کھیپ میں شامل کرنا چاہ رہا تھا' تم تک پہنچے اور پولیس کے شکنجے میں جکڑا جائے۔"

غزالہ نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کئی سیکنڈ بعد اس کے ہونٹوں نے حرکت کی "پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں ایک نہایت اچھے کاز کے لیے تھوڑی سی قربانی دینا ہوگی۔ تمہیں یہ گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت امکان اس بات کا ضرور ہے کہ ارشاد احمد خود یا اس کا کوئی کارندہ تم تک رسائی کی کوشش کرے۔ ساہی صاحب کے تعاون سے ہم اس مکان کے اردگرد پولیس کے سادہ پوش متعین کردیں گے۔ وہ چوبیس گھنٹے نگرانی کریں گے۔"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "میں اپنی ذات کے لیے ہر خطرہ مول لے سکتی ہوں لیکن تابی۔۔۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو؟"

"کچھ نہیں ہوگا غزالہ۔۔۔ نہ اسے نہ تمہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "جیسے ہم پہلے بہت سی آزمائشوں میں سرخ رُو ہوئے ہیں' انشاء اللہ اس آزمائش میں بھی ہوں گے۔"

غزالہ خاموش رہی۔ یہ خاموشی اس بات کی علامت تھی کہ وہ نیم رضامند ہے۔ ہم سے بے تحاشا اختلاف رکھنے کے باوجود وہ ارشاد احمد والے معاملے میں ہم سے اختلاف نہیں کرپا رہی تھی۔ پوری روداد سننے کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اس کی تھوڑی سی قربانی بہت سے بے گناہوں کی زندگیاں اجیرن ہونے سے بچا سکتی ہے۔

میں اور صفدر قریباً دو گھنٹے غزالہ کے پاس بیٹھے۔ اس دوران میں ہم نے چائے بھی پی۔ غزالہ اپنی ایک پرانی ٹیچر کے ہاں قیام پذیر تھی۔ ان کا نام سیدہ مہرالنساء تھا۔ وہ غزالہ کو بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں (غزالہ کی اس طرح کی ایک استاد مسز رقیہ بھی تھیں جن کے کلینک میں' میں زیر علاج رہا تھا) ہم نے معصوم صورت "تابی" کو بھی دیکھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور نظر آرہا تھا لیکن غزالہ نے بتایا کہ اب وہ بہت بہتر ہے۔ غزالہ کے ساتھ بچے کی ایسوسی ایشن بالکل "ماں اور بچے" جیسی تھی۔ وہ جتنی دیر ہمارے سامنے رہا' غزالہ سے چمٹ کر بیٹھا رہا اور گاہے گاہے بڑے پیارے سامنے رہا' غزالہ سے کے رُخسار پر بوسہ دیتا رہا۔ میں نے بھی اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ انتخاب میری سیاہ عینک پر چلی گئی۔ وہ عینک اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ اور آخر کامیاب رہا۔ میری آنکھ کی چوٹ نے غزالہ کو چونکا دیا۔ بے اختیار اس کے ہونٹ تھرائے۔ وہ آنکھ کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ شاید ہمت ہی نہیں ہوسکی تھی۔ غزالہ سے کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔

صفدر نے ہمت کرکے شیخ عاصم کا ذکر بھی چھیڑا لیکن غزالہ اس بارے میں کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی کتاب میں سے شیخ عاصم کا ورق پھاڑ چکی ہے۔۔۔ مگر اس ورق کے پھٹنے سے شاید ایک اور ورق بھی زندگی کی کتاب سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ اس دوسرے ورق پر کیا کچھ لکھا تھا یہ صرف غزالہ ہی کو معلوم تھا۔ شام سے کچھ پہلے جب ہم غزالہ سے رخصت ہوئے تو ہم تینوں میں کافی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ غزالہ' ارشاد احمد تک پہنچنے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون پر تیار تھی۔

اگلے تین روز بڑی بے یقینی کی کیفیت میں گزرے۔ غزالہ کی قیام گاہ کے اردگرد سفید پوش پولیس اہلکار متعین کردیے گئے تھے۔ یہ اے ایس آئی اور سب انسپکٹر رینک کے اہلکار تھے۔ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ ایک سب انسپکٹر اور

اے ایس آئی گھر کے سامنے متعین تھے۔ سب انسپکٹر نے فرنٹ کی ریڑھی لگا رکھی تھی۔ جبکہ اے ایس آئی بھک منگے کے حلیے میں تھا اور گھر کے عین سامنے فٹ پاتھ پر فالج زدہ شخص کے روپ میں بیٹھا تھا۔ ایک اہلکار بازار میں تعینات تھا جبکہ دو اے ایس آئی مکان کی عقبی گلیوں میں خوانچہ فروشوں کی حیثیت سے چکراتے رہتے تھے۔ یہ بڑے گھاگ قسم کے اہلکار "ریکی" کے ماہر تھے۔

دوسری طرف میں اور صفدر اپنے طور پر بھی کارین اور ارشاد احمد کا کھوج لگانے کی سعی کررہے تھے۔ ساہی صاحب کا ایک تجربہ کار انسپکٹر خورشید شاہ ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ ساہی صاحب خود بھی اس معاملے میں بہت پُرجوش تھے۔ انہوں نے مجھے ایک غیر ملکی میگزین میں چھپنے والا آرٹیکل دکھایا تھا۔ اس آرٹیکل کا عنوان تھا "غلامی آج بھی موجود ہے" اس مضمون میں واضح ثبوتوں کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں آج بھی انسانوں کی خرید و فروخت جاری ہے۔ آج بھی غلاموں اور کنیزوں کے لیے سرعام نیلامی ہوتی ہے اور بولیاں دی جاتی ہیں۔ اس مضمون میں SLAVERY کی وہ مختلف اقسام بتائی گئی تھیں جو موجودہ دور میں رائج ہیں اور ان پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ افریقہ' مڈل ایسٹ اور یورپ میں کون کون سے ممالک ہیں جہاں بردہ فروشی اور غلامی مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ ایک جگہ مضمون نگار نے لکھا تھا "اور تو اور' انسانی حقوق کے ایک بہت بڑے علم بردار ملک برطانیہ میں بھی SLAVERY موجود ہے اور اقوام متحدہ کی ناک کے عین نیچے اس کی قراردادوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔" مضمون نگار نے ثبوتوں کے ساتھ بتایا تھا کہ آج بھی بہت سے انگریز لارڈز کے محلات میں ایشین اور افریقی مرد و زن غلاموں کی صورت میں موجود ہیں۔ بعض اُمرا اچھی نسل کے گھوڑوں کی طرح اچھی نسل کے غلاموں کے حصول کے لیے بھی سخت کوشش کرتے ہیں۔

مضمون میں جنوبی ایشیا کے کئی ایسے پس ماندہ ممالک کا ذکر کیا گیا تھا جہاں سے غلاموں کی کھیپیں ترقی یافتہ اور دولت مند ملکوں میں پہنچائی جاتی ہیں۔ اب اس گھناؤنے دھندے کے آثار ہمیں اپنے اردگرد بھی نظر آئے تھے۔ اس معاملے کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ ساہی صاحب بھی اس بات کو پوری پوری اہمیت دے رہے تھے۔

ہم نے ارشاد احمد کے ملنے جلنے والوں سے پوچھ گچھ کی پھر بھکر میں جھوک ضامن کا دورہ کیا اور کارین کے اہل خانہ سے تفتیش کی۔ بعد ازاں لاہور اور بھکر میں چار پانچ جگہوں پر چھاپے بھی مارے گئے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ ارشاد احمد اور افریقی مائیکل سے وابستہ تمام افراد زیر زمین چلے گئے ہیں۔ میرا لاہوریا دوست عالم قریشی بھی اس سلسلے میں سرگرم تھا' اس نے لاہور کے تمام بہترین ہوٹلوں میں "کھانے کھائے" اور مائیکل کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے صرف اور صرف اتنا سراغ ملا کہ چند روز پہلے ایک دراز قد جسیم حبشی نے ہوٹل میں لنچ اور ڈنر کیا تھا' اس کے ساتھ ایک مقامی شخص تھا اور وہ لوگ کئی گھنٹے مسلسل گفتگو میں مصروف رہے تھے۔ مقامی شخص کا جو حلیہ معلوم ہوا اس سے قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ ارشاد احمد ہوگا۔

بردہ فروش رجب کی کوٹھی سے برآمد ہونے والی دونوں خوب رو لڑکیوں کی بھنک اخبار نویسوں کو بھی پڑ گئی تھیں۔ ہر روز لڑکیوں کے بارے میں کوئی چھوٹی بڑی خبر شائع ہوجاتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی کہ گہری براؤن آنکھوں اور گہرے سیاہ بالوں والے افراد شاذو نادر ہی پائے جاتے ہیں اور ان دونوں خصوصیات کی حامل یہ لڑکیاں' بردہ فروش "آرڈر کے مال" کی حیثیت سے اسمگل کررہے تھے۔ بردہ فروشوں کے نزدیک یہ دونوں لڑکیاں نایاب جانوروں کی جوڑی کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے' میں پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی میں اس کے ساتھ موجود تھا۔ پروفیسر بے حد پریشان تھا۔ اس کی پریشانی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ اس کی لاڈلی بیٹی درندہ صفت لوگوں کے قبضے میں تھی اور ان لوگوں کا اب کچھ پتا نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ قانون کے خوف سے وہ لوگ بیرون ملک فرار ہوچکے ہوں' ایسے میں وہ SHELTER کے طور پر اس کی بیٹی کو بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ پولیس کارروائیوں کے جواب میں وہ لوگ لڑکی کو جان سے ہی مار ڈالیں۔ ان کے ذہنوں میں بجا طور پر یہ شبہ بیٹھ سکتا تھا کہ ان کے خلاف قانون کے حرکت میں آنے کی وجہ پروفیسر اللہ دتا ہے۔ میں پروفیسر کو مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ میں نے کہا "پروفیسر! آپ مذہبی آدمی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خدا نے موت کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ موت ہر پل زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ آپ خدا سے دعا کریں اور اس امر پر یقین رکھیں کہ

مارنے والے کے مقابلے میں بچانے والا بہت طاقت ور ہے۔ آپ نے قانون کا ساتھ دے کر ایک بہت بڑا کام کیا ہے' میرا دل گواہی دیتا ہے' قدرت آپ کو اس اچھے کام کا صلہ ضرور دے گی۔"

میری گفتگو کے دوران میں مسیحا صفت پروفیسر کی انگلیاں مسلسل تسبیح پر گردش کرتی رہی تھیں۔ پروفیسر میرے اس تصور سے بالکل مختلف نکلا تھا جو میں نے شروع میں اس کے متعلق قائم کیا تھا۔ شروع میں' میں نے اسے کوئی میٹرک پاس قسم کا عطائی ڈاکٹر سمجھا تھا' جو اپنی چرب زبانی اور عیاری سے لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا' پروفیسر سے ایک بار ملنے کے بعد بھی میری رائے میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن جب ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں تو آہستہ آہستہ پروفیسر کی نہایت سنجیدہ' متین اور گہری شخصیت سامنے آنے لگی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ تعلیم یافتہ تھا بلکہ اس کے پاس اپنے پیشے کے لیے خداداد صلاحیتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کیمسٹری سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور وہ اپنی اس کوالی فیکیشن کو ادویہ سازی کے کام میں بڑے اچھے طریقے سے استعمال کرتا تھا۔ تاہم علاج معالجے اور ادویہ سازی کے حوالے سے وہ صرف اپنی سائنٹیفک اپروچ پر ہی انحصار نہیں کرتا تھا' اس کے ہنر میں ایک خاص قسم کی روحانیت بھی موجود تھی۔ میں نے اس کی فارمیسی میں مٹی جیسے ایک باریک سفوف کے کئی تھیلے دیکھے تھے۔ اس سفوف کے کئی رنگ تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا اپنی تیار کردہ بیشتر ادویات میں یہ سفوف استعمال کرتا ہے۔

میں اور پروفیسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب اچانک صفدر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ ہانپے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! باہر چلیں۔ ایک بڑی مصیبت کھڑی ہوگئی ہے۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو باہر جاکر آپ کو خود دیکھنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ پریشان تو تھا مگر پریشانی میں دبی دبی مسکراہٹ بھی تھی۔

میں اٹھ کر باہر پورچ میں آیا۔ یہاں وہی سوزوکی کار کھڑی تھی جس پر تین روز پہلے میں اور صفدر غزالہ کی رہائش گاہ پر پہنچے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا' گاڑی کی پچھلی نشست پر زریں گل نظر آرہا تھا لیکن ایسی حالت میں کہ اسے دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل تھا۔ کوئی شخص اس کی کمر پر سوار تھا اور بازو اس کی گردن میں حمائل کر رکھے تھے۔ قریب جاکر دیکھا تو یہ پیرِ فروت شاہِ جنات کا مشیرِ خاص سائیں عالی تھا۔ میں بری طرح چونک گیا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ آفت کا پرکالا جب بھی ٹپکے گا' بالکل اچانک ہی ٹپکے گا لیکن پھر بھی اسے اچانک زریں کے سر پر سوار دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

وہ بولا "ہم ہوٹل سے نکل کر گاڑی کی طرف جارہے تھے۔ یہ اچانک بھیڑ میں سے بندر کی طرح اچھلا اور زریں گل سے چمٹ گیا۔ زریں ایک دم گھبرا گیا۔ شاید اگر میں نہ ہوتا تو وہ سائیں عالی سمیت کسی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آجاتا۔ میں نے مشکل سے اسے سنبھالا اور سائیں کو نیچے اتارنے کی کوشش کی مگر وہ ایک ہی تکرار کیے جارہا تھا "چل چل گھوڑے شفیع محمد کے پاس چل۔ چل چل گھوڑے۔" وہاں ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ میں نے تماشا بننے سے بہتر سمجھا کہ زریں اور سائیں عالی سمیت گاڑی میں گھس جاؤں۔ کچھ آگے جاکر میں نے گاڑی روکی اور دوبارہ کوشش کی کہ سائیں کو زریں کی گردن سے اتار سکوں لیکن ناکامی ہوئی۔ مجبوراً ہم یہاں آگئے ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ زریں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور وہ روہانسے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ سائیں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی دونوں ننگی ٹانگیں زریں کی کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھیں اور اس کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی بے شمار مالائیں اور گھنٹیاں وغیرہ زریں کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی سائیں عالی نے کسی کیکڑے کی طرح چھلانگ لگائی اور زریں کی گردن پر سے اتر کر فرش پر آگیا۔ لاٹھی ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر پروفیسر کا رائفل بردار گارڈ ایک دم چوکس ہوگیا۔ اس نے رائفل سیدھی کرلی تھی۔ میں نے گارڈ کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔

سائیں عالی نے کہا "شفیع محمد! میں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا تھا۔ پورے ایک سو جنوں کا گینگ میں نے تیری تلاش میں لگایا ہوا تھا۔"

"کیوں' میری کیا ضرورت آن پڑی؟"

"بڑی سخت ضرورت۔۔۔ بہت ہی سخت ضرورت۔ یوں ہی تو بمبئی سے سرپٹ بھاگا ہوا نہیں آیا ہوں۔ چل کہیں اکیلے میں سب کچھ بتاتا ہوں تمہیں۔" وہ بے تابی سے مجھے مین گیٹ کی طرف گھسیٹنے لگا۔

میں نے کہا "ادھر کہاں جاتے ہو۔ اندر آؤ۔ کمرے میں

بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

میں اسے لے کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔ سائیں عالی نے ڈراؤنی شکل بنائی اور اپنی آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے کہا "بہت خطرہ ہے' بہت زیادہ خطرہ ہے۔"

"کس کے لیے؟"

"غزالہ کے لیے۔"

"کیا مطلب؟"

"کل بہت شدید زلزلہ آنے والا ہے۔ رات گیارہ بج کر چالیس منٹ پر۔ اندرون شہر کئی خستہ حال مکان گر جائیں گے۔ صدر کے جس تین منزلہ مکان میں غزالہ اپنی ٹیچر مہرالنساء کے ساتھ رہ رہی ہے وہ بھی بہت بوسیدہ ہے۔ وہ بھی گر جائے گا۔ غزالہ کو وہاں سے نکال لو۔ فوراً نکال لو۔ میں اس کا ستارہ دیکھ رہا ہوں' وہ سخت گردش میں ہے۔ میرے منہ میں خاک' اگر غزالہ وہاں رہی تو یہ نہ ہو کہ تم دونوں۔۔۔ ہمیشہ کے لیے جدا ہوجاؤ۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بہت دکھ کی بات ہوگی' میرے لیے تو بہت ہی دکھ کی بات ہوگی۔ تم دونوں کی جدائی کا سبب میں بنا تھا' میں تمہاری اس جدائی کو ہمیشہ کی جدائی نہیں بننے دوں گا۔ تم دونوں ملوگے اور ضرور ملوگے لیکن صرف میرے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم دونوں کو بھی بہت ہمت کی ضرورت ہوگی۔ بولو کروگے نا ہمت؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "کیا تم غزالہ سے مل چکے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو سیدھا بمبئی سے آرہا ہوں۔ بذریعہ پرستان ائرلائنز۔"

"اگر تم غزالہ سے ملے نہیں تو تمہیں کیسے معلوم کہ وہ صدر کے علاقے میں اپنی ٹیچر مہرالنساء صاحبہ کے پاس ہے؟"

"میرے جنات والی ٹاکی کے ذریعے مجھے پل پل کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور وہ بھی معلوم ہے جو ہونے والا ہے۔ تم نے غزالہ کو مجرم پکڑنے کے لیے چارا بنا رکھا ہے لیکن اس کا کچھ فائدہ ہونے والا نہیں۔ پولیس والے ایک سال بھی مونگ پھلی' فروٹ اور دہی بھلے (دہی بڑے) بیچتے رہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہاں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

سائیں عالی کی معلومات مرعوب کن تھیں۔ میں نے کہا "سائیں' تم بات گھما پھرا کر کیوں کرتے ہو۔ صاف کیوں نہیں بتاتے کہ غزالہ کو کیا خطرہ ہے؟"

وہ بولا "اوئے چغد! بتایا تو ہے کہ زلزلے کا خطرہ ہے۔ ٹھیک گیارہ بج کر چالیس منٹ پر۔ میں زمین پر ناک رگڑ کر زلزلے کی لہریں محسوس کرسکتا ہوں۔ مجھ سے یہ ہنر سیکھنے کے لیے شاہِ جنات نے مجھے پرستان کے سب سے بڑے صوبے کی گورنری پیش کی تھی مگر میں نے انکار کردیا لیکن میں تجھے یہ ہنر سکھا دوں گا' شرط یہ ہے کہ تو ہر بات یقین کے ساتھ مان لیا کر اور بے تکے سوالات مت پوچھا کر۔"

"مگر سائیں۔۔۔"

"پھر وہی مگر۔" سائیں نے میری بات کاٹی "یہ مگر مجھے مگرمچھ سے بھی برا لگتا ہے۔ تجھے کہا ہے نا کہ جس طرح بھی ہو غزالہ کو وہاں سے نکال لے ورنہ۔۔۔ گیارہ بج کر چالیس پر تم دونوں کی جدائی کا گھڑیال بج جائے گا۔ ٹن ٹناٹن ٹن۔ ٹن ٹناٹن ٹن۔"

اس دوران میں صفدر بھی وہاں آگیا۔ سائیں نے اس کے سامنے بھی وہی باتیں دُہرائیں جو میرے سامنے کی تھیں۔ وہ گیارہ بج کر چالیس منٹ کا ذکر ایسے کر رہا تھا جیسے زلزلے کے بجائے غروبِ آفتاب کی بات کر رہا ہو۔

صفدر نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "محترم سائیں صاحب! ہم تو غزالہ کو یہاں لانے سے رہے۔ وہ ہمارے کہنے پر نہیں آئے گی۔ اگر زلزلے کی آمد کا ٹائم آپ نے کنفرم کرلیا ہے تو پھر آپ خود کوشش کرکے دیکھ لیں۔"

"کیا کوشش کرکے دیکھ لوں؟"

"غزالہ کو یہاں لانے کی کوشش۔"

سائیں نے صفدر کو گھورا "میں نہیں لاسکتا۔"

"آپ کے پاس سیکڑوں جری قسم کے جنات ہیں اور آپ ہماری درخواست پر ایک لڑکی کو یہاں نہیں لاسکتے۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں اور کیا نہیں کرسکتا' اس بات کو چھوڑو۔ میں تو۔۔۔" ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ گہری سانس لے کر بولا "ٹھیک ہے۔ اس قسم کا نازک کام تم جیسے چھچھوروں پر چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔ میں۔۔۔ خود ہی جاتا ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا یوں باہر نکلا جیسے غزالہ سامنے صحن میں موجود ہو اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر یہاں لانا چاہتا ہو لیکن جلدی میں اس نے باہر نکلنے کے بجائے بغلی کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ صفدر نے بازو پکڑ کر اسے باہر کا راستہ دکھایا۔ برآمدے میں زریں گل موجود تھا۔ وہ سائیں عالی کو دیکھ کر بدک گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ سائیں عالی پھر چھدک کر اس کی گردن پر سوار ہوجائے گا لیکن اس مرتبہ سائیں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیر کی طرح سیدھا نکلتا چلا گیا۔

زریں گل بولا "یہ انسان ہے یا چھلاوا۔ کبھی کبھی توام کو لگتا ہے کہ اس نے واقعی جن پال رکھے ہیں۔"

میں نے کہا "بے وقوف جن پالتے نہیں جاتے' پلے پلائے ہوتے ہیں۔"

"تمہاری طرح۔" صفدر نے زیرِ لب کہا۔

"آپ کیا بول رہا ہے۔" زریں نے چونک کر پوچھا۔

صفدر نے فوراً بات بدلی "میں کہہ رہا ہوں کہ کبھی کبھی تو مجھے بھی شک ہوتا ہے کہ شاید اس کے پاس واقعی جن شن موجود ہیں۔ اب ذرا سوچیں' بغیر پاسپورٹ بغیر ویزا وہ کس طرح خراماں خراماں انڈیا سے پاکستان چلا آیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر آج ہم آسٹریلیا چلے جائیں تو پرسوں وہ بھی سڈنی کی گلیوں میں گھومتا پھرتا نظر آئے گا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ سائیں عالی کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی روحانیت موجود ہے۔ وہ اپنے لب ولہجے سے مخاطب کو متاثر کرتا ہے اور اپنی بات منوالیتا ہے' اوپر سے اس کا حلیہ بھی ایسا ہے کہ ہر کوئی اسے پہنچا ہوا بزرگ سمجھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اچھے بھلے تعلیم یافتہ لوگ بھی دو چار منٹ کی گفتگو کے بعد سائیں کے پاؤں چھونے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔"

صفدر بولا "حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف انڈیا سے پاکستان پہنچا ہے بلکہ غزالہ کا پتا ٹھکانا بھی اسے معلوم ہوچکا ہے۔"

"بھئی' وہ تو آئندہ کی خبر بھی دے رہا ہے' یعنی کل گیارہ بج کر چالیس منٹ پر زلزلہ آنے والا ہے۔"

صفدر بولا "اگر وہ اتنے یقین سے کہہ رہا ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہ زلزلہ اس نے خود ہی لانا ہو۔ اس کے پاس ایک سو بارہ جنات ہیں۔ اتنے جنات بہ آسانی زلزلہ لاسکتے ہیں۔"

زریں بولا "آپ لوگ تو مذاق فرما رہا ہے۔ سنجیدگی سے سوچنے کا بات یہ ہے کہ سائیں عالی' غزالہ صاحبہ کی طرف گیا ہے۔ کہیں وہ انہیں زبردستی یہاں آنے پر مجبور نہ کرے۔"

"اگر وہ آبھی گئی تو کیا مضائقہ ہے۔" صفدر نے کہا "مجھے نہیں امید کہ ارشاد احمد یا اس کا کوئی ساتھی غزالہ کے پیچھے وہاں پہنچے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے شاہ جہاں صاحب؟"

"ہاں لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے کہا "وہ لوگ زیرِ زمین چلے گئے ہیں یا پھر ہوسکتا ہے کہ لاہور میں ہی نہ ہوں۔"

صفدر نے پُرسوچ لہجے میں کہا "مجھے شیخ عاصم کی طرف سے بھی بہت خطرہ ہے۔ شیخ کے ہرکارے ہر جگہ غزالہ کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

زریں گل مسلسل اپنی گردن مسل رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ صفدر نے اسے اوندھا لٹا کر اس کی گردن کا مساج شروع کردیا۔

ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قریباً ایک گھنٹے بعد سائیں عالی واقعی غزالہ کو لے کر پروفیسر اللہ دتا کی رہائش گاہ پر چلا آیا۔ وہ دونوں ٹیکسی سے اترے' بچہ غزالہ کی گود میں تھا۔ ایک بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا' ٹیکسی ڈرائیور نے اتر کر سائیں عالی کے غلیظ ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کرایہ لیے بغیر واپس چلا گیا۔

غزالہ ہکا بکا سی نظر آرہی تھی۔ اس کے جسم پر شکن شکن قمیص تھی۔ لگتا تھا کہ سائیں نے اسے لباس بدلنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

"یہ سائیں عالی کو کیا ہوگیا ہے۔" وہ بولی "ایک منٹ بھی مجھے وہاں رکنے نہیں دے رہے تھے۔ کہہ رہے ہیں کہ وہاں بہت خطرہ ہے۔ سارا سامان بھی سمیٹنے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے راضی کیا کہ سامان پھر منگوالوں گی۔"

صفدر نے کہا "ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں۔ بس یہی کہہ کر گئے تھے کہ وہاں بہت خطرہ ہے' میں غزالہ کو لینے جارہا ہوں۔"

"وہاں اتنی زور زور سے نعرے لگا رہے تھے کہ گلی محلے والے اکٹھے ہونے لگے تھے۔" غزالہ بولی "بالکل مست حال ہورہے تھے۔ اگر میں کچھ دیر اور وہاں رکتی تو سارا بازار اکٹھا ہوجاتا۔ میں نے آنے میں پس و پیش کیا تو انہوں نے اپنی گدڑی میں سے واکی ٹاکی نکال کر میرے کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف ابو بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا "سائیں صاحب! جو کہہ رہے ہیں درست کہہ رہے ہیں' تم جہاں بھی ہو فوراً ان کے ساتھ چلی جاؤ۔" میں مزید بات کرنا چاہتی تھی مگر سائیں عالی نے واکی ٹاکی میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں راستے میں بہت کہتی رہی ہوں کہ وہ ابو سے دوبارہ میری بات کرادیں لیکن کہتے ہیں کہ میرے پاس کوئی واکی ٹاکی نہیں' وہ تو غائب کی آواز تھی جو جناتی طریقے سے مجھ تک پہنچی تھی۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو اب ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔" غزالہ بچے کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"خیر ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ ہاں پریشان ہوا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

سائیں ٹیکسی سے اترنے کے بعد وہیں لان کی گھاس پر

اکڑوں بیٹھ گیا تھا اور مراقبے میں چلا گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے کچھ پڑھ رہا تھا اور ہوا میں پھونکیں مار رہا تھا۔

غزالہ ہمارے ساتھ اندر آگئی۔ پروفیسر اللہ دتا اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے غزالہ کی گود میں سے بچہ لے لیا۔ اسے پیار کیا پھر غزالہ سے بچے کا حال احوال دریافت کیا۔ غزالہ نے بتایا کہ کئی دن کے افاقے کے بعد بچے کو آج پھر بخار ہوا ہے۔ پروفیسر بڑے یقین سے بولا "انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ فوری طور پر بخار اتار دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اس کا مستقل علاج چاہتا ہوں۔ آج مہینے کا آخری ہفتہ ہے۔ مہینے کے آخری ہفتے بڑے میاں صاحب بھی یہاں آتے ہیں۔ اگر وہ تشریف لائے تو میں ان سے بھی بچے کا معائنہ کرواؤں گا۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی' پروفیسر اللہ دتا فون سننے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "یہ بڑے میاں صاحب کون ہیں؟"

غزالہ نے بتایا "پروفیسر کے مرشد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں بھی بہت شفا ہے' نیم مردہ لوگوں میں زندگی دوڑا دیتے ہیں۔"

شام کے فوراً بعد واقعی پروفیسر کے پیرو مرشد سے ملاقات ہوگئی۔ ایک نئی مارک ٹو گاڑی کو تھی کے پورچ میں آکر رکی۔ ایک وہیل چیئر پہلے سے پورچ میں موجود تھی۔ گاڑی کے اندر سے ایک بزرگ کو نکال کر بڑے احترام سے وہیل چیئر پر بٹھایا گیا۔ میں' صفدر اور زریں گل دنگ رہ گئے۔ یہ بزرگ ہمارے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ہم اسے لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں دیکھ چکے تھے۔ اس مسیحا صفت شخص نے حمزہ کی ٹانگ کا علاج کیا تھا اور اسے مکمل طور پر معذور ہونے سے بچالیا تھا۔ میانی صاحب قبرستان کی وہ رات میرے لیے ناقابلِ فراموش تھی جب ہم جاں بہ لب حمزہ کو اس بزرگ کے پاس علاج کے لیے لے کر گئے تھے۔ میں نے اس سفید ریش بزرگ کو ایک نیم روشن کمرے میں ہاتھوں اور پاؤں کے بل چلتے دیکھا تھا۔ وہ کمر کی کسی خاص تکلیف میں مبتلا تھا اور مسلسل کراہتا رہتا تھا۔ اس کے دوا خانے میں بیش قیمت دوائیں نہیں تھیں۔ بس مختلف رنگوں اور نسلوں کی مٹی تھی۔ اس شخص نے اسی مٹی سے ڈاکٹر حمزہ کا علاج کیا تھا۔ ممکن ہے کہ مٹی میں دواؤں کی آمیزش بھی ہو مگر بظاہر وہ مٹی ہی نظر آتی تھی۔

میں نے دیکھا' وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا بزرگ مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا تھا' اسی حالت میں دیکھا تھا۔ خدا جانے اس کی یہ "ہوں ہوں" نیند میں بھی ختم ہوتی تھی یا نہیں۔ لوگوں میں حیرت انگیز طور پر شفا بانٹنے والا یہ شخص خود ایک مسلسل کرب میں مبتلا تھا۔ پروفیسر اللہ دتا اسے بڑے احترام سے ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ ساتھ تین چار افراد اور بھی تھے۔ کمرے میں غالباً کھانے وغیرہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ بہرحال ہم میں سے کوئی اندر نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر کا ایک ملازم باہر آیا اور غزالہ کی گود سے ننھے "نابی" کو لے کر اندر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد بچہ باہر آگیا۔ اسے غالباً کوئی دوا بھی پلائی گئی تھی جو اس کے ہونٹوں پر لگی تھی۔ اچانک میرا دھیان ان مختلف رنگوں کے سفوف جات کی طرف چلا گیا جو میں نے چند دن پہلے پروفیسر کی فارمیسی میں دیکھے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ وہ سفوف بھی مٹی کی ہی پسی ہوئی شکل ہوں۔ میانی صاحب قبرستان کے اس بزرگ اور پروفیسر اللہ دتا کا طریقۂ علاج انوکھا ہونے کے باوجود اپنی افادیت کے ٹھوس ثبوت رکھتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میانی صاحب کے تاریک قبرستان میں ایک سنسان چار دیواری کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی نظر نہ آتیں اور پروفیسر اللہ دتا کے کلینک پر ہر طبقے کے لوگوں کا ہجوم نہ ہوتا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جوہرِ قابل کی کمی نہیں لیکن اسے دریافت نہیں کیا جاتا اور نہ پروان چڑھایا جاتا ہے۔ قریباً دو گھنٹے قیام کے بعد وہ سفید ریش پُراسرار معالج جتنی خاموشی سے آیا تھا اتنی ہی خاموشی سے واپس چلا گیا اور میرے ذہن میں اَن گنت سوال چھوڑ گیا۔

غزالہ واپس جانا چاہتی تھی لیکن سائیں عالی ہر گھڑی اس کا سپرا دے رہا تھا۔ اس کا نادر شاہی فرمان یہ تھا کہ غزالہ یہاں رہے گی' کم از کم کل رات گیارہ بج کر چالیس منٹ تک یہاں رہے گی۔ کیونکہ کل رات لاہور میں ایک خوف ناک زلزلہ آنے والا ہے جو کوئٹہ کے زلزلے کی یاد تازہ کردے گا۔ سائیں عالی کی بات کو کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا' تاہم یہ بات تو ہم دونوں بھی محسوس کررہے تھے کہ غزالہ اس چار دیواری میں ذیشان پارک والے مکان سے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ صفدر کے علاوہ زریں گل کا بھی زبردست اصرار تھا کہ غزالہ کم از کم کل کا دن یہاں رہے۔ وہ اپنی حاملہ بیوی گل ثوم کو یہاں لانا چاہتا تھا اور اس کا معائنہ کرانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی غزالہ کے ساتھ زریں گل کو بہت لگاؤ تھا۔ صفدر اور زریں کے پیہم اصرار پر غزالہ رک گئی۔ میرے ساتھ وہ بہت واجبی سی بات کررہی تھی۔ زریں گل اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہورہا تھا اور صفدر کو آنکھوں آنکھوں میں

معنی خیز اشارے کررہا تھا۔ غزالہ دوسرے کمرے میں تھی۔ زریں گل گنگنانے لگا "کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتا ہے کتنا پیارا۔ چپ رہ کے بھی نظر میں ہے پیار کا اشارہ۔ کچھ لوگ۔۔۔"

صفدر نے کہا "زریں گل' میرا خیال ہے کہ آج تو ضرور مار کھائے گا۔"

"کس سے؟"

"ڈاکٹر صاحبہ سے' اور کس سے؟"

"ام تو غزالہ صاحبہ کو منانے کے لیے اپنا جان بھی قربان کرنا پڑے تو فوراً کردے گا۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر ڈاکٹر صاحبہ ناراض ہوگئیں تو کل تمہاری زوجہ محترمہ کا چیک اپ کون کرے گا۔"

"زوجہ کا چیک اپ کیا ام تو زوجہ کو بھی استاد صیب کی چھوٹی سی خوشی کے لیے قربان کرسکتا ہے۔"

وہ بڑے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک پلیٹ کو اٹھا کر طبلہ بنایا اور لنک لنک کر گانا شروع کردیا "روٹھے ہو تم۔۔۔ تم کو کیسے مناؤں خوچے۔ بولو ناں۔۔۔ بولو ناں۔"

میں نے زریں گل کی گردن دبوچی "اوئے تان سین کی اولاد! یہ گانے بجانے کا موقع نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب سخت پریشان ہیں۔ ان کی بچی کی زندگی خطرے میں ہے اور یہی نہیں' پچھلے ہفتے یہاں تین بندے بھی قتل ہوچکے ہیں۔ ایسی سوگوار فضا میں تم فلمی گانے گاؤ گے تو ضرور پروفیسر صاحب سے پھینٹی کھاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے' اب ام فلمی گانے نہیں گائے گا بلکہ مکالموں سے کام چلائے گا۔ ام جارہا ہے غزالہ صاحبہ کے پاس۔"

"کیا کرو گے وہاں جاکر؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے دل میں آپ کے لیے نرم خوشہ پیدا کرے گا۔"

"خوشہ نہیں گوشہ۔" صفدر نے تصحیح کی۔

میں نے کہا "نرم گوشے سے پہلے میں جوتے مار مار کر تیرا سر نرم کردوں گا۔ چپکا بیٹھا رہ یہاں' کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

زریں گل باغی لہجے میں بولا "استاد صیب! آپ امارا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے۔ ام سچ کہتا ہے' اب ام سے آپ کا غم نہیں دیکھا جاتا۔ آپ کیوں اپنے آپ پر اتنا ظلم فرماتا ہے۔ یہ بہت زیادہ ظلم ہے۔ اتنا زیادہ ظلم تو۔۔۔"

"ظلم ناٹکہ میں تھیم آرا پر بھی نہیں ہوا تھا۔" صفدر نے فوراً لقمہ دیا۔

"آپ مذاق کی بات کرتا ہے' ام ایک دم سنجیدہ ہے۔ ام جانتا ہے کہ آپ غزالہ بی بی کو چاہتا ہے۔ ام جانتا ہے کہ غزالہ بی بی بھی آپ کو چاہتا ہے لیکن ام یہ نہیں جانتا کہ آپ ایک دوسرے کو کیوں نہیں مل سکتا۔ ام تو آج تک یہی سنتا آیا ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کتنا لمبا صبر کیا ہے آپ نے۔ اگر اتنے لمبے صبر اور انتظار کا پھل بس انتظار ہی ہے تو پھر کڑوا پھل کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "تیرے سوال کا جواب ایک زوردار جھانپڑ کے سوا اور کچھ نہیں۔"

"تو پھر ام کو مارو نہ جھانپڑ لیکن جو امارے دل میں ہے وہ ام ضرور بولے گا اور امارے دل میں وہی بات ہے جو اب سائیں عالی کے دل میں ہے۔"

"اور سائیں عالی کے دل میں کیا بات ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"خو سائیں صیب فرماتا ہے کہ غزالہ بی بی اور استاد صیب کا ستارہ آپس میں ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے' اگر کسی تیسرے ستارے نے ٹانگ نہ اڑایا تو پتا نہیں کون سے برج میں یہ دونوں ستارہ مل جائے گا۔"

زریں گل نے آخری فقرہ بڑی اونچی آواز میں کہا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں غزالہ بھی سن لے۔ مجھے زریں پر غصہ آرہا تھا۔ اس کی یہ بکواس سن کر غزالہ برہم بھی ہوسکتی تھی۔ ایسے میں ممکن تھا کہ وہ فی الفور واپس روانہ ہوجاتی۔ میں نے بہانے سے زریں کو باہر بھیج دیا۔

رات کو ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ غزالہ بھی بچے کو سلا کر آگئی اور ہمارے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے شیخ عاصم اور امارات کے حوالے سے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا تھا' ہم نے بھی اس موضوع کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہماری گفتگو بس ان حالات کے گرد گھومتی رہی تھی جو ہمارے آس پاس موجود تھے۔ بردہ فروشوں اور ان کی کارروائیوں کا مسئلہ بے حد توجہ طلب تھا۔ یہ لوگ نجانے کب سے اس دھندے میں مصروف تھے اور ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے غیر ملکی افراد کے ملوث ہونے سے یہ معاملہ اور بھی سنگین ہوگیا تھا۔ بردہ فروشی کا ذکر آتے ہی ذہن میں بیگار کیمپوں کا خیال آجاتا ہے یا پھر ایسے جرائم پیشہ گروہوں کا تصور ابھر آتا ہے جو نوعمر بچوں کو معذور کرتے ہیں اور منظم طریقے سے ان سے بھیک منگوانے

کا پیشہ کراتے ہیں یا پھر کچھ لوگ اس ضمن میں انسانی اعضاؤں کی خرید و فروخت کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن زیر نظر واقعات بالکل مختلف نوعیت کے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بردہ فروشی "غلامی اور ملکیت" کے خالص نظام کے حوالے سے ہے۔ ایس ایس پی ساہی صاحب نے اس سلسلے میں اعلیٰ حکام سے رابطہ کرلیا تھا اور اب اس معاملے کو نہایت سنجیدگی سے لیا جارہا تھا۔ رجب اور کارپین کی تلاش شب و روز جاری تھی اور ان دونوں سے بھی زیادہ اہمیت افریقی مائیکل کو دی جارہی تھی۔ اس کی آدم خوری کی خبر بھی اب زبان زد خاص و عام ہوگئی تھی۔ اخباروں میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ ایک سال پہلے مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر اور اس کی بیوی کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا تھا اس کا تعلق بھی افریقی مائیکل اور اس کے ساتھیوں سے تھا۔ شیر محمد ڈوگر اور اس کی اہلیہ کی لاشیں جنگل سے ملی تھیں اور ان کے بارے میں یہ خیال کیا گیا تھا کہ گیدڑوں اور آوارہ کتوں نے انہیں بھنبھوڑ ڈالا ہے لیکن اب پروفیسر کے بیان کے بعد واضح ہوا تھا کہ وہ آدم خور حبشیوں کے ہاتھوں اذیت ناک موت مرے تھے۔ تیسرا شخص ڈی ایس پی کمانڈو بھی حبشیوں ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا مگر اس کی لاش دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ لاش کیوں دستیاب نہیں ہوئی تھی؟ یہ سوال بھی کئی اور سوالوں کی طرح جواب طلب تھا۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ زریں گل اپنی اہلیہ گل ثوم کو لے آیا۔ اس کا وزن تھوڑا سا بڑھ گیا تھا لیکن مجموعی خوب صورتی میں فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے شرمائے لجائے انداز میں ہمیں سلام کیا۔ غزالہ نے اسے گلے سے لگایا۔ وہ اب تھوڑی بہت اردو بولنے لگی تھی۔ سکھانے والا چونکہ زریں گل تھا لہٰذا وہ بھی "ہم" کو ام ہی کہتی تھی اور مذکر مونث میں بھی دلچسپ گڑبڑ کرتی تھی بلکہ اس معاملے میں وہ زریں سے بھی کچھ آگے ہی تھی۔ کہنے لگی "اللہ بڑی اچھی ہے۔ اس نے امارا دعا قبول کیا۔ آپ کو ام سے ملایا۔"

وہ پہلے سے کچھ شوخ بھی ہوگئی تھی۔ نوخیز لڑکیوں کی طرح ہر کام پھرتی سے کرتی نظر آتی تھی۔ غزالہ کا رخسار چوم کر کہنے لگی "آپ ام کو بہت پسند ہے۔ امارا دل چاہتی ہے' ام آپ کے لیے اپنے ہاتھ سے روٹا پکائے اور کھلائے۔"

"او خدائی خوار! روٹا نہیں روٹی۔" زریں نے درست کیا۔

"ہاں آج کا روٹی یعنی کھانا' ام خود پکائے گا انشاء اللہ۔"

زریں نے اسے ہریات کے ساتھ انشاء اللہ اور ماشاء اللہ وغیرہ کہنا بھی سکھا دیا تھا۔

غزالہ نے اس کا سرخ و سپید ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "گل ثوم! اس حالت میں تمہارے لیے زیادہ کام کاج مناسب نہیں' تم زیادہ سے زیادہ آرام کرو۔"

"کیوں ام کو کیا ہوا۔ زریں بھی ہر وقت یہی کہتی رہتی ہے۔"

صفدر کے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا "بہت خوب۔۔۔ زریں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ خود بھی مذکر مونث کا بہت بڑا غرق کرتا تھا۔"

ہمارے منع کرنے کے باوجود گل ثوم کچن میں گھس گئی اور برتن کھڑکھڑانے لگی۔ مجبوراً غزالہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ دونوں بے تکلفی کے ماحول میں باتیں کرتی رہیں۔ گل ثوم کی بلند و بالا آواز کچن سے باہر تک آرہی تھی۔

"آپ کا شادی بن گیا؟" اس نے غزالہ سے پوچھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔"

"آپ نے کیوں نہیں بنایا۔ اس میں بڑا مزہ آتا۔ دل خوش ہوجاتا۔ آپ کب خوش ہوئے گا؟"

"پتا نہیں۔" غزالہ نے جھنجلا کر کہا۔

"زریں بتاتی تھی۔ آپ ماشاء اللہ کسی سے پیار کرتا۔ آپ ام کو بتائے گا کہ کس سے کرتا؟" غزالہ غالباً غصے کے سبب خاموش رہ گئی تھی۔ گل ثوم کھلکھلا کر ہنس دی "آپ بہت شرماتا لجاتا ہے لیکن ام کو کچھ کچھ پتا ہے۔"

اس کے بعد شاید گل ثوم کو ڈانٹ پڑی تھی اور اس کی آواز بہت مدھم ہوگئی تھی۔۔۔

کھانا مزے دار تھا۔ غزالہ کے ہاتھ کی بھولی بسری لذت یاد آگئی۔ بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ ماش کی دال اور گوشت کی ڈش تھی۔ ساتھ میں گاجر کی کھیر یعنی گجریلا تھا۔ کھانے کے بعد میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے لان میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ گل ثوم ننگے سر اور ننگے پاؤں لان میں بھاگ رہی تھی' بھاگتی بھاگتی وہ بیرونی سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھی کی چھت پر چلی جاتی پھر نیچے اترتی اور لان کا ایک چکر لگا کر دوبارہ چھت پر چڑھ جاتی۔ ملازم حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے' کوٹھی سے باہر موجود پولیس کے باوردی اور سفید پوش ملازمین کو بھی یہ منظر دکھائی دے رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو راہداری میں غزالہ اور زریں گل کھڑے تھے۔ غزالہ کے

چہرے پر ہراس نظر آرہا تھا۔ یقیناً میری طرح وہ بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ گل ثوم پر کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "زریں' اس پاگل کو روکو۔ کیوں اپنی جان کی دشمن ہو رہی ہے۔ اس کی حالت۔۔۔ بھاگنے دوڑنے والی نہیں۔"

زریں بوکھلایا ہوا باہر نکلا اور گل ثوم کو آوازیں دینے لگا۔ وہ تیسری بار چھت پر چڑھنے کے بعد نیچے اتر رہی تھی' زریں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی بلکہ سہم گئی۔ زریں نے اسے ڈانٹا اور پھر کھینچ کر اندر لے آیا۔ وہ لال بھبوکا ہو رہی تھی اور ہانپی ہوئی تھی۔

"یہ کیا چکر تھا؟" میں نے زریں سے پوچھا۔

"یہ ایک دم بے وقوف ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے کھوپڑے میں مغز کی جگہ لکڑی' پتھر بھرا ہوا ہے۔ ام کو اگر دفینے میں سے حصہ مل گیا تو ام اس کا دماغ ضرور تبدیل کرائے گا۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"پاگل کا بچی کہتا ہے کہ غزالہ بی بی کے ہاتھ میں بڑا لذت ہے' اس نے اتنا اچھا گجریلا پکایا کہ ام ضرورت سے زیادہ کھا گیا۔ اب اسے ہضم کرنے کے لیے دوڑیں لگا رہا تھا۔"

صفدر ہنسا "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ بات کوئی اور ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہاں آس پاس کوئی پہاڑی یا ٹیلا ہے۔ میں نے کہا اللہ کی بندی یہ لاہور ہے' یہاں جو ٹیلا آس پاس ہے وہ بھی سو ڈیڑھ سو کلو میٹر دور ہے لیکن تم نے ٹیلے کو کیا کرنا ہے۔ کہنے لگی' کچھ نہیں' بس یونہی کسی ٹیلے پر چڑھنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"پھر کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"تم تو فوراً تھانے دار بن جاتے ہو۔ آرام سے پوچھو گے تو بتا دے گی۔"

"اچھا ام ابھی پوچھتا ہے۔" زریں گل لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔

زریں کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ خوش نظر آرہا تھا "ہاں بھئی کیا بات تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا' غالباً دیکھ رہا تھا کہ غزالہ تو آس پاس نہیں پھر اپنے مخصوص انداز میں بولا "ام نے اسے خواہ مخواہ پاگل کا بچی کہہ دیا' وہ خاصا سمجھ دار ہے۔ وہ دراصل استاد صیب اور غزالہ بی بی کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔"

"یہ کیسی دعا تھی جو بھگٹ بھاگ کر مانگی جاتی ہے" صفدر نے پوچھا۔

"یہ دعا مانگنے کا قبائلی طریقہ ہے جناب! اگر ایک اور عورت آپس میں پیار فرماتا ہو لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے کھچا کھچا رہتا ہو تو ان کا کوئی دوست یا خیر خواہ ان مشکل آسان فرمانے کے لیے یہ عمل کرتا ہے۔ مرد کے ایک بال اکھاڑ کر عورت کے سر میں ڈال دیا جاتا ہے اور عورت کے سر کا ایک بال مرد کے سر میں ڈال دیا جاتا ہے دعا مانگنے والا کھلی جگہ پر چلا جاتا ہے اور کسی ٹیلے پر سات مرتبہ چڑھ کر سات مرتبہ اترتا ہے۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پڑھتا بھی جاتا ہے۔ یہاں کوئی ٹیلا وغیرہ تو تھا نہیں اس لیے گل ثوم نے چھت کو ٹیلا بنا لیا۔"

"اور یہ رہا جناب وہ بال۔" صفدر نے میرے سر پر پھیرا اور ایک لمبا سا بال اتار لیا۔ یقیناً یہ غزالہ ہی کا تھا۔

"یار! کن پاگلوں میں پھنس گئے ہیں ہم۔" میں نے صفدر سے کہا "یہ سائیں عالی اور زریں کیا کم تھے جو یہ آفت بھی نازل ہو گئی ہے۔"

یہ بات میں نے انگریزی میں کہی تھی۔ زریں کو ایک پھر تاؤ چڑھ گیا۔ "فرنگیوں" کی زبان سے اسے خدا واسطے بیر تھا اور پھر جب کسی انگریزی فقرے میں زریں کا نام آجائے تو جلتی پر تیل کا کام ہو جاتا تھا۔ اُن گنت بدگمانیاں اسے گھیر لیتی تھیں۔ وہ سرتاپا لالہ سُد میر بن جاتا تھا۔ اس میں مشہور فلموں آگ کا دریا' فرنگی' سرحد کی گود میں' کے مکالمے فر فر اس کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور قریباً نصف گھنٹا زریں کے اندر سُد میر کی روح غراتی رہی۔

زریں کی سادگی کو گل ثوم کی معصومیت نے دوچند کر دیا تھا۔ ان دونوں کو خوش دیکھ کر میرے دل کی گہرائیوں میں مسرت کی لہر اٹھتی تھی۔ اردگرد کے سنگین حالات کے پس منظر میں ان کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ ارشاد احمد' مائیکل ان کے کارندے کسی بھی وقت اس خوب صورت جوڑے کے لیے نقصان کا باعث بن سکتے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ارشاد احمد اور افریقی مائیکل گرفتار نہ ہوتے' زریں اور گل ثوم میرے ساتھ پروفیسر کی رہائش گاہ ہی رہیں گے۔ یہ ایک وسیع کوٹھی تھی' اکا موڈیشن کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں مکمل تحفظ تھا۔ ساہی صاحب

کوٹھی سے باہر سادہ پوش پولیس متعین کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ مسلح گارڈز بھی تھے جو چوبیس گھنٹے پہرا دے رہے تھے۔ اس بات کا امکان تو کم ہی تھا کہ مائیکل یا اس کا کوئی کارندہ اس کوٹھی کا رخ کرے گا پھر بھی چھوٹے سے چھوٹے امکان کو نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔ میری تو یہ بھی خواہش تھی کہ غزالہ بھی دونوں بڑے مجرموں کی گرفتاری تک یہیں رہے لیکن وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کل دوپہر تک یہاں سے جانے پر اصرار کرے گی۔

رات کا کھانا ہم نے اکٹھے ہی کھایا۔ سائیں عالی بھی اس کھانے میں شریک تھا۔ اس نے بھنے ہوئے قیمے میں بہت سی چینی ڈالی اور یوں کچر کچر کھانے لگا کہ دل مالش کرنے لگا پھر اس نے پودینے کی چٹنی کچر یلے میں ڈالی' اس میں تھوڑی سی کوک ملائی اور آدھا ڈونگا اٹھا کر پی گیا۔ ہم سب تو خیر پہلے سے جانتے تھے لیکن پروفیسر اللہ دتا سائیں عالی کی کارروائیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ سائیں عالی بے حد سنجیدہ تھا۔ شاید رات کو آنے والے زلزلے کے شدید جھٹکوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بار بار غزالہ کو تنبیہہ کر رہا تھا کہ وہ گھر نہیں جائے گی' ہرگز گھر نہیں جائے گی۔

کھانے کے بعد میں اور صفدر اپنے کمرے میں آ گئے۔ صفدر مونگ پھلی کا شوقین تھا۔ مونگ پھلی کھاتے ہوئے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھا "کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ہو سکتا ہے کہ مائیکل یا ارشاد احمد میں سے کسی نے یہاں آنے کی کوشش کی ہو لیکن کوٹھی کے آس پاس سفید پوش پولیس کو پہچان کر واپس چلا گیا ہو۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اب کوٹھی میں پیش آنے والے خونی واقعے کو پندرہ سولہ روز گزر چکے ہیں۔ کیوں نہ ایک رسک اور لیا جائے۔ کوٹھی کے آس پاس سے سفید پوش پولیس ہٹالی جائے' معمول کے ایک گارڈ کے سوا یہاں کوئی حفاظتی انتظام نہ ہو۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر پروفیسر تک پہنچنے کی کوشش کریں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' خاموش راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور یہاں رہنے والے نامعلوم بوڑھے کی وہی کرب ناک آواز سنائی دی جو اکثر ہماری سماعت کو جھنجوڑ دیتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔"

ہر بار جب وہ یہ فقرہ ادا کرتا تھا تو اس کی آواز میں غم کی شدت پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ یہ آواز مجھے بڑی اداس کرتی تھی کہ دل و دماغ میں ایک صحرا سا پھیل جاتا تھا۔ اس صحرا میں ان گنت لوگ ننگے سر و ننگے پاؤں سرگرداں نظر آتے تھے۔ وہ اپنے پیاروں کی تلاش میں چہروں پر مہینوں کی گرد سجائے ہوتے تھے' کسی کو بیٹے کی' کسی کو بھائی کی' کسی کو پوتے یا پوتی کی تلاش ہوتی تھی۔ میں ان کی ویران اور کھلی آنکھوں میں جھانکتا تھا اور خود بھی اندر سے کھنڈر ہو جاتا تھا۔ بوڑھا صدا دیتا ہوا کوٹھی کے کسی دوسرے حصے میں چلا گیا اور اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ پروفیسر اللہ دتا ہمارے ساتھ والے کمرے میں تھا' اس کی ہچکیوں کے ساتھ رونے کی آواز آئی اور سوگوار فضا کو چیرتی اور سوگوار کر گئی۔ پروفیسر کو اپنی اکلوتی بیٹی کا غم اکثر نالۂ نیم شب پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پورے ایک برس سے اس کی بیٹی پنجۂ ستم میں تھی۔ وہ جن لوگوں کے چنگل میں تھی وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً انسانوں کو کچا چبا جاتے تھے۔ وہ اب نہ صرف اپنی عزت گنوا چکی تھی بلکہ بیمار بھی تھی۔ اسے یرغمال بنانے والوں نے موجودہ واقعات کے بعد خبر نہیں اسے زندہ بھی چھوڑا تھا یا نہیں۔

پروفیسر کی سسکیاں آدھی رات کے سینے کو شق کرتی رہیں۔ کوٹھی کے بند دروازوں کے اندر ایک بیکراں غم لیرا لیتا رہا اور بند دروازوں سے باہر رکھوالی کے کتے بھونکتے رہے اور مسلح گارڈز کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔

کچھ دیر بعد اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پروفیسر کے سلیپروں کی چاپ میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ بڑی بے قراری کے عالم میں ہمارے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ پھر اس نے دھڑا دھڑ دروازے پر دستک دی۔ ساتھ ہی وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں چلا رہا تھا "شاہ جہاں۔۔۔ دروازہ کھولو۔"

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ پروفیسر کا چہرہ دہشت سے بگڑا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آ گیا۔ صوفے پر گر کر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا "میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں۔۔۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں۔ یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے!" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"کیا ہوا پروفیسر؟" میں نے پوچھا۔

وہ اپنی دہشت زدہ آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولا "شاہ جہاں! میں نے۔۔۔ اس کو دیکھا ہے۔ ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"کس کو؟"

وہ خوف سے پھٹی آواز میں بولا "اسی خونی قاتل کو۔۔۔ وہ میرے گھر میں موجود ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

"لیکن کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" صفدر نے استفسار کیا۔

"اسی درندے مائیکل کی۔ ابھی دو منٹ پہلے وہ مجھے کمرے کی کھڑکی میں نظر آیا ہے۔ وہ گرے رنگ کے سوٹ میں ہے' سرخ ٹائی لگا رکھی ہے۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔"

مجھے پروفیسر کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔ مائیکل کو پورے لاہور میں کھوجا جا رہا تھا۔ وہ اس عمارت میں کیسے پہنچ سکتا تھا۔ چاروں طرف سے پولیس نے عمارت کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اندر بھی مسلح گارڈ موجود تھے۔ میں نے پروفیسر کو تسلی دی اور اسے یقین دلایا کہ اگر کوئی یہاں ہے بھی تو وہ ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا' صفدر نے بھی بستر کے فوم کے نیچے سے آٹو میٹک رائفل نکال کر تکیے پر رکھ دی تھی۔ پروفیسر کی حالت بدستور پتلی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دو تین سگریٹ پھونکے' میں نے اس سے کہا کہ وہ ہمارے ہی کمرے میں سو رہے۔ پروفیسر کسی لحاظ سے بھی کمزور اعصاب کا مالک نظر نہیں آتا تھا لیکن حالات کے شکنجے میں کس جانے کے بعد وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں واپس جانے پر زور نہیں دیا۔ صفدر صوفے پر لیٹ گیا جبکہ پروفیسر میرے ساتھ والے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ اعصاب کو پرسکون کرنے والی کوئی دوا لے لے لیکن اس نے انکار کیا۔

کمرے میں نائٹ بلب روشن کر کے میں بھی بستر پر دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد اونگھ سی آ گئی۔ یک لخت ایک چیخ نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ یہ پروفیسر ہی کی چیخ تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا اور کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا "وہ ہے۔۔۔ وہ یہیں ہے۔ میں نے ابھی اسے پھر دیکھا ہے۔"

میں نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی۔ اس مرتبہ مجھے صفدر کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا "میرا خیال ہے کہ ابھی کوئی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا۔"

صفدر نے آٹومیٹک رائفل ہاتھ میں لے لی تھی' میں نے بھی ریوالور تھام لیا اور پوری طرح چوکس ہو گیا۔ صفدر نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور محتاط انداز میں اردگرد دیکھا' راہداری دور تک خالی تھی۔ ٹی وی لاؤنج کی طرف بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے سرگوشی میں صفدر سے کہا "ہو سکتا ہے کوئی ملازم ہو۔ پروفیسر کا کمرا خالی دیکھ کر ہمارے کمرے میں جھانک رہا ہو۔"

"نہیں' میں نے بھاری بوٹوں کی آواز سنی ہے۔" صفدر نے فوراً جواب دیا۔

کمرے کی فضا میں ایک سراسیمگی سی محسوس ہوئی۔ اس چار دیواری میں صرف ہم ہی نہیں تھے۔ غزالہ بھی معصوم بچے سمیت موجود تھی۔ اس کے علاوہ زریں گل' گل ثوم اور سائیں عالی بھی تھے۔ اگر انسان کے روپ میں ایک آدم خور وحشی اس چار دیواری میں موجود تھا تو وہ سب شدید خطرے میں تھے۔ میں سب سے پہلے اس کمرے میں پہنچا جہاں غزالہ اور گل ثوم سو رہی تھیں۔ ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا' نائٹ بلب کی روشنی میں وہ دونوں محو خواب نظر آئیں۔ بچہ محمد ثانی غزالہ سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ بالکل جیسے ایک بچہ اپنی ماں سے پیوست ہو' پھر میں نے زریں گل اور سائیں عالی کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی بخیریت تھے۔ زریں سو رہا تھا جبکہ سائیں عالی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے' گہرے مراقبے میں تھا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آیا تو صفدر اور پروفیسر کو محو گفتگو پایا۔ صفدر پوچھ رہا تھا "اگر آپ کے خیال میں مائیکل اسی چار دیواری میں ہے تو وہ خود کو کہاں چھپا سکتا ہے؟"

پروفیسر نے لرزاں و ترساں آواز میں کہا "وہ۔۔۔ دوسری منزل کے کسی۔۔۔ عقبی کمرے میں ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک بیس منٹ بھی ہے۔ یہ وہی بیس منٹ ہے جہاں مائیکل نے مجسٹریٹ اور اس کی بیوی کو ڈی ایس پی کمانڈو سمیت اذیت دے کر قتل کیا تھا۔ اس وقت سے بیس منٹ (تہ خانہ) بند پڑا ہے۔"

صفدر نے کہا "چلیں آئیں' پہلے اوپر کی منزل پر چلتے ہیں پھر بیس منٹ دیکھتے ہیں۔"

صفدر کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ اردگرد کے سارے کمرے اور راہداریاں دیکھ چکا ہے۔ بیس منٹ کے ذکر پر پروفیسر کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ شاید اسے ایک سال پہلے کے وہ خونی مناظر یاد آ گئے تھے جو اس نے اور اس کی بیٹی نے تہ خانے میں ملاحظہ کیے تھے۔ ان مناظر کی دہشت جیسے ابھی تک پروفیسر کی آنکھوں میں جمی ہوئی تھی۔

ہم پہلے بالائی منزل پر گئے۔ بڑی احتیاط سے مشکوک کمروں کا جائزہ لیا۔ ہم نے بالائی منزل کا ایک ایک چپا دیکھا اور پھر نیچے بیس منٹ کی طرف آ گئے۔ کافی طویل سیڑھیاں

اتر کر ہم ایک آہنی دروازے کے سامنے پہنچے۔ گرد آلود سیڑھیاں اترتے ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ کوٹھی کے اس حصے میں طویل عرصے سے کوئی نہیں آیا۔ آہنی دروازے پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا اور کچھ کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ صفدر نے پروفیسر سے پوچھا "بیس منٹ کب سے بند ہے؟"

پروفیسر بولا "مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ اس کی چابی میرے ملازم اشرف کے پاس تھی۔ کبھی کبھار وہ اندر کی صفائی کراتا تھا۔"

میں نے تالے کو ہلایا جلایا کنڈی کو کھینچ کر دیکھا' صاف پتا چلتا تھا کہ دروازہ عرصے سے بند ہے لیکن دروازے کے قریب پہنچتے ہی مجھے ایک عجیب بات کا احساس ہوا۔ میں نے صفدر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ وہ شاید واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا "اس تہ خانے میں جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا "تالے کی چابی مل سکتی ہے؟"

پروفیسر نے کہا "اشرف تو یہاں نہیں ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"آٹھ دس روز سے گاؤں گیا ہوا ہے۔ چابی بھی اسی کے پاس ہے۔"

میں نے فیصلہ کن لہجے میں صفدر سے کہا "صفدر' یہ تالا توڑنا ہوگا۔"

صفدر کے پاس وہی "ایم جی" تھی جس سے میں نے مسائی حبشی کو گولیوں سے بھونا تھا۔ اس رائفل پر جدید قسم کا سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ سیڑھیوں کا بالائی دروازہ بند تھا لہٰذا امید تھی کہ تہ خانے میں ایم جی چلنے کی آواز کوٹھی سے باہر سنائی نہیں دے گی۔ میری ہدایت کے مطابق صفدر نے تالے پر ایم جی کا برسٹ مارا اور وہ کنڈی سمیت ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹانگ مار کر دروازہ کھولا۔ ہم چند لمحے دیواروں کی اوٹ میں ساکت کھڑے رہے' پھر صفدر نے اندر گھس کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور بیس منٹ کی لائٹیں روشن کردیں۔ اندر کا منظر حیرت ناک تھا۔ یقیناً ہمارے ساتھ ساتھ پروفیسر کو بھی شدید دھچکا لگا تھا۔ بیس منٹ اندر سے بالکل صاف ستھرا تھا۔ وہاں پینٹ پارٹیشن نظر آرہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ ہم کسی تہ خانے کے بجائے ایک سجے سجائے فلیٹ میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک کمرے کی آرائش سٹنگ روم کے طور پر کی گئی تھی' ایک دوسرا کمرا ہو بہو بیڈ روم کا منظر پیش کررہا تھا۔ یہاں لباس اور جوتے وغیرہ بھی نظر آرہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص یہاں رہائش پذیر ہے۔ پروفیسر شدید خوف کے ساتھ شدید الجھن کا شکار بھی تھا۔ وہ ہکلا کر بولا۔

"میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں۔۔۔ جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ شائستہ سے ملانے کے لیے" فی الحال پروفیسر کی بات پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم نے بے حد احتیاط سے سارے بیس منٹ کا معائنہ کیا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا مگر شواہد مل رہے تھے کہ یہاں کوئی رہائش پذیر ہے اور تو اور' کچن میں استعمال شدہ برتن بھی موجود تھے اور پھر ایک ایسی شہادت نظر آئی جس نے ہمیں سرتاپا ہلا دیا۔ میں نے کچن میں موجود ریفریجریٹر کھولا۔ فریزر کے اندر فروزن گوشت پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔۔۔ یہ ران کا گوشت تھا۔۔۔ انسانی ران کا۔۔۔ گھٹنے کے ذرا اوپر سے کاٹی ہوئی یہ ران صاف پہچانی جارہی تھی۔ ران پر برف جمی تھی اور برف کی سفیدی کے اندر سے سیاہ انسانی بال صاف نظر آرہے تھے۔ ابکائی میں نے بمشکل روکی اور پیچھے ہٹ گیا۔ صفدر نے بھی یہ منظر دیکھا اور اس کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔ پروفیسر کی نگاہ پڑنے سے پہلے ہی میں نے ریفریجریٹر کا دروازہ بند کردیا۔ اس کمرے میں دو اور اہم چیزیں بھی نظر آئیں۔ ایک تو ڈیپ فریزر تھا۔ دوسرا ایک طاقت ور وائرلیس سیٹ تھا جس میں سے بہت سے تار وغیرہ نکل کر میز کے نیچے چلے گئے تھے۔ میں اس وائرلیس سیٹ کو دیکھ رہا تھا جب اچانک ایک آواز نے ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے سنائی دی تھی۔ آواز کا ماخذ وہ چھوٹا سا سوراخ تھا جو ایگزاسٹ فین کے لیے رکھا گیا تھا لیکن ابھی فین اس میں لگایا نہیں گیا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمیں شدید جھٹکا لگا کہ سوراخ میں سے آٹومیٹک رائفل کی خوفناک تال جھانک رہی تھی۔ ہماری ایک غلط جنبش ہمارے جسم میں درجنوں سوراخ بنا سکتی تھی۔ بولنے والے نے اپنے الفاظ پھر دہرائے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

"اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھالو۔" پھر ذرا توقف سے بولا "ورنہ نتائج کی تمام ذمے داری تم پر ہوگی۔"

اس کی آواز میں موجود دھمکی آمیز لرزش نے مجھے بتا دیا کہ وہ خوف ناک ارادہ رکھتا ہے اور ہماری معمولی سی مزاحمت کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ ہمیں صاف دیکھ

رہا تھا اور خود ہماری نظروں سے مکمل طور پر اوجھل تھا۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے ہتھیار پھینک دیے۔

"پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ اور اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھو۔" ایگزاسٹ فین کے سوراخ سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

میں نے اور صفدر نے اس حکم پر عمل کیا۔ پروفیسر بھی۔۔۔ لڑکھڑاتا ہوا ہمارے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ اس کا زرد چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ابھی اسے دل کا دورہ پڑجائے گا۔ ایسے دہشت زدہ چہرے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

روزن کے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ میری نگاہیں روزن سے نکلی ہوئی رائفل کی نال پر مرکوز تھیں۔ اگر رائفل کی نال روزن سے اوجھل ہوتی تو ہم مزاحمت کی کوشش کرسکتے تھے' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ ایک لمبا تڑنگا حبشی دیو دروازے سے اندر آگیا۔ اس کا حلیہ ہی اس کی شناخت تھا۔ وہ تھری پیس گرے سوٹ میں ملبوس تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا اور بال چمک رہے تھے۔ وہ سونڈ بونڈ آدم خور مائیکل تھا۔

اس انسان نما درندے کے چہرے پر جو سب سے نمایاں چیز مجھے نظر آئی وہ اس کے غیر معمولی حد تک چوڑے اور مضبوط جبڑے تھے۔ ناک حبشیوں کی طرح چپٹی اور ہونٹ موٹے تھے۔ اگر اس کے غیر معمولی چوڑے جبڑوں کو نظر انداز کردیا جاتا تو وہ ایک لمبا تڑنگا مہذب سیاہ فام نظر آتا' اس کے ہاتھ میں جدید ماؤزر تھا اور چہرے پر ایک نہایت عیار مسکراہٹ تھی۔ اس کی چتلون کی دائیں جیب بہت پھولی پھولی تھی۔ معلوم نہیں اس نے وہاں کیا ٹھونس رکھا تھا۔ حبشی کے چہرے کی عیار مسکراہٹ دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ اس نے ہمیں چکما دیا ہے۔ وہ ہماری توقع سے زیادہ ہوشیار تھا۔ روزن میں آٹومیٹک رائفل کے پیچھے وہی تھا اور اب ہمارے سامنے ماؤزر تھامے بھی وہی کھڑا تھا۔ اگر رائفل اب بھی روزن میں نظر آرہی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے رائفل کو روزن میں پھنسا دیا تھا۔

"خوش آمدید۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور ایک ٹانگ پر وزن ڈال کر کھڑا ہوگیا۔

ہمارے لیے مائیکل کی یہاں موجودگی ایک حیرت انگیز انکشاف تھی۔ ہم اس بدبخت کو پورے شہر میں تلاش کرا رہے تھے اور وہ پروفیسر کی رہائش گاہ میں ہی چھپا ہوا تھا۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ ہوسکتا ہے پروفیسر کی مصیبت زدہ بیٹی بھی اسی بیس منٹ میں کہیں موجود ہو لیکن فی الحال اس بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ فی الحال تو ہمیں ایک خطرناک ہتھیار اور انسان نما درندے کا سامنا تھا۔ ماؤزر کا رخ میرے اور صفدر کی طرف تھا۔ پروفیسر میں مائیکل کو غالباً اتنا دم خم ہی نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت آپ لوگوں کی کچھ زیادہ خدمت نہیں کرسکتا۔" مائیکل نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس نے چتلون کی پھولی ہوئی جیب میں سے ایک ماسک نکالا اور منہ پر چڑھالیا پھر اسی جیب میں سے اس نے شیشے کی ایک لمبوتری بوتل نکالی۔ یہ ایک اسپرے تھا۔ بالکل ایسا ہی ایک اسپرے ہمیں ارشاد احمد کی خانہ تلاشی کے دوران میں ایک کمرے سے ملا تھا۔ اس کمرے میں سے بہت سے جعلی پاسپورٹ' شناختی کارڈز اور غیر ملکی سفارت خانوں کی مہریں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ یہ اسپرے جو مائیکل کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا' نہایت خطرناک تھا۔ اس کی مدد سے کسی بھی شخص کو کئی گھنٹوں کے لیے اعصابی طور پر یکسر مفلوج کیا جاسکتا تھا پھر میں نے دیکھا کہ بوتل کے "اسپرنگ نوزل" سے دھند جیسی تیز گیس خارج ہوئی اور مختصر کمرے میں پھیلنے لگی۔ اس موذی گیس میں سانس لینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور یہ کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ ایک دم ہی ریڑھ کی ہڈی اور دماغ میں ایک سرد لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی' اس کے ساتھ ایک تیز بو نے ذہن کو جکڑ لیا۔

"خبردار کوئی حرکت نہ کرے۔" ماسک کے عقب سے حبشی مائیکل کی آواز پھر ابھری۔ چند سیکنڈ بعد یکایک ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر گھٹنوں کے بل گرا۔ نگاہ کے سامنے زرد رنگ سا پھیلتا جارہا تھا۔ اس رنگ میں' میں نے صفدر کو لڑکھڑاتے ہوئے اور دیوار سے ٹکراتے دیکھا' اس کے بعد ذہن یک لخت کورے کاغذ کی طرح سفید اور سادہ ہوگیا۔ کوئی احساس نہ رہا۔ تکلیف کا' پریشانی کا نہ گرد و پیش کا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں نیم وا ہیں۔ سب کچھ نظر آرہا تھا لیکن ادراک کسی شے کا نہیں تھا۔ جیسے انسان یکسر بے خیالی میں کسی شے کو دیکھتا چلا جارہا ہو اور بس دیکھتا چلا جارہا ہو۔ میں نے نوٹ کیا کہ میرا چہرہ سن ہے اور ہونٹوں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے تک لے جانا چاہا لیکن۔۔۔ کہاں تھا میرا ہاتھ؟ میں کوشش کے باوجود نہ جان سکا کہ میرا

ہاتھ کہاں ہے اور وہ حرکت میں کیوں نہیں آرہا۔ زندگی میں ایسی کیفیت میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

پتا نہیں اس کیفیت میں کتنا عرصہ گزرا۔ میں وقت کا ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پایا' تاہم میرا خیال ہے کہ دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کس رخ سے اور کس آسن میں فرش پر گرا ہوا تھا۔۔۔ اور گرا ہوا تھا یا بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ یا ہوا میں معلق تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک زردی مائل پردہ تھا اور اس پردے میں سے کمرے کے دھندلے منظر نظر آرہے تھے۔ میں افریقی مائیکل کو دیکھ رہا تھا لیکن یوں دیکھ رہا تھا جیسے پردہ اسکرین پر کسی اجنبی کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ مائیکل کو دیکھ کر ذہن میں کسی بھی قسم کی کیفیت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ لاتعلق سی لاتعلقی تھی یا یوں کہہ لیں کہ بے حسی سی بے حسی تھی۔ اچانک مجھے ایک اور جسم نظر آیا' یہ غزالہ کا جسم تھا۔ وہ دبے پاؤں آئی اور میں نے اسے اندھا دھند مائیکل پر جھپٹتے دیکھا۔ اس نے مائیکل کا ماؤزر والا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر نیچے جھکا دیا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی کہ مائیکل اس ہاتھ کو دوبارہ سیدھا نہ کر سکے۔ ساتھ ساتھ وہ چلا بھی رہی تھی۔ یقیناً مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اٹھ کر مائیکل پر جھپٹ پڑوں لیکن غزالہ کی آواز مجھے کہیں دور' بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سنگین ترین منظر کو دیکھ کر بھی میرے ذہن میں کوئی کیفیت نہیں ابھری تھی۔ ذہن کی سلیٹ بالکل صاف تھی اور شاید صاف نہ بھی ہوتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے اعضا کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے دیکھا' غزالہ نے اپنے دانت مائیکل کی کلائی پر گاڑ دیے تھے اور ایسی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی جن میں انتہا درجے کی التجا کے ساتھ انتہا درجے کی حیرت بھی پوشیدہ تھی پھر میں نے دیکھا کہ مائیکل نے قریب رکھی ہوئی آٹومیٹک رائفل اٹھائی اور اس کے دستے سے غزالہ کے سر پر ضربیں لگانے لگا۔ چوٹیں کھانے کے باوجود غزالہ پوری جان کے ساتھ جبشی سے چمٹی رہی۔ ہر ضرب سے غزالہ کے بال اس کے چہرے پر بکھرتے جا رہے تھے لیکن اس منظر سے میرا تعلق وہی تھا جو پردہ اسکرین کے منظر سے ہوتا ہے۔ جب میں نے غزالہ کی پیشانی پر خون کی سرخ لکیر دیکھی تو ایک ساعت کے لیے' صرف ایک ساعت کے لیے ذہن میں کرب کا احساس جاگا۔ جیسے گھٹا ٹوپ تاریکی میں ایک جگنو سا چمکے۔ میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن زبان نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ غزالہ کے ہاتھوں سے مائیکل کی کلائی چھوٹ گئی۔ وہ نیم جان ہو کر اوندھے منہ فرش پر گر مائیکل کی ٹانگ بار بار حرکت کرنے لگی۔ وہ اسے ٹھو رسید کر رہا تھا۔ میں نے یونہی نیم دلی سے کوشش کی کہ آنکھیں بند کر لوں مگر آنکھیں بند کرنا بھی میرے بس میں تھا یا تو میری آنکھوں پر پلکیں نہیں تھیں یا پلکوں سے رابطہ نہیں تھا پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں کھلی آنکھوں ساتھ ہی سو گیا ہوں۔

بے ہوش انسان جب ہوش میں آتا ہے تو ایک دو کے اندر اس کے حواس بحال ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایک ہوشی (یا بے حسی) تھی جو آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوش تبدیل ہوئی۔ پہلے دل و دماغ پر چھائی ہوئی اتھاہ مایوسی قنوطیت میں افاقہ ہوا پھر نگاہ کے سامنے چھائی ہوئی زردی کی کثافت کم ہوئی۔ کاسۂ سر اور ریڑھ کی ہڈی میں یخ بستگی جگہ ہلکی سی حرارت کا احساس ہونے لگا پھر مجھے اندازہ ہوا میں پلکیں جھپکا رہا ہوں اور میرے پاؤں کی انگلیاں مرضی سے حرکت کر رہی ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ میں اعضا کو حرکت دینے اور اپنے خیالات مجتمع کرنے کے ہو گیا۔ میں نے صفدر کو دیکھنے کی کوشش کی' وہ میرے ہی موجود تھا اور بے سُدھ پڑا تھا۔ غالباً اس پر اعصاب گیس کا اثر مجھ سے زیادہ ہوا تھا۔ (میں نے آخری لمحات سانس روک لی تھی' صفدر یہ نہیں کر سکا تھا) پروفیسر اوندھا منہ پڑا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا اور پھر میری نگاہ ہستی پر پڑی جو میری عزیز ترین تھی۔ میں نے غزالہ کو دیکھا وہ قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے صرف ایک پاؤں میں جوتی تھی۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اس پر بنفشی کا سویٹر تھا۔ اس کی اوڑھنی قریب ہی پڑی تھی۔ غزالہ پر پٹی باندھ دی گئی تھی تاہم رخساروں اور گردن پر ابھی خون جما ہوا تھا۔ اس کی ایک کلائی بھی سُوجی ہوئی تھی۔ نے اندازہ لگایا کہ غزالہ کو خواب آور دوا دی گئی ہے۔ نیند کے باوجود وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی' وہ سے بند تھا۔ کھڑکیوں میں لوہے کی گرل اور جالی لگی تھی۔ کمرے میں ایک الماری' ایک بیڈ اور تھوڑا سا فرنیچر تھا۔ میں نے الماری میں سے ایک تولیا نکالا' باتھ روم جا کر گرم پانی سے تولیے کا ایک حصہ بھگویا۔۔۔ اور غزالہ چہرے اور گردن سے خون اچھی طرح صاف کیا۔ اس ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں پانی سے کیا۔ غزالہ کی کلائی اتری ہوئی تو نہیں تھی غالباً اس

شدید موچ آئی تھی۔ مجھے الماری کے ایک خانے میں وِکس کا مرہم نظر آگیا۔ میں نے کلائی پر مرہم لگا کر تولیے سے ایک پٹی پھاڑی اور باندھ دی۔

میرے اس عمل کے دوران میں ہی صفدر کے حواس بحال ہونا شروع ہو گئے تھے پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل تھیں اور بالکل خالی خالی نظر آرہی تھیں "غزالہ ٹھیک تو ہے؟" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ صفدر نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور دیر تک گم صم و ساکت بیٹھا رہا۔

درحقیقت اعصاب شکنی کی کیفیت نے ہمیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ حواس بحال ہونے کے باوجود طبع پر عجیب سی پژمردگی اور غنودگی چھائی تھی۔ اعصاب شکنی سے پہلے کے واقعات حالانکہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے پیش آئے تھے لیکن وہ دور دراز کے واقعات لگتے تھے۔ ہمارا تہ خانے میں داخل ہونا' یہاں کسی کی موجودگی اور رہائش کا احساس ہونا' فریج میں انسانی گوشت کا فروزن لوتھڑا پھر مائیکل کی آمد۔ اس کے چہرے کا نیلگوں گیس ماسک اور اسپرے۔ ایک ناگوار بُو نتھنوں میں گھسنے لگی اور دل مالش کرنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ بیس منٹ میں داخل ہونے سے قبل میں نے تیل کے چولھے کی بو بھی محسوس کی تھی۔ درحقیقت یہی مدھم بُو تھی جس نے مجھے بیس منٹ کا تالا تڑوانے اور اندر داخل ہونے پر مجبور کیا تھا۔ جب تیل کے چولھے پر کھانا پکایا جاتا ہے تو ایک مخصوص باس سی در و دیوار میں پھیل جاتی ہے اور یہی باس مجھے بیس منٹ کے دروازے پر محسوس ہوئی تھی۔

غنودگی اور نقاہت کے زیر اثر میں پھر لیٹ گیا۔ نجانے کب آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو چار پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ ہم ایک نہایت خطرناک آدم خور وحشی کے قبضے میں ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ پروفیسر اب صوفے پر نیم دراز تھا اور سسکیوں سے رو رہا تھا۔ صفدر کمرے میں ٹہل رہا تھا' اس کے پھونکے ہوئے سگریٹ کا دھواں کمرے میں موجود تھا۔ میں نے غزالہ کو دیکھا' وہ قالین پر ہی لیٹی ہوئی تھی۔ صفدر نے اس کے سر کے نیچے ایک صوفے کی گدی رکھ دی تھی اور جسم پر گرم چادر ڈال دی تھی۔ میں نے صفدر سے پوچھا "یہ جاگی نہیں؟"

وہ بولا "نہیں۔۔۔ بس غنودگی میں پانی مانگ رہی تھی۔ میں نے پانی پلایا ہے۔"

میں نے غزالہ کو چھوا تو اس کا جسم تپ رہا تھا "میرا خیال ہے کہ اسے بخار ہے۔" میں نے صفدر کو اطلاع دی۔

صفدر نے بھی غزالہ کو چھو کر دیکھا "ہاں کافی تیز بخار ہے۔"

میں نے غزالہ کو جگانا چاہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بستر پر لیٹ جائے لیکن وہ بدستور نیم بے ہوشی میں رہی۔ میں نے اسے اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس بھاری بھرکم چاپ نے مجھے سمجھا دیا کہ انسان نما درندہ کھڑکی کی طرف آرہا ہے پھر وہ کھڑکی پر نظر آیا۔ تھری پیس سوٹ' عینک اور سرخ ٹائی۔ اس کی حرکات و سکنات میں واشنگٹن ڈی سی کے کسی ڈپلومیٹ کا سا رکھ رکھاؤ تھا لیکن اس کی درندگی کا ثبوت میں فریج کے بالائی خانے میں ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس کی ایک کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وہی جگہ تھی جہاں غزالہ نے آخری کوشش کے طور پر اپنے دانت گاڑے تھے۔ ان لمحوں میں غزالہ کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت بھی مجھے ابھی تک یاد تھی۔۔۔ اس حیرت کی وجہ یقیناً میری بے عملی ہی تھی۔ جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا' غزالہ ہمارے پیچھے ہی پیچھے تہ خانے تک چلی آئی تھی۔ جب ہم تالا توڑ کر اندر گھس آئے تو وہ بھی تھوڑے سے وقفے کے بعد اندر آگئی تھی۔ اس وقت تک مائیکل ہمیں گن پوائنٹ پر لے چکا تھا اور ہم اعصاب شکنی کی کیفیت میں زیر دام تھے۔ غزالہ نے مائیکل کے ہاتھ میں ماؤزر دیکھا تھا اور ہمیں ایک موقع دینے کے لیے بے دریغ مائیکل پر جھپٹ پڑی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی مگر ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔

کھڑکی کے سامنے پہنچ کر مائیکل نے اپنے نہایت صاف دانتوں کی نمائش کی اور بولا "میں آپ کو ایک بار پھر خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید ہے کہ ہمارا سفر اچھا گزرے گا۔"

"سفر؟ کیسا سفر؟" میں نے پوچھا۔

"زندگی کا سفر۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

یہ معمولی سا جملہ تھا لیکن میرے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے حوالے سے مائیکل کے ارادے بڑے طویل اور دور رس ہیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مائیکل' یہ بھول جاؤ کہ تم یہاں سے بچ کر نکل سکتے ہو۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے انجام کو دردناک ترین بنا رہے ہو۔"

"میری فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے حیران کن اعتماد اور شائستگی سے کہا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص انسانی گوشت کھاتا تھا۔

پروفیسر نے چیختے ہوئے کہا "میری بیٹی کہاں ہے۔ خدا

کے لیے مائیکل۔۔۔ مجھے بتاؤ میری شائستہ کہاں ہے؟"

"حوصلہ رکھو ڈیئر' وہ یہیں پر ہے۔" مائیکل نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

پروفیسر نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے "مجھے اس سے ملا دو مائیکل۔۔۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب لے لو۔ بس میری بیٹی مجھے دے دو۔ میں اسے لے کر کہیں بہت دور چلا جاؤں گا۔ بس اپنی بیٹی کو لے کر۔"

"دور جانے کے لیے بیٹی کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔" مائیکل لفنگے پن سے ہنسا "اور فی الحال وہ زیادہ صحت مند نہیں۔ کچھ زنانہ قسم کے معاملات ہیں اس کے۔ بائی گاڈ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ پتا نہیں کس کی شرارت ہے۔ بہرحال ایک دو ماہ میں سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا پھر اسے جہاں جی چاہے لے جانا۔"

"وہ جیسی بھی ہے' بس دے دو مجھے۔۔۔ مائیکل میری جھولی میں اس کی بھیک ڈال دو۔ وہ بڑے تھوڑے دل کی ہے۔ یہ نہ ہو اس کی جان چلی جائے۔ وہ مر رہی ہے مائیکل۔۔۔ وہ بجھتی جارہی ہے۔"

پروفیسر نے عاجزی کی انتہا کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رگڑنا شروع کردیا۔

مائیکل کی گردن نخوت سے کچھ اور اکڑ گئی۔ وہ امریکی لہجے میں انگلش بول رہا تھا۔ کہنے لگا "چھوڑ دیں گے ڈیئر۔ چھوڑ دیں گے مگر ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر تم سے بہت سا حساب کتاب بھی تو کرنا ہے۔"

"میرا سب کچھ لے لو۔ میری جان بھی لے لو مگر میری شائستہ کو اور دُکھ نہ دو۔ وہ تم لوگوں کا ظلم نہیں سہہ سکتی۔"

"ظالم ہم نہیں۔ ظلم تم نے اپنے آپ پر کیا ہے ڈیئر۔" مائیکل مسکرایا "تمہارے بھائی ارشاد احمد نے تمہیں کتنا سمجھایا۔ کتنا سر پھوڑا تمہارے ساتھ۔۔۔ کیا کیا جتن کیے۔۔۔ لیکن تم پر اپنی "من مرضی" کا بھوت سوار رہا۔ تم نے ہم سے کھلی جنگ کی۔۔۔ اور جنگ میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ مار دیا مرجاؤ۔ اگر ہم تمہیں نہ مارتے تو تم ہمیں مار دیتے۔"

روتے روتے پروفیسر کی ہچکی بندھ گئی۔ اگر مائیکل کمرے کے اندر ہوتا تو پروفیسر یقیناً اس کے پاؤں میں اپنا سر رکھ دیتا اور مائیکل کے ایک اشارے پر اس کے پاؤں چاٹنا شروع کردیتا۔ مائیکل کا رعب کچھ اس طرح طاری تھا اس پر کہ دیکھ کر ترس آتا تھا اور نہ صرف ترس آتا تھا بلکہ شرمندگی بھی ہوتی تھی۔

میں نے مائیکل سے کہا "پروفیسر کا کہنا ہے کہ تم نے ان کی بیٹی کو کسی اور جگہ جس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور تم پروفیسر کو وہاں لے جانے کے لیے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیا کرتے تھے؟ اب تم کہہ رہے ہو کہ پروفیسر کی بیٹی یہیں ہے؟"

"وہ بھی درست تھا اور یہ بھی درست ہے۔" مائیکل مسکرایا۔

"کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے؟"

"تم لوگوں کے لیے انکشاف یہ ہے کہ ڈیئر پروفیسر کی بیٹی پچھلے دس گیارہ مہینے سے اسی تہ خانے میں ہے۔۔۔ اور میں بھی یہیں تھا۔"

میں نے دیکھا کہ اس انکشاف پر پروفیسر اللہ دتا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ناقابلِ یقین نگاہوں سے مائیکل کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ مائیکل نے کہا "درحقیقت میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں۔ مجھے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے سارے کام یہیں پر ہورہے تھے۔"

مائیکل ناقابلِ یقین بیان دے رہا تھا۔ وہ پچھلے قریباً ایک سال سے اس کوٹھی کے تہ خانے میں موجود تھا اور کسی کو خبر نہیں تھی۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ ٹھیک ہے کہ تین دردناک اموات کے بعد تہ خانہ بند پڑا تھا اور کوئی اس جانب آتا نہیں تھا مگر ملازم تو کبھی کبھار آتے ہوں گے' خاص طور سے ملازم اشرف جس کے پاس تہ خانے کی چابی تھی۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس تہ خانے میں خوراک اور زندگی کی دوسری سہولیات کیسے اور کس کے ذریعے پہنچتی تھیں۔

عیار آنکھوں والا مائیکل بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ امریکن اسٹائل کی انگلش میں بولا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کیا سوال ابھر رہے ہیں۔ تم سوچ رہے ہو کہ اس تہ خانے میں رہتے ہوئے' باہر کی دنیا سے میرا رابطہ کیونکر بحال تھا۔۔۔" ایک لمحے توقف کرکے وہ مسکرایا اور بولا "میرا رابطہ ارشاد احمد اور ملازم اشرف علی کے ذریعے بحال تھا۔ اشرف علی ڈیئر پروفیسر کا واحد ملازم تھا جس کے پاس تہ خانے کی چابی تھی اور جو کبھی کبھار تہ خانے میں آتا تھا۔ اشرف کا ایک ساتھی ملازم بھی اس سلسلے میں اس کا رازداں تھا۔۔۔"

پھر مائیکل ارشاد احمد کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کب اور کیسے اس سے رابطہ کرتا تھا۔ مائیکل بڑے موڈ میں نظر آتا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں اپنی عیاری کی تمام تفصیل ہمیں بتائی اور تہ خانے کے حوالے سے کئی انکشافات کیے۔ اس کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب درج ذیل ہے۔

قریباً گیارہ ماہ پہلے جب مائیکل نے ارشاد احمد کے ساتھ مل کر مجسٹریٹ ڈوگر اور ڈی ایس پی کمانڈو کو قتل کیا اور پروفیسر کی بیٹی کو یرغمال بنایا تو اس نے پروفیسر کے گھر میں واقع تہ خانے کو ہی اپنا مستقل ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ تہ خانہ کافی گہرائی میں واقع تھا اور ہر لحاظ سے محفوظ تھا پھر اس طرف کوئی آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ پروفیسر کی بیٹی کو یرغمال بنانے کے بعد مائیکل اور ارشاد احمد نے پروفیسر کو پانچ چھ ہفتوں کے لیے ایبٹ آباد بھیج دیا تھا۔ پروفیسر کی اس غیر حاضری کے دوران میں ان دونوں نے نہایت رازداری سے تہ خانے میں تبدیلیاں کروائیں اور یوں تہ خانہ ایک لگژری فلیٹ کی سی شکل اختیار کرگیا۔ اس کام میں پروفیسر کا ملازم اشرف اور اس کا ساتھی منشا۔ ارشاد احمد کے رازداں تھے۔

تہ خانے میں داخلے کے دو راستے تھے۔ ایک تو وہی آہنی دروازہ جس کا تالا تڑوا کر ہم اندر داخل ہوئے تھے اور بعد میں غزالہ بھی داخل ہوئی تھی' دوسرا راستہ ارشاد احمد کے ذاتی کمرے میں سے تھا۔ جیسا کہ پروفیسر نے مجھے بتایا تھا کہ اپنی علیحدہ رہائش گاہ بنانے کے باوجود ارشاد احمد نے اس گھر میں اپنا ذاتی کمرا نہیں چھوڑا تھا اور اکثر یہاں آتا رہتا تھا' درحقیقت یہ بھی اسی سازش کا حصہ تھا۔ ارشاد احمد کے اس کمرے کے ساتھ ایک اسٹور بھی ملحق تھا۔ اس اسٹور کے اندر سے بھی تہ خانے میں اترنے کے لیے ایک راستہ بنایا گیا تھا۔ ارشاد احمد کے کمرے کی طرح اس اسٹور کو بھی تالا لگا رہتا تھا اور چابیاں ارشاد احمد کے پاس ہوتی تھیں یا پھر ملازم اشرف کے پاس۔ پروفیسر اپنے کلینک اور فارمیسی میں زیادہ مصروف رہتا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہورہا ہے؟ کون آتا ہے' کون جاتا ہے؟ دونوں اہم ملازم چونکہ ساتھ ملے ہوئے تھے' لہٰذا ارشاد احمد اور مائیکل کو کسی طرح کی دشواری نہیں تھی اور یوں وہ لاڈلی بیٹی جس کے لیے پروفیسر دن رات تڑپتا رہتا تھا' اسی فرش کے نیچے دکھ جھیلتی رہی تھی جس پر پروفیسر چلتا پھرتا تھا۔ یہ عیاری اور دیدہ دلیری کی ایک حیران کن مثال تھی۔ ایک ایسا ملزم جس کو پورے شہر میں تلاش کیا جارہا تھا' مدعی ہی کے گھر میں ایک سال سے روپوش تھا۔ مائیکل کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پروفیسر کو چکما دینے کے لیے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی پھر اسے گاڑی پر بٹھا کر یونہی قریبی سڑکوں پر تھوڑی دیر گھمایا جاتا تھا اور واپس کوٹھی میں لاکر تہ خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا جہاں وہ اپنی مصیبت زدہ بیٹی سے ملاقات کرتا تھا۔ بعد ازاں یہی عمل پھر دہرایا جاتا تھا۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے گاڑی میں تھوڑی سی سیر کرائی جاتی تھی اور واپس کوٹھی میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

مائیکل کے یہ انکشاف ہمارے لیے تعجب خیز تھے۔ خاص طور سے پروفیسر اللہ دتا کی آنکھیں تو پھٹی رہ گئی تھیں۔ میں نے مائیکل سے پوچھا "ملازم اشرف اب کہاں ہے؟"

"تمہارے خیال میں وہ کہاں ہے؟" مائیکل نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"میری معلومات کے مطابق وہ آٹھ دس روز سے اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ وہ یہیں ہے۔" مائیکل مسکرایا "اس کی ٹانگ کا ایک حصہ تم فریج میں دیکھ چکے ہو۔"

"کیا؟" پروفیسر چیخا۔

"ہاں۔۔۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ بہت دکھی ہورہا تھا۔ میں نے اسے سکھی کردیا ہے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کا ایک انداز یہ بھی تو ہے۔"

"اور اسے سکھی کرنے کے بعد تم نے اس کا گوشت کھانا شروع کردیا؟"

اس نے قہقہہ لگایا "انگریزی محاورے کے مطابق اسے ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ سکھی ہونے والا تو سکھی ہوگیا تھا۔ اب اگر اس کا بے جان جسم کسی کام میں آجاتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ یوں سکھ پانے والے کی آتما بھی سکھی ہوجاتی ہے۔"

"اب تک اس تہ خانے میں کتنی آتماؤں کو سکھی کرچکے ہو تم؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا "کچھ زیادہ نہیں۔ میں نے اپنی خواہش پر بہت قابو رکھا ہے۔ پچھلے دس گیارہ مہینوں میں بمشکل چار پانچ آتمائیں ہی سکھی ہوئی ہوں گی۔"

میں اس کی ڈھٹائی پر ششدر رہ گیا۔ صفدر نے کہا "یعنی چار پانچ انسانوں کو مار کر ان کا گوشت کھانے کا اعتراف کررہے ہو تم؟"

وہ لاپروائی سے بولا "اعتراف تو جرم یا گناہ کا کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تو یہ صرف ایک اطلاع ہے۔ میں نیامی حبشی ہوں۔ اگر تم افریقہ کے بارے میں اور وہاں کے لوگوں کے متعلق تھوڑا بہت بھی جانتے ہو تو تم نے "نیامیوں" کا ذکر ضرور سنا ہوگا اور مجھے یہ بتاتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہورہی کہ "نیامیوں" کی وجہ شہرت آدم خوری ہے۔ ہمارے رسم و رواج اور عقائد کے مطابق انسان کا گوشت کھانا ایک قطعی معمول کا عمل ہے۔ ہر خطے کے لوگوں کی کوئی بنیادی اور

مرغوب غذا ہوتی ہے۔ جیسے پاکستان میں گندم شوق سے کھائی جاتی ہے' بنگال میں مچھلی اور چاول' امریکا میں آلو' سری لنکا میں پلاؤ اور ناریل کا تیل' نمل ایسٹ میں زیتون اور کھجوریں۔ اسی طرح ہم لوگوں کے لیے انسانی گوشت پسندیدہ غذا ہے۔ انسانی گوشت کی خواہش خود ہماری پیدا کردہ نہیں ہے' یہ صدیوں سے ہمارے خون میں سفر کررہی ہے۔ ہم چاہیں بھی تو تین چار صدیوں تک اس عادت سے مکمل چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ بالکل جیسے بنگال' امریکا اور سری لنکا وغیرہ کے لوگ اپنی اپنی مرغوب غذاؤں کی خواہش سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دنیا کے دوسرے باشندوں کی نسبت ہمارے لیے اپنی پسندیدہ خوراک کو ترک کرنا کہیں زیادہ دشوار ہے۔ انسانی گوشت کی لذت کے متعلق تم نے بہت کچھ سنا ہوگا اور جو کچھ تم نے سنا ہے حقیقت اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔"

میرا دل مالش کررہا تھا۔ صفدر بھی شاید بمشکل اپنی ابکائیاں روکے ہوئے تھا۔ ہم حیرت سے مائیکل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ جو خوش لباس شخص ہمارے سامنے کھڑا عمرانیات اور نفسیات وغیرہ پر بات کررہا ہے وہ ایک پیدائشی آدم خور ہے۔

صفدر نے پوچھا "جو چار پانچ افراد تمہاری "پسندیدہ خوراک" کی صورت تمہارے فریج میں پہنچے ہیں اور کچن کی زینت بنے ہیں' وہ کون تھے؟"

"بس' میری اور تمہاری طرح کے انسان ہی تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی ڈی ایس پی کمانڈو تھا جو ہم نے شروع میں ہلاک کیا تھا۔ اس کا گوشت اچھا تھا۔ میں نے اس کی لاش باہر نہیں پھنکوائی تھی۔ اس کا فروزن گوشت وقفے وقفے سے ڈیڑھ ماہ تک استعمال ہوا۔ بعد ازاں ارشاد احمد دو مزید افراد کو یہاں لایا۔ دونوں جواں سال تھے اور امریکا جانے کے خواہش مند تھے۔ وہ امریکا کو جنت قرار دیتے تھے۔ ہم نے انہیں ارضی جنت کے بجائے اصلی جنت میں پارسل کردیا۔ پروفیسر کا ملازم منشا بھی بے حد دکھی اور زندگی سے بیزار تھا۔ اس کی نجات کا کریڈٹ بھی مجھے ہی جاتا ہے۔"

"اوہ! مائی گاڈ!" پروفیسر چیخا "تم نے منشا کو بھی مار ڈالا۔"

"اوہ' تم تو یوں چلّائے ہو جیسے خدانخواستہ تمہاری بیٹی کام آگئی ہے۔ بھئی وہ ملازم تھا' ایک معمولی ملازم۔"

میں نے کہا "منشا اور اشرف تو تمہارے ساتھ ملے ہوئے تھے پھر انہیں کیوں قتل کیا تم نے؟"

"بس وہ بہت زیادہ دکھی ہوگئے تھے۔ وہ منشا کتے کا بچہ اتنا دکھی تھا کہ اس سے اپنا دکھ سنبھالا ہی نہیں گیا اور وہ ایک رات پاگل بھینسے کی طرح ڈیئر پروفیسر کی بیٹی پر جا پڑا۔ وہ نرم نازک لڑکی اس بپھرے ہوئے مسٹنڈے کا مقابلہ کہاں تک کرتی۔ میرے باخبر ہونے تک اور موقع پر پہنچنے تک وہ اپنا کام کرچکا تھا۔ میں نے ڈیئر پروفیسر سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کی بیٹی پانچ برس بھی میرے پاس رہے تو اس کی آبرو پر کوئی حرف نہیں آئے گا لیکن اس بدبخت کی وجہ سے میرے وعدے کے ٹکڑے ہوگئے۔ جس منحوس رات لڑکی کی آبرو قتل ہوئی' اسی رات میں نے آبرو کے لٹیرے کو بھی قتل کردیا۔" مائیکل کے چہرے پر تشنج کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ تاہم اس کے چہرے سے اس کی سچائی یا دروغ گوئی کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔

میں نے پوچھا "اور اشرف کا کیا قصور تھا؟"

"اس کا قصور بھی صرف یہی تھا کہ وہ دکھی تھا۔"

"تم سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری لعنتی بھوک ان کی زندگی کے خاتمے کا سبب بن گئی تھی۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں نا کہ میں نے ان پانچوں میں سے کسی ایک شخص کو بھی بے سبب نہیں مارا۔ وہ بے چارے دکھی ہی اتنے تھے کہ انہیں مارنا مجھے کارِ ثواب محسوس ہوا۔ ہاں جب وہ مرگئے تو پھر ان کے جسموں کو بیکار پھینکنے کے بجائے میں نے انہیں استعمال میں لانا مناسب سمجھا۔ آخر میں اشرف کو دکھوں سے نجات حاصل ہوئی۔ وہ منشا کے اچانک غائب ہوجانے سے پریشان تھا۔ بے چارے کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ منشا میرے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ اس کا اندیشہ پختہ ہوتا جارہا ہے اور وہ میرے لیے یا اپنے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرلے گا تو میں نے اس کا خاتمہ بالخیر کردیا۔"

ہماری طرح پروفیسر بھی دم بخود سن رہا تھا۔ غزالہ گرم چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور قالین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ بخار کی نشان دہی کررہا تھا۔ مائیکل نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ڈیئر! آج میں نے تم کو سب کچھ صاف بتا دیا ہے۔ تمہیں اب اس بات پر یقین کرلینا چاہیے کہ تمہاری بیٹی کے سلسلے میں' میں اپنے وعدے پر قائم رہا ہوں۔ بس۔۔۔ بس وہ ایک حادثہ تھا جو ہوگیا۔"

"میں مانتا ہوں۔ سب مانتا ہوں۔" پروفیسر نے کہا "مجھے تم سے کوئی گلہ شکایت نہیں' بس مجھے میری شائستہ کی صورت دکھادو۔"

"اچھا دکھا دیتے ہیں۔ دکھا دیتے ہیں لیکن تھوڑا صبر کرو۔" مائیکل نے جھنجلا کر کہا۔

میں نے پوچھا "تمہارا دستِ راست ارشاد کہاں ہے؟"

"اس کے بارے میں میری معلومات بھی وہی ہیں' جو تمہاری ہیں بلکہ شاید تمہاری کچھ زیادہ ہی ہوں۔ تم نے کئی روز ارشاد احمد کا روپ دھارے رکھا ہے بلکہ ارشاد بن کر اپنے ہی قتل کے سودے بھی طے کرتے رہے ہو۔"

میں نے کہا "میری معلومات تو یہی ہیں کہ ارشاد احمد پولیس چھاپے سے پہلے ہی فرار ہوگیا تھا۔"

"میرے خیال میں تمہاری معلومات درست ہیں۔ وہ پولیس کے خوف سے روپوش ہے۔ اس وقت یہ بیس منٹ اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتی تھی مگر باہر پولیس موجود ہے لہٰذا وہ یہاں بھی نہیں آسکتا۔ ویسے پروفیسر جیسے چالاک شخص کا حقیقی بھائی ہونے کے باوجود کبھی کبھی وہ بے وقوفی کا ثبوت دیتا ہے یا شاید لالچ میں آکر اس سے بے وقوفی سرزد ہوجاتی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "آج سے چار ماہ پہلے میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اب کام سمیٹ لینا چاہیے لیکن وہ بضد رہا کہ نہیں' ابھی کچھ دیر اور یہ سلسلہ چل سکتا ہے' وہ پروفیسر کی پروفیسری کو پوری طرح نچوڑ لینا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پروفیسر کے عقیدت مندوں میں ابھی عقیدت موجود ہے۔ اس کا نظریہ غالباً یہ تھا کہ کام اس وقت چھوڑنا چاہیے جب پروفیسر کو اس کے عقیدت مندوں سے جوتیاں پڑنا شروع ہوجائیں یا لوگ خشوع و خضوع کے ساتھ جمع ہوکر آئیں اور ریکروٹنگ ایجنسی کے دفتر کو آگ لگا دیں۔ تم مشرقی لوگوں کی یہی تو مصیبت ہوتی ہے۔ جب ڈرتے ہو تو چھپکلی سے بھی ڈرتے ہو' جب دلیری دکھاتے ہو تو آنکھیں بند کرکے بھڑوں کے چھتے میں ٹکر دے مارتے ہو۔"

"پھر ایسے لوگوں سے تو بالکل نہیں ڈرنا چاہیے جبکہ تم نے ہمیں پنجرے میں بند کرکے رکھا ہوا ہے۔"

"سارے ایک جیسے نہیں ہوتے۔" مائیکل نے فوراً جواب دیا "میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں تمہاری عیاری کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ تم نے ارشاد احمد اور اس کے چہری نوکر کی بے وقوفی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ نہ صرف تم آناً فاناً رب تک پہنچ گئے بلکہ "پروفیسر ڈیئر" کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے' کرے کوئی بھرے کوئی۔ بے وقوفی ارشاد احمد کے چہری نوکر نے کی تھی اور نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اپنے ایک مخلص اور جاں نثار ساتھی سے محروم ہونا پڑا۔ میں سائن کا ذکر کررہا ہوں جو پچھلے دنوں تمہارے ہاتھوں شوٹ ہوا۔۔۔"

"چلو اپنے دکھوں سے نجات پالی اس نے۔" میں نے مائیکل کا فقرہ اسی پر الٹ دیا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا "لیکن وہ دکھی نہیں تھا۔ وہ تو بہت سکون سے تھا' تم نے ایک غلط آدمی کو مارا اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو ناحق قتل کرتا ہے اس کی اپنی آتما دکھی ہوجاتی ہے اور زندگی اس کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس بوجھ کو اتار دینا نیکی کا کام ہے لیکن گھبراؤ مت' کم از کم میں تو یہ نیک کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔"

"تو کیا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے اس کے منصوبے کی ٹوہ لینا چاہی۔

"بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔" وہ مسکرایا۔

"پھر بھی کوئی ہنٹ تو دو۔" صفدر نے کہا۔

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے جبڑے کچھ اور بھی چوڑے نظر آنے لگے تھے۔ تب وہ سنجیدگی سے بولا "میں یہاں سے جارہا ہوں۔ یہاں میرا کام ختم ہوچکا ہے۔ میری منزل اب ماریطانیہ ہے۔"

"اور ہماری منزل؟" صفدر نے پوچھا۔

"تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ جاؤں گا۔" اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اس تہ خانے سے باہر یقیناً دوپہر ہوچکی تھی لیکن یہاں وقت کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ اور تو اور' ہمارے پاس گھڑیاں بھی نہیں تھیں۔ اس کمرے میں پابند کرنے کے بعد ہماری مکمل جامہ تلاشی لی گئی تھی اور لباس کے سوا کوئی چیز نہیں رہنے دی گئی تھی حتیٰ کہ میرا خنجر بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ کمرے میں ایک وال کلاک موجود تھا مگر مائیکل اور غزالہ کی شدید چھینا جھپٹی کے دوران میں وہ بھی دیوار سے گر گیا تھا اور فرش پر ٹوٹا پڑا تھا۔

میں نے غزالہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ آگ کی طرح تپ رہی تھی۔ صفدر گلاس میں پانی لے آیا۔ میں نے رومال بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھنا شروع کردیا۔۔۔ کچھ دیر بعد غزالہ کا بخار ہلکا ہوگیا مگر شام کے بعد پھر تیز ہوگیا۔ اس بخار کا سبب یقیناً سرکی چوٹیں ہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا

کہ اس تہ خانے سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غزالہ کا بچہ کس حال میں ہے۔ زریں گل، گل ثوم اور سائیں عالی ہماری گمشدگی کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور خود کس حال میں ہیں؟ عمارت کے اردگرد پولیس موجود تھی اور ساہی صاحب بھی قریباً روزانہ ہی چکر لگاتے تھے۔ معلوم نہیں مائیکل نے ساہی صاحب اور ان کے عملے کو مطمئن کرنے کے لیے کیا قدم اٹھایا تھا؟ پھر میرا دھیان ان سنگین اعترافات کی طرف چلا گیا جو خوں خوار مائیکل نے کیے تھے۔

مجھے لگا جیسے اس تہ خانے میں ابھی تک شیر محمد ڈوگر، اس کی اہلیہ، ڈی ایس پی کمانڈو اور دیگر چار مقتولین کی چیخیں گونج رہی ہیں۔ خدائے ذوالجلال نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا لیکن وہ کبھی کبھی خود کو درندوں سے بھی بدتر ثابت کر دیتا ہے۔ ایسا شقی القلب بن جاتا ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی جیسے انسان کو تڑپا تڑپا کر مارتا ہے۔ اس کے نالے سنتا ہے، اس کی آخری ہچکیوں کا ارتعاش محسوس کرتا ہے لیکن اس پر رحم نہیں کھاتا۔

پروفیسر رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا اور رات کو جلدی سو گیا تھا۔ صفدر بھی صوفے پر بیٹھا بیٹھا نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ میں غزالہ کے قریب موجود تھا اور گاہے گاہے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ وہ گہری نیند میں بخار کے زیر اثر... بڑبڑانے لگتی تھی۔ اس نے کئی بار بچے "تابی" کا نام لیا، پھر ایک دو بار اپنی والدہ کو پکارا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اٹھے اور کچھ کھا پی لے۔ میں نے کئی بار اسے شانوں سے جھنجوڑا۔ اس نے آنکھیں نیم وا کیں اور پھر بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد وہ بے ہوشی میں بڑبڑائی "میرا جانا ہی بہتر ہے شاہ جہاں... میں آپ کے پاس رہوں گی تو بہت دکھ جھیلوں گی۔ آپ کو کیا پتا کتنا چاہتی ہوں آپ کو... آپ کے پاس رہ کر آپ سے دور رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ کسی دن... کسی دن سب کچھ میرے بس سے باہر ہو جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو اس عہد کا کیا ہوگا جو میں نے خود سے کیا ہے۔ میں اپنی نظروں میں خود ہی گر جاؤں گی اس لیے مجھے جانے دیں شاہ جہاں۔ ہم ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی ایک دوسرے کو یاد رکھ سکتے ہیں۔ بتائیں رکھ سکتے ہیں نا؟"

"ہاں رکھ سکتے ہیں۔" میں نے اس کی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے میری بات کہاں سننا تھی۔ وہ اپنی روانی میں بولتی رہی "میں آپ کو اپنا پتا نہیں بتاؤں گی مگر کبھی کبھی آپ کو خط لکھا کروں گی... اور جب "تابی" بڑا ہو جائے گا تو وہ بھی آپ کو خط لکھا کرے گا۔ ہم دور رہ کر بھی ہمیشہ آپ کے قریب رہیں گے۔"

کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے کروٹ بدلی اور ایک دم بڑبڑانے لگی "اچھا، مجھے آپ ہی بتائیں۔ میں کیسے رہ سکتی ہوں یہاں۔ میں کیسے توڑ دوں اپنا عہد۔ اگر ایک بار توڑوں گی تو پھر بار بار توڑوں گی۔ میں پہلے ہی بہت کمزور ہوں، پلیز آپ میرے حوصلے کو طاقت دیں، مجھے اور کمزور مت کریں۔ پلیز شاہ جہاں۔"

رات آخری پہر تک وہ اسی طرح بڑبڑاتی اور کراہتی رہی۔ تاہم علی الصباح اس کا بخار اترنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر کی درخواست پر مائیکل نے پروفیسر کا میڈیکل باکس کمرے میں پہنچا دیا۔ پروفیسر نے نہ صرف غزالہ کے سر کی پٹیاں تبدیل کر دیں بلکہ کھانے کے لیے دوا بھی دی۔ دوا کھانے سے غزالہ کی طبیعت مزید بہتر ہوئی اور مجھے اس کی طرف سے کافی تسلی ہو گئی۔ ہوش میں آتے ہی غزالہ نے تابی کو دیکھنے کا مطالبہ کر دیا۔ مائیکل کا موڈ غالباً اچھا تھا۔ اس نے غزالہ کا مطالبہ مانتے ہوئے نہ صرف یہ کہ تابی کو تہ خانے میں پہنچا دیا بلکہ پروفیسر کا وہ مطالبہ بھی مان لیا جو پروفیسر کل رات سے بار بار دہرا رہا تھا۔ تابی کو تہ خانے میں لانے کے چند ہی منٹ بعد مائیکل پروفیسر کی بیٹی شائستہ کو بھی کمرے میں لے آیا۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال تھی۔ وہ یقیناً قبول صورت رہی ہوگی مگر حالات کی تاریک پرچھائیوں نے اس کے حسن کا چاند گہنا دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یہ تلخ حقیقت کھل جاتی تھی کہ اس کا پاؤں بھاری ہے۔ پروفیسر کو دیکھتے ہی وہ چلا کر اس سے لپٹ گئی اور باپ بیٹی زار و قطار رونے لگے۔ مائیکل نے دروازہ باہر سے دوبارہ مقفل کر دیا تھا۔ صفدر نے پروفیسر کو اور میں نے شائستہ کو دلاسا دیا اور انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔

دوپہر کا کھانا مائیکل کے ایک حبشی ملازم نے ہم تک پہنچایا۔ یہ بھی ایک دراز قد اور قوی ہیکل شخص تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک انڈر ویئر تھا جو گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ اس کی صورت میں ایک ایسی کرختگی تھی جو عام انسان کے خدوخال میں نہیں ہو سکتی۔ یقیناً یہ شخص بھی مائیکل کے قبیل سے ہی تعلق رکھتا تھا اور اس کے ان تین یاروں میں سے تھا جن میں سے ایک کو میں ہلاک کر چکا تھا۔ کھانا ایگزاسٹ فین کے روزن کے ذریعے ہی ہم تک پہنچایا گیا۔ کھانے میں روٹی چاول اور گوشت کا شوربا تھا۔ اس تہ خانے میں آنے کے بعد

گوشت کے لفظ سے ہی نفرت ہونے لگی تھی۔ بے شک یہ گوشت بکرے کا تھا مگر کچھ ایسی کراہت دل میں پیدا ہو رہی تھی کہ پروفیسر سمیت کسی نے سالن کو ہاتھ نہیں لگایا۔

کھانے کے بعد صفدر قیلولے کے لیے لیٹ گیا۔ مجھے بھی غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں صفدر کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا۔ غزالہ بستر پر لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بچہ اس کے پہلو میں چت لیٹا تھا اور فیڈر سے دودھ پی رہا تھا۔ غزالہ کو محو خواب دیکھ کر وہ اٹھا اور بے تکلفی سے میرے سینے پر آ کر اوندھا لیٹ گیا۔ میں نے پیار سے اس کے گھونگریالے بالوں کو بوسہ دیا اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ وہ لاڈ سے میری سرخ آنکھ میں انگلی چبھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی پکڑ کر دانتوں میں دبالی۔ وہ شکایتی انداز میں "ماما" پکارنے لگا۔ غزالہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور اپنے پہلو میں دیکھا پھر اس کی نگاہ تابی پر پڑی جو میرے سینے پر اوندھا پڑا تھا۔ غزالہ خاموشی سے تابی کو دیکھتی رہی پھر نقاہت بھری آواز میں بولی "کیوں ستاتے ہو انہیں۔ آجاؤ میرے پاس۔"

تابی نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا اور دوبارہ میری آنکھ میں انگلی چبھونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے غزالہ کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ جب سے وہ دوبارہ ملی تھی یہ پہلی مسکان تھی جو میں نے اس کے سنجیدہ ہونٹوں پر دیکھی تھی مگر افسوس کہ اس مسکان کی عمر فقط ایک لمحہ تھی۔ اگلے ہی لمحے پھر سنجیدگی کی پرچھائیوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ میں غزالہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ وہ کیوں اس تہ خانے میں گھسی اور اپنی جان شدید خطرے میں ڈال کر مائیکل پر حملہ آور ہوئی۔ کیوں اس نے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی اتنا بڑا قدم اٹھا لیا؟ مگر اس موقع پر یہ سوال غزالہ کو پریشان کر سکتے تھے لہٰذا میں خاموش رہا... تابی میرے سینے پر بدستور اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ غزالہ نے آنکھیں پھر سے موند لی تھیں لیکن... مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس کی بظاہر بند آنکھوں میں ایک معمولی سی درز موجود ہے جس میں سے وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ یہ معمولی سی درز امید کی ایک کرن جیسی تھی... اور کرن تو خواہ کتنی بھی چھوٹی ہو، تاریکی کے بڑے سے بڑے سمندر کا سینہ چیر سکتی ہے۔

امید کی اس کرن کے خوشگوار احساس کو سینے میں جذب کر کے میں لیٹا رہا۔ دھیرے دھیرے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی چلی گئیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد [illegible]

میں ذرا بھاری پن آجاتا ہے لیکن یہ بھاری پن معمول سے قدرے زیادہ تھا۔ میں اس غیر معمولی بھاری پن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید میرے ذہن میں خطرے کی ایک آدھ گھنٹی بھی بجی تھی لیکن پھر اچانک ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

○☆○

اس کے بعد کے واقعات مجھے ایک دھندلے خواب کی طرح یاد ہیں اور یہ خواب مختصر نہیں تھا، بہت طویل تھا۔ شاید کئی دنوں پر محیط تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنے اردگرد آوازوں اور لمس کا احساس ہوتا تھا مگر یہ احساس واضح ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ آوازیں کہیں دور، بہت دور سے آ رہی ہیں اور لمس بھی جیسے کسی دھند میں چھپا ہوا ہے پھر کسی وقت یوں محسوس ہوتا جیسے میں ایک ریل گاڑی پر سوار ہوں۔ ریل گاڑی ایک گونج کے ساتھ کسی طویل سرنگ میں سفر کر رہی ہے۔ چلتی جا رہی ہے، بس چلتی ہی جا رہی ہے۔ کہیں کوئی اسٹیشن نہیں، کوئی منزل نہیں۔ کسی وقت گہری غنودگی میں مجھے اپنے بازو پر چبھن کا احساس ہوتا اور پورے بازو پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ ذہن کی اتھاہ تاریکی میں سے یہ موہوم سا احساس ابھرتا کہ شاید مجھے انجکشن لگایا جا رہا ہے۔

پھر ایک روز مجھے یوں لگا جیسے میں کسی گودی پر ہوں۔ میرے اردگرد یانی کا شور ہے۔ باربردار مزدوروں کی چیخ و پکار ہے۔ مسافروں کی بے قرار آوازیں ہیں جیسے کہیں دور کوئی جہاز یا بجرا اپنا بلند بانگ ہارن بجا رہا ہے اور اس کی آواز ساحلی ہوا کے دوش پر ڈوب ابھر رہی ہے۔ کیا یہ محض میرا تصور تھا یا اس میں کوئی حقیقت تھی۔ میں نے گہری غنودگی میں سر توڑ کوشش کر کے اپنے حواس مجتمع کرنے چاہے لیکن ناکامی ہوئی۔ پلکوں پر منوں بوجھ تھا۔ سخت جدوجہد کے باوجود میں انہیں کھول نہیں پایا، بے حسی اور بے اختیاری کا تند دھارا ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

پہلی بار جب میرے حواس مکمل طور پر بحال ہوئے تو میں ایک سخت سطح پر پشت کے بل لیٹا تھا۔ میں کتنی ہی دیر خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہا۔ چھت لکڑی کے تختوں کی تھی اور ان پر رنگ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لکڑی کے "گرینز" اور گرہیں وغیرہ صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں جس سطح پر لیٹا تھا وہ متحرک تھی اور ایک تھرتھراہٹ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی قوت جمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب پہلے میری نگاہ اپنے پاؤں پر گئی۔ پاؤں ننگے تھے اور جسم پر جو لباس نظر آ رہا تھا وہ بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ میں سوتی

کپڑے کے ایک براؤن پائجامے کرتے میں تھا۔ بلب کی روشنی میں مجھے اپنے اردگرد دس افراد اور نظر آئے۔ وہ سب براؤن پائجامے کرتے میں تھے۔ ان سب کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال منتشر تھے۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے کی طرف چلا گیا۔ میری شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ کم از کم ایک ہفتہ پرانی شیو تھی۔ ہم سب لوگ لکڑی کے ایک مضبوط کیبن میں تھے۔ اس کیبن میں صرف ایک دروازہ تھا' کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ ایک کھلا بیت الخلا بھی اسی کیبن کے اندر نظر آرہا تھا۔ اکلوتے نلکے میں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک کر بیت الخلا میں گر رہا تھا۔ طہارت کے لیے لوٹے کی وضع کا ایک برتن بھی یہاں پایا جاتا تھا۔ میرے اردگرد موجود تمام افراد محوِ خواب تھے۔ وہ لکڑی کے سخت فرش پر یوں بے سُدھ لیٹے تھے جیسے نرم فوم پر استراحت کررہے ہوں۔ میں نے ان کی صورتیں غور سے دیکھیں۔ ان میں دو تین سندھی یا بلوچی تھے' باقی سب پنجابی تھے۔ ان میں مجھے صرف ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور وہ صفدر کا تھا۔ صفدر کی شیو بھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی اور وہ کافی مدقوق نظر آرہا تھا۔ ایک چیز نوٹ کرکے میں بری طرح چونک گیا۔ صفدر اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا۔ اسے میک اپ کے بغیر دیکھ کر میرا ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ گیا۔ میرا میک اپ بھی صاف کیا جاچکا تھا۔۔۔ چہرے کو چھونے کے لیے جب میں نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو کندھے کے قریب چبھن کا احساس ہوا۔ میں نے آستین اوپر اٹھا کر بازو دیکھا۔ وہاں چار پانچ جگہ ہلکے نیل نظر آرہے تھے۔ یقیناً یہ انجکشن کے نشانات تھے۔ ایسی ہی چبھن اور نشانات کا احساس مجھے اپنے کولھے پر بھی ہوا۔

میں صفدر کی حالتِ زار دیکھ چکا تھا' اب مجھے اپنی جسمانی کمزوری کا احساس بھی ہوا' جسم پہلے سے دبلا محسوس ہورہا تھا۔ نقاہت بھی نمایاں تھی۔ یوں لگا جیسے پچھلے سات آٹھ روز تک ہمیں صرف انجکشن وغیرہ کے ذریعے ہی خوراک پہنچائی گئی ہے۔ میں اٹھ کر صفدر کے پاس پہنچا۔ جب میں فرش پر کھڑا ہوا تو پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ جس مرتعش فرش پر میں موجود ہوں وہ پانی پر تیر رہا ہے۔ مجھے بمبئی میں ایک مرتبہ ایک بڑے اسٹیمر جہاز پر سفر کرنے کا اتفاق ہوچکا تھا' کچھ اسی قسم کا احساس مجھے اب ہورہا تھا۔۔۔ میں صفدر کے پاس بیٹھ گیا اور اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے صفدر بیدار ہوگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا تھیں اور رُخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

"آپ کیسے ہیں شاہ جہاں صاحب؟" اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اور تم؟"

"میں بھی آپ کے سامنے ہوں۔ میں کچھ دیر پہلے جاگ گیا تھا۔ آپ کو جگانے کی کوشش کی' آپ نہیں جاگے تو پھر میں بھی سوگیا۔ میرا خیال ہے کہ چار پانچ گھنٹے تو سویا ہوں گا۔"

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے بھئی۔ یہ ہم کس چیز پر سوار ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی بڑا بجرا یا جہاز وغیرہ ہے۔ یہ ہلکورا تم محسوس کررہے ہو نا' یہ لانچ یا چھوٹی موٹی کشتی کا نہیں ہوسکتا۔"

صفدر نے اثبات میں سرہلایا اور بولا "مجھے اندیشہ ہے کہ۔۔۔ ہم۔۔۔ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کے قبضے میں ہیں اور ہمیں شاید پاکستان سے باہر لے جایا جارہا ہے۔"

میں چند لمحے سناٹے کی سی کیفیت میں صفدر کا چہرہ تکتا رہا پھر میں نے پوچھا "کیا تم نے یہاں ان میں سے کسی کو دیکھا ہے؟"

صفدر نے اثبات میں سرہلایا اور بولا "اس کیبن جیسے یہاں پانچ چھ کیبن مجھے اور نظر آئے ہیں۔ ان سب میں بھی لوگ بند ہیں۔"

"تم نے کیسے دیکھ لیا۔ دروازہ تو بند ہے۔"

"دروازہ کھلا تھا لیکن پورا نہیں کھلا تھا۔" صفدر اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور درمیان میں انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہاں سے ایک تختہ سلائیڈ کرکے پیچھے چلا گیا تھا۔ مشکل سے آٹھ نو انچ چوڑا خلا پیدا ہوا تھا۔ اس میں سے دو لڑکیوں نے کھانے کی دو ٹرے اندر پہنچائی تھیں۔ اس وقت میں باہر جھانکنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔"

"لڑکیاں کون تھیں؟"

"یقیناً وہ بھی ہماری طرح پکڑ کر لائی گئی ہیں۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک لمبا چوڑا سیاہ فام مسٹنڈا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی ایک لمبی چھڑی تھی جسے لڑکیاں خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ غالباً لڑکیوں نے کسی طرح کی مزاحمت کی کوشش کی تھی جس کے بعد انہیں مارا پیٹا گیا تھا۔ باہر ایک ٹرالی پر بہت سی ٹرے رکھی ہوئی تھیں' لڑکیوں نے وہ سب اٹھا اٹھا کر کیبنوں میں پہنچائی تھیں۔ کھانے میں مرغی کا گوشت اور روٹیاں تھیں جو یقیناً انہی لڑکیوں نے پکائی تھیں۔ ہمارے کیبن میں میرے علاوہ صرف دو بندے اور جاگ رہے تھے۔ ہم نے تھوڑا تھوڑا کھایا اور باقی کھانا واپس

کردیا۔"

"زریں یا سائیں عالی تو نظر نہیں آیا؟"

"نہیں ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا۔" صفدر نے کہا۔

"اور غزالہ یا گل ثوم؟"

"نہیں۔ ان میں سے بھی کوئی نہیں۔"

"اس میں ایک پہلو امید کا بھی ہے۔" میں نے کہا "ہوسکتا ہے کہ وہ کسی طور بچ گئی ہوں یہاں آنے سے۔"

"اور امید پر دنیا قائم ہے۔" صفدر کے لہجے سے بدستور مایوسی جھلک رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم قریباً ایک ہفتہ بے ہوشی کی حالت میں رہے ہیں۔" میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور اس بے ہوشی کی ابتدا بھی آپ کو یاد ہے یا نہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہی دوپہر کا کھانا جو ہم نے بیس منٹ کے کمرے میں کھایا تھا۔ سالن کو تو ہم میں سے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ چاولوں میں کچھ ملایا گیا تھا۔"

"مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سات دن ہم کہاں رہے۔ اب ہم کہاں ہیں۔۔۔ اور کہاں جارہے ہیں؟" صفدر نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

نجانے کیوں اس لمحے مجھے بدبخت مائیکل کا کہا ہوا وہ فقرہ یاد آگیا جو بیس منٹ میں اس کی کالی زبان سے ادا ہوا تھا۔ اس نے امریکن اسٹائل انگلش میں کہا تھا "خوش آمدید۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا سفر اچھا گزرے گا۔" میں نے پوچھا تھا کہ سفر سے اس کی کیا مراد ہے۔ اس نے جواب دیا تھا "زندگی کا سفر۔"

معلوم نہیں کہ کیا منصوبے تھے اس بدبخت کے۔۔۔ ہمارے اردگرد جو آٹھ افراد موجود تھے وہ بالکل انہی لوگوں جیسے تھے جو ہمیں بردہ فروش رجب کے ٹھکانے پر ملے تھے۔ سب کے سب نوجوان' جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے' غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے۔ ایک دو کے سوا ان سب کی عمریں بائیس اور پچیس سال کے درمیان تھیں۔ اب یہ سارے افراد ہمارے ہم سفر تھے اور ہم نامعلوم سمت میں پانی کی سطح پر سفر کررہے تھے۔ مستقبل کا دھندلا سا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور یقیناً صفدر کی نگاہوں کے سامنے بھی گھوم رہا ہوگا مگر فی الحال ہم دونوں اس سلسلے میں بات کرنے سے کترا رہے تھے۔

صفدر گہری سوچ میں تھا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "سائیں عالی بھی ہمارے ساتھ کوٹھی کے اندر تھا' معلوم نہیں اس کا کیا بنا؟"

"اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ برے سے برے حالات میں بھی اپنا بچاؤ کرلیتا ہے۔"

"ویسے یہ سائیں عالی ہے واقعی پُراسرار۔"

"شاید تم اس واقعے کا ذکر کررہے ہو جب میں نے بھوپال کی اس کوٹھی میں ٹیوب لائٹ بجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ بٹن دبانے کے باوجود نہیں بجھی تھی۔"

"ہاں وہ واقعہ بھی حیران کن تھا لیکن میرا دھیان سائیں کی اس زلزلے والی بات کی طرف جارہا ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"آپ کو یاد ہوگا۔ سائیں نے اس روز کتنی تکرار سے کہا تھا کہ کل رات گیارہ بج کر چالیس منٹ پر زلزلہ آئے گا۔"

"ہاں یاد تو ہے۔"

"اور آپ کو وہ وال کلاک بھی یاد ہے جو بیس منٹ میں مائیکل اور غزالہ کی جھڑپ کے دوران میں گر کر ٹوٹا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

صفدر ڈرامائی لہجے میں بولا "شاید آپ نے نوٹ نہیں کیا۔ وال کلاک گرنے کے بعد گیارہ بج کر اڑتالیس منٹ پر رک گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بیس منٹ میں پیش آنے والے نہایت سنگین واقعات کا آغاز گیارہ بج کر چالیس منٹ کے لگ بھگ ہوا تھا۔"

صفدر کی بات نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی چونکا دیا۔ صفدر خالی خالی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ سائیں نے جس خوفناک زلزلے کا اشارہ دیا تھا وہ یہی زلزلہ ہو جو بیس منٹ میں آیا اور سب کچھ تہ و بالا کرگیا۔"

صفدر کی بات سوچنے کی دعوت دے رہی تھی۔ آدم خور مائیکل ایک زلزلہ ہی تو تھا جو اچانک تہ خانے میں نمودار ہوا اور ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا گیا۔ ممکن تھا کہ عام شخص اسے ایک اتفاق کہتا بلکہ ہم بھی سائیں کو جانتے نہ ہوتے تو اسے اتفاق ہی کہتے مگر ہم سائیں کے حوالے سے ایسے اتنے اتفاقات دیکھ چکے تھے کہ اب ایسے واقعات کو محض اتفاق کہنا دشوار محسوس ہوتا تھا۔

صفدر اور میں کتنی ہی دیر اپنی اپنی سوچ میں گم رہے۔ ہمارے کیبن کے ایک دو مزید ساتھی بھی اب اٹھ گئے تھے۔ صفدر نے ان سے بات کرنا چاہی لیکن وہ بے حد ڈرے ہوئے

تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں لب تک ہلانے کی ہمت نہیں۔ بس ہاتھوں کے ڈرے ہوئے اشاروں سے انہوں نے یہ کہا کہ وہ کوئی بات کرنا نہیں چاہتے۔ ایک شخص کے بازوؤں پر مجھے ہنٹر یا بید کی چھڑی کے سیاہی مائل نشان نظر آئے۔ ایک دوسرے شخص کی آنکھ پر چوٹ لگی ہوئی تھی جو غالباً کسی زور دار مکے کا نتیجہ تھی۔ ایک نوجوان اٹھا تو اس کے چہرے پر بے قراری کی کیفیت نظر آئی۔ یقیناً اسے ٹوائلٹ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں علیحدہ سے انتظام نہیں تھا۔ کمرا ہی ٹوائلٹ تھا اور ٹوائلٹ ہی کمرا تھا۔ وہ کچھ دیر تو جھجکتا رہا اور اِدھر اُدھر چکراتا رہا' جب کچھ بھی بس میں نہ رہا تو ہمارے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بلا جھجک فارغ ہو گیا۔ بند کیبن میں بُو کا پھیلنا ضروری تھا لیکن جتنا اندیشہ تھا اتنی بُو نہیں پھیلی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ چھت کے ایک کونے میں ایگزاسٹ فین موجود ہے۔ پرانا سا فین تھا لیکن کام کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر ذہن پر بوجھ سا محسوس ہوا کہ اگر ہم نادیر یہاں رہے تو ہمیں بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ بہرحال ایسے حالات کا انسان بہت جلد عادی ہو جاتا ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ لچک قدرت نے بڑے اہتمام سے رکھی ہوئی ہے۔

قریباً دو گھنٹے بعد وہ منظر میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا جس کا نقشہ صفدر نے کھینچا تھا۔ کیبن کے بند دروازے سے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک آواز آئی جس سے اندازہ ہوا کہ کسی کیبن کے دروازے کا تختہ کھینچا گیا ہے اور کھانے کے ٹرے اندر پہنچائے گئے ہیں۔ وقت کا اندازہ تو ہمیں نہیں ہو سکتا تھا لیکن گمان غالب یہی تھا کہ یہ رات کا کھانا ہے۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہمارے کیبن کے عین سامنے سنائی دی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے کا ایک تختہ سلائڈ کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ آٹھ انچ چوڑے اور قریباً تین فٹ لمبے خلا میں سے دو لڑکیوں کے چہرے نظر آئے۔ وہ خاصی خستہ حال نظر آتی تھیں۔ چہروں سے تھکاوٹ کا اندازہ ہوتا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کتنے افراد کا کھانا پکانا پڑ رہا تھا انہیں۔ ان کے عقب میں ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام شخص تھا۔ وہ لوہے کی ایک بڑی ٹرالی دھکیل رہا تھا۔ اس ٹرالی پر کھانوں کے ٹرے تھے اور پانی کے جگ تھے۔ یہ جگ عجیب وضع کے تھے۔ ان کی اونچائی کم اور قطر زیادہ تھا۔ یقیناً یہ جگ ان کیبنوں کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ ان کا سائز ایسا رکھا گیا تھا کہ آٹھ نو انچ کے خلا میں سے بہ آسانی گزر سکیں۔

صفدر کے بیان کے عین مطابق دروازے کے خلا میں سے پانچ عدد کیبن نظر آ رہے تھے۔ مگر میں نے چار منزلہ ٹرا میں رکھی ہوئی ٹرے گنیں تو وہ ۴۸ تھیں۔ دو کیبنوں میں کھ تقسیم ہو چکا تھا' اس حساب سے دیکھا جاتا تو ابھی ۸ کیبن او تھے۔ یعنی یہاں کُل دس کیبن تھے۔ اگر ایک کیبن میں دس افراد رکھے گئے تھے تو پھر یہاں جس بے جا میں رکھے گئے کا افراد کی تعداد ۱۰۰ کے قریب تھی۔ صفدر نے بتایا تھا کہ زرین گل یا سائیں عالی اسے قیدیوں میں نظر نہیں آئے لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ بھی ان ۱۰۰ قیدیوں میں ہی کہیں موجود ہوں۔

جب لڑکیاں کھانے کی ٹرے اندر پہنچا رہی تھیں' میں نے ایک لڑکی سے بات کرنا چاہی۔ میں نے اردو میں کہا "کیا تم بتا سکتی ہو کہ ہم کس چیز پر سفر کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟"

ابھی میرا سوال بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ سیاہ فام تڑپ کر آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی موٹی چھڑی تھی۔ اس نے یہ چھڑی نیزے کی طرح دو دفعہ میری گردن میں چبھوئی اور مجھے دور ہٹا دیا۔ ساتھ ہی اپنی زبان میں اس نے تند و تیز بکواس بھی کی تھی۔ چھڑی کی دوسری ضرب اتنی شدید تھی کہ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ دونوں لڑکیاں کھانا دے کر سہمی ہوئی سی پیچھے ہٹ گئیں پھر ایک اور سیاہ فام آگے آیا۔ یہ قد میں چھوٹا تھا اور اس کا جسم بھی زیادہ توانا نہیں تھا۔ وہ پتلون قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی راڈ تھی۔ لوہے کی اس راڈ کے ایک سرے پر تانبے کی پٹی سے ایک فٹ قطر کا حلقہ سا بنا ہوا تھا۔ اس حلقے کے ساتھ تانبے ہی کا ایک تار منسلک تھا جو راڈ کے ساتھ ساتھ سیاہ فام کے ہاتھ تک چلا گیا تھا۔ سیاہ فام افریقی نے راڈ دروازے کے خلا میں سے کیبن میں داخل کی اور اس کے سرے کا حلقہ طوق کی طرح ایک شخص کی گردن میں ڈال دیا پھر اس نے تار کھینچا تو حلقہ گردن میں بالکل فٹ ہو گیا۔ تب اس شخص نے زور لگا کر اس شخص کو دروازے کے خلا کے قریب کھینچ لیا۔ یہ تھر تھر کانپتا ہوا شخص وہی تھا جس کی آنکھ پر مکے کی چوٹ کا زخم تھا۔ اسے خلا کے قریب کھینچ کر سیاہ فام افریقی نے اس کے زخم پر ایک مرہم لگایا اور پھر احتیاط سے بینڈیج کر دی۔ یہ عمل دیکھ کر بالکل یہی محسوس ہوا جیسے کوئی حیوانات کا ڈاکٹر جانوروں کے ریوڑ میں سے ایک جانور کو شکنجہ لگا کر مرہم پٹی کر رہا ہے۔ ٹریٹ منٹ کے بعد تانبے کا حلقہ قیدی کی گردن میں سے نکال لیا گیا اور وہ کسی جانور ہی کی

طرح دُم دبا کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

کیبن میں موجود تمام قیدیوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری طرح وہ بھی اس کیبن میں نئے ہیں۔ کھانے کی ٹرے ان کے سامنے پڑی تھیں اور وہ جھجک جھجک کر لقمے لے رہے تھے۔ کھانے میں شوربے والے مٹر تھے اور روٹیاں تھیں۔ میں نے اور صفدر نے بھی چند نوالے لیے۔ ہم دونوں کے سوا کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بے شک وہ ہمارے ساتھ ہی یہاں لائے گئے تھے مگر اس سے پہلے ان پر کافی ظلم و ستم توڑا جا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی حالت سدھائے ہوئے جانوروں کی سی نظر آ رہی تھی۔

غزالہ کا دھیان ہر پل میرے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ منظر بار بار نگاہوں کے سامنے آتا تھا جب ننھا محمد تابی میرے سینے پر چڑھ کر اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے غزالہ یہ منظر دیکھ کر مسکرائی ہے۔ وہ مدھم مسکراہٹ میرے دل و دماغ سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ تاریکی کے بیکراں سمندر میں میرے لیے امید کی ایک کرن موجود ہے۔۔۔ لیکن حالات کے اس پلٹے نے ایک بار پھر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ غزالہ کہاں اور کس حال میں تھی' مجھے کچھ علم نہیں تھا۔

صفدر نے جیسے میرے ذہن کا خیال پڑھتے ہوئے کہا "غزالہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟"

"میں نہیں سوچتا' وہ خود بخود سوچ میں آ جاتی ہے۔"

وہ بولا "اگر سائیں عالی کی زلزلے والی پیش گوئی کو سچ مان لیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غزالہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"سائیں عالی نے یہی کہا تھا نا کہ غزالہ کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ زلزلے کی آمد آمد ہے' یہ نہ ہو کہ زلزلے میں وہ ہم سے بچھڑ جائے۔"

میں نے کہا "ہم سائیں عالی کی باتوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دینے لگے ہیں!"

"مشکلات میں انسان کا یقین روحانیت پر بڑھ جاتا ہے اور اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ ہم اس جدید دور میں بھی قدیم زمانے کے غلاموں کی طرح پابہ زنجیر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جائے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "صفدر' خبر نہیں کیوں میرے دل میں ایک وہم سا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر۔۔۔ غزالہ اس بار بھی مجھ سے دور ہو گئی تو پھر میں اسے کبھی نہ پا سکوں گا۔ سب کچھ ہمیشہ کے لیے ایک حسرت بن کر رہ جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب آپ خود بھی سائیں عالی کی باتوں کو اہمیت دے رہے ہیں۔"

"نہیں۔ تمہارا تجزیہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔

ایک دم جیسے صفدر کو کچھ یاد آیا۔ اس نے جلدی سے اپنی قمیص کے نیچے پائجامے کے نیفے میں ہاتھ ڈالا اور مڑے تڑے اخبار کا ایک ٹکڑا نکال لیا "ہمارے لیے ایک بے حد اہم خبر ہے؟" اس نے کہا۔

"کس بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"دفینے کے بارے میں۔" اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔

مصنف ایم۔ اے راحت کے سدا بہار
قلم سے ایک شاہکار ناول

باغی

معاشرے کی سنگلاخ چٹانوں پر
سفر کرنے والے بیٹے کی داستان

★

جس نے ماں کے لئے زمین کی پستیاں سمیٹ لیں

★

قہقہوں کے درمیان چھپے آنسوؤں کی داستان

★

طنز و مزاح کا پیکر ناول

★

خوبصورت سرورق دیدہ زیب گیٹ اپ

علی شاہ پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور- 7247414

اس نے اخبار کے مڑے تڑے کاغذ کو سیدھا کیا۔ یہ بائیس تاریخ کا اخبار تھا۔ یعنی اگر ہم ایک ہفتہ بے ہوشی کی حالت میں رہے تھے تو یہ اخبار پانچ روز پہلے کا تھا۔ صفدر نے ایک سرخی پر انگلی رکھ دی۔ پہلے صفحے پر یہ چار کالمی سرخی کافی نمایاں تھی۔ جلی حروف میں لکھا تھا "چٹے پل کی حویلی کے نوادرات ایک سازش کے تحت غائب کیے گئے۔"

ذیلی سرخی تھی "سارا چکر شاہ جہاں عرف استاد جہانی نے چلایا۔"

مزید ذیلی سرخیاں یوں تھیں "استاد جہانی نے ایک امریکی ارب پتی سے ملی بھگت کرکے ملک کو قیمتی اثاثے سے محروم کیا اور کروڑوں کا نقصان پہنچایا۔"

اس تہلکہ خیز خبر میں مجتبیٰ کنور کے حوالے سے کئی انکشافات کیے گئے تھے۔ مجتبیٰ کنور نے کہا تھا کہ شاہ جہاں نے اپنے کچھ بہی خواہوں کے ساتھ مل کر دفینے کے حوالے سے بہت بڑا فراڈ کیا ہے۔ ان لوگوں نے انمول نوادرات اور قریباً بیس کروڑ کے جواہر اور سونا انڈیا سے یو ایس اے منتقل کردیا ہے۔ مجتبیٰ کنور نے اس سلسلے میں چند ثبوت بھی پیش کیے تھے۔ مسٹر کلارک کی کمپنی ایف ایم کے دو انڈین ملازم تھے جنہوں نے بیان دیا تھا کہ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے کئی بریف کیس ایف ایم کی بھوپال برانچ میں لائے گئے تھے۔ بعد ازاں انہیں رازداری سے کسی اور جگہ منتقل کردیا گیا تھا۔ انڈین ائرلائن کی ایک انٹرنیشنل فلائٹ کے کارگو کی تفصیل بھی شواہد میں شامل تھی۔ اس تفصیل میں بیس عدد بریف کیسوں کا ذکر موجود تھا۔ اس کے علاوہ گولی ناتھ میڈیکوز کے گودام کا اسٹور کیپر بھی شاملِ تفتیش ہوا تھا۔ اس نے خانہ بدوش لڑکی کی عصمت دری کا اعتراف کیا تھا' اس کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ گودام میں کئی ہفتے تک کچھ پُراسرار قسم کا سامان اسٹور رہا ہے۔

اندازہ ہوتا تھا کہ مجتبیٰ کنور پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے وسیع ذرائع استعمال کرتے ہوئے معاملے کی چھان بین جاری رکھی تھی اور آخر یہ کھوج پالیا تھا کہ بریف کیس کیسے اور کب بھوپال سے نیویارک منتقل کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو پانے کے بعد مجتبیٰ کنور کا آگ بگولا ہونا لازمی تھا۔ وہ میرے سامنے نہیں تھا' تاہم میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا کہ وہ آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہے اور اس کے منہ سے شعلے خارج ہو رہے ہیں۔ درحقیقت مجتبیٰ کنور کے لیے یہ سزا تھی اس لالچ کی جو اس نے دفینے کے حوالے سے کیا تھا۔ اگر وہ لالچ نہ کرتا اور ہم سے بالا ہی بالا سرکاری افسران سے ساز باز شروع نہ کردیتا تو یہ سارا معاملہ باہمی مشورے سے طے ہوتا۔ ہم دفینے کا سارا سامان قانونی طریقے سے پاکستان لاتے اور قانونی طریقے سے ہی اس کے حق داروں کا فیصلہ بھی ہوتا۔ اب مجتبیٰ کنور جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا اور بارودی دھماکوں جیسے بیانات دے رہا تھا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ہمارے خلاف انتظامیہ کی ساری مشینری کو حرکت میں لے آیا ہوگا اور جگہ جگہ ہماری گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جارہے ہوں گے۔ یعنی جو دشمنی اب تک ڈھکی چھپی تھی وہ مکمل کرسامنے آگئی تھی۔

مجتبیٰ کنور نے اس خبر کو وطن دشمنی کے نقطۂ نظر سے بھی اُچھالا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ملک کو گراں قدر ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے محروم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ ایسے بیسیوں نوادرات جن کا تعلق صرف پاکستان سے تھا' پیسے کے لالچ میں امریکا پہنچا دیے گئے ہیں اور اس گھناؤنے فعل کے ذمے دار استاد جہانی کے علاوہ اس کے سنگی ساتھی بھی ہیں۔ مجتبیٰ کنور کو معلوم نہیں تھا کہ وہ تمام نوادرات جن کا تعلق پاکستان سے تھا ہم نے بھوپال ہی میں بڑی ذمے داری سے محفوظ کررکھے ہیں۔

صفدر نے پچھلے صفحے پر باکس میں ایک اور سنگین خبر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ محترم ایس ایس پی ساہی صاحب کی معطلی اور گرفتاری کی خبر تھی۔ خبر میں لکھا گیا تھا کہ اعلیٰ حکام کی ہدایت پر استاد جہانی سے خصوصی تعلق رکھنے والے اس سینئر پولیس آفیسر کو بھی لائن حاضر کرکے گرفتار کرلیا گیا ہے اور اس سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ خبر میں "بھی" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھ سے تعلق رکھنے والے کچھ اور لوگوں کو بھی پکڑا گیا تھا۔ میرا دھیان چاروں طرف گھوم گیا۔ میرا اور کون ہوسکتا تھا۔ شفتا اور انجم تو یقیناً محفوظ پناہ گاہ میں تھیں اور مجھے بھروسا تھا کہ پولیس ان تک نہیں پہنچ سکتی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ساہی صاحب کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

صفدر نے کہا "گرفتاری کی اس خبر میں کہیں غزالہ اور اس کے والدین کی طرف تو اشارہ نہیں؟"

"ممکن ہے۔ اور پھر زریں گل اور گلشوم بھی تو نظر نہیں آرہے۔ ان کے علاوہ عالم قریشی ہے۔ سائیں عالی اور سروج ہیں۔ غزالہ کی استاد مسز رقیہ اور مہرالنساء بھی ہیں۔"

صفدر اور میں کافی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ صفدر کے چہرے پر تاسف نظر آرہا تھا۔ گہری سانس لے کر بولا "ایک بات بار بار ذہن میں آتی ہے شاہ جہاں صاحب۔"

"کیا؟"

"کہیں ہم سے واقعی غلطی تو نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے' کہیں ہم نے مسٹر کلارک پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تو نہیں کرلیا۔ اب دیکھیے نا۔ قریباً دو مہینے ہونے کو آئے ہیں لیکن مسٹر کلارک کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اسے ہم سے مسلسل رابطہ رکھنا چاہیے تھا۔ ہمیں بتانا چاہیے تھا کہ نوادرات اور زیورات کی فروخت کس مرحلے میں ہے اور یہ کام کب تک مکمل ہوگا۔"

میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ میں جانتا تھا کہ زریں کی طرح صفدر بھی لالچی نہیں۔ مگر دفینے کے سامان کا معاملہ اتنا بڑا اور گمبھیر تھا کہ ذہن میں بے اختیار اندیشے ابھرتے تھے اور معروضی انداز میں سوچا جاتا تو میں نے واقعی ایک بڑا رسک لیا تھا' بغیر کسی گارنٹی اور تحفظ کے کروڑوں کا سامان مسٹر کلارک کے حوالے کردیا تھا تاکہ وہ اسے بیرونِ ملک لے جائیں۔ اب اگر ان کی نیت میں فرق آجاتا تو ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ مسٹر کلارک جیسے نہایت بارسوخ شخص کے لیے کسی حیلے بہانے سے یہ دولت ہضم کرنا مشکل نہیں تھا۔

"آپ مسکرا رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"مسکراہٹ اطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یعنی آپ مسٹر کلارک کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہیں؟"

"پوری طرح مطمئن تو کبھی بھی نہیں ہوا جاسکتا لیکن میرے دل کی گواہی ہے کہ مسٹر کلارک اچھے انسان ہیں' وہ اپنا وعدہ ایفا کریں گے۔"

"مگر اچھا انسان کبھی کبھی بُرے حالات میں بھی تو پھنس جاتا ہے!"

"بُرے حالات میں تو ہم بھی پھنس سکتے ہیں بلکہ پھنسے ہوئے ہیں۔"

"گستاخی معاف۔۔۔ میرا مطلب یہ تھا شاہ جہاں صاحب کہ بے شک ہم دفینے کا سامان پاکستان نہ لاتے' ہم اسے انڈیا میں ہی کہیں محفوظ کردیتے۔ مسٹر کلارک کا حصہ دے کر انہیں رخصت کردیا جاتا۔ سامان انڈیا میں ہوتا تو سامان اور حالات پر ہماری گرفت ہوتی۔"

"اوّل تو ہم انڈیا میں اسے محفوظ رکھ ہی نہیں سکتے تھے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو سامان کی فروخت اور مناسب قیمت ملنے کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل موجود تھے۔"

"میں کوئی اعتراض نہیں کررہا ہوں جناب۔ مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ مسٹر کلارک کی طرف سے اتنی تاخیر کیوں ہوئی ہے۔"

"کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ بہرحال مسٹر کلارک کی ذات پر مجھے اب بھی مکمل اعتماد ہے۔"

"اگر آپ کو ہے تو پھر ہمیں بھی ہے۔" صفدر مسکرایا "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

پھر شاید اس کا دھیان ساہی صاحب کی طرف چلا گیا تھا' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ پرسوچ لہجے میں بولا "ساہی صاحب معلوم نہیں کس حال میں ہوں گے۔"

"مجھے ان سے زیادہ فکر زریں اور گلشوم کی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں تو بہت برا ہوا ہے۔ زریں کے پاس تو وکیل کرنے کے پیسے بھی نہیں ہوں گے۔ عالم قریشی مدد کرسکتا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ بھی پکڑا گیا ہو' یا پھر روپوش ہوگیا ہو۔"

صفدر ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ وہ سٹپٹایا ہوا تھا "میں پوچھتا ہوں ان لوگوں سے کہ وہ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر سے بٹھالیا "ابھی تمہارے سامنے میں نے بھی یہی پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" میں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ سیاہ فام نے مجھے چھڑی سے جو بے رحم ٹھوکا دیا تھا اس نے گردن پر گہرا نیل ڈال دیا ہے۔

صفدر مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ اچانک ایک شخص نے بلند آواز سے رونا شروع کردیا۔ پھر وہ بے حال ہوکر چیخنے لگا "ہائے میں کیا کروں۔ نسرین میں کدھر جاؤں۔۔۔ ہائے نسرین میں کیا کروں۔"

پھر وہ تیزی سے اٹھا اور غم سے نڈھال ہوکر اس نے دروازے کی مضبوط چوکھٹ سے سر ٹکرانا شروع کردیا۔ یہ پورا کیبن لکڑی کا تھا۔ اس کے سر کی ضربوں سے مہیب آواز پیدا ہونے لگی۔ سر ٹکرانے والے کی پیشانی پھٹ گئی اور خون کی دھار بہہ نکلی۔ میں نے دیکھا کہ یہ وہی شخص تھا جس کی آنکھ پر تھوڑی دیر پہلے سیاہ فام پہرے دار نے مرہم لگا کر پٹی باندھی تھی۔

صفدر نے بھاگ کر اسے شانوں سے پکڑا۔ حیرت کی بات تھی کہ باقی سب افراد دم بخود بیٹھے تھے۔ جیسے کچھ دیکھ رہے ہوں نہ سن رہے ہوں۔ وہ شخص صفدر کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہا تھا لیکن یہ کسی عام شخص کی گرفت نہیں تھی' وہ صرف اپنے نچلے دھڑ کو حرکت دے پا رہا تھا۔ یوں لگتا

تھا کہ اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہے۔ پوری قوت سے ٹانگیں چلا رہا تھا وہ۔ میں نے بمشکل اس کی ٹانگیں قابو کیں۔

اسی دوران میں دروازے میں موجود سلائیڈنگ تختہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور آٹھ نو انچ چوڑے خلا میں سے دو حبشیوں کی خوں بار آنکھیں نظر آئیں۔ ایک حبشی کے منہ سے غراہٹ برآمد ہوئی' اس نے بڑی چابک دستی سے کوئی شے کیبن کے اندر داخل کی۔ یہ وہی راڈ تھی جس کے اگلے سرے پر پیتل کا پھندا لگا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں یہ پھندا مضروب کی گردن میں فٹ ہو گیا۔ حبشی نے صفدر کو اشارہ کیا کہ وہ مضروب کو چھوڑ دے۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد صفدر نے اسے چھوڑ دیا۔ میں ٹانگیں پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ حبشی نے ایک بے رحم جھٹکے سے مضروب کو خلا کے قریب کھینچ لیا۔ گلا دبنے سے مضروب کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور پیشانی سے رسنے والا خون باقاعدہ بہنے لگا تھا۔ وہ چیخنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ لمبے تڑنگے طاقت ور حبشی نے زور لگا کر مضروب کا سر خلا میں سے باہر نکال لیا۔ پھر اس نے آہنی راڈ کو ایک کنڈے میں یوں پھنسا دیا کہ مضروب واپس کیبن میں نہیں آسکتا تھا۔ اب اس کا سر کیبن سے باہر اور دھڑ کیبن کے اندر تھا۔ سیاہ فام حبشی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید کی چھڑی حرکت میں آئی اور شائیں سے مضروب کی گردن پر لگی۔ وہ چیخ پڑا۔ یہ اتنی زوردار ضرب تھی کہ مضروب کی گردن کی کھال پر فوراً سرخ لکیر نمودار ہو گئی اور خون رسنے لگا۔ دوسری ضرب اس کے رخسار پر لگی' یہاں سے بھی گوشت ادھڑ گیا۔ پھر تو جیسے سیاہ فام پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اندھا دھند ضربیں لگانے لگا۔ وہ اتنی قوت سے ہاتھ چلا رہا تھا جیسے جیتے جاگتے انسان پر نہیں مٹی کی دیوار پر ضربیں لگا رہا ہو۔ شاید اس کا ارادہ تھا کہ چہرے کا قیمہ بنا کر چھوڑے گا۔ بدقسمت شخص کے ایک رخسار سے کھال لٹک گئی تھی اور اب ہر ضرب سے خون کے باریک چھینٹے اڑ رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر نیم جان ہو گیا تھا۔ کیبن کے اندر اس کا نچلا دھڑ تکلیف کی شدت سے کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔

میں نے چلا کر کہا "چھوڑ دو اسے۔ کیا اب اس کی جان لے لو گے؟"

میں نے یہ جملہ انگلش میں کہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' وہ خوں خوار سیاہ فام صرف قبائلی زبان سمجھتے تھے۔ مضروب کے چہرے کا بھرتا سا بن گیا تھا۔ پہلے اس کی صرف ایک آنکھ زخمی تھی اب پورا چہرہ خون رنگ ہو رہا تھا۔ چھڑی چلانے کے ساتھ ساتھ سیاہ فام اپنی زبان میں کچھ بک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مضروب کی چیخیں مدھم ہو گئیں پھر اس کا سر ایک دم نیچے کی طرف جھک گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے خون کے ساتھ ساتھ رال بہہ کر فرش پر گر رہی تھی۔ ناک سے بھی مواد بہہ رہا تھا۔ چہرے کی ایک جانب کی جلد خوفناک انداز میں لٹکی ہوئی تھی۔

سیاہ فام نے اس کے زخم زخم چہرے پر نفرت بھری نگاہ ڈالی اور گردن سے پھندا نکال کر واپس کیبن میں پھینک دیا۔ وہ لکڑی کے مضبوط فرش پر لاش کی طرح کھٹاک سے گرا اور چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کے ساتھی ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کسی نے اٹھ کر اسے دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان سسکیوں سے رو رہا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں سسکیوں کی آواز بلند نہ ہو جائے وہ بار بار اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیتا تھا۔ میں نے اور صفدر نے مضروب کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ صفدر نے پلاسٹک کے گلاس میں نلکے سے پانی لے کر اسے پلانے کی کوشش کی مگر وہ بے سُدھ تھا۔ دروازے کا نو انچ چوڑا اور تین فٹ لمبا خلا پھر سے بند ہو چکا تھا۔ بدنصیب شخص کے رخسار سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ کیبن میں کوئی ایسی شے موجود نہیں تھی جس سے خون کو روکا جا سکتا یا مرہم پٹی کی جا سکتی۔ ہم اس کے چہرے کو دھونے کے سوا اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ کیبن میں بوسیدہ لیکن صاف ستھرے کمبل موجود تھے۔ کیبن کے ایک کونے میں دو کمبل بچھا کر مضروب کو لٹا دیا اور دو کمبل اس کے اوپر ڈال دیے۔ اس کارروائی کے دوران میں کوئی دوسرا شخص اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ صرف درمیانی عمر کے ایک شخص نے مضروب کو اٹھا کر کمبل پر لٹانے میں ہماری مدد کی تھی۔

میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا "اس بندے کا کیا نام ہے؟"

"اسلم۔" اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

"اور تمہارا نام؟"

"نثار علی ـــ یہ بندہ میرے ہی محلے کا ہے۔" اس نے مضروب اسلم کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟"

"وزیر آباد سے۔ دبئی جانا چاہتے تھے۔ ان ظالموں کے چنگل میں پھنس گئے۔"

"تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ہم کس شے پر سفر کر رہے ہیں۔ کوئی لانچ ہے یا ـــ؟"

"تمہاری طرح مجھے بھی اس کمرے میں ہی ہوش آیا ہے۔ یہاں جتنے بندے ہیں ان سب کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے۔"

"پہلے کہاں تھے تم لوگ؟"

اس سے پہلے کہ نثار نامی وہ شخص جواب دیتا' دروازے کے پاس قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ لرز کر خاموش ہو گیا۔ نہ صرف خاموش ہو گیا بلکہ دور ایک گوشے میں جا بیٹھا۔

بھاری قدموں کی آہٹیں دروازے کے بالکل پاس پہنچیں۔ یہ ایک سے زائد افراد تھے۔ دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ اس مرتبہ دروازے میں خلا پیدا نہیں ہوا بلکہ دروازہ پورا ہی کھل گیا۔ خود سے صرف سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر مجھے ایل ایم جی (لائٹ مشین گن) کی خوفناک نال نظر آئی۔ یہ ایک دیوہیکل سیاہ فام تھا۔ اس کے پہلو میں ایک اور قد آور سیاہ فام نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بدبخت ضیاء تھا جس نے چھڑی کی ضربوں سے اسلم کے چہرے کی کھال ادھیڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پستول بردار نے بڑی کرخت آواز میں کچھ کہا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

میں اٹھ کر کیبن سے باہر آگیا۔ دروازہ ایک بار پھر جھٹکے سے بند کر دیا گیا۔ پستول بردار نے اپنا پستول پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور جیب ہی سے ایک چابی نکال کر کیبن کے وزنی دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ مشین گن والا اس دوران میں بالکل چوکس کھڑا رہا تھا۔ میں ان لوگوں کی درندگی دیکھ چکا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ بندہ مارنا ان کے لیے مکھی مارنے کی طرح ہے۔ قریب ہی لکڑی کی دیوار پر ایک کھونٹی تھی اور اس پر تین عدد ہتھکڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ پستول بردار نے ایک ہتھکڑی اتاری اور انگلی کے اشارے سے مجھے گھوم جانے کا آرڈر دیا۔ میں نے اپنا رخ دیوار کی طرف کر لیا۔ سیاہ فام نے میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑے اور کلائیاں ہتھکڑی میں جکڑ دیں۔ تب اس نے بڑی بے رحمی سے میری کمر میں اپنی منحوس چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری پسلیاں توڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے وہ میری گردن میں بھی ایسے ہی پُرغضب ٹھوکے دے چکا تھا۔ میرے لیے اس کے دل میں خصوصی عناد محسوس ہوتا تھا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی میں ان کے ایک ساتھی (سائن) کو ہلاک کیا تھا۔ اس سخت مقابلے کا ہر ہر منظر مجھے اب تک یاد تھا۔ یقیناً ان حبشیوں کے ذہن میں بھی یہ واقعہ ابھی تر و تازہ تھا۔

وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر ایک بڑے دروازے تک لائے۔ دروازہ کھولا گیا تو سامنے لکڑی کی ہی تنگ و تاریک سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گن بردار میرے عین عقب میں تھا۔ میرے نتھنوں میں عجیب سی بو گھس رہی تھی بلکہ اسے خوشبو کہنا چاہیے۔ یہ جانی پہچانی خوشبو تھی۔ ذہن پر زور دیا تو اندازہ ہوا کہ یہ باسمتی چاولوں کی خوشبو ہے۔ پرانے باسمتی چاولوں کی بوری کھولی جائے تو اس میں سے ایسی ہی مہک آتی ہے۔

قریباً تیس عدد زینے طے کرنے کے بعد ہم کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے ایک اسٹور میں پہنچے۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں' تیل کے خالی ڈرم' مچھلیاں پکڑنے کے جال۔ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے کنٹینرز' بہت کچھ بھرا ہوا تھا اس اسٹور میں۔ اس کاٹھ کباڑ میں سیڑھیوں کا بالائی دروازہ یوں چھپا ہوا تھا کہ آسانی سے نظر نہیں آسکتا تھا۔ اسٹور کا دروازہ اندر کی طرف کھلا۔ سامنے بھری ہوئی بوریوں کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی دن کی روشنی بھی دکھائی دی۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ رات تھی لیکن باہر دیکھا تو سہ پہر کا منظر نظر آیا۔ درحقیقت کیبن میں کچھ دیر پہلے ہمیں دوپہر کا کھانا دیا گیا تھا۔ اس سے چند گھنٹے پہلے دیا جانے والا کھانا صبح کا تھا۔ دروازہ کھلنے کے باوجود آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ بوریوں کی اونچی اونچی قطاروں نے دروازہ مسدود کر رکھا تھا۔ گن بردار نے ذرا آگے بڑھ کر بوریوں کی ایک قطار کو ٹانگ سے دھکیلا تو میں ششدر رہ گیا۔ دو عمودی قطاروں میں رکھی ہوئی قریباً بیس عدد بوریاں ایک دم سلائیڈ کر کے پیچھے ہٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی بوریوں کے درمیان ایک پانچ فٹ چوڑا راستہ نظر آنے لگا۔ بالکل "کھل جا سم سم" والا معاملہ تھا۔ پیچھے ہٹنے والی بوریاں درحقیقت ایک سلائیڈنگ تختے پر رکھی گئی تھیں۔ یہ تختہ چھوٹے پہیوں کے ذریعے دو شان دار پٹڑیوں پر بے حد روانی سے حرکت کرتا تھا۔ میرے سامنے گن بردار نے صرف ایک ٹانگ کے زور سے اس میکنیزم کو بہ آسانی حرکت دے دی تھی۔ ہم چار پانچ فٹ چوڑے راستے میں داخل ہوئے۔ ہمارے دونوں جانب بوریوں کے قریباً ۲۰ فٹ اونچے ڈھیر تھے۔ اس کے اوپر بڑے بڑے شیڈ نظر آ رہے تھے۔ خوشبو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ان بوریوں میں بہترین کوالٹی کے باسمتی چاول ہیں۔ ہم قریباً پچاس گز طویل راستے سے گزر کر کھلی جگہ پر آگئے۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ہم ایک وسیع و عریض جہاز پر تھے۔ اپنے دائیں کندھے کے اوپر سے میں اس جہاز کے پہلے عرشے

کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد دوسرا عرشہ تھا اور پھر جہاز کا شان دار "برج" دکھائی دیتا تھا۔ دونوں عرشوں پر جہاز کے باوردی ملازم چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ان کی وردیاں نیلی تھیں اور سروں پر زرد ٹوپیاں تھیں۔ ان کی نیلی جیکٹوں پر پشت کی جانب کچھ پرنٹ بھی تھا۔ یہ ایک مونوگرام تھا جس میں "III" کے الفاظ نمایاں تھے۔ میں پہلی نگاہ میں پہچان گیا تھا کہ یہ ایک مال بردار جہاز تھا۔ جہاز نہ تو نیا تھا نہ بہت پرانا۔ ہاں اس کے کچھ حصے قدرے بوسیدہ نظر آرہے تھے۔ میں نے جہاز سے آگے نیلے سمندر پر نظر ڈالی۔ دور تک سمندر دکھائی دیتا تھا اور سمندر سے آگے بھی سمندر ہی تھا۔ سمندر کی کوئی قسم نہیں ہوتی۔ کوئی سمت اور کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ یہ بس سمندر ہی ہوتا ہے۔ اپنے سینے میں ہزاروں طوفان' ان گنت راز اور لاتعداد دنیائیں سمیٹے ہوئے' یہ ایک اور ہی جہان ہے۔ یہ ایک کہانی ہے اور اس کے اندر لہر در لہر ہزاروں کہانیاں ہیں۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ نیلے سمندر کی طرح نیلے آسمان نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم کس راہ پر محوِ سفر ہیں۔ دور دور تک کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ ہم کھلے سمندر میں' ساحل سے بہت دور ہیں۔

سیاہ فام نے ایک بار پھر بے دردی سے میری کمر میں ٹھوکا دیا اور میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ سیاہ فام بے حد کرخت لہجے میں بولنے لگا۔ شکر ہے کہ میں اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا ورنہ ناحق میں خون جلاتا۔

سیڑھیاں طے کرکے ہم پہلے عرشے پر آئے اور وہاں سے دوسرے عرشے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی کسی جنس کی بے شمار بوریاں پڑی دکھائی دیں۔ یہیں پر ایک طرف رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ لگژری کمرے نظر آتے تھے۔ درمیان سے ایک قالین پوش راہداری گزرتی تھی۔ دوسرے عرشے پر پہنچتے ہی پُرنم سمندری ہوا کے جھونکے شدت سے محسوس ہونے لگے۔ بہرحال سمندر پُرسکون تھا اور مطلع بھی بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے اور کیوں۔

ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر چھڑی بردار حبشی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک آواز بلند ہوئی اور حبشی مجھے لے کر اندر داخل ہوگیا۔ گن بردار سیاہ فام بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے اندر آیا۔ یہ کمرا اندر سے خاصا کشادہ تھا اور غیر متوقع طور پر کافی سجا ہوا بھی تھا۔ درحقیقت چھوٹے سائز کے دو تین کمروں پر مشتمل یہ ایک اپارٹمنٹ تھا۔ سامنے شیشے کی ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں سے نیلگوں سمندر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے علاوہ جہاز کا مستول بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ کیبن نما کمرے میں جو شخص صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ بدبخت مائیکل تھا۔ کالگو جنگلات سے وارد ہونے والا پُراسرار آدم خور۔ ہمیشہ کی طرح وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ نظر کا چشمہ اتار کر اس نے شفاف میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس میز پر وہسکی کی بوتل اور گلاس وغیرہ بھی نظر آرہے تھے۔

مائیکل مجھے دیکھ کر پُراسرار انداز میں مسکرایا پھر امریکی لہجے میں بولا "مجھے تم سے مصافحہ کرنا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ تم اپنے ہاتھ آگے نہیں لاسکتے ہو۔ بہرحال گڈ آفٹرنون جینٹل مین۔ مجھے امید ہے تمہارا سفر اچھا گزر رہا ہوگا۔"

"ضرورت سے زیادہ اچھا گزر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہمارے ساتھ رہوگے تو ایسے ہی مزے کروگے۔"

اس نے سیاہ فام کارندوں کو اشارہ کیا' وہ خاموشی سے باہر چلے گئے اور کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ مائیکل اسی طرح بے پروائی سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ میری آمد کے بعد اس نے اپنے کوٹ کے نیچے لگے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری آنکھ کی چوٹ اب کافی بہتر ہے۔ ہلکی سی سرخی رہ گئی ہے۔"

"میری آنکھ کے متعلق فکرمند ہونے کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

"مسٹر! ہم تو ہر ایک کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں۔ کوئی اس چیز کی قدر نہ کرے تو اور بات ہے۔ اب پروفیسر کی بیٹی شاستے (شائستہ) ہی کو دیکھو۔ وہ بیمار تھی۔ میں نے سوچا کہ پروفیسر ساری دنیا کو شفا بانٹتا ہے' بیٹی کو کیوں تندرست نہ کرے گا لہٰذا میں شاستے کے علاج کے لیے پروفیسر ڈیوکو ہی ساتھ ہی لے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ شائستہ یہاں ہے؟"

"ہاں۔ وہ میرے ساتھ ہی جارہی ہے۔"

"اور پروفیسر؟"

"وہ بھی یہیں ہے۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"پروفیسر تو شاید مصروف ہوگا۔ شاستے سے تم ابھی مل سکتے ہو۔" اس نے اندرونی دروازے کی طرف رخ کرکے بڑی ملائمت سے پکارا "شاستے! ادھر آؤ پلیز۔"

اس کی دوسری صدا پر کمرے کے اندرونی دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور میں شائستہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بڑے نفیس ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ گلے میں قیمتی پتھروں کی جگمگاتی مالا تھی۔ میں نے پہلی بار ذرا غور سے شائستہ کو دیکھا۔ بقول پروفیسر اس کی عمر قریباً بیس سال تھی لیکن اپنی معصومیت اور سادگی کے سبب وہ عمر سے تین چار برس چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا تاہم یہ زردی اس کی خوب صورتی کو پوری طرح ڈھانپ نہیں سکی تھی۔ مائیکل نے کہا "ڈارلنگ سلام کرو۔ یہ تمہارے ڈیڈی کے دوست اور تمہارے ہم وطن ہیں۔ اور تم ان سے پہلے مل بھی تو چکی ہو۔"

شائستہ نے دھیمی آواز میں "گڈ آفٹرنون" کہا۔ میں نے جواب دیا۔ شائستہ سوالیہ نظروں سے مائیکل کو دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ "میں جاؤں؟"

مائیکل نے اس کا منشا نظر سمجھتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ گھومی اور بال درست کرتی دروازے میں اوجھل ہوگئی۔ میرے کانوں میں ابھی تک ڈارلنگ کا لفظ گونج رہا تھا۔ مائیکل نے شائستہ کو ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

میں نے مائیکل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "پروفیسر کی بیٹی یہاں کس حیثیت سے ہے؟"

"میری بیوی کی حیثیت سے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک گیا "لاہور میں تو تم نے۔۔۔ کچھ اور بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ تمہارے ایک ملازم نے شائستہ کے ساتھ زیادتی کی تھی جس کی وجہ سے۔۔۔ وہ پریگنینٹ ہوگئی۔"

"وہ میرا ملازم نہیں تھا۔ پروفیسر ہی کا ملازم تھا۔"

"جو بھی تھا لیکن تم نے کہا تھا کہ اس نے شائستہ پر مجرمانہ حملہ کیا' جس کی پاداش میں تم نے اس شخص کو جان سے ماردیا۔"

"ہاں ایسا ہوا تھا۔" مائیکل نے تاسف سے کہا "مجھے شاستے پر بہت ترس آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے شادی کرلوں تاکہ اس کی زندگی برباد ہونے سے بچ جائے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے دکھ ختم ہوجائیں یا وہ خود ہی ختم ہوجائے۔ ایک دم۔ جسٹ ان اے سیکنڈ۔"

اس نے جام بھرا اور تلخ وہسکی گھونٹ گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس مکروہ شخص کا چہرہ نوچ لوں۔ اس کے چہرے پر کمینگی درج تھی اور آنکھوں میں مسخرہ چھپا ہوا تھا۔

میں نے کہا "مائیکل! تم پرلے درجے کے بے غیرت شخص ہو۔ تمہارا جھوٹ تمہارے لعنتی چہرے پر لکھا نظر آتا ہے۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"یہی جھوٹ کہ شائستہ کی آبرو کا لیٹرا پروفیسر کا ملازم تھا جسے تم نے قتل کردیا۔۔۔ اور اس کا گوشت فریج میں محفوظ کرلیا۔ سچ کیا ہے' یہ تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ شائستہ کی آبرو کسی اور نے نہیں تم نے برباد کی اور اب بھی تم نے اسے اپنی جس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس کے مجبور باپ کو بھی بے دردی سے بلیک میل کررہے ہو۔"

"تم جو چاہو کہہ سکتے ہو' بلکہ چاہو تو مجھے گالیاں بھی دے سکتے ہو۔ جب موقع آئے گا' میں ہر بات کا حساب چکا دوں گا۔ باقی رہی شاستے کی بات۔۔۔ تو اس کے حوالے سے تمہارے لیے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ وہ اب میری وائف ہے۔ تم اس کے بھائی یا باپ نہیں ہو لیکن اگر تم چاہو تو میں اس میرج کے قانونی کاغذات تمہیں دکھا سکتا ہوں۔ یہ شادی شاستے کی مکمل آمادگی اور رضامندی سے ہوئی ہے۔"

"تم ایک لعنتی بردہ فروش ہو مائیکل۔ تمہاری زبان پر بیوی اور شادی جیسے الفاظ آکر ناپاک اور حقیر محسوس ہونے لگتے ہیں۔ تم ایسے تمام الفاظ کو معاف ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

"چلو معاف رکھتا ہوں۔ اور کوئی خدمت؟"

"میرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"کون سے ساتھی؟"

"لیڈی ڈاکٹر غزالہ۔ میرا دوست زریں گل اور اس کی بیوی۔"

مائیکل زور سے ہنسا۔ اس کا سیاہ چہرہ کچھ اور سیاہ ہوگیا "تو تم انہیں ساتھی کہہ رہے ہو۔ وہ اب تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔ تمہارے ساتھی اب ہم ہیں۔۔۔ ہم۔" وہ اپنے چوڑے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "ساتھی بھی' ہم سفر بھی اور دوست بھی۔"

"چلو جو بھی ہے لیکن وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"میری یادداشت کافی کمزور ہے لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو آخری بار میں نے ڈیئر پروفیسر کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔"

"شاید تم بتانا نہیں چاہ رہے ہو۔"

"یہ ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

اچانک میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کو دیکھا۔ وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ وہ معمولی لباس میں تھا۔ چہرے پر مسکینی تھی اور نظرات کی جھریاں تھیں۔

"پروفیسر آپ یہاں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

پروفیسر خاموش رہا۔ میں نے اردو میں سوال کیا تھا' اس کے باوجود مائیکل نے اندازہ لگالیا کہ میں نے کیا پوچھا ہے۔ وہ پروفیسر کی جگہ جواب دیتے ہوئے بولا "یہ چھوٹے موٹے کام پروفیسر ڈیئر اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ میں بہت کہتا ہوں' کیا ضرورت ہے۔ نصف درجن ملازم موجود ہیں لیکن فارغ بیٹھنا پروفیسر ڈیئر کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور کوئی کام نہ ملے تو جھاڑ پونچھ ہی شروع کردیتے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا ہے۔ آپ رشتے میں میرے "فادر ران لا" ہیں۔ آپ کے معمولی کام کرنے سے لوگ کیا سوچیں گے مگر ان کا کہنا ہے کہ محنت میں عظمت ہے اور کوئی کام بھی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔"

مائیکل کے چہرے پر وہی مسخرانہ کمینگی نظر آرہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے پروفیسر کو اپنے جوتے چاٹنے پر مجبور کیا تھا۔ پروفیسر کے دل کا ٹکڑا مائیکل کے قبضے میں تھا۔ وہ ایک مجبور باپ کی مجبوری کو تماشا بنا رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پروفیسر کے لیے اس کے دل میں زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی یہ خطا معاف کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ اپنے بھائی ارشاد کی طرح پروفیسر نے اس کی طرف دستِ تعاون نہیں بڑھایا تھا اور پولیس کے پاس جانے کی دھمکی دی تھی۔

پروفیسر نے دھیمے لہجے میں پوچھا "کتنی چینی؟"

"نہیں' میں چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے کہا۔

"کیوں مسلمان نہیں ہو تم۔" مائیکل نے پوچھا۔

"مسلمان کے لیے کیا چائے پینا ضروری ہے؟"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم شراب تو پیو گے نہیں لہٰذا چائے پی لو۔"

"فی الحال کچھ نہیں پیوں گا۔" میں نے کہا۔

"اگر ہاتھ بندھے ہیں تو ڈیئر پروفیسر تمہیں اپنے ہاتھ سے پلا دیں گے۔"

"نہیں شکریہ۔"

مائیکل نے بڑی رعونت سے پروفیسر کو اشارہ کیا۔ وہ ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر چلا گیا۔

مائیکل نے کہا "تمہیں یہاں بلانے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں تمہیں اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نے سائن کو مارا ہے اور سائن کو دو بدو مقابلے میں مارنا آسان نہیں تھا۔ تم نے بے خبری میں ایک بڑا کام کیا ہے۔ سائن ایک منتخب لڑاکا تھا۔"

"اللہ نے چاہا تو میں تمہیں آئندہ بھی حیران ہونے کا موقع دوں گا۔"

"مجھے لگ رہا ہے۔" وہ تنقیدی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"اگر آزمانا چاہو تو ابھی آزما سکتے ہو۔ میں تم میں سے کسی کے ساتھ بھی ایک صاف ستھرے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔"

"تمہیں یہ موقع ضرور ملے گا مگر ابھی نہیں۔" مائیکل کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں تھیں۔

اس نے افریقی زبان میں کسی کو پکارا۔ دروازہ کھلا اور مشین گن والا دیوہیکل حبشی دندناتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور گن پوائنٹ پر باہر لے آیا۔ اپارٹمنٹ کے دروازے سے باہر نکلتے نکلتے میں رک گیا۔ میں نے مائیکل سے مخاطب ہو کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مائیکل' اسے میری درخواست سمجھو' اطلاع سمجھو یا وارننگ' اگر غزالہ اور گلثوم تمہارے پاس موجود ہیں تو انہیں کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے۔"

مائیکل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ مسکراہٹ بھی پتھر تھی۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔ جہاز کے عرشے سے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہ پروفیسر اللہ دتا پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پلاسٹک کی ایک بالٹی میں سے سبزی کے چھلکے سمندر میں پھینک رہا ہے۔ میری طرف اس کی پشت تھی لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آیا۔ ایک قابل معالج' ہزاروں لوگوں کا مسیحا اور بارسوخ شخص حالات کی چکی میں پس کر خاک سے باریک ہوگیا تھا۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی خاطر وہ ایک نوکر کی طرح ان لوگوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ مائیکل نے مجھے ابھی بتایا تھا کہ وہ پروفیسر کو شائستہ

کے علاج کے لیے اپنے ساتھ لایا ہے مگر میں جانتا تھا کہ مائیکل کے دیگر جھوٹوں کی طرح یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ پروفیسر خود منت سماجت کرکے اس سفر میں شریک ہوا ہوگا۔ وہ کسی بھی صورت اپنی بیٹی کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ مائیکل نے اپنے جذبۂ حاکمیت کی تسکین کے لیے پروفیسر کو ایک خدمت گار کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

گن بردار سیاہ فام مجھے لے کر سیڑھیوں پر آیا۔ طویل سیڑھیاں طے کرکے ہم زیریں عرشے پر پہنچے' پھر اس گودام میں داخل ہوئے جہاں فرش سے چھت تک بوریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ گودام میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک نظر نیلگوں سمندر پر ڈالی۔ آسمان شفاف تھا۔ سورج کے جھکاؤ سے میں نے اندازہ لگایا کہ مغرب ہمارے عقب میں ہے اور ہم مشرق یا جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اگر ہم کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے تھے اور ہمارا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم افریقہ یا ماریطانیہ کی طرف نہیں جا رہے۔۔۔ تو پھر ہم کہاں جا رہے تھے؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا جس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جہاز کے نچلے حصے تک جانے والا خفیہ راستہ گودام کی بیکڑوں بوریوں کے درمیان سے ہی کہیں نکلتا تھا۔ ایک اجنبی کے لیے اس راستے کو ڈھونڈ لینا آسان نہیں تھا۔ یہ باسستی کی آڑ میں بردہ فروشی کا راستہ تھا۔ ہم ایک خاص مقام پر پہنچے تو بوریوں کی دو قطاریں سلائیڈنگ تختے پر پھسلتے ہوئے پیچھے ہٹ گئیں اور ہم کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے اسٹور روم میں داخل ہوگئے۔

اسٹور روم سے سیڑھیاں اتر کر ہم پھر سے جہاز کے پیندے میں پہنچ گئے۔ میری الٹی ہتھکڑی کھولی گئی اور اسی کیبن میں پہنچا دیا گیا جہاں سے نکالا گیا تھا۔ تمام افراد گم صم بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا سب گونگے بہرے ہیں۔ مغلوب محمد اسلم ابھی تک نیم بے ہوش پڑا تھا۔ بے ہوشی میں اس کی زبان پر بار بار نسرین نامی عورت کا نام آرہا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت کون ہے اور اس مصیبت میں وہ اسے کیوں یاد کر رہا ہے۔

مجھے صفدر کے چہرے پر اضطراب نظر آیا "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "پتا نہیں۔ مجھے اس اطلاع پر خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔۔۔ لیکن اطلاع بڑی اہم ہے۔"

"کیا؟"

"زریں گل یہیں ہمارے ساتھ ہے۔"

میں دم بخود رہ گیا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کی آواز سنی ہے۔ وہ ہماری دائیں جانب دو کیبن چھوڑ کر تیسرے کیبن میں ہے۔ دراصل وہ بلند آواز میں حبشیوں کو گالیاں دے رہا ہے اور انہیں دھمکا رہا ہے کہ اگر انہوں نے اس کی بیوی سے کوئی بدتمیزی کی تو وہ انہیں زندہ درگور کردے گا۔"

ابھی صفدر کی بات منہ ہی میں تھی کہ کہیں قریب سے زریں گل کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی "ام تم سب کا بیڑا غرق فرمائے گا۔ کتے کے بچو! تم ام کو جانتا نہیں۔ ام مرنے سے نہیں ڈرتا۔ اگر تم کسی کا پتا باپ کی اولاد نہیں ہو تو آؤ۔ ایک ایک کرکے نہیں آسکتے تو دو دو کرکے آجاؤ۔ ام تمہاری دم میں نمدہ نہ فٹ کرے تو امارا نام زریں خاں نہیں۔"

پھر وہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ کوئی جواب نہیں آیا تو وہ دوبارہ چنگھاڑا "ام خدا کا قسم کھاتا ہے اگر تم نے امارے بی بی کو بری نظر سے دیکھا تو ام اس مکان کو جہنم بنا دے گا۔ آگ لگا کر پھونک دے گا سب کچھ۔"

صفدر نے مجھے ٹھوکا دیا "موصوف جہاز کو مکان فرما رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے حبشیوں کو "کالے لنگور" کا خطاب دے رہے تھے۔"

"یہ بڑی گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا "یہ بے وقوف ایک دفعہ پہلے بھی اسی طرح پٹ چکا ہے۔"

"ہاں مجھے بھی یاد ہے۔ بڑی مار پڑی تھی۔"

"میرا خیال ہے' اسے منع کیا جائے۔"

"ٹھیک ہے' میں کرتا ہوں۔"

صفدر نے بلند آواز سے کہا "زریں گل۔۔۔ او زریں گل۔۔۔ ہم بھی ادھر ہیں۔"

چند لمحے بعد مسرت سے بھرپور آواز سنائی دی "صپدر صیب۔۔۔ یہ آپ ہی کا آواز تھا ناں؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے' میں اپنی نقل اتار رہا ہوں۔"

زریں نے پکار کر کہا "خدا کی قسم صپدر صیب! ام بہت پریشان تھا۔"

"اب تو ساری پریشانیاں دور ہوگئیں نا۔ کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ۔"

"آپ کیا بات کر رہا ہے صپدر صیب! ام تو پریشانی سے بے حال ہو رہا ہے۔ کلثوم کا کچھ خبر ہے نہ استاد صیب کا۔"

"استاد صیب یہاں میرے ساتھ ہی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہوش کے ناخن لو۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم اسی طرح

واویلا کر کے پٹ چکے ہو۔ یہ لوگ تو ویسے بھی بہت ظالم ہیں۔ ابھی ایک بندے کا بھرتا بنا دیا ہے انہوں نے۔ بہتر یہی ہے کہ کان لپیٹ کر چپکے بیٹھے رہو۔"

"کیا یہ استاد صیب نے فرمایا ہے؟"

"بالکل بقلم خود۔"

"صپدر صیب! بس ایک دفعہ ام کو استاد صیب کا آواز سنا دو۔ امارا دل معترف (مطمئن) ہو جائے گا۔"

"تم دل معترف نہ کرو۔ بس چپ کر کے بیٹھے رہو۔ وہ لوگ سخت غصے میں ہیں۔ بس اب کوئی بات نہیں کرنا۔ سمجھو لائن کٹ گئی۔"

"کیا کٹ گیا۔"

"تیرا سر کٹ گیا۔ بس اب چپکا بیٹھا رہ۔"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال ام نہیں بولے گا۔ بس ام کو ایک بات بتا دیں۔ یہ ام کس چیز میں بیٹھا ہوا ہے؟"

"مکان میں۔۔۔ ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا۔"

"خو چے اتنا پاگل نہیں ام۔۔۔ خو ام کو معلوم ہے کہ یہ مکان نہیں ہے۔ وہ تو ام نے جان بوجھ کر کہا تھا۔۔۔ کہ شاید امارا غلطی درست کرنے کے لیے وہ کالا لنگور دروازہ کھولے اور ام کچھ کر سکے۔"

"وہ بھی اتنا پاگل نہیں۔ ویسے یہ بحری جہاز ہے۔۔۔ اب خاموش ہو جاؤ اور بولنا نہیں ہے۔" صفدر نے سختی سے کہا۔

شکر ہے کہ زریں گل خاموش ہو گیا۔ ہمارے ساتھ رابطہ ہونے کے بعد اس کی کافی ڈھارس بندھی تھی۔ اس کے لب و لہجے میں زندگی دوڑ گئی تھی۔

میں نے صفدر کو تمام احوال سنایا۔ اس کو بتایا کہ یہ ایک بڑا مال بردار جہاز ہے جو کھلے سمندر میں جنوب مشرق کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ میں نے اسے اطلاع دی کہ جہاز میں پروفیسر اللہ دتا کی بیٹی شائستہ کے علاوہ خود پروفیسر بھی ہے۔ یہ جان کر صفدر کو از حد حیرانی ہوئی کہ شائستہ کو مائیکل نے اپنی بیوی بتایا ہے اور وہ اس کے ساتھ دوسرے عرشے پر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں ہے۔

صفدر نے پُر سوچ لہجے میں کہا "شاہ جہاں صاحب! میرا تو پہلے دن سے یہی خیال تھا کہ لڑکی سے زیادتی کرنے والا یہی بدبخت مائیکل ہے۔ گھر کے تہ خانے میں اس کے سوا بھلا کون یہ جرأت کر سکتا تھا۔"

"لیکن اگر ایسی بات تھی تو شائستہ نے باپ سے اپنی ملاقاتوں میں اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ پروفیسر کے بقول اس نے بھی یہی کہا کہ ایک رات اندھیرے میں کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔"

"ممکن ہے مائیکل نے اسے ڈرا دھمکا کر یہ بیان دینے پر مجبور کیا ہو۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس تہ خانے میں صرف ایک ہی بار شائستہ پر مجرمانہ حملہ کیا گیا ہو اور یہ جرم مائیکل نے تاریکی میں کیا ہو۔"

"یہ بات کچھ منطقی نہیں لگتی۔" میں نے کہا "کیونکہ مائیکل نے اگر ایک بار لڑکی کو ہوس کا نشانہ بنایا تھا تو پھر بار بار ایسا کرنے سے اسے کس نے روکا۔ وہ اس تہ خانے میں شائستہ پر مکمل دسترس رکھتا تھا۔"

"ہاں یہ جھول تو ہے لیکن ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں۔ مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ مختلف حالات میں مختلف رویّوں کا اظہار کرتے ہیں۔"

اچانک ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ ہمارے کیبن نما کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا' پھر سیاہ فام کی نہایت کرخت بکواس سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ ہمارے بولنے پر برہم ہو رہا تھا۔

ادھیڑ عمر نثار علی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہم سے خاموش رہنے کی درخواست کی۔ چند سیکنڈ تک چیخنے چلّانے کے بعد سیاہ فام بھوت واپس چلا گیا۔ ادھیڑ عمر نثار میرے قریب کھسک آیا اور ہاتھ جوڑ کر سرگوشی کی "خدا کے لیے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ یہ وحشی غصے میں آ گئے تو باہر نکال کر ایک ایک کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

میں نثار سے اس کے حالات کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کی خوف زدہ صورت دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ باقی چھ افراد بھی پتھریلے مجسموں کی طرح ساکت و جامد بیٹھے تھے۔ ان میں سے کبھی کبھی کسی کی مدھم سسکی سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ یہ سب لوگ منہری سپنوں کے مسافر تھے۔ بیرون ملک جانے کی آس لے کر گھروں سے نکلے تھے۔ کسی کو گھر بنانا تھا' کسی کو بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے تھے' کسی کو بیمار ماں کا علاج کرانا تھا اور کوئی محبت کی بازی میں ہار سے بچنا چاہتا تھا۔ اب یہ لوگ گردشِ دوراں کے بے رحم شکنجے میں تھے اور گئے وقت پر حسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔ سب سے پتلی حالت اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے کی تھی جس کی ہچکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مجھے اس کے ہاتھوں پر چوٹوں کے پرانے نشان نظر آئے جو یقیناً سخت مار پیٹ کا نتیجہ تھے' کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں جب تاریک براعظم افریقہ سے لوگوں کو غلام بنا کر سمندر پار لے جایا جاتا تھا تو ان میں ایک خاص قسم کی اداسی اور قنوطیت پیدا ہو جاتی

تھی اور کبھی کبھی یہ کیفیت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ غلاموں کی کیمپ بیمار پڑ جاتی تھی اور ان میں سے اکثر مر جاتے تھے۔ اس بیماری کو "وطن سے دوری کا غم" قرار دیا جاتا تھا اور مختلف زبانوں میں اس بیماری کے مخصوص نام تھے۔ نجانے کیوں ان گم صم بیٹھے ہم وطنوں کو دیکھ کر مجھے یہ ساری تفصیل یاد آ گئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے میں ان تمام لوگوں سمیت قدیم دور میں چلا گیا ہوں اور "وطن سے دوری کے غم" میں مبتلا ہوں۔

اگلے دو روز اسی حالت میں گزر گئے۔ دروازے میں ہر روز تین مرتبہ باقاعدگی سے خلا پیدا ہوتا تھا اور کھانے کی دو بڑی ٹرے اندر آ جاتی تھی۔ ان میں ہم دس افراد کے لیے کافی کھانا ہوتا تھا۔ یہ پاکستانی کھانا اکثر چپاتی' چکن اور چاول پر مشتمل ہوتا تھا۔ یقیناً کھانے کی تیاری انہی خواتین سے کرائی جاتی تھی جو اس جہاز میں قیدیوں کی حیثیت سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ میں روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے اکثر سوچتا تھا کہ کیا پتا یہ غزالہ یا گلشوم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی ہو۔ غزالہ اور گلشوم کے حوالے سے میں نے جو بات کہی تھی مجھے امید تھی کہ وہ مائیکل کے ذہن میں ہو گی۔

کھانا سرو کرنے میں قیدی خواتین ہی مدد کرتی تھیں۔ یہ کل چار پانچ عورتیں تھیں۔ ہم ہر روز اس اندیشے کے تحت باہر دیکھتے تھے کہ شاید ان میں غزالہ یا گلشوم ہوں' لیکن ابھی تک یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا تھا۔

کمرے میں موجود تین چار افراد ناصاف پانی کے سبب بدہضمی کا شکار ہو گئے تھے۔ انہیں بار بار ٹوائلٹ کی ضرورت پیش آتی تھی۔ شروع میں تو یہ سب کچھ تکلیف دہ تھا لیکن اب روٹین میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔ مضروب اسلم کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ اس کے چہرے کے زخموں سے خون رسنا بند ہو گیا تھا اور اب وہ کھانے کے لیے اپنے منہ کو حرکت بھی دے سکتا تھا۔ وہ کوئی غم ناک کہانی سینے میں چھپائے ہوئے تھا اور ہر وقت اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ تاہم کڑی سزا جھیلنے کے بعد اس نے دوبارہ بہ آوازِ بلند رونے دھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور صرف اسلم ہی نہیں' تمام کیبنوں میں موجود تمام قیدی اس واقعے کے بعد مزید سہم گئے تھے۔

ایک رات سمندر میں شاید مدوجزر تھا۔ جہاز بری طرح ہچکولے کھاتا رہا۔ تاہم تین چار گھنٹے بعد یہ ہچکولے بتدریج کم ہو گئے اور ہم جو نیم خوابی کی حالت میں تھے' پُرسکون نیند سو گئے۔ ابھی ہمیں سوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بلند آوازوں کی وجہ سے دوبارہ آنکھ کھل گئی۔ یہ زریں گل تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' اس نے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ بلند آواز میں حبشی پہرے داروں کو للکارنے لگا اور انہیں وارننگ دینے لگا کہ اگر اس کی بیوی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا بھی گیا تو وہ قیامت برپا کر دے گا۔

میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ خاموش رہے ورنہ سب کے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ پکار کر بولا "سب کے لیے کیوں ہو گی استاد صیب۔۔۔ صرف امارے لیے ہو گی اور ام ہر مصیبت کے لیے تیار ہے۔"

وہ بحث پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا "زریں! بے وقوف مت بنو۔ گلشوم ہمیں ہمارے ساتھ ہے' وہ بالکل خیریت سے ہے۔"

"آپ۔۔۔ آپ نے کیسے دیکھا اسے؟"

"کل وہ لوگ مجھے عرشے پر لے کر گئے تھے۔ وہاں اسے دوسری عورتوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور حفاظت سے ہے۔"

"اور غزالہ بی بی؟"

"وہ بھی وہیں ہے۔ وہ خیریت سے ہیں۔ کم از کم منزل پر پہنچنے تک وہ بالکل خیریت سے رہیں گی۔" میں نے زریں کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"استاد صیب! آپ کہیں امارے تسلی کے لیے تو نہیں کہہ رہا؟"

صفدر نے تلملا کر کہا "یار! تم اپنی بک بک بند کرتے ہو یا نہیں۔"

شکر ہے کہ اس کے بعد زریں کی آواز نہیں آئی۔ خبر نہیں وہ ناراض ہو گیا تھا یا صفدر کی فکرمندی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سیاہ فام وحشی جہاز کے اس حصے میں موجود نہیں تھے' ورنہ زریں سے یہ مکالمے بازی ہمیں بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔

تیسرے دن جہاز رک گیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ اور کیوں کھڑے ہیں۔ ایک دو بار کسی جہاز کا سائرن سنائی دیا تھا۔ اس آواز سے یہ قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ شاید ہم کسی بندرگاہ پر ہیں۔ جہاز کے جس حصے میں ہم موجود تھے وہاں بیرونی آوازیں نہیں پہنچتی تھیں۔ اگر کوئی بلند آواز پہنچتی بھی تھی تو بے حد مدھم ہوتی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں گھڑیاں نہیں تھیں' نہ ہی وقت معلوم کرنے کا کوئی اور ذریعہ تھا۔ بس تین وقت کھانے کی آمد سے یہ پتا چلتا تھا کہ یہ دن کا کون سا حصہ ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ یہ عارضی قیام ہے اور ہم پھر روانہ ہو جائیں گے' لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہم مسلسل رکے رہے۔ اب ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ ہم کسی بندرگاہ پر ہی ہیں۔ عرشے سے آنے والی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ جہاز پر کچھ لادا جا رہا ہے۔ یہ کام بندرگاہ پر پہنچنے کے چوبیس گھنٹے بعد شروع ہوا اور پھر شروع ہی رہا۔ بھاری کنٹینر تھے جو کرین کے ذریعے جہاز پر آتے تھے پھر انہیں پہیوں پر چلا کر مطلوبہ جگہ پر پہنچایا جاتا تھا۔ یہ ساری آوازیں مسلسل ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ کارروائی پہلے دن آٹھ گھنٹے اور اگلے دن بھی تین چار گھنٹے جاری رہی۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی' مال بردار جہاز اکثر راستے سے اسی طرح مال اٹھاتے اور اتارتے ہیں۔ جب مال چڑھانے کی کارروائی ختم ہو گئی تو ہمیں امید پیدا ہوئی کہ جہاز پھر چل پڑے گا اور ہمیں حبس کی اس کیفیت سے نجات ملے گی جو یہاں پہنچنے کے بعد محسوس ہو رہی تھی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جہاز مسلسل بندرگاہ پر کھڑا رہا۔ تیسرے روز مائیکل اپنے خوں خوار کارندوں کے ساتھ ہمارے پاس آیا۔ اس وقت ہم دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے۔ مائیکل نے پہلے ہمارے ساتھ والے دو کیبنوں کا معائنہ کیا' پھر ہمارے کیبن پر پہنچ گیا۔ سلائیڈنگ تختہ ہٹا کر دروازے میں خلا پیدا کیا گیا۔ مائیکل نے تمام قیدیوں (یعنی بردوں) کا بغور معائنہ کیا۔ وہ بدبخت حسبِ معمول تھری پیس سوٹ اور ٹائی کے ساتھ تھا۔ تہذیب کی اوٹ میں چھپا ہوا ایک قدیم وحشی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا اٹھا۔ خلا کے قریب جھک آیا "کیسے ہو مسٹر شاہ جہاں!" اس نے کہا۔

"تمہاری کرم فرمائی سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

"لیکن کچھ کمزور نظر آ رہے ہو۔ شاید بڑھی ہوئی شیو کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہے۔" پھر وہ اپنے کارندوں کی طرف متوجہ ہوا اور کسی افریقی زبان میں انہیں کچھ ہدایات دیں۔ تب ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا "میں نے تم سب لوگوں کی شیو اور حجامت وغیرہ کا کہہ دیا ہے۔ سب لوگوں کے غسل اور کمروں کی صفائی کا حکم میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ آج تمہیں دھلے ہوئے کپڑے بھی ملیں گے' امید ہے کہ تم سب اس تبدیلی کو انجوائے کرو گے۔ مگر ڈسپلن اپنی جگہ ہے' ہم ڈسپلن کی خلاف ورزی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔"

اس نے آخری الفاظ شہادت کی انگلی اٹھا کر کہے تھے۔

اس کے ہاتھ صاف شفاف تھے' جیسے دفتر میں کام کرنے والے کسی آفیسر کے ہاتھ ہوں مگر یہ ہاتھ درحقیقت ایک درندے کے خونی پنجے تھے۔ گوشت نوچنے اور ادھیڑنے والے پنجے۔

صفدر نے کہا "ایک درخواست ہے اگر آپ جناب کی طبیعت پر ناگوار نہ گزرے تو۔"

"ہاں ہاں کہو' لیکن صرف ایک درخواست ہونی چاہیے۔"

"ہمارا ساتھی دو کیبن چھوڑ کر تیسرے کیبن میں بند ہے۔ ذرا جذباتی بندہ ہے۔ پریشان ہو کر واویلا کرنے لگا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ آپ کے کارندے مشتعل ہو کر اسے مارنے پیٹنے نہ لگ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔" مائیکل نے کہا "اسے تمہارے کیبن میں منتقل کر دیا جائے گا۔ یہاں سے ایک بندے کو اس کیبن میں بھیج دیا جائے گا۔"

پھر اس نے اپنے کارندوں سے کچھ کھسر پھسر کی اور صفدر سے مخاطب ہو کر بولا "اور کوئی خدمت؟"

میں نے کہا "کیا دیگر ساتھیوں سے ہماری ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"دیگر ساتھیوں سے تمہاری مراد شاید وہ دونوں لڑکیاں اور بچہ ہے۔ لیکن ان سے ملاقات کے لیے ضروری ہے کہ وہ تینوں اس جہاز میں ہوں۔"

"تو کیا وہ جہاز میں نہیں ہیں؟"

"یہ تمہاری تیسری درخواست ہے۔ یعنی تم جاننا چاہتے ہو کہ وہ لوگ جہاز میں ہیں یا نہیں۔ میں نے صرف ایک درخواست کی اجازت دی تھی۔" وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ چوتھے کیبن کے معائنے میں مصروف تھا۔

اس معائنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تین سیاہ فام حجام وہاں آن موجود ہوئے۔ ان کے ساتھ تین چار سپلیر بھی تھے۔ کیبنوں کے سامنے تین کرسیاں رکھ دی گئیں۔ تین کیبنوں میں سے ایک ایک بندہ نکالا جاتا۔ اس کی شیو بنائی جاتی اور اگر بال لمبے ہوتے تو حجامت بھی کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ ہر کیبن میں ایک بالٹی' ایک ڈونگا اور صابن تولیا بھی دے دیا گیا۔ دھلے ہوئے دس دس براؤن کرتے پائجامے بھی ہر کیبن میں پہنچا دیے گئے۔ یہ لباس بھی ہمارے پہلے لباس کی طرح استعمال شدہ تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کئی بار پہلے بھی پہنا اور دھویا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ جہاز کے اس کمپارٹمنٹ میں جس طرح کے کیبن بنے ہوئے تھے اور دیگر انتظامات تھے انہیں دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ اس مال بردار

جہاز کو پہلے بھی انسانوں کی اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ کارروائی قریباً چھ سات گھنٹے جاری رہی۔ میں نے اور صفدر نے بھی شیو بنوائی اور بال ترشوائے۔ اس کے بعد نیم گرم پانی سے غسل بھی کیا۔ دھلے ہوئے کپڑے پہن کر کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ شام کا کھانا قدرے پر تکلف تھا۔ اس میں مٹر پلاؤ' قورمہ اور چائے تھی۔ سرو کرنے والی لڑکیاں بھی قدرے تر و تازہ نظر آتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کئی روز کے بعد انہیں بھی دھلے ہوئے کپڑے نصیب ہوئے تھے۔ دوسری وجہ شاید یہ ہوگی کہ آج کھانے میں چاول تھے اور لڑکیوں کو دو تین سو چپاتیاں پکانے کی مشقت نہیں کرنا پڑی تھی۔

کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد میں اور صفدر لیٹ گئے۔ زریں گل کے سلسلے میں ابھی تک وعدہ پورا نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی اسے ہمارے والے کیبن میں نہیں پہنچایا گیا تھا۔ ہم شدت سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت رات کے نو بجے ہوں گے جب ایک بار پھر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ پانچ چھ افراد کے قدموں کی چاپ تھی۔ باری باری کیبنوں کے سلائیڈنگ تختے پیچھے ہٹنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جس طرح صبح مائیکل نے قیدیوں کا معائنہ کیا تھا اسی طرح کوئی اور ہستی معائنے پر تشریف لائی ہے۔ ہمارے کیبن میں تیز لائٹس روشن ہوگئی تھیں۔ یقیناً دیگر کیبنوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔

کچھ دیر بعد ہمارے کیبن کے دروازے میں بھی خلا پیدا ہوا اور معائنہ کرنے والوں کی آواز سنائی دی۔۔۔ میں نے آواز کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کیبن سے باہر کی تمام لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ وہ لوگ چونکہ اندھیرے میں کھڑے تھے لہٰذا نظر نہیں آرہے تھے۔ صرف اتنا پتا چل رہا تھا کہ ان لوگوں میں مائیکل بھی موجود ہے۔ اس کی آواز خاصی واضح سنائی دے رہی تھی۔ اس نے انگلش میں ہمیں "اسٹینڈ اپ" ہونے کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں وہ کھسر پھسر کے انداز میں اپنے ساتھیوں سے بات کرنے لگا۔ تیز روشنی کے سبب ہماری آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ ان لمحوں میں یہی محسوس ہوا جیسے کیبن میں موجود ہم کسی شوکیس میں سجی ہوئی اشیا ہیں جنہیں خریدار تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک بڑا ہی ذلت آمیز احساس تھا۔ اُس کی اذیت وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو اپنی بدقسمتی کے سبب اس مرحلے سے گزرا ہو۔ غزالہ اور شیخ عاصم کے ہنی مُون کے دوران میں' میں نے شیخ عاصم کے ہاتھوں بڑی توہین برداشت کی تھی بلکہ توہین کا لفظ بھی درست نہیں' اسے ذلت کہنا چاہیے۔ شیخ عاصم نے میرے ہاتھوں پر خاص قسم کے دستانے چڑھا دیے تھے جن کے سبب میں کسی طرح کا ہتھیار استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور شیخ عاصم پوری بے فکری سے مجھے گھریلو ملازم کی ذمے داریاں سونپ سکتا تھا مگر ذلت کا ایسا احساس اس وقت بھی نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازے کا خلا پُر ہوگیا اور قدموں کی چاپ اگلے کیبنوں کی طرف چلی گئی۔ اس معائنے کے بعد طبیعت سخت مکدر ہوئی تھی' تاہم کچھ ہی دیر بعد اس کدورت کا ازالہ بھی ہوگیا۔ لمبے تڑنگے نیامی گن بردار نے کیبن کا دروازہ کھولا اور اپنی زبان میں بک بک کرنے کے بعد زریں گل کو اندر دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بے پروائی سے ایک قیدی کی گردن دبوچی اور اسے گھسیٹ کر باہر کھینچ لیا۔ کیبن کا وزنی دروازہ ایک مہیب آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

زریں گل جذباتی انداز میں مجھ سے لپٹ گیا' میرے رخسار چومنے کے بعد وہ صفدر سے بغل گیر ہوا۔ وہ یوں خوش نظر آرہا تھا جیسے وہ آزاد ہوگیا ہو۔ ان لمحوں میں شاید کلثوم کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ ہم تینوں ایک کونے میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے' زریں گل کی آواز بلند تھی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ سرگوشی میں بات کرے۔ میں نے اسے بتایا کہ حبشی پہرے دار پہلے ہی اس کی طرف سے بھڑکے ہوئے ہیں' کہیں یہ نہ ہو کہ وہ اس کی جان کو آجائیں۔

زریں گل نے پہرے داروں کو بے نقط سنائیں اور دیر تک سرگوشیوں میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ آخر میں اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

صفدر نے کہا "یہ سوال پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن ذہن میں آرہا ہے کہ یہ شکر کس سلسلے میں ہے؟"

وہ بولا "ام اس لیے شکر ادا کررہا ہے کہ ام کو ان کالے لنگوروں کا زبان نہیں آتا۔ اگر ام کو ان کا بک بک سمجھ میں آجاتا تو ام کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا اور ام اب تک ان میں سے دو تین کو مار کر خود بھی مرقعۂ اجل بن چکا ہوتا۔"

"مرقعۂ اجل نہیں لقمۂ اجل۔" صفدر نے تصحیح کی۔

زریں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "تاستو نصیب' آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے کلثوم اور غزالہ بی بی کو یہاں

دیکھا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ۔۔۔"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ قدموں کی تیز چاپ ہمارے کیبن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دراصل غیر ارادی طور پر زریں گل کی آواز پھر بلند ہوگئی تھی' مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ قدموں کی اس چاپ کا تعلق زریں کی بلند آواز سے ہی ہے۔ ہم دم سادھے انتظار کرتے رہے' ادھیڑ عمر نثار خشمگیں نظروں سے زریں کو گھور رہا تھا۔ غالباً اس کا خیال بھی یہی تھا کہ پہرے دار زریں کی آواز کی وجہ سے دروازے کی طرف آیا ہے۔ چند لمحے بعد دروازے کا سلائیڈنگ تختہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ دو پہرے داروں کی کرخت آوازیں سنائی دیں پھر اچانک لوہے کی طویل راڈ اندر آئی۔ اس سے پہلے کہ میں یا صفدر کچھ سمجھ پاتے' تانبے کا حلقہ زریں گل کی گردن میں آچکا تھا۔ زریں نے اضطراری کیفیت میں راڈ کو تھام لیا۔ اسی دوران میں حلقہ زریں کی گردن کے گرد فٹ ہوگیا اور وہ ایک جھٹکے سے دروازے کے خلا کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا سر کیبن سے باہر اور دھڑ کیبن کے اندر تھا۔ وہ چیخنے کی کوشش کررہا تھا مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میری نگاہ میں وہی تین روز پہلے کا منظر گھوم گیا جب ہمارے روم میٹ محمد اسلم کو اسی طرح شکنجے میں کس کر زخموں سے چُور کردیا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی ادھڑی ہوئی کھال ابھی تک کریہہ منظر پیش کرتی تھی۔ میں اور صفدر' زریں گل کو واپس کیبن میں کھینچنے کی کوشش کرنے لگے مگر عملاً ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کی گردن میں تانبے کی پتری کا حلقہ تھا۔ یہ حلقہ آہنی راڈ سے منسلک تھا اور راڈ کو دیوار سے ایچ کردیا گیا تھا۔ یہ لوگ بردہ فروش تھے۔ اگر کسی بردے کے چہرے کی کھال ادھڑ جائے تو یقیناً اس کی قیمت بہت کم رہ جاتی ہے مگر باقی قیدیوں کے لیے عبرت ناک مثال بنانے کے لیے ایک دو قیدیوں کا نقصان یہ لوگ برداشت کرلیتے تھے۔ درحقیقت زریں گل سے بھی کچھ بے وقوفی ہوئی تھی۔ وہ میرے اور صفدر کے منع کرنے کے باوجود پچھلے تین چار دن سے بار بار بول رہا تھا۔ پہرے دار اسے دو تین بار بہت سختی سے منع بھی کرچکے تھے مگر اس پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ پہرے داروں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا۔ لمبے تڑنگے نیامی پہرے دار کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے پہلے زریں کے سر پر دو زوردار ٹھوکریں رسید کیں' پھر وہی منحوس چھڑی اٹھالی جس سے اس نے اسلم کے چہرے کا بھرتا بنایا تھا۔ یہ لچک دار بید کی چھڑی قریباً چار فٹ لمبی تھی۔ جس وقت شائیں سے چھڑی کی پہلی ضرب زریں کے چہرے پر لگی' میں نے دروازے کے خلا میں سے اپنا سر نکالا اور لپک کر نیامی پہرے دار کا گریبان پکڑلیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا' میں نے اسے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ دروازے کا خلا صرف نو انچ چوڑا تھا۔ نیامی پہرے دار کا چہرہ بری طرح دروازے سے ٹکرایا اور وہ ڈگمگا کر رہ گیا۔ دوسرا پہرے دار اسے چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان بھی دبوچ لیا۔ تھوڑا سا پیچھے دھکیل کر میں نے انہیں دوبارہ قوت سے اپنی طرف کھینچا' ایک بار پھر ان کے چہروں کا خوفناک تصادم دروازے سے ہوا۔ وہ چیخ اٹھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ یک لخت ایسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ میں نتائج سے بے پروا ہوگیا تھا اور دل میں ٹھان لی تھی کہ جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے تین چار بار دونوں پہرے داروں کو انتہائی شدید جھٹکے دیے اور ہر بار ان کا بالائی دھڑ مضبوط دروازے سے ٹکرایا۔ ان دونوں کے چہرے زخمی ہوگئے تھے' صفدر نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیامی پہرے دار کی جیب میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال لیا۔ میں نے جب دیکھا کہ صفدر نے ریوالور کو ایک پہرے دار کی کنپٹی سے لگا دیا ہے تو میں نے دوسرے پہرے دار کو یوں گھمایا کہ اس کی پشت دروازے سے لگ گئی' میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑلی۔ وہ بہت لمبا تڑنگا تھا' گردن قابو آنے کے باوجود زور لگا رہا تھا۔ میں نے چابی کی تلاش میں اس کی جیبیں ٹٹولیں مگر ناکامی ہوئی۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ پہرے داروں کے ساتھی نازل ہوگئے ہیں۔ ہمارے کیبن میں موجود افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ بس ایک شخص ہسٹیریائی انداز میں چلّا رہا تھا اور یہ وہی نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا نام شہزاد معلوم ہوا تھا۔ دوسرے تمام کیبنوں میں موت کا سکوت طاری تھا۔

چند لمحے بعد سیاہ فام گن بردار ہمارے سامنے پہنچ گئے۔ ان کی تعداد تین تھی۔ دو کے پاس رائفلیں اور ایک کے ہاتھ میں لمبا چھرا تھا "خبردار!" صفدر نے پکار کر کہا "کوئی آگے آیا تو ان دونوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کردوں گا۔"

مسلح افراد جہاں کے تہاں رک گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے کشادہ تھیں۔ یقیناً وہ حیران تھے کہ ان کے دو نڈر شہ زور آناً فاناً زیر دام کیسے آگئے۔ صفدر نے ایک بار پھر پکار کر وارننگ دی۔ تینوں مسلح افراد ایک اوٹ میں ہوگئے اور

بلند آواز میں افریقی بولنے لگے۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے مزید قدموں کی آواز ابھری۔ اس مرتبہ دو افراد اندر داخل ہوئے اور ان میں سے ایک مائیکل خود تھا۔ اندر کی سنگین صورتِ حال دیکھ کر اس کے چہرے پر اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ اس نے پکار کر اپنے کارندوں سے کچھ کہا' غالباً یہ کہا تھا کہ وہ گولی نہ چلائیں پھر وہ ہماری طرف آگیا۔ شستہ انگلش میں بولا "یہ کیا ہو رہا ہے۔ چھوڑ دو ان لوگوں کو۔۔۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح یہاں سے بچ کر نکل سکتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ سارا کیا دھرا تمہارے انہی غنڈوں کا ہے۔ یہ ہر بندے کو ذلیل و خوار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس معاملے پر بات کر لیتے ہیں' تم ان کو چھوڑ دو۔" مائیکل نے تحکم سے کہا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح خود بھی ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔

"اگر نہ چھوڑیں تو؟" میں نے کہا۔

"ہمارے نزدیک ان آدمیوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن ان کے مرنے کی وجہ سے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم ان سادہ لوح لوگوں کی طرح ہمیں بھیڑ بکریاں مت سمجھو۔ اگر مزاحمت پر آگئے تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا تمہیں اور تمہارے چوچوں کو۔"

مائیکل مسکرایا "میں جانتا ہوں کہ تم معمولی غنڈے نہیں ہو لیکن حالات بڑوں بڑوں کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پروفیسر اللہ دتا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ کوئی معمولی بے آسرا شخص تھا؟ اپنی برہنہ بیٹی کو گوشت خوروں کے نرغے میں دیکھ کر اس نے اپنی زبان سے میرے بوٹ چاٹے تھے۔ یہی سب کچھ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم۔۔۔ کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

"جو کچھ میں کہنا چاہ رہا ہوں' وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تمہاری محبوبہ غزالہ اور اس کابلی خاں کی بیوی ہماری تحویل میں ہیں۔ ذرا سوچو' نازک مزاج شہری لڑکیوں کو اذیت دینے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔" مائیکل کے چہرے پر سفاکی اور کمینگی بارش کی طرح برس رہی تھی۔

ایک دم جیسے میرے بازوؤں کی توانائی زائل ہو گئی۔ صفدر کا تمتمایا ہوا چہرہ بھی ماند پڑ گیا تھا۔

مائیکل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "پورا اطمینان رکھو۔ میں تمہاری شکایت رفع کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم لوگ ڈسپلن کی پابندی کرو گے تو تم سے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ میں گھوڑے کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کا قائل نہیں ہوں۔"

میں نے نیامی حبشی کی گردن چھوڑ دی' وہ مجھے خونی نظروں سے گھورتا ہوا مائیکل کی طرف چلا گیا۔ میرے اشارے پر صفدر نے بھی دوسرے پہرے دار کی کنپٹی سے ریوالور ہٹا لیا اور اسے دور مائیکل کی طرف پھینک دیا۔

مائیکل نے اپنے مسلح کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ اوٹ میں سے نکل آئے۔ ان ہی میں سے ایک کارندے نے صفدر کا پھینکا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔ مائیکل دھیمی آواز میں اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایات دینے لگا۔ زریں کی گردن ابھی تک حلقے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کی طرف مائیکل سمیت کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

میں نے مائیکل کی توجہ زریں گل کی طرف مبذول کرائی اور کہا کہ اسے چھوڑا جائے۔ مائیکل نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور ہونٹوں پر کمینی سی مسکراہٹ سجا کر ہمارے قریب آگیا۔ "مجرم کو اس کے کیے کی سزا تو ملنی چاہیے۔" اس نے کہا۔

"دیکھو تم اپنے کہے سے پھر رہے ہو۔" میں نے کہا "ابھی تم نے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہیں ہوگی۔"

"لیکن یہ تو انصاف ہے۔ تمہارے اس ساتھی نے بار بار کی تنبیہہ کے باوجود ڈسپلن توڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب اگر اسے معاف کر دیا جائے گا تو پھر دوسرے بھی رعایتوں کے طلب گار ہوں گے۔"

"یہ بدعہدی ہے۔" صفدر نے کہا "جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ اگر آئندہ ایسا ہوا تو پھر ہم ذمے دار ہوں گے۔"

"یعنی تم اس کے لیے معافی کی درخواست کر رہے ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے کارندے کو اشارہ کیا۔ اس نے آہنی راڈ کا سرا دیوار کے کنڈے میں سے نکال دیا اور تانبے کا حلقہ ڈھیلا کر کے زریں کی گردن آزاد کر دی۔ زریں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر بلند آواز سے بولنا شروع کر دے گا۔ میں نے اس کا شانہ تھاما اور سختی سے ہدایت کی کہ وہ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالے گا۔

کچھ دیر بعد مائیکل اور اس کے ساتھی واپس چلے گئے۔ نیامی پہرے دار ہمیں مسلسل خوں خوار نظروں سے گھورتا

تھا' اس نے زریں گل کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ فحش اشارے کیے اور پھر ایک جھٹکے سے دروازے کا سلائیڈنگ تختہ چلا کر خلا بند کر دیا۔

زریں گل بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ آزاد ہوتا تو یقیناً سیاہ فام پہرے داروں سے بھڑ جاتا۔ ادھیڑ عمر نثار علی نے زریں گل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور سرگوشی میں بولا "خدا کے لیے خان صاحب! خود پر رحم کرو اور ہمارے اوپر بھی۔ بم کو ٹانگ مارنا کوئی بہادری نہیں ہوتی' یہ لوگ بم سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ جس پر غصہ کرتے ہیں' اس کے چیتھڑے اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔"

صفدر نے کہا "چلو ایک بات تو ثابت ہوئی۔ غزالہ اور کلثوم بھی جہاز پر ہیں۔"

"اس بات کے ثابت ہونے سے ہمارے ہاتھ پاؤں کچھ اور بندھ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

صفدر پُرسوچ لہجے میں بولا "اگر پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی میں موجود تمام افراد اس وقت جہاز پر ہیں تو ممکن ہے کہ سائیں عالی بھی یہیں ہو۔"

نیامی پہرے دار کے بھاری قدموں کی چاپ دروازے کے بالکل قریب محسوس ہونے لگی تو ہم بالکل خاموش ہو گئے۔

رات کافی ہو چکی تھی' تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب اپنے اپنے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کئی خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں بیک وقت خوشی اور غم چھپا ہوتا ہے' غزالہ کی جہاز پر موجودگی بھی ایک ایسی ہی خبر تھی۔ اس کے پابندِ سلاسل ہونے کا دکھ تھا اور اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ وہ لاپتا نہیں بلکہ ہماری ہم سفر ہے۔ اس رات بارہ ایک بجے کے لگ بھگ سیڑھیوں کی طرف سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جن سے اندازہ ہوا کہ کچھ اور قیدی جہاز میں سوار کیے جا رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد مردوں کی تھی تاہم کچھ عورتیں بھی تھیں۔ چند عورتوں کی فریادی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سیاہ فام پہرے داروں کی منت سماجت کر رہی تھیں۔ یہ آوازیں سن کر ہم پر انکشاف ہوا کہ جہاز پر سوار ہونے والے نئے قیدیوں کا تعلق انڈیا سے ہے۔ جو جتھے ہم تک پہنچے تھے وہ ہندی میں تھے۔ نئے آنے والوں کو اسی کیبن رات کے کسی حصے میں بھیج دیا گیا۔ قریباً دو گھنٹے تک چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان بدنصیب مسافروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا پھر خاموشی چھا گئی۔

رات گزر گئی اور اگلا دن بھی خاموشی سے گزر گیا۔ اس تمام عرصے میں ذہن کے اندر ان گنت سوال سر اٹھاتے رہے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہماری منزل کون سی ہے اور ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال بھی خاصا اہم تھا کہ غزالہ اور کلثوم کے بارے میں مائیکل کا بیان سچ ہے یا جھوٹ۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ غزالہ اور کلثوم بھی جہاز پر موجود ہیں لیکن یہ اس کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ہمیں اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے وہ اس قسم کے اور بھی کئی جھوٹ گھڑ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سوال یہ بھی پریشان کن تھا کہ اس وقت ہم کہاں لنگر انداز ہیں اور کب تک رکے رہیں گے۔

اگلے روز رات کو ایک بار پھر مجھے کیبن میں سے نکالا گیا۔ حسبِ سابق کیبن سے نکال کر مجھے پہلے ہتھکڑی لگائی گئی' پھر "ایل ایم جی" کے نشانے پر سیڑھیاں چڑھا کر عرشے پر لایا گیا۔ وہاں سے میں اس لگژری اپارٹمنٹ میں پہنچا جہاں مائیکل سے ملاقات ہوئی تھی۔ مائیکل ایک آرام دہ صوفے میں دھنسا ہوا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں معصوم صورت شائستہ بھی موجود تھی۔ اس نے ایک ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔ مائیکل کو بھی میں نے پہلی بار تھری پیس سوٹ کے علاوہ کسی اور لباس میں دیکھا۔ غیر متوقع طور پر اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شاید اس لباس کے ذریعے اس نے شائستہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ شائستہ۔۔۔ جو مائیکل کے بقول اس کی بیوی تھی۔ ایک جواں سال ملازمہ مائیکل اور شائستہ کے سامنے سے کافی کے برتن ہٹا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر مائیکل کی ساری توجہ مجھ پر مبذول ہو گئی۔ اس نے بڑے شائستہ لہجے میں شائستہ سے کہا "پلیز ڈارلنگ! تم ذرا اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔"

شائستہ فرمانبرداری سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ مائیکل نے مجھے خوش آمدید کہا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس مہذب شخص کو دیکھ رہا تھا اور یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہی "افریقہ کا وحشی آدم خور" بھی ہے۔ مائیکل کے اشارے پر خوش پوش ملازمہ نے کھڑکی پر سے پردہ ہٹا دیا اور باہر چلی گئی۔ کھڑکی سے باہر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہ ایک بڑی بندرگاہ تھی۔ کچھ فاصلے پر دو بڑے جہاز اور ان کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کھلے سمندر میں بھی کئی چھوٹی بڑی روشنیاں متحرک تھیں۔ یہ وہ چھوٹی کشتیاں اور لانچیں وغیرہ تھیں جو سمندر اور ساحل کے درمیان سفر کر رہی تھیں۔ ساحل سے آگے ایک عظیم الشان شہر کی روشنیاں دکھائی

دے رہی تھیں۔ سیکڑوں بلند عمارتیں اور ان کے اندر روشنیوں کے ہزار ہا نقطے' اور جلتے بجھتے نیون سائن۔ روشنیوں کی کئی ایک متحرک لڑیاں بھی نظر آتی تھیں۔ یہ شہر کی بارونق سڑکوں کی جھلک تھی۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم بمبئی میں ہیں۔"

مائیکل مسکرایا "مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو گے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اس شہر کے شناور ہو۔ اب ثبوت بھی مل گیا۔"

یہ شبہ تو مجھے پہلے سے ہی تھا کہ شاید ہم بمبئی یا رتناگری میں ہیں۔ اب میں بمبئی کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ ایک مشہور بندرگاہ' ہندوستان کا بہت بڑا تجارتی مرکز اور انڈین فلم انڈسٹری کا محور۔ یہ ہزار ہا قسم کے ہزار ہا انسانوں کا شہر تھا۔ یہاں عظیم الشان پلازوں کے سائے میں پھٹی پرانی جھونپڑیاں بھی نظر آتی تھیں اور بڑے بڑے ہندو سیٹھوں کی چمک دار گاڑیوں کے اردگرد کیچوؤں جیسے حقیر انسان بھی رینگتے تھے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" مائیکل نے مجھے چونکایا۔

"سوچ رہا ہوں کہ اس شہر جیسے شہر ہمیشہ غلام پیدا کرتے رہیں گے اور تم جیسے لوگ ان غلاموں کو جمع کرکے ہمیشہ انسانوں کی منڈیاں سجاتے رہیں گے۔ تمام تر تمدنی اور سائنسی ترقیوں کے باوجود شاید یہ سلسلہ رکنے میں نہ آسکے۔"

"میں نے تمہیں یہاں فلسفے کی کلاس لینے کے لیے نہیں بلایا' ایک کام سے بلایا ہے۔"

"کیسا کام؟"

"ایک ایسا کام جو عام شخص کے لیے مشکل ہو سکتا ہے لیکن تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کرکے اپنے لیے گلاس تیار کیا اور ڈرامائی لہجے میں بولا "میں تمہیں بمبئی بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے۔ تم تو پریشان ہوگئے۔ زیادہ دن کے لیے نہیں بھیجوں گا' صرف ایک دو روز کی بات ہے۔ اس کے بعد تم پھر اپنی جانِ جاناں کے پاس اس جہاز میں ہوگے۔"

"کس جانِ جاناں کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا تمہاری ایک سے زیادہ جانِ جاناں ہیں۔" وہ مسکرایا "اگر یہ بات لیڈی ڈاکٹر غزالہ کے کانوں تک پہنچ گئی تو انہیں پریشانی لاحق ہو جائے گی۔"

"کیا تم صاف سیدھے لہجے میں بکواس نہیں کر سکتے ہو؟"

مائیکل نے مائنڈ کیے بغیر وہسکی کا ایک گھونٹ بھرا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تم ان دو لڑکیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو جو رجب کے گھر سے دوسرے بائیس عدد بردوں کے ساتھ برآمد ہوئی تھیں۔ گہرے سیاہ بالوں اور براؤن آنکھوں والی وہ دونوں لڑکیاں میرے لیے بہت اہم تھیں' ان کی حیثیت آرڈر کے مال کی سی تھی۔"

"لیکن یہاں ان لڑکیوں کا ذکر کیسے آگیا۔ وہ تو لاہور میں پولیس کسٹڈی میں ہیں؟"

"تمہارے ملک میں جو چیز پولیس کسٹڈی میں ہو وہ کہیں بھی پہنچ سکتی ہے۔ عالمِ بالا میں بھی۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"وہ دونوں لڑکیاں اس وقت بمبئی میں ہیں۔ کیسے اور کن ہاتھوں سے ہو کر یہاں پہنچی ہیں' میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر کہاں اور کس کے پاس ہیں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری اطلاعات کے مطابق پولیس نے احاطہ کچہری سے لڑکیوں کے فرار کا ڈراما رچایا تھا اور ان کے پیسے کھرے کیے تھے۔ اس کے بعد وہ کسی اسمگلر کے ذریعے انڈیا آگئیں۔ اب وہ بمبئی میں ایک اور مغویہ لڑکی کے ساتھ موجود ہیں۔ جس شخص کے پاس وہ موجود ہیں اس کا نام سن کر شاید تمہیں جھٹکا لگے گا۔ اس کا نام بسواجیت چاپر ہے۔"

بسواجیت چاپر کا نام سن کر میں واقعی چونک گیا۔ میں بمبئی کے اس نامی گرامی نوجوان غنڈے کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس شخص کو شنکر شکرا کا دستِ راست بھی کہا جا سکتا تھا۔ بسواجیت چاپر سے کچھ عرصہ پہلے انڈیا میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ چاپر درحقیقت ایک نہایت امیر کبیر خاندان کا فرد تھا۔ اس نے جرائم کا راستہ صرف تفریحِ طبع کے لیے اختیار کیا تھا ورنہ اس کے صنعت کار باپ کے پاس اتنی دولت موجود تھی کہ چاپر کی کئی نسلیں بغیر کچھ کیے عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتی تھیں۔ درحقیقت بمبئی کے کئی نامی گرامی مجرموں کی طرح بسواجیت چاپر بھی اسٹوڈنٹس پالیٹکس کی پیداوار تھا۔ وہ ایک بڑے کالج کی یونین کا صدر رہا تھا۔ وہیں سے اس ہونہار سپوت پر شنکر شکرا کی جوہر شناس نگاہ پڑی۔ بسواجیت کا دل ایک بڑے فوجی افسر کی خوب صورت بیوی پر آیا ہوا تھا۔ شنکر شکرا نے بسواجیت کی خاطر اس بلرام سنگھ نامی افسر کو قتل کر ڈالا اور لڑکی کو بسواجیت کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس واقعے کے بعد بسواجیت دل و جان سے شنکر شکرا کی شاگردی میں آگیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا دستِ

راست بن گیا۔ اب اس مال بردار جہاز کے لگژری اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر مائیکل مجھے بتا رہا تھا کہ لاہور سے لاپتا ہونے والی لڑکیاں بمبئی شہر میں بسواجیت کے قبضے میں ہیں۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" مائیکل نے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ جھوٹ واقعی بہت بڑی لعنت ہے۔ جھوٹے بندے کے منہ سے سہواً سچی بات بھی نکل جائے تو اس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"غالباً تم میری بات پر یقین نہیں کر پا رہے ہو!"

میں نے کہا "اگر یقین کر بھی لوں تو یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ تم نے مجھے یہاں طلب کیوں کیا ہے اور مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو۔"

وہ بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم بسواجیت سے ڈیل کرکے ان لڑکیوں کو یہاں جہاز میں لاؤ۔"

"یہ شبھ کام کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔ تم بہتر طور سے کر سکتے ہو۔ تم اس شہر کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کے علاوہ شنکر شکرا اور اس کے ساتھیوں سے نبرد آزما ہونے کا طویل تجربہ تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں اور خطرناک لوگوں سے نمٹنے کا حق دار تم سے بڑھ کر اور کون ہوگا۔"

میں نے کہا "میں یہ حق تمہیں دیتا ہوں۔۔۔ اس کے علاوہ تمہاری خطرناکی اور خوں خواری کو بھی سلام پیش کرتا ہوں۔"

"طنز مت کرو ڈیئر۔" وہ مسکرایا "اس وقت جہاز میں میری حیثیت کپتان کی سی ہے' میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بمبئی میں بھی میں ویسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا جیسا تم کر سکتے ہو۔"

"شاید تمہیں معلوم نہیں' میں عرصہ تین سال سے نہایت شدت کے ساتھ انڈین پولیس اور دیگر ایجنسیوں کو مطلوب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بمبئی میں داخل ہوتے ہی میں پہچانا جاؤں۔ ایسی صورت میں تمہارا یہ جہاز بھی اپنے تمام بردوں کے ساتھ قانون کی گرفت میں آسکتا ہے۔"

"یہ سب میرے سوچنے کی باتیں ہیں' تمہارے سوچنے کی نہیں۔ تمہارے سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ تم بسواجیت اور اپنے دیگر "دوستوں" کے ساتھ کس طریقے سے ڈیل کرتے ہو اور ان لڑکیوں کو کتنی جلدی جہاز میں لاتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہم زیادہ دیر بندرگاہ میں نہیں رک سکتے۔ تم جتنی جلدی لڑکیوں کو لے آؤ گے' ہم اتنی ہی جلدی یہاں سے روانہ ہو سکیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میری یادداشت خاصی کمزور ہے۔ میں اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔"

"جب تم کچھ بتانا نہیں چاہتے ہو تو یادداشت کو بیچ میں گھسیٹ لیتے ہو۔"

"جب تمہیں معلوم ہے تو پھر کیوں اصرار کرتے ہو؟"

"اچھا اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟ میرا مطلب ہے کہ جہاز سے اتر کر شہر جانے سے انکار کر دوں تو؟"

"تم کر ہی نہیں سکتے۔ میں اس سلسلے میں پوری ریسرچ کر چکا ہوں۔ اپنے دوست تمہیں جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ انہی دوستوں کی خاطر تم کچھ عرصہ قبل لاہور میں ایک ایسا کام کرنے پر مجبور ہوگئے تھے جو واقعی نہایت دشوار تھا۔ امارات کے ایک شیخ نے تمہارے دو دوستوں اور ان کی بیویوں کو یرغمال بنایا تھا' ان یرغمالیوں کی باعزت رہائی کی خاطر تم اپنی اکلوتی بہن کا رشتہ اپنے ایک دشمن سے کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ سچ پوچھو تو میں نے بھی اماراتی شیخ کا راستہ اپنانے کی ہی کوشش کی ہے۔"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"بالکل دھمکی دے رہا ہوں اور اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ بھی رکھتا ہوں۔" مائیکل کا لہجہ ایک دم سنگین ہو گیا تھا' وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا "میں تمہیں پھر آگاہ کرتا ہوں کہ تمہاری لیڈی ڈاکٹر غزالہ' اس کالے پالک بچہ تالی اور کلثوم نامی لڑکی میرے قبضے میں ہیں اور اسی جہاز پر ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق بمبئی جانے سے انکار کیا یا وہاں جاکر کسی طرح کی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھیوں کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ یاد رہے کہ تمہارے ساتھیوں میں صفدر اور وہ کابلی خاں بھی شامل ہیں۔"

مائیکل کے لہجے میں ہراساں کر دینے والی سنجیدگی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ ہو اور میں انسانی لباس میں چھپے ہوئے اس درندے کی گردن دبا سکوں۔ "بمبئی جانے اور بسواجیت سے ملنے" کے موضوع پر میرے اور مائیکل کے درمیان تادیر گفتگو ہوئی۔ وہ دونوں لڑکیاں مصدقہ اطلاعات کے مطابق بسواجیت چاپر کے پاس تھیں۔ بمبئی پورٹ پر لنگر انداز ہونے کے بعد مائیکل کے کارندوں نے بسواجیت سے رابطہ کیا تھا اور لڑکیوں کی واپسی پر بات کی تھی لیکن بسواجیت اڑ گیا تھا۔ وہ لڑکیاں واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکیاں میری ملکیت

ہیں' چاہے میں انہیں پچاس روپے میں بیچ دوں' چاہے پچاس لاکھ میں بھی نہ بیچوں۔ دراصل بسواجیت دل پھینک قسم کا بندہ تھا۔ خوب صورت عورتوں کی اسے تلاش رہتی تھی۔ لڑکیاں اسے پسند آگئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کے بدلے میں اس نے مائیکل کی آفر کی ہوئی ایک بڑی رقم ٹھکرا دی تھی۔ دوسری طرف مائیکل کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہر قیمت پر لڑکیوں کو اپنے "سامان" میں شامل کرکے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لڑکیوں اور بسواجیت کے ذکر پر مائیکل کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ بولا "تم نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا۔۔۔ ایک بڑھیا نے اپنے بیٹے کی طرف سے ایک ایسی نایاب مینا کا تحفہ وصول کیا تھا جو کئی زبانوں میں گانے گاتی تھی اور کہانیاں سناتی تھی۔ نادان بڑھیا مینا کو پکا کر کھا گئی تھی۔ کچھ یہی حال اس بسواجیت کا ہے۔ وہ بڑھیا والا کردار ادا کررہا ہے۔ ان لڑکیوں کی قدر و قیمت سے بے خبر ہے اور چند راتیں ان کے ساتھ سو کر انہیں بے کار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بے وقوف' جاہل انڈین۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن تم تو لڑکیوں کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ ہو' تم ان کی قیمت کیوں نہیں بڑھا دیتے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ہر چیز قابلِ فروخت ہوتی ہے' صرف بیچنے والے کو اس کی قیمت ملنی چاہیے۔"

"اسی لیے تو اس انڈین کو بے وقوف اور جاہل کا خطاب دے رہا ہوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ ایک بگڑا تگڑا رئیس زادہ ہے۔ ضد پر آگیا ہے۔ کہتا ہے کہ کسی بھی قیمت پر لڑکیاں حوالے نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک انڈین کی سائیکی کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو اور اس شخص کو تو تم ویسے بھی اچھی طرح پہچانتے ہو۔ اس سے ڈیل کرو۔ کوشش کرو کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آئے' نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکال لو۔ بہرحال لڑکیاں ہر صورت میں ملنی چاہئیں اور "صحیح سالم" حالت میں ملنی چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔ لڑکیوں کی دوشیزگی برقرار رہنی چاہیے ورنہ ان کی اصل قیمت کا عشرِ عشیر بھی نہیں مل سکے گا۔"

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی۔" میں نے کہا "یہ لڑکیاں تو پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے رجب کے پاس تھیں۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ یہ تمہارے لیے آرڈر کا مال ہیں۔"

"یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں پیارے۔ یہ لڑکیاں کراچی کے اسحاق جالندھری نے میرے ہی لیے حاصل کی تھیں۔ اسحاق جالندھری پر چھاپا پڑگیا اور یہ لڑکیاں دوسرے بندے کے پاس چلی گئیں جس کا نام تم رجب بتا رہے ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہے۔ اب یہ پھر ہمارے پاس آجائیں گی۔"

"بہت بھروسا ہے تمہیں؟"

"مجھے تم پر بھروسا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام چٹکی بجاتے کرگزرو گے۔"

"اس کے بدلے مجھے کیا حاصل ہوگا؟"

"تم سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو ڈیئر۔ پھر بھی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے بہتر سلوک کیا جائے گا۔"

"اس بہتر سلوک کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرسکو گے؟"

"کیا مطلب؟"

"میں اپنی ساتھی لڑکیوں غزالہ اور کلثوم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مائیکل نے ایک گہری سانس لی' پھر اس کے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی "اس دوسری لڑکی کا نام تو تم نے یونہی لیا ہے' درحقیقت تم لیڈی ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہو۔" وہ آنکھ میچ کر بولا۔

"چلو جو بھی سمجھ لو۔"

"ٹھیک ہے' ابھی تھوڑی دیر میں اس کا انتظام کردیتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا' اپنے ساتھ چالاکی کرنے والے کو میں اکثر ایک بہت سرد مقام پر بھیج دیتا ہوں۔ وہاں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کئی درجے نیچے ہوتا ہے اور جگہ۔۔۔ جگہ تو اتنی تنگ ہوتی ہے کہ بندے کو ٹکڑوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مائیکل معنی خیز انداز میں ڈیپ فریزر کا ذکر کررہا تھا اور مجھے وہ منظر یاد دلا رہا تھا جو میں نے پروفیسر کے گھر کے تہ خانے میں دیکھا تھا۔

اسی دوران میں اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی "کم اِن" مائیکل نے کہا۔ فربہ جسم کی ایک یورپین ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

اس نے انگلش میں کہا "سر! پروفیسر صاحب پھر آئے ہیں' کہتے ہیں کہ مسز شائستہ سے ملنا ہے۔"

مائیکل کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی۔ دبی آواز میں بولا "ایک تو اس بڈھے نے ناک میں دم کردیا ہے۔" پھر ملازمہ سے مخاطب ہوکر کہا "جاؤ اس سے کہہ دو کہ وہ ابھی سو رہی ہے۔ صبح آکر مل لے۔"

کسی اندرونی کمرے سے شائستہ کی مدھم آواز آئی "کون ہے مائیکل؟"

"تمہارے مطلب کی بات نہیں ڈارلنگ۔" مائیکل نے قدرے نرمی سے کہا پھر ابرو کے اشارے سے ملازمہ کو ہدایت کی کہ وہ باہر چلی جائے۔

ملازمہ چلی گئی۔ میں نے کہا "یہ ظلم کیوں کررہے ہو مائیکل؟"

وہ بولا "تمہیں تو یہاں ہر طرف ظلم ہی ظلم نظر آتا ہے اور میں شاید دنیا کا ظالم ترین شخص۔۔۔ جس کا نام جلد از جلد گنیز ریکارڈ بک میں درج ہونا چاہیے۔"

"آئیڈیا کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے۔"

وہ مسکرایا "اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ تم فی الحال اپنی جانِ جاناں سے مل لو۔ اس کے بعد میں تمہیں تمہارے کام کے بارے میں ضروری ہدایات دوں گا۔"

اس نے بیل بجائی۔ دیوہیکل خیامی گن سونتے اندر داخل ہوگیا۔ اس کی موٹی بھدی سیاہ انگلی بڑے خطرناک انداز میں ہر وقت ٹریگر پر رہتی تھی۔ سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میرے عقب میں چلتے چلتے خیامی کو کہیں ٹھوکر بھی لگ جائے تو ایل ایم جی کے منہ سے موت کا قہقہہ بلند ہوجائے۔

دونوں پہرے دار مجھے لے کر زیریں عرشے پر آئے۔ تھوڑی دیر مجھے ایک نشست گاہ میں بٹھایا گیا۔ نشست گاہ میں میری الٹی ہتھکڑی کھول دی گئی پھر وہاں سے سیدھا ایک ایسے اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا جہاں غزالہ ایک سالہ بچے محمد ثانی کے ساتھ موجود تھی۔ غزالہ شلوار قمیص میں تھی۔ چہرے کی کھلی کھلی رنگت اور بالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی نہا کر نکلی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور تحیر کے ملے جلے آثار تھے۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا "مجھے یقین تھا کہ آپ۔۔۔ اس جہاز میں موجود ہیں لیکن ان لوگوں میں سے کوئی بتاتا نہیں تھا۔"

"تم خیریت سے تو ہو نا۔۔۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور آپ؟" وہ بولی۔

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ زریں گل اور صفدر بھی یہیں موجود ہیں۔ زریں گل کلثوم کے لیے بہت پریشان ہے۔"

"کلثوم بھی قیدی عورتوں میں شامل ہے۔" غزالہ نے اطلاع دی۔

"کہاں ہیں وہ عورتیں؟"

"جہاز کے نچلے حصے میں۔ وہاں جانے کے لیے چور راستہ استعمال ہوتا ہے۔ چاول کی بہت سی بوریوں کے درمیان یہ ایک خفیہ راستہ ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ غزالہ کس راستے کی بات کررہی ہے۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "باقی عورتیں وہاں ہیں تو تم یہاں کیوں ہو؟"

"جہاز کا وائس کپتان ایک اٹالین ہے۔ فلیمنگ نام ہے اس کا۔۔۔ چند دن پہلے وہ ایک دم بیمار ہوگیا۔ میں نے اسے دوا وغیرہ دی۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اسی نے مائیکل سے میری سفارش کی تھی اس سفارش کے نتیجے میں مجھے یہ علیحدہ رہائش دی گئی ہے۔ جہاز کے ملازمین میں سے تین چار افراد بیمار ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کررہی ہوں۔ پرسوں میں نے مائیکل سے کہا تھا کہ کلثوم کو بھی میرے پاس یہاں اپارٹمنٹ میں منتقل کردیا جائے۔ وہ نیم رضامند نظر آرہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آج کل میں کلثوم بھی یہاں آجائے۔"

"کل کتنی عورتیں ہیں یہاں؟"

"جس کیبن میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں کلثوم کے علاوہ آٹھ لڑکیاں اور عورتیں مزید تھیں۔ اس کے علاوہ بھی یہاں عورتیں موجود ہیں۔ وہ کچن میں کام کرتی ہیں اور لانڈری وغیرہ کا کام بھی ان سے لیا جاتا ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ ان کے ساتھ یہاں اچھا سلوک ہوتا ہوگا۔ تین روز پہلے جب جہاز یہاں بندرگاہ پر رکا تھا تو امیگریشن' کسٹم اور ہیلتھ ڈپارٹمنٹس کے افسران معائنے کے لیے جہاز پر آئے تھے۔ اس وقت کام کرنے والی ان عورتوں کو جہاز کے زیریں حصے میں چھپا دیا گیا تھا۔ یہ افسران کچھ دیر جہاز پر ٹھہر کر اور پرتکلف کھانا کھا کر واپس چلے گئے تھے۔ انہوں نے جہاز کے تفصیلی معائنے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

میرے اور غزالہ کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ غزالہ کو بھی چند روز پہلے ہماری طرح اس جہاز پر ہی ہوش آیا تھا۔ غزالہ کی اتری ہوئی کلائی اب ٹھیک تھی۔ سر کی چوٹ کا بھی مدھم سا نشان ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ اب تک ہم سب کے بارے میں بے حد پریشان تھی۔ میں نے غزالہ کو اپنے اور ساتھیوں کے حالات کے بارے میں بتایا۔ غزالہ بھی یہ جان کر حیران ہوئی کہ پروفیسر اللہ دتا کی اکلوتی بیٹی شائستہ مائیکل کے اپارٹمنٹ میں رہ رہی ہے اور مائیکل اسے اپنی بیوی بتا رہا ہے۔

ننھا ثانی اب پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ اس کے سانولے

چہرے پر رونق اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا پھر اس نے حسبِ سابق میری آنکھ میں انگلی چبھونے کی کوشش شروع کردی۔ پتا نہیں یہ اسے کیا لت پڑ گئی تھی۔ اس کی یہ ادا واقعی بڑی پیاری لگتی تھی۔ جس دوران میں' میں غزالہ سے باتیں کر رہا تھا وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف تھا' غزالہ بار بار اسے منع کر رہی تھی' آخر اس نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ذرا غصے سے بولی "کیا کرتے ہو تابی؟"

وہ بھی ایک چنچل تھا۔ اس نے غزالہ کے بال اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑے اور قریباً لٹک سا گیا۔ غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بال چھڑانے کی کوشش میں دہری ہو گئی۔ وہ اسے پکارنے لگی "پلیز تابی۔۔۔ پلیز۔" وہ اس کی مٹھیاں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر زیادہ زور بھی نہیں لگا رہی تھی۔ یہ کشمکش دلچسپ تھی' بہرحال غزالہ نے بال چھڑائے اور تابی کو گود میں دبوچ کر بیٹھ گئی۔ دانا سچ کہتے ہیں کہ بڑوں کی محفل میں صرف ایک بچہ بھی چلا جائے تو پوری محفل بارونق اور جاندار ہو جاتی ہے۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے غزالہ کے چہرے پر جو گہری سنجیدگی چھائی رہتی تھی اس میں معصوم تابی بار بار رخنہ ڈال رہا تھا۔ میری طرح غزالہ کے ذہن میں بھی موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے بہت سے سوالات تھے۔ ہماری منزل کیا تھی؟ وہاں ہمیں کس مقصد سے لے جایا جا رہا تھا؟ کیا کسی طرح اس چنگل سے نکلا جا سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

تابی تھوڑی دیر بعد غزالہ کی گود سے کھسک کر پھر میرے پاس آگیا۔ کچھ دیر انگلیاں کرتا رہا تب اس نے دوبارہ وہی مشغلہ شروع کردیا۔ اپنی ننھی ننھی بے ضرر انگلیوں سے میری آنکھ چبھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس کے ہاتھ تھامتا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتا۔ اب وہ مجھے سچ مچ پیارا لگنے لگا تھا۔ وہ زیادہ خوب صورت تو نہیں تھا لیکن اس کے سانولے چہرے میں کوئی ایسی کشش تھی جو دل کو کھینچتی تھی۔ وہ جب زیادہ بے تکلف ہونے لگا تو غزالہ کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔ وہ بولی "آپ اسے پیچھے کیوں نہیں ہٹا دیتے' آنکھ چبھو دے گا آپ کی۔"

میں نے کہا "بچے کو سختی سے منع کرنا اچھا نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ بدتمیزی کر رہا ہے۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے بال بھی تو پکڑے تھے اس نے' تم نے سختی سے منع کیوں نہیں کیا؟"

"میری بات اور ہے لیکن دوسروں سے ایسا کرے گا تو۔۔۔"

"یعنی میں دوسرا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی "نہیں کب تک میں دوسرا ہی رہوں گا۔"

وہ ایک دم چونک کر خاموش ہو گئی۔ فضا اچانک بوجھل سی ہو گئی تھی۔ ہم کتنی ہی دیر چپ بیٹھے رہے۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی تابی کی کلکاری گونج جاتی تھی۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے ایک دو روز جہاز سے باہر رہنا پڑے گا' شہر میں کوئی کام ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتوار تک آجاؤں گا۔"

"کیا مائیکل آپ کو جانے دے گا؟"

"مائیکل ہی کا کام ہے۔"

"کوئی خطرناک کام ہوگا؟"

"نہیں کچھ ایسا خطرناک بھی نہیں۔"

"شاید وہ آپ کو بلیک میل کر رہا ہے؟"

"فی الحال ہم اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

ننھا تابی غزالہ کی گود میں مچلنے لگا اور توتلی زبان میں ناقابلِ فہم الفاظ بولنے لگا۔ ان میں ایک آدھ لفظ اردو کا بھی سنائی پڑتا تھا۔ غزالہ بولی "کہہ رہا ہے کہ آپ مت جائیں۔"

یہ الفاظ غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہے تھے۔ شاید اسے بھی فضا کی سنجیدگی اور بوجھل پن کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے تابی کو گود میں اٹھا کر تھوڑا سا پیار کیا۔

وہ پھر کوئی لاطینی قسم کی زبان بولنے لگا "یہ اب کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

وہ بولی "گونگے کی رمز گونگے کی ماں ہی جان سکتی ہے۔"

میں نے لمبی آہ بھر کر کہا "اور گونگے کی ماں کی رمز کون جانے گا؟"

آواز مدھم تھی۔ غزالہ تک نہیں پہنچ سکی۔ وہ بولی "کیا کہا ہے آپ نے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر سرخ رنگ سا لہرا گیا "کچھ تو کہا ہے۔"

"بس یہی سوچ رہا تھا کہ۔۔۔ اگر تابی والی بات تم نے کہی ہوتی تو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے جانے سے روکا ہوتا۔"

اس کی پلکیں جھک گئیں اور چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ معلوم نہیں یہ ناراضگی کی سرخی تھی یا شرم کی یا پھر دونوں کی۔ میں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

باہر گن بردار غلامی موجود تھا۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر واپس اسی کیبن میں لے آیا جہاں میں اور صفدر اپنے دیگر

آٹھ ساتھیوں کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ صفدر بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے شروع سے آخر تک اسے تمام بات بتائی۔ ہم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ زریں گل بھی گاہے گاہے اس گفتگو میں شریک ہوتا رہا۔

اگلے روز سہ پہر کے بعد مائیکل نے مجھے دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں طلب کیا۔ وہ حسبِ معمول تھری پیس سوٹ میں تھا اور بڑے ٹھاٹ سے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایک موالی قسم کا بندہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خالص بمبئی کا رہائشی لگتا تھا۔ جیکٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جیکٹ کے نیچے سرخ رنگ کی ڈبی دار قمیص تھی۔ گلے میں رومال اور سر پر ٹوپی تھی۔ اس نے بال بڑے فلمی اسٹائل میں بنا رکھے تھے اور بڑے ایکشن کے ساتھ بات کرتا تھا۔ مائیکل نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا "اس کا نام رمیش عرف ہیرو ہے۔ یہ بمبئی میں میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہے۔ یہ شہر میں ساری اونچ نیچ سے واقف ہے اور ہمارے مارکٹ کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ میرا مطلب بسواجیت چاپر کے موجودہ ٹھکانے سے ہے۔ اس نے تصدیق کر رکھی ہے کہ دونوں لڑکیاں چاپر کے پاس ہیں اور اس کی رہائش گاہ پر موجود ہیں۔ رمیش تمہارے لیے شہر میں سواری اور رہائش کا انتظام کرے گا اور اس کے علاوہ بھی جس طرح کی مدد کی ضرورت ہوگی یہ بہم پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

میں نے رمیش نامی اس جواں سال شخص سے چند باتیں کیں۔ وہ بولتا بھی فلمی اسٹائل سے تھا۔ مجھے یہ انداز کچھ جانا پہچانا لگا۔ غور کیا تو پتا چلا کہ یہ مشہور انڈین اداکار ششی کپور کا انداز ہے۔ موصوف کی شکل میں بھی تھوڑی بہت ششی کپور کی جھلک پائی جاتی تھی۔ یقیناً وہ بزعم خود اپنے آپ کو ششی کپور ہی سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسے ہیرو کا خطاب ملا ہوا تھا۔

"ششی کپور" کا تعارف کرانے کے بعد مائیکل نے اسے باہر بھیج دیا اور مجھے اس "ڈیل" کے متعلق بتانے لگا جو میں نے بسواجیت چاپر سے کرنا تھی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے بہر صورت لڑکیاں چاپر سے حاصل کرنا تھیں۔ اس سلسلے میں' میں اسے اپنی صوابدید کے مطابق پچاس ہزار سے لے کر دس لاکھ تک کوئی بھی رقم آفر کر سکتا تھا۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلتا تو میں انگلیاں ٹیڑھی بھی کر سکتا تھا۔ اس صورت میں مجھے آزادی تھی کہ میں آٹھ دس بندے پار کر دیتا اور اگر ضروری سمجھتا تو خود بھی خراماں خراماں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملتا۔۔۔ مائیکل کو فقط لڑکیوں سے غرض تھی۔ مائیکل نے میرے لیے ایک رائفل کا انتظام بھی کیا تھا' یہ رائفل فی الوقت رمیش کی تحویل میں تھی۔

مائیکل کی پوری بات سننے کے بعد میں نے اس کے سامنے صرف ایک شرط رکھی۔ میں نے کہا کہ میرا ساتھی صفدر میرے ساتھ جائے گا۔ تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ مائیکل نے یہ بات مان لی۔

○☆○

رات کے نو بجے تھے جب میں اور صفدر "ہیرو" کے ساتھ جہاز سے نیچے اترے تو جہاز کھلے سمندر میں کھڑا تھا۔ نیچے اترنے کے لیے رسے کی سیڑھی استعمال کی گئی۔ اس سیڑھی نے ہم تینوں کو ایک ڈونگے میں پہنچا دیا۔ ڈونگے کا انجن اسٹارٹ تھا' ہمارے بیٹھتے ہی وہ کنارے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاز سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر ہم نے جہاز کا نام اس کے پہلو پر لکھا دیکھا۔ جہاز کا نام "ہرکولیس" تھا۔ ہمارے اردگرد بہت سے جہازوں' اسٹیمروں اور لانچوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کوسٹ گارڈز کی ایک لانچ شور مچاتی ہمارے قریب سے بھی گزری مگر کسی نے ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ جلد ہی ہم کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ "ہیرو" بڑی ہوشیاری سے ہمیں پورٹ سے نکال لے گیا۔ صرف ایک جگہ دو افراد نے ہمیں روکا۔ غالباً ان کا تعلق امیگریشن سے تھا۔ ہمارے "ہیرو" نے قریباً ایک منٹ ان سے کھسر پھسر کی اور انہوں نے بلا تامل ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ یقیناً یہ پورٹ کے ان کرپٹ افسران میں سے تھے جو جہاز رانوں سے تحفے تحائف لے کر ہر قسم کے معاملات کی طرف سے آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ٹیکسی اسٹینڈ پر موجود تھے' تاہم ہیرو نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بجائے ایک پبلک بوتھ سے فون کیا اور چند منٹ بعد اچھی حالت کی ایک بل مین کار ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی۔ ہیرو نے ششی کپور کے انداز میں اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کے استعمال کے لیے ہے چیف۔۔۔ یہ لیجیے چابی۔"

اس نے چابی میری طرف بڑھا دی اور میرے لیے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ صفدر نے میری طرف دیکھ کر ستائشی انداز میں بھویں اچکائیں۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی' صفدر ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہیرو بڑے ایکشن سے جھک کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ جو شخص گاڑی لے کر آیا تھا وہ وہیں پورٹ پر رہ گیا۔ میں اور

صفدر پینٹ قمیص میں تھے' صفدر نے جیکٹ اور میں نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ براؤن رنگ کا منحوس کرتہ پائجامہ ہم وہیں جہاز پر اتار آئے تھے۔ مائیکل کی طرف سے ہم دونوں کو کولٹ پسٹل فراہم کیے گئے تھے۔ دونوں پسٹل کے وافر راؤنڈ بھی ہمارے پاس موجود تھے۔ وقت رخصت آٹھ ہزار کے کرنسی نوٹ بھی مائیکل نے میری جیب میں ڈال دیے تھے۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے ہیرو سے پوچھا۔

"مالا بار ہل۔" اس نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا "میرے خیال میں اپن کو راستہ بتانے کی جرورت تو نہیں۔ آپ اس شہر کو جانتے ہی ہیں۔"

"شہر کو بھی جانتا ہوں اور شہر کے لوگوں کو بھی۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا نٹھی ہو۔"

"ج... جی ہاں۔"

"پھر ہندی کیوں بولتے ہو۔ میرا نٹھی کیوں نہیں بولتے؟"

اس نے شستی کپور کے انداز میں منہ ٹیڑھا کیا "بس جی عرصہ ہوگیا بمبئی میں رہتے ہوئے اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ہندی زبان ہر دوسری زبان کو کھا جاتی ہے۔"

ہم شہر کے مغربی حصے سے گزرتے ہوئے مالا بار ہل کی طرف جا رہے تھے۔ جونہی ہم نے نہرو پارک کی طرف جانے والی سڑک کراس کی' "ہیرو" نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وڑی یہ رہا آپ کا ہوٹل۔ یہاں فلور نمبر ایک میں دو ڈبل بیڈ کمرے آپ دونوں کے لیے ریزرو ہیں۔ کمرا نمبر بیس اور اکیس۔ یہ رہیں کمروں کی چابیاں۔" اس نے دو چابیں صفدر کی طرف بڑھا دیں۔

میں نے کہا "تم نے کمرے تو ایسے ریزرو کرائے ہیں جیسے ہم یہاں پندرہ دن کے تفریحی دورے پر ہیں۔ بھائی میرے... ہمیں زیادہ سے زیادہ دو دن یہاں رکنے کی اجازت ملی ہے اور اگر کام اس سے پہلے ہوگیا تو پہلے ہی واپس جانا ہوگا۔"

"اپن نے فی الحال بکنگ بھی دو دن کی کرائی ہے جناب... بھگوان کرے آپ کا کام آج ہی ہو جائے لیکن اگر کوئی اندھیر سویر ہوگئی تو پھر رکنا تو پڑے گا۔ مائیکل صاحب ہر صورت چھوکریوں کو جہاز پر دیکھنا مانگتے ہیں۔"

"تم اتنے وشواس سے کیسے کہتے ہو کہ چھوکریاں چاپر کی رہائش گاہ پر ہی ہیں؟"

"اس کی تفصیل میں جانے کا ٹائم نہیں ہے جناب... مگر اپن آپ کو پوری گارنٹی دیتا ہے کہ دونوں بلکہ تینوں لڑکیاں اس وقت چاپر کی کوٹھی پر ہیں۔"

صفدر نے چاپر کی کوٹھی کا محل وقوع دریافت کیا اور اس سلسلے میں دیگر باتیں "ہیرو" سے پوچھیں۔ معلوم ہوا کہ دشمن داری کے سبب چاپر کی کوٹھی پر حفاظت کے سخت انتظامات ہیں۔ اصل عمارت کے چاروں طرف کھلا احاطہ ہے اور اس احاطے کو چودہ پندرہ فٹ اونچی چار دیواری سے محفوظ کیا گیا ہے۔ چاپر کے مسلح کارندے ہر وقت چار دیواری کے اندر اور باہر پہرا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پولیس کے مستقل گارڈ کا انتظام بھی ہے۔ چاپر کے بارے میں معلوم ہوا کہ آج کل وہ گاڑیاں بدل بدل کر سفر کرتا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ہر وقت بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوتا ہے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے "ہیرو" کے لہجے میں خفیف سی لرزش آگئی تھی۔ یہ لرزش اس بات کی گواہ تھی کہ وہ بسواجیت چاپر کی طاقت اور حیثیت سے بری طرح مرعوب ہے۔

کچھ دیر گاڑی میں خاموشی رہی پھر ہیرو نے پوچھا "وڑی آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے' اپن کا مطلب ہے کہ چاپر صاحب سے کیسے ملنا ہے۔ وہ اپوائنٹ منٹ کے بغیر کسی سے ملتے نہیں ہیں... اور اگر کسی چال کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہونا ہے تو بھی اچھی طرح منصوبہ بندی کر لینی چاہیے۔"

میں نے کہا "تم بے فکر رہو۔ ہم صاف سیدھے طریقے سے کوٹھی میں داخل ہوں گے اور بغیر کسی اپوائنٹ منٹ کے ہوں گے۔"

"شاید چاپر صاحب سے آپ کا دوستی کا رشتہ ہے!"

"دوستی کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط رشتہ ہے۔ دشمنی کا رشتہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہیرو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ بہرحال مزید کوئی سوال پوچھنے کی اسے جرأت نہیں ہوئی۔ باقی کا سفر قریباً خاموشی سے ہی طے ہوا۔ ہم مالا بار ہل پہنچے اور پھر ہیرو کی ہدایات کے مطابق ایک ماڈرن آبادی میں پہنچ گئے۔ یہاں کوئی کوٹھی بھی تین چار کنال سے کم نہیں تھی۔ غالباً اس آبادی کا شمار بمبئی کی امیر ترین آبادیوں میں ہوتا تھا۔ پانچ چھ کنال کی ایک شان دار کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ہم رکے۔ پُرشکوہ گیٹ پر دو مسلح چوکی داروں نے ہمیں روکا۔ انہوں نے اوپر سے نیچے تک جگر پاش نظروں سے ہمارا معائنہ کیا۔ میں نے ذرا تند لہجے میں کہا۔

"جاؤ... چاپر سے کہو استاد جہانی تم سے ملنے آیا ہے۔"

"استاد جہانی۔ کون استاد جہانی؟" ایک چوکی دار نے کہا۔

"تیرا باپ استاد جہانی؟" میں نے سختی سے جواب دیا

"جاؤ' جو کچھ کہا گیا ہے وہ کرو۔"

چوکی دار جو شکل سے ہی آکڑ خاں لگتا تھا' ایک دم غصے سے سرخ ہوگیا۔ اپنے غصے پر قابو پاتا ہوا اور مجھے گھورتا ہوا وہ اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے مؤدب لہجے میں کہا کہ ہم اپنا اسلحہ اس کے حوالے کردیں۔ جب ہم لوٹیں گے تو اسلحہ واپس کردیا جائے گا۔

میں نے صفدر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے اپنے ہتھیار چوکی دار کو دے دیے۔ دوسرے چوکی دار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی پورچ میں پہنچی تو وہاں اپنی شان دار کار کے پہلو میں چاپر خود ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہوگیا تھا۔ سرخ و سپید چہرے پر رعونت اور سفاکی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گلے میں سونے کی چین' ہاتھوں میں نہایت بیش قیمت انگوٹھیاں' وہ شکل و صورت سے ہی ایک بگڑا تگڑا خطرناک رئیس زادہ نظر آتا تھا۔

"آؤ استاد جہانی' تم نے تو ایک دم حیران کردیا۔"

"کیوں' میں قطب شمالی میں تو نہیں رہتا۔ تمہارے پڑوس میں رہتا ہوں۔ کسی بھی وقت ملاقات ہوسکتی ہے۔"

"تمہاری ملاقات کسی نہ کسی قیامت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔"

"قیامتیں تو تم خود پالتے ہو چاپر۔"

"میری طرف سے بہت بدظن لگتے ہو۔"

"بدظن کا لفظ تو شک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ جنوبی بھارت کے پچاس فی صد فتنے شنکر شکرا اور اس کے ہونہار شاگرد چاپر کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"میں اسے اپنی تعریف سمجھوں یا تذلیل؟"

"تذلیل کے لیے عزت کا ہونا شرط ہے۔"

"دیکھو تمہاری حیثیت اس وقت تک ایک مہمان کی ہے۔ مجھے اپنے ملازموں کے سامنے بدتمیزی پر مجبور نہ کرو۔"

"میں یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا۔ ایک معاملہ طے کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"تو کیا یہاں پورچ میں کھڑے کھڑے طے کرو گے؟"

"نہیں... بیٹھیں گے۔ بڑے آرام سے بیٹھیں گے۔"

"تو پھر مہمان ہی تو ہوئے نا... چلو آؤ۔" وہ مسکرایا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور صفدر' چاپر کے ساتھ ایک وسیع نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ ہیرو باہر کے کمرے میں رہ گیا تھا۔ ہمارے سامنے چائے کے لوازمات رکھے تھے مگر میں نے یا صفدر نے چائے پینے کا رسک نہیں لیا تھا۔ جلد ہی ہم اصل موضوع پر آگئے۔

میں نے کہا "چاپر! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس دو اسمگل شدہ لڑکیاں ہیں۔"

وہ مکاری سے مسکرایا "مجھے معلوم تھا کہ تمہاری آمد کی وجہ یہی ہے۔"

"شاید اسے ہی چور کی داڑھی میں تنکا کہتے ہیں۔ بہرحال' اب تمہارے کیا ارادے ہیں۔ ان لڑکیوں کا اصل مالک مائیکل نام کا نیگرو ہے اور وہ یہاں بمبئی میں ہی موجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق مائیکل کا نمائندہ لڑکیوں کا معاملہ طے کرنے کے لیے دو تین بار تم سے ملاقات کرچکا ہے۔"

چاپر نے اپنی انگلی اٹھائی "سنو جہانی! پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں لڑکیوں کی حیثیت کٹی پتنگوں کی سی ہے اور کٹی پتنگ اسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ہو۔ کوئی اس کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا... اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے ان لڑکیوں کے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ میں انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کرو گے ان لڑکیوں کا؟"

"اچار ڈالوں گا۔"

"ایسے اچار کی تمہارے پاس کمی نہیں ہے۔ مرتبانوں کے مرتبان بھرے پڑے ہیں۔ میرے خیال میں تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہو۔ یہ کاج بوائے کی سی ضد تم جیسے نامی گرامی بدمعاش کو زیب نہیں دیتی۔ اپنے پیر استاد کی طرح جرائم کی دنیا میں نام کمانا ہے تو ذرا حقیقت پسند بنو۔ اب دیکھو ان لڑکیوں کے عوض تمہیں ٹھیک ٹھاک منافع مل رہا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تم ایک سنگین قسم کی دشمنی سے بچ جاؤ گے۔ یہ مت بھولو کہ جرائم کی دنیا میں دشمنیاں بڑھنے لگیں تو دوستیاں گھٹنا شروع ہوجاتی ہیں۔"

"تم دو ٹوک بات کرو۔ تم کس حیثیت سے یہاں آئے ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"میں مائیکل کی طرف سے ہی آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ لڑکیوں کا معاملہ طے کرلو' کچھ تم نیچے آؤ' کچھ وہ اوپر آجاتا ہے۔"

"لیکن وہ اتنی ہٹ دھرمی کیوں کر رہا ہے۔ وہ ایک بردہ فروش ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے مال میں کچھ ویسٹیج بھی چلی جاتی ہے۔ یعنی طویل سفر کے دوران میں دو تین فی صد بردے مر بھی جاتے ہیں۔ وہ سمجھ لے کہ یہ دونوں لڑکیاں بھی مر گئی ہیں۔"

"یعنی تمہارا فیصلہ ہے کہ وہ لڑکیاں تم نہیں چھوڑو گے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔"

"لیکن وہ لڑکیاں تمہیں بہرصورت دینا پڑیں گی۔"

"تو تم اپنی اصلیت پر آگئے ہو۔ دھمکی دے رہے ہو۔"

"ظاہر ہے کہ جب بات چیت کے راستے بند کردو گے تو زور آزمائی کا راستہ ہی رہ جائے گا۔"

"کتنا مال لیا ہے اس کالے سے؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مال کی میرے نزدیک کبھی کوئی حیثیت نہیں رہی۔"

"مگر جیون کی اہمیت تو ہے۔ اب تو سنا ہے کہ تمہیں بہت بڑی دولت بھی ملنے والی ہے۔ اگر جیون ہوگا تو اس دولت سے فائدہ اٹھاؤ گے نا ورنہ وہ کس کام آئے گی۔ تمہارا تو کوئی وارث بھی نہیں ہے۔"

"میں تم سے مکالمے بازی کا مقابلہ کرنے نہیں آیا۔ مجھے وہ لڑکیاں چاہئیں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

اس نے قیمتی برانڈ کا سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا "ٹھیک ہے۔ دے دیتے ہیں لڑکیاں۔۔۔ تم بتاؤ، تم کیا خرچ کرسکتے ہو ان کے لیے۔"

"مجھے تمہاری کمینی فطرت کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم صرف قیمت بڑھانے کے لیے یہ ناٹک رچا رہے ہو۔"

"چلو ایسے ہی سہی۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "بولو کیا خرچ کرو گے ان پر؟"

"بہتر ہے کہ تم اپنے منہ سے پھوٹ دو۔"

وہ گہرا کش لیتے ہوئے بولا "مہاشے! پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں وہ دونوں نہیں تینوں لڑکیاں خریدنا ہوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا ٹھیک ٹھاک خرچا ہوا ہے ان پر۔ پندرہ لاکھ تو میں نے کیش دیا تھا۔ نائیکا کو جو تحفے تحائف دیے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ پھر پولیس درمیان میں کود پڑی تھی۔ اس کا منہ بھی بڑی مشکل سے بند ہوا تھا۔ بہرحال یہ ساری غیر اہم باتیں ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں ان دو لڑکیوں کو بیچنا نہیں چاہتا۔ اب تم مجھے مجبور کررہے ہو۔ میرے مجبور کیے جانے کی کوئی قیمت تو ہوگی۔"

صفدر نے کہا "پہلے ایک بات کلیئر کرلو۔۔۔ وہ لڑکیاں ہمیں اسی حالت میں چاہئیں جس حالت میں لاہور سے گئی تھیں۔"

وہ مسکرایا "تم بڑا نازک سوال پوچھ رہے ہو۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ لڑکیاں اسی حالت میں ہیں۔ وہ دربدر بھٹکی ہوئی یہاں نہیں پہنچیں بلکہ ویسے ہی آئی ہیں جیسے آپ دونوں "شوں" کرکے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لاہور سے انہیں ایک مشہور سپلائر میڈم ڈیبی نے پولیس کے ناؤٹ سے خریدا تھا۔ اس نے انہیں سیدھا انڈیا پہنچایا۔ وہ انہیں دہلی کے بازارِ حسن میں لے جانا چاہتی تھی لیکن بیچ میں اس کا ناکرا مجھ سے ہوگیا۔ اس طرح لڑکیاں میں نے خرید لیں۔ ابھی تک وہ بالکل سچل مال ہے۔ کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا انہیں۔ اگر تم چاہتے ہو تو۔۔۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔" میں نے قطع کلامی کی "تم بولو، کیا مانگتے ہو لڑکیوں کا؟"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "سنو جانی! اگر وہ لڑکیاں تمہیں اپنے ساتھ لے جانی ہیں تو ستر لاکھ روپیہ کیش یہاں رکھنا ہوگا۔"

میں سناٹے میں رہ گیا "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے چاپر۔ تم یہ کیا مانگ رہے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم۔۔۔ کہ تم وہ لڑکیاں چھوڑنا نہیں چاہتے ہو۔"

اس نے قہقہہ لگایا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "تم اتنے بھولے نہیں ہو شاہ جہاں۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ منزل پر پہنچ کر ان لڑکیوں کی قیمت کیا ہوگی۔ وہ حرام زادہ نیگرو انہیں یورپ یا امریکا کے کسی شوقین کے سامنے پھینک بھی دے گا تو آٹھ دس لاکھ ڈالر اٹھالے گا۔ اس کالے دھندے پر تھوڑی بہت نگاہ ہماری بھی ہے۔ ہمیں جان کاری ہے کہ کھلی مارکیٹ میں کس مال کا کیا بھاؤ جارہا ہے۔ پچھلے مہینے اٹلی میں جو مقابلۂ حسن ہوا تھا اس میں اسی رنگ و روپ کی ایک لڑکی کی بولی تین لاکھ اسّی ہزار ڈالر تک پہنچی تھی۔"

میں جانتا تھا کہ چاپر ایک پرلے درجے کا مکار اور جھوٹا شخص ہے۔ وہ آسانی سے قابو آنے والا نہیں تھا۔ اس نے اتنی قیمت بتادی تھی کہ مائیکل لڑکیاں خرید ہی نہ سکے اور اگر خریدے تو اسے دانتوں پسینہ آجائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکیاں از خود بیچنے کے چکر میں ہے۔ اس جیسے کائیاں شخص کے لیے یہ بالکل مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں کو بہترین جگہ پر لے جاکر بہترین قیمت پر بیچ سکتا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پیر استاد شنکر شکرا نے اسے ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ میں نے چاپر سے شنکر شکرا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے گول مول انداز میں جواب دیا اور بتایا کہ وہ اس وقت انڈیا میں نہیں۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر بہتر ہی تھا کہ شنکر سے ٹاکرے کا اندیشہ نہیں رہا

تھا۔

اس معاملے میں ہمارے اور چاپر کے درمیان آدھ پون گھنٹا گفتگو ہوئی۔ چاپر کا عندیہ یہی تھا کہ وہ اپنی طلب شدہ قیمت میں زیادہ سے زیادہ چار پانچ لاکھ کی کمی قبول کرے گا۔ رات قریباً گیارہ بجے ہم چاپر سے یہ کہہ کر رخصت ہوگئے کہ ہم اس سلسلے میں اصل خریدار مائیکل سے مشورہ کرلیں۔ تاہم رخصت ہونے سے پہلے ہم نے چاپر سے کہا کہ ہم لڑکیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ معمولی تذبذب کے بعد چاپر آمادہ ہوگیا۔ اس کے حکم پر تین لڑکیوں کو کسی عقبی کمرے سے نکال کر ڈرائنگ روم میں لایا گیا۔ وہ بالکل بھیڑ بکریوں کی طرح چاپر کے گارڈز کے اشاروں پر چل رہی تھیں۔ اشارے پر رکتی تھیں، بیٹھتی تھیں اور اٹھتی تھیں۔ رجب سے برآمد ہونے والی دونوں لڑکیوں کے چہرے پر مجھے دیکھ کر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ اس سے پہلے وہ مجھ سے لاہور میں رجب کی رہائش گاہ پر مل چکی تھیں۔ میں نے انہیں حتی المقدور حوصلہ دیا تھا اور ان کا خوف دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اسی اچھے سلوک کے حوالے سے وہ مجھے اب بھی دیکھ رہی تھیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں امید کی ایک موہوم کرن سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ میں لڑکیوں سے ان کا حال چال پوچھنا چاہتا تھا مگر چاپر نے پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ ہم لڑکیوں سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ تیسری لڑکی بھی کافی خوب صورت تھی بلکہ کافی سے زیادہ خوب صورت تھی حالانکہ اس کا لباس بھی باقی لڑکیوں جیسا تھا لیکن نجانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر غم کے گہرے سائے تھے۔ وہ ہمارے سامنے کسی معصوم جانور کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر دل کٹ سا گیا۔ اس کے چہرے اور گردن پر سرخ داغ تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے دست درازی بھی کی جاتی رہی ہے۔ چاپر کے اشارے پر تینوں لڑکیوں کو واپس بھیج دیا گیا۔ ہم بھی اٹھ کر باہر آگئے۔ یہاں ہمارا گائیڈ ہیرو شنی کپور کے فلمی انداز میں ٹہل ٹہل کر ہمارا انتظار کررہا تھا۔ ہم پورچ میں پہنچے۔ یہاں چاپر کے گارڈز نے ہمارے پستول ہمیں واپس کردیے۔ بل مین گاڑی میں بیٹھ کر ہم بسواجیت چاپر کی شان دار کوٹھی سے باہر نکل آئے۔

کچھ دیر میں نے یونہی مالابار کی سڑکوں پر اِدھر اُدھر گاڑی گھمائی۔ جب یقین ہوگیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جارہا تو میں نے اسی ہوٹل کی طرف رخ کرلیا جس کے بارے میں ہیرو نے بتایا تھا کہ وہاں ہمارے لیے کمرے بک ہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم ہوٹل ڈان کے ایک آرام دہ کمرے میں بیٹھے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ میری طرح صفدر کے چہرے پر بھی سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا "یعنی آپ کا خیال ہے کہ مائیکل سے رابطہ کرنا بیکار ہے۔"

"ہاں، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ چاپر نے جو رقم مانگی ہے وہ کسی طور بھی مائیکل کو قبول نہیں ہوگی بلکہ شاید وہ اس کا چوتھا حصہ دینے کو بھی تیار نہیں ہوگا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ سودا طے نہیں ہوسکتا؟"

"ناممکن ہے، چاپر نے اتنی ڈیمانڈ ہی اس لیے کی ہے کہ سودا طے نہ ہوسکے۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے؟"

"کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ آپ نے کچھ سوچ بھی لیا ہے۔"

"بڑے مزاج شناس ہوتے جارہے ہو۔"

"آپ کی دعا ہے۔"

"ہوں۔"

"تو کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میری معلومات کے مطابق چاپر کی ایک محبوبہ ہے۔ چاپر نے خفیہ شادی کر رکھی ہے اس سے۔ وہ چاپر کے ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہے۔ وہ ایک زبردست گلوکارہ تھی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں اس کا مستقبل بڑا روشن تھا لیکن اب وہ صرف اور صرف چاپر کی خاطر گمنامی کی زندگی گزار رہی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ چاپر بھی اس سے محبت کرتا ہے بلکہ شاید وہ واحد ہستی ہے چاپر کو جس کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے۔"

"ہاں یہ تو میں نے بھی سنا تھا کہ چاپر کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔"

"بس وہی لڑکی اور بچہ اس کا "آگا" بھی ہے اور "پیچھا" بھی۔ وہ دونوں بمبئی میں ہی کہیں رہتے ہیں۔ اگر کسی طرح ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہوجائے تو کام بن سکتا ہے۔"

صفدر نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں صفدر! جس طرح چاپر نے لڑکیوں کو یرغمال بنا رکھا ہے، ہم چاپر کی محبوبہ کو یرغمال بنا کر اس سے اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ انہیں ڈھونڈیں گے کہاں۔ یہ تو ایک کروڑ انسانوں کا شہر ہے۔"

ڈھائی تین سال پہلے جب میں بمبئی آیا تھا تو شنکر شکرا سے میرا ٹاکرا ہوا تھا۔ ایک روز میں شنکر شکرا کا تعاقب کررہا تھا۔ وکٹوریا گارڈنز کے علاقے میں شنکر ایک کوٹھی پر دو تین منٹ کے لیے رکا تھا۔ جب وہ باہر آیا تھا تو اس کے ساتھ چاپر بھی تھا۔ دونوں کار میں بیٹھ کر پھر روانہ ہوگئے تھے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی کوٹھی تھی جہاں چاپر نے اپنی گلوکارہ بیوی کو رکھا ہوا ہے۔"

"لیکن آپ کے بقول اس بات کو ڈھائی تین سال گزر چکے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ گلوکارہ ابھی تک اپنے بچے کے ساتھ وہیں مقیم ہو۔"

"ہاں امکانات تو بہت سے ہیں۔ بہرحال چیک کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"کیا ہم خود چیک کرنے جائیں گے۔"

"نہیں' یہ ہیرو کسی مرض کی دوا ہے۔ اسے بھیجتے ہیں۔"

میں نے ہیرو کو آواز دی۔ وہ باہر بالکونی میں بیٹھا تھا۔ پہلی ہی آواز پر بال پیشانی سے جھٹکتا ہوا اندر آگیا۔ میں نے اسے پاس بٹھالیا اور سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ رات ہم نے ہوٹل کے کمرے میں ہی گزاری۔ ہیرو اپنی رہائش گاہ پر واپس چلا گیا تھا۔ وہ بہت چلتا پُرزہ تھا اور بڑی حد تک ایک وفادار شخص بھی تھا۔ اگلے روز وعدے کے عین مطابق گیارہ بجے کے قریب اس نے ہمیں ہوٹل آکر رپورٹ دے دی۔ وہ میری ہدایت کے مطابق وکٹوریا گارڈنز کے علاقے میں گیا تھا اور میرے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا تھا۔ اس نے مطلوبہ مکان میں رہنے والوں کے متعلق اہم معلومات حاصل کی تھیں۔

اس نے بتایا "وڑی اپن نے کوٹھی نمبر ۳۱۸۔بی کا مکمل سروے کیا ہے۔ اپن نے ایک قریبی دکان دار کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور اس سے تفصیل معلوم کی۔ اس تفصیل کے مطابق اس کوٹھی میں ایک سُندر عورت اپنے چار پانچ سالہ بیٹے اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا پتی بیرونِ ملک میں ہے اور وڑی کسی بڑے عہدے پر کام کرتا ہے۔ جواں سال عورت کا نام مسز رائے معلوم ہوا ہے۔"

ہیرو کی اطلاع نہ صرف چونکا دینے والی تھی بلکہ نہایت خوش کن بھی تھی۔ میں نے اندھیرے میں جو تیر چھوڑا تھا وہ عین نشانے پر لگا تھا۔ ہم چاپر کی محبوبہ دل نواز کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ مجھے اور صفدر کو یہی توقع تھی کہ اگر چاپر کی داشتہ نما بیوی اس کوٹھی میں مقیم ہوئی تو پتا چلے گا کہ اس کا شوہر کہیں بیرونِ ملک کام کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال ایک اور اہم اطلاع بھی ہیرو نے ہمیں دی۔ اس نے بتایا "کوٹھی کے اندر لان میں شامیانے وغیرہ لگ رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ کوٹھی میں کافی مہمان موجود ہیں۔ اپن کو اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی فنکشن وغیرہ ہے۔ اپن نے دکان دار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ جو عورت یہاں رہتی ہے اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہے۔ رات کو کافی بڑا فنکشن ہونے والا ہے۔"

صفدر نے پوچھا "فنکشن کا ٹائم کیا ہے؟"

"اپن کو ٹھیک سے جانکاری نہیں لیکن خیال ہے کہ رات نو دس بجے کے بعد ہی ہوگا۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ہیرو! پھر وہاں جاؤ۔ ساری بات ٹھیک ٹھیک معلوم کرکے آؤ۔ فنکشن کتنے بجے شروع ہوگا' کب ختم ہوگا۔ برات کہاں سے اور کب آئے گی وغیرہ وغیرہ۔"

ہیرو فوراً اٹین شین ہوگیا اور بڑے خاص انداز سے سلیوٹ کرکے باہر نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ شام کے وقت واپس آیا۔ معلومات کے حوالے سے وہ ہماری توقعات پر پورا اترا تھا۔ اس نے بتایا کہ برات نہرو پارک کے علاقے سے آئے گی۔ قریباً دس بجے رات فنکشن شروع ہوگا اور صبح چار پانچ بجے تک جاری رہے گا۔ کوٹھی کے وسیع لان میں قریباً چار سو مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ اس نے ایک خاص بات یہ بھی بتائی کہ شادی کے فوراً بعد یعنی کل دوپہر دلہا دلہن ہنی مُون کے لیے سنگاپور روانہ ہوجائیں گے۔ مسز رائے اور ان کا بچہ بھی نویاہتا جوڑے کے ساتھ جائیں گے۔

یہ آخری اطلاع ہمارے لیے ذرا پریشان کن تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں جو بھی کرنا ہے' آج رات ہی کرنا ہے۔ کل "مسز رائے" نے اپنے بچے کے ساتھ اڑن چھو ہوجانا تھا۔ اس نئی اطلاع کی روشنی میں آج رات کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ میں' صفدر اور ہیرو ڈیڑھ دو گھنٹے سر جوڑے بیٹھے رہے اور ہم نے ایک مکمل لائحۂ عمل تیار کرلیا۔ اس لائحۂ عمل کے مطابق ہمیں براتیوں میں شامل ہوکر اس فنکشن میں شرکت کرنا تھی۔ ہیرو کو بھی ہمارے ساتھ رہنا تھا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ ہم تینوں اپنی بل مین کار میں ہوٹل سے نکلے اور وکٹوریا گارڈنز کے علاقے میں مطلوبہ کوٹھی تک پہنچ گئے۔ رہائشی علاقے میں گھری ہوئی وہ کوٹھی روشنیوں سے جگمگ نور بنی تھی۔ کوٹھی سے باہر چھوٹی بڑی

گاڑیوں کی طویل قطار نظر آرہی تھی۔ رنگین ساریوں کے آنچل لہرا رہے تھے اور نقرئی قہقہے سرد ماحول کو گرما رہے تھے۔ برات ابھی نہیں پہنچی تھی۔ ہم نے اپنی کار کوٹھی سے کچھ فاصلے پر پارک کی اور خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔ آخر برات کا شور سنائی دیا۔ مقامی رواج کے مطابق برات ایک شان دار بگھی کے ساتھ آرہی تھی۔ آتش بازی کا مظاہرہ ہورہا تھا اور باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بگھی کے پیچھے پیدل براتی تھے اور ان کے پیچھے کاروں کی طویل قطار تھی۔ ہم تینوں بھی برات میں شامل ہوگئے اور بہ آسانی کوٹھی کے اندر پہنچ گئے۔ ایسے موقع پر کسی آؤٹ سائیڈر کا پہچانا جانا آسان نہیں ہوتا' اور جہاں جوش و خروش جتنا زیادہ ہوتا ہے' بے خبری اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ بمبئی کے پوش علاقے میں یہ ماڈرن لوگوں کی ایک رنگین محفل تھی۔ لان کے ایک گوشے میں شان دار سٹیج بھی بنایا گیا تھا۔ یہاں دلہا اور اس کے دوست برا جمان ہوگئے۔ سرد اور گرم مشروبات مہمانوں کے درمیان گردش کرنے لگے۔ میں' صفدر اور ہیرو خود کو مصروف رکھنے کے لیے مسلسل باتیں کرتے چلے جارہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بسواجیت یا پھر اس کا کوئی قریبی ساتھی اس فنکشن میں شریک نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی اس محبوبہ اور بیٹے کو زمانے کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔ اگر وہ یہاں آتا بھی ہوگا تو رات کے اندھیرے میں چوری چھپے آتا ہوگا اور چوری چھپے چلا جاتا ہوگا۔ سرعام اپنی سالی کی شادی میں شریک ہوکر وہ برسوں پرانے اس راز کو خطرے سے دوچار کیسے کرسکتا تھا۔ اس قسم کے راز پالنے والے لوگوں کو اس طرح کی قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ نجانے اس سے پہلے بھی اس کوٹھی میں کتنے فنکشن چاپر کے بغیر ہوچکے تھے اور آئندہ بھی ہونا تھے۔

میں اور صفدر تھری پیس سوٹ میں تھے جبکہ ہیرو کلف دار کُرتے پائجامے اور واسکٹ میں تھا۔ وہ بال بھی اپنے پسندیدہ اداکار کے انداز میں بناتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ کپڑے بھی ویسے ہی پہنے۔ اسے دور سے دیکھنے والا یقیناً ایک بار چونکتا ضرور ہوگا۔ اس محفل میں رقص و سرود کا انتظام بھی تھا۔ موسیقی کی تانیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ جسم تھرک رہے تھے' قہقہے بکھر رہے تھے اور نگاہوں کا تصادم ہورہا تھا۔ ہماری دائیں جانب لڑکیوں کا ایک گروپ تھا' وہ کورس میں گانے گارہی تھیں اور لڑکوں کو ہُوٹ کررہی تھیں۔ پھر لڑکوں نے بھی ایک گروپ بنالیا اور لڑکیوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ اس ہنگامہ ہائے ہو میں صفدر اور میں ایک دوسری ہی دنیا کے لوگ تھے' خوش باش لوگوں کی اس رنگین محفل میں ہم تھوڑی دیر کے لیے اترے تھے پھر ہمیں اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوجانا تھا۔ کتنا فرق تھا ہم میں اور ہمارے اردگرد ناچتے گاتے لوگوں میں۔ آرکسٹرا.... نے اپنی دُھن بدلی تو ڈانسنگ فلور پر جوڑے پاؤں تھرکانے لگے۔ پٹلون قمیص والی ایک نہایت ماڈرن پارسی لڑکی نے صفدر کو رقص کی پیشکش کی مگر صفدر نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ بے شک بسواجیت چاپر یا اس کا کوئی کارندہ اس محفل میں نظر نہیں آیا تھا' مگر پھر بھی ہمارے پہچانے جانے کا چانس موجود تھا۔ ممکن تھا کہ چاپر یا شنکر شکرا کا کوئی ایسا ساتھی یہاں موجود ہو جسے ہم نہ جانتے ہوں لیکن وہ ہمیں جانتا ہو یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی اجنبی ہی ہمیں پہچان لیتا۔ دفینے کے ہنگامے کے حوالے سے ہماری تصویریں انڈین اخبارات میں چھپتی رہی تھیں اور پولیس کے دل میں تو خاص طور سے ہمارے لیے بڑی "محبت و عقیدت" پائی جاتی تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ اگنی کے گرد پھیرے ہوئے اور پھر پُرتکلف "بھوجن" دیا گیا۔ بھوجن کے دوران میں ہی میں نے مسز رائے یعنی چاپر کی حسین داشتہ کو پہچان لیا تھا۔ اس کی شکل دلہن سے اتنی ملتی تھی کہ کسی تصدیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر بھی احتیاطاً ہیرو نے اپنے طور پر تصدیق کرلی تھی کہ یہی دلہن کی بڑی بہن "مسز رائے" ہیں۔ ہمیں مسز رائے کو اغوا کرنا تھا۔ اور مجبوری یہ تھی کہ اسی بھری پُری محفل سے اغوا کرنا تھا کیونکہ کل صبح وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ سنگاپور اڑن چھو ہورہی تھی۔

کھانے کے بعد دلہن کو بھی دلہا کے ساتھ بٹھادیا گیا اور رواجی رسمیں شروع ہوئیں۔ اس موقع پر سب مہمان آپس میں گھل مل گئے۔ خوش گپیوں اور چٹکلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میری اور ہیرو کی گھڑی آپس میں ملی ہوئی تھی' دونوں میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں تھا۔ میں نے ہیرو کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر کوٹھی کے گیراج کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں اور صفدر ٹہلتے ہوئے اسٹیج کے قریب چلے گئے۔ میری نگاہ مسز رائے پر تھی۔ وہ بار بار اپنی زرنگار ساری کا آنچل سنبھالتی ہوئی بمبئی کی معزز خواتین سے گفتگو میں مصروف تھی۔

میں اس کے قریب جاکھڑا ہوا "ہیلو مسز رائے' کیسی ہیں آپ؟"

وہ مجھے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی "بالکل ٹھیک ٹھاک اور.... آپ کیسے ہیں؟"

"فائن۔۔۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے' آپ کو مبارک ہو۔"

"اور آپ کو بھی۔۔۔ آپ۔۔۔ اکیلے ہی آئے ہیں؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ آپ کی بہن بھی ہیں۔"

"اوہ میں نے دیکھا ہی نہیں۔۔۔ کہاں ہیں وہ؟"

ظاہر ہے' وہ یہ ساری گفتگو مجھے پہچانے بغیر کر رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ گفتگو کے دوران میں ہی اسے میرا حدود اربعہ یاد آجائے اور وہ خجالت سے بچ جائے۔ میں اسے اس پریشانی سے نکالنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی' گھڑی کی سوئیاں مطلوبہ مقام پر پہنچ چکی تھیں۔ ایک دم تاریکی چھا گئی۔ ایک ساتھ بہت سی سُریلی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے مسز رائے کے منہ پر ہاتھ رکھا اور صراحی دار گردن کو اپنے دائیں بازو میں جکڑ لیا۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچلی لیکن آواز نہیں نکال سکی۔ میں نے گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور اس کے حواس معطل کر دیے۔ اس کا خوشبودار گداز بدن کسی بے جان شے کی طرح میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے کندھے پر لاد لیا اور لوگوں کے درمیان سے گیراج کی طرف بڑھا۔ یہ سب کچھ تین چار سیکنڈ کے اندر ہو گیا۔ ابھی لوگ صرف شور مچا رہے تھے۔ کسی نے لائٹر یا ماچس وغیرہ نہیں جلائی تھی۔ پوری کوٹھی گہری تاریکی میں ڈوب چکی تھی اور یہ کام ہیرو نے کوٹھی کا مین سوئچ آف کر کے اور پلگ نکال کر کیا تھا۔ پلاننگ کے مطابق ہیرو ہل مین کار کو مین گیٹ کے بالکل پاس لے آیا تھا' اور اس کا رخ اس نے سڑک کی طرف رکھا تھا۔ چابی بھی اگنیشن میں موجود تھی۔ جس وقت میں نے مسز رائے کو گاڑی میں لاکر ڈالا' صفدر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایک طرف سے ہیرو برآمد ہوا اور پھرتی سے صفدر کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک لان میں ماچسیں وغیرہ روشن ہو گئی تھیں۔ ایک آدھ ٹارچ کی روشنی بھی گردش کر رہی تھی۔ کئی قسم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مہمان اونچی آواز میں بجلی کے فیل ہونے پر تبصرہ کر رہے تھے لیکن بجلی اتنی جلدی آنے والی نہیں تھی کیونکہ سفید رنگ کے تین بڑے بڑے پلگ ہیرو نے اپنے سامنے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے تھے۔

"مشن کمپلیٹ؟" صفدر نے پوچھا۔

"یس' مشن کمپلیٹ۔" میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

اس نے گیئر لگایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ مین گیٹ پر موجود ایک مسلح چوکی دار ہم سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر موجود تھا مگر اسے بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہوا ہے اور چوکی دار پر ہی کیا موقوف' ہم چار ساڑھے چار سو مہمانوں کے درمیان سے مسز رائے کو مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے آئے تھے۔

پروگرام کے مطابق ہم اپنے "شکار" کو سیدھا پارسی ٹاورز کے عقب میں واقع ایک متوسط آبادی میں لے گئے۔ ہمارے "ہیرو" کا گھر اسی آبادی میں واقع تھا۔ یہ دس مرلے کی مکان نما کوٹھی تھی۔ بیوی بچے بالائی منزل پر رہتے تھے' نچلی منزل ہیرو نے اپنی جائز و ناجائز سرگرمیوں کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ یہاں ہمیں ہر سہولت میسر آسکتی تھی اور سب سے بڑی سہولت ٹیلی فون کی تھی۔ ہم گاڑی کو گھر کے گیراج میں لے گئے۔ گیراج میں بے ہوش مسز رائے (یا جو بھی اس کا اصل نام تھا) کو نکالا اور ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے گرد و پیش کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے چاند ستاروں سے سجی ہوئی ایک رنگین محفل میں تھی۔ اب ایک نیم روشن کمرے میں پڑی تھی اور اپنے اردگرد بوسیدہ فرنیچر دیکھ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں' پھر کھولیں۔۔۔ پھر زور سے چیخنا چاہا مگر اس چیخ و پکار کا انتظام صفدر پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس نے ایک میز پوش کا گولا بنا کر مسز رائے کے منہ میں گھسیڑ دیا تھا اور اوپر سے کس کر ایک پٹی باندھ دی تھی۔ ایسی ہی ایک دوسری پٹی سے مسز رائے کے دونوں پاؤں بھی باندھ دیے گئے تھے۔

وہ خوب سجی سنوری تھی۔ ڈیڑھ دو لاکھ کے تو زیورات ہی اس کے جسم پر تھے۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہاں وہ پوری طرح محفوظ اور سلامتی سے رہے گی' شرط یہی ہے کہ وہ ہماری ہدایات پر بلا چون و چرا عمل کرے۔ میں نے کہا "یہ بات بھی دل سے نکال دینا کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو پہنچ سکے گا یا تم چیخ و پکار کر کے ہمارا کوئی نقصان کر سکو گی۔"

عورت کچھ سمجھ دار لگتی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے اور اب وہ مکمل طور پر مسلح مردوں کی دسترس میں ہے۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے یقین دلایا کہ اگر میں اس کے منہ میں سے کپڑا نکال دوں تو وہ شور نہیں مچائے گی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے اس کا منہ آزاد کر دیا۔ وہ آنسو بہانے لگی اور اپنا دوش پوچھنے لگی۔

میں نے کہا "شریمتی! دوش نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے کیونکہ یہ حساب کتاب شروع ہو گیا تو پھر تمہاری جان آسانی سے نہیں چھوٹ سکے گی۔ بس تم ہم سے تعاون کرو۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمہیں جلد آزاد کر سکیں۔"

"میں کیا کروں۔ جو کچھ میرے پاس ہے تم لے لو۔ اگر مزید چاہیے تو میں انتظام کر دیتی ہوں۔" اس نے زیور اتار اتار کر بستر پر پھینکنے شروع کر دیے۔

صفدر نے کہا "شریمتی جی! ہمیں آپ کے گہنوں کی ضرورت نہیں۔۔۔ اور نہ ہی نوٹوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں کچھ اور درکار ہے۔ تمہارے پتی صاحب نے تین عدد جوان لڑکیاں اغوا کر کے اپنے قبضے میں رکھی ہوئی ہیں اور کسی صورت بھی انہیں آزاد کرنے پر تیار نہیں۔ وہ لڑکیاں چھوڑ دے' ہم تمہیں باحفاظت واپس پہنچا دیں گے۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو۔ میرے پتی تو امریکا میں ہیں۔"

"ایک وقت میں کتنے پتی رکھتی ہو تم؟" صفدر نے پھنکار کر پوچھا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ میں نے کہا "دیکھو مسز رائے! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسز رائے تمہارا اصل نام نہیں ہے۔ پانچ چھ سال پہلے تک تم روپا جان کے نام سے گلوکاری کرتی تھیں۔ پھر تم نے گلوکاری چھوڑ کر بسواجیت چاپر کی داشتہ کا رتبہ حاصل کر لیا اور اب تم اس کے بچے کی ماں ہو۔"

"یہ غلط ہے۔ میں داشتہ۔۔۔" وہ ایک دم کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ داشتہ نہیں ہو' دھرم پتنی ہو لیکن ہو تو چاپر کی پتنی نا۔ اس سے تو ہزار درجے بہتر تھا کہ تم کسی نیم شریف آدمی کی داشتہ ہوتیں۔"

روپا جان کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ غم اور خوف کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ بار بار اپنی مسلی ہوئی گردن سہلا رہی تھی۔

میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور بسواجیت چاپر کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر میں نے کل کی ملاقات میں اس سے حاصل کیا تھا۔ تیسری چوتھی گھنٹی پر چاپر کے کسی ہرکارے نے ریسیور اٹھایا۔ میں نے اس سے تعارف کرایا اور کہا کہ چاپر کو بلاؤ۔ میرا نام سن کر روپا جان بھی چونک گئی۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے میرا نام سن رکھا ہے۔ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ ریسیور پر چاپر کی آواز سنائی دی "ہاں۔ شاہ جہاں! کیا حال ہے۔ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ابھی انڈیا میں ہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ابھی ہمارے سروں پر خطرات منڈلا رہے ہیں۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"بے شک منڈلا رہے ہیں بلکہ تم خود چاہ رہے ہو کہ یہ خطرات منڈلاتے رہیں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں بھیا۔۔۔ میں نے تو ہر بات کھول کر تمہیں بتا دی ہے۔ اب جو فیصلہ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے۔"

"ہم فیصلہ کرنے والے کون ہیں' ہم تو گزارش ہی کر سکتے ہیں۔ وہ لڑکیاں ہمیں درکار ہیں اور ہر صورت میں درکار ہیں۔"

"تو لے لو نا بھئی۔ انکار کون کرتا ہے۔" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "تمہاری ایک پتنی ہے روپا جان۔۔۔ وہ مسز رائے کے نام سے "گارڈنز ویو" کی کوٹھی نمبر ۳۸۔ بی میں رہائش پذیر ہے۔"

دوسری طرف چاپر کے سر پر غالباً بم کا دھماکا ہو گیا تھا۔ وہ تین چار سیکنڈ تک کچھ بول نہیں سکا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" آخر اس کی لرزاں آواز ابھری۔

میں نے ریسیور روپا کے منہ سے لگا دیا اور اشارے سے اسے کہا کہ وہ پتی کو اپنی خیریت سے آگاہ کرے۔

روپا نے لرزتی سسکتی آواز میں کہا "ہیلو۔۔۔ مم۔۔۔ میں روپا بول رہی ہوں۔ ان لوگوں نے میرے پاؤں باندھ رکھے ہیں اور پستول لیے میرے سر پر کھڑے ہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔ بھگوان جانے کون سی جگہ ہے۔"

میں نے ریسیور روپا کے ہاتھ سے چھین لیا "ہیلو چاپر!"

میں نے کہا "امید ہے کہ تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی۔"

دوسری طرف سے چاپر غرایا "میں تیرا خون پی جاؤں گا جانی۔۔۔ اگر روپا کو کسی نے میلی نظر سے دیکھا بھی تو بھگوان کی سوگند میں اس کے لیے قیامت لے آؤں گا۔"

"واہ۔۔۔ کیا بات ہے۔ اپنی عزت کی اتنی رکھوالی اور دوسروں کی آبرو کا ایسا تیا پانچا۔ قربان جانے کو جی چاہتا ہے تمہارے وچاروں پر۔ اب کیا خیال ہے تمہارا' اگر ان لڑکیوں کے بدلے ہم تمہاری روپا کو نیگرو مائیکل کے پاس لے جائیں۔ کھلی مارکیٹ میں کیا قیمت ہوگی اس کی۔ بچے والی ہے لیکن ہے تو بڑی زوردار چیز۔ کسی شوقین کے آگے پھینک بھی دیں گے تو خرچا پانی تو پورا ہو ہی جائے گا۔"

دوسری طرف چاپر کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا تھا۔ وہ

ٹیلی فون پر دہاڑ رہا تھا۔ جو منہ میں آرہا تھا' بک رہا تھا۔ جب اس کا دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا تو میں نے کہا۔

"دیکھو چاپر! تمہیں اور تمہارے گرو گھنٹال کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے کبھی خالی خولی دھمکی نہیں دی۔ تمہاری چتی' محبوبہ یا داشتہ جو بھی ہے' ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے۔ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ تم وہ تینوں لڑکیاں ہمارے حوالے کردو' ہم روپا دیوی کو بحفاظت تمہارے پاس پہنچا دیں گے۔"

"تم اسے لائے کہاں سے ہو؟" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"جہاں تم نے اسے رکھا ہوا تھا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن وہاں تو آج شادی کا فنکشن تھا۔"

"شادی کے فنکشن سے ہی لائے ہیں۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بہت جلدی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جلد از جلد روپا دیوی اپنے گھر واپس پہنچ جائے۔ ابھی تو مہمانوں کے ہجوم میں ٹھیک سے روپا کی گمشدگی کا پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔ اگر دس پندرہ منٹ یا آدھ پون گھنٹے میں روپا واپس پہنچ جائے تو وہ اپنی غیر حاضری کے سلسلے میں کوئی قابلِ قبول بہانہ بنا سکتی ہے لیکن اگر دیر ہوگئی تو پھر یہ گرما گرم خبر ہر طرف پھیل جائے گی۔"

دوسری طرف یقیناً چاپر دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ لائن پر کئی سیکنڈ تک خاموشی چھائی رہی' پھر چاپر نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے جانی! مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" اس کی آواز میں شکست خوردگی واضح طور سے محسوس ہو رہی تھی۔

"ویری نائس۔ یہ ہوئی نا بات۔ اب ذرا جلدی سے بتا دو کہ روپا کے ساتھ لڑکیوں کا تبادلہ کیسے اور کہاں ہوگا۔ میں ایک بار پھر تمہیں مشورہ دوں گا کہ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہمارے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور۔ مجھے معلوم ہے کہ جنوبی بھارت کے کمینوں میں کوئی تمہارا اور شنکر کا ثانی نہیں۔ اگر تم نے کسی طرح کی چالاکی دکھائی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ روپا کو لاش بنانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ آئی رئیلی مین اٹ!"

"بولو۔ تم لڑکیوں کو کہاں حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"بندرگاہ پر۔" میں نے کہا۔

"مقام اور وقت بتاؤ۔"

میں نے چاپر کو ہولڈ کرایا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ہیرو سے مشورہ کیا۔ ہیرو کی رائے تھی کہ بندرگاہ کے چینل نمبر دو کے سامنے یہ تبادلہ ٹھیک رہے گا۔ میں نے چاپر کو مقام بتا دیا۔ وقت ایک گھنٹے بعد یعنی ڈھائی بجے کا طے ہوا۔ میں نے بتایا کہ وہ دونوں لڑکیوں کے ساتھ نیلے رنگ کی شیورلٹ میں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ صرف دو بندے اور ہوں گے۔

میں نے کہا "دو لڑکیاں کیوں۔ تینوں لڑکیاں ہوں گی۔" اس نے خود کہا تھا کہ جو بھی معاملہ ہوگا تینوں لڑکیوں کا ہوگا۔"

"شاہ جہاں! وہ سودا تھا' یہ زبردستی اور دھونس ہے۔"

"سودے کو زبردستی اور دھونس میں بدلنے والے بھی تم ہی ہو۔"

کچھ دیر تک اس سلسلے میں میرے اور چاپر کے درمیان تکرار ہوئی۔ آخر چاپر کو میری بات ماننا ہی پڑی۔ میں نے ہاتھ ہی ایسی جگہ پر ڈالا تھا کہ وہ تڑپ پھڑک نہیں سکتا تھا۔ دیکھ ہی دیکھتے اس کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ جس طرح ہر جن کی جان کسی نہ کسی طوطے میں ہوتی ہے' اسی طرح مضبوط سے مضبوط شخص کا بھی کوئی نہ کوئی ویک پوائنٹ ہوتا ہے۔ اگر اس ویک پوائنٹ کا کھوج لگ جائے تو اسے پچھاڑنا مشکل نہیں ہوتا۔

چاپر سے ڈھائی بجے کا وقت مقرر ہوا تھا۔ اب چالیس پچاس منٹ ہمیں اسی مکان میں گزارنے تھے۔ سردی معمول سے زیادہ تھی۔ ہیرو مکان کی بالائی منزل پر گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک ٹرے میں گرم گرم چائے اور اُبلے ہوئے انڈے لے آیا۔ ہم نے چائے پی بلکہ روپا کو بھی اس چائے میں شریک کیا۔ اس کا خوف اب کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور اگر اس کے عاشقِ نامدار چاپر نے ہمارا مطالبہ پورا کردیا تو ہمیں اسے چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اب کسی حد تک پُرسکون بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی "کیا ایسا نہیں ہو سکتا مسٹر جانی! کہ تم فون پر میرے گھر بات کرا دو۔ دیکھو میری بہن کی برات آئی ہوئی ہے' اگر میری گمشدگی کی خبر نکل گئی تو بہت برا ہوگا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' بات کرا دیتے ہیں لیکن تم کہو گی کیا؟"

"میں کچھ نہ کچھ کہہ لوں گی۔ پلیز آپ میری بات کرا دیں۔"

صفدر نے روپا کے گھر کا نمبر ملا کر ریسیور اسے تھما دیا۔ وہ بات کرنے لگی۔ اس نے اپنی کسی آنٹی کو بلایا اور اسے سمجھانے لگی کہ اسے بڑی ایمرجنسی کی حالت میں اسپتال آنا پڑ گیا ہے' یہاں اس کی ایک دوست حادثے میں زخمی ہو کر بے ہوش پڑی ہے۔ اس نے اپنی آنٹی یا موسی سے یہ بھی کہا

کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ تمام معاملات سنبھال کر رکھے اور اس کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس نہ ہونے دے۔

فون پر روپا (مسز رائے) کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابھی صرف چند منٹ پہلے کوٹھی کی لائٹ بحال ہو سکی ہے اور روپا کی غیر موجودگی کا ابھی کسی کو پتا نہیں تھا۔ فون کرنے کے بعد روپا کے چہرے پر خاصا اطمینان نظر آنے لگا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "مسٹر شاہ جہاں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ کے ساتھ آپ کا نامی گرامی ساتھی صفدر ہے۔"

"لگتا ہے کہ کافی کچھ جانتی ہو تم ہمارے بارے میں۔"

"آج کل اخباروں میں آپ کے بارے میں خبریں آرہی ہیں۔ کیا آپ دونوں اخبار نہیں پڑھتے۔"

"پڑھنے کو دل تو چاہتا ہے لیکن یار لوگ پڑھنے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ اس سے اخلاق خراب ہوتا ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔

وہ صفدر کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی "سنا ہے کہ آپ کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے مسٹر شاہ جہاں۔۔۔ امریکی صنعت کار جی کلارک نے آپ کے ساتھ فراڈ کیا ہے اور وہ دفینہ جس کے پیچھے آپ کئی سال سے تھے' اُڑا کر لے گیا ہے۔"

"یہ خبر تم نے اخبار میں پڑھی ہے؟"

"اخبار میں پڑھی ہے اور ویسے بھی سنی ہے۔ آج کل مختلف حلقوں میں اس خبر کا چرچا ہے۔"

میں نے کہا "پہلی بات تو یہ ہے کہ تم پورے دفینے کی بات کر رہی ہو جبکہ پورا دفینہ ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے' دوسری بات یہ ہے کہ مسٹر کلارک نے کوئی فراڈ نہیں کیا ہے۔ بے شک وہ امریکی ہے لیکن تمہارے عاشق چاپر اور اس کے پیر استاد شنکر جیسے بہت سے مشرقی لوگوں سے بہتر ہے۔"

"مگر اخبار میں تو لکھا ہے کہ وہ کہیں روپوش ہو گیا ہے۔"

"اخبار کل کلاں تمہیں دلیپ کمار کی بیوی لکھ دیں گے تو مان لوگی؟"

"آپ تو خواہ مخواہ بگڑ رہے ہیں۔ میں تو وہی کچھ بتا رہی ہوں جو کہا اور سنا جا رہا ہے۔ آپ کے اپنے ساتھیوں کے بیانات آرہے ہیں جنہوں نے آپ پر الزام لگایا ہے کہ آپ نے سب کو اندھیرے میں رکھ کر دفینے کا سامان امریکی صنعت کار کو سونپ دیا اور وہ اڑن چھو ہو گیا۔"

"اوہ! غالباً تم مجتبیٰ کنور کی بات کر رہی ہو۔ وہ کبھی میرا ساتھی نہیں تھا۔"

"لیکن وہ آپ کے ساتھ ایک عرصہ دفینے کی تلاش میں شامل رہا ہے۔ وہ اندر کی ساری باتیں جانتا ہے۔"

"وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو اس فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا تھا لیکن صفدر نے پھر مجتبیٰ کنور کے بیانات کی بات چھیڑ دی۔ یوں لگتا تھا کہ کبھی کبھی مسٹر کلارک پر اس کا اعتماد بھی ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ قریباً پون گھنٹے بعد ہم نے دوبارہ چاپر سے فون پر رابطہ کیا۔ اس کی ہیجانی آواز سنائی دی "بس میں لڑکیوں کو لے کر روانہ ہو رہا ہوں۔ تم بھی چل پڑو۔ ایک بار پھر وارننگ دیتا ہوں تمہیں۔۔۔ روپا کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔"

"بے فکر رہو۔" میں نے کہا "وہ بہت انجوائے کر رہی ہے اپنے اغوا کو۔ اسے تو افسوس ہے کہ وہ اس سے پہلے اغوا کیوں نہیں ہوئی۔"

"مسخری مت کرو شاہ جہاں! میں نے تمہاری تمام شرطیں مانی ہیں' اب کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔" چاپر کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں ہوگی چندا۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اگر تمہاری نیت میں فتور نہیں تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہاری شہزادی اپنی بہن کی شادی میں واپس پہنچ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' میں لڑکیوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ رہا ہوں۔"

فون بند کرتے ہی میں نے روپا سے کہا "چلو شریمتی جی! تمہیں تمہارے چاہنے والے کے پاس لے چلیں۔" صفدر نے اس کے پاؤں کھول دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ہل مین گاڑی میں بیٹھے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ اب رات کے سوا دو بج چکے تھے۔ بمبئی دن رات جاگنے والا شہر ہے مگر رات کے اس پہر یہاں بھی سڑکیں خالی خالی نظر آرہی تھیں۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہیرو میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور کسی گائیڈ کے سے انداز میں بتاتا جا رہا تھا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں اور ہمارے اردگرد کون سی مشہور عمارات واقع ہیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری معلومات اس سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔ تاہم اس کا دل رکھنے کے لیے میں نہ صرف خاموش تھا بلکہ گاہے گاہے اس کی اطلاعات پر گہری دلچسپی کا اظہار بھی کرتا تھا۔ روپا اور صفدر پچھلی نشست پر تھے۔ صفدر نے بڑی "ملائمت اور شائستگی" کے ساتھ پٹل کی نال روپا کی پسلیوں سے لگا رکھی تھی۔ روپا مشکل میں تھی

اس کے باوجود وہ مجھ میں اور صفدر میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ بالکل جیسے ہم کوئی مشہور و معروف اداکار ہوں اور اتفاقاً ایک عادی فلم بین سے ہماری ملاقات ہوگئی ہو۔ اس نے صفدر کے ساتھ پھر وہی دفینے والا موضوع چھیڑ رکھا تھا۔

وہ بولی "میں آپ دونوں سے چھپا چاہتی ہوں' لیکن میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی کہ آپ جیسے جہاں دیدہ لوگوں نے ایک غیر ملکی پر اتنا اعتماد کیوں کرلیا؟"

میں نے کہا "ایسے سوالوں کا جواب دیا نہیں جاسکتا' صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔"

"تو مجھے بھی محسوس کرادیں۔"

صفدر نے کہا "فی الحال تم صرف یہ محسوس کرو کہ تم مشکل میں ہو اور بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ تمہارا عاشق یا پتی دیو جو بھی ہے' کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے اور تمہارا سندر شریر (جسم) گولیوں کے سوراخوں سے محفوظ رہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم بندرگاہ کے علاقے میں داخل ہوگئے مہاراشٹر کی یہ بندرگاہ اپنی وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں چوبیس گھنٹے رونق رہتی ہے۔ کنارے پر لگی ہوئی بڑی بڑی فیریوں' لانچوں اور کشتیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم چینل نمبر دو کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں قدرے خاموشی تھی۔ شپ یارڈ کے عقب میں ایک وسیع احاطہ تھا' اردگرد کائن کے گودام تھے اور تاروں کی روشنی میں "پام" کے بلند و بالا درخت آخیر شب کی ساحلی ہوا میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ کنارہ ہماری دائیں جانب تھا اور یہاں وہ ڈونگا موجود تھا جو ہمیں مال بردار جہاز "ہرکولیس" سے ساحل پر لایا تھا۔

حسب توقع احاطے میں چاپر کی نیلی شیورلیٹ موجود تھی۔ اس نے ہیڈلائٹس دوبار آن کرکے بجادیں۔ ہم اپنی کار شیورلیٹ کے بالکل قریب لے گئے۔ شیورلیٹ کی اندرونی بتی روشن ہوئی۔ اندر تینوں لڑکیوں کی موجودگی کا پتا چل رہا تھا۔ وہ عقبی نشست پر بیٹھی تھیں۔ ہم نے بھی اندرونی بتی جلائی اور چاپر کو روپا جان کی موجودگی کا ثبوت دے دیا۔ چند لمحے بعد شیورلیٹ کے دروازے کھلے۔ پہلے چاپر اور اس کا ساتھی نکلے' پھر تینوں لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ صفدر بھی روپا جان کو لے کر باہر نکل آیا۔ روپا نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا اور چاپر کی طرف چلی گئی۔ تینوں لڑکیاں ہمارے پاس آگئیں۔ وہ ڈری سہمی ہوئی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ہم نے انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔ کسی متوقع خطرے سے نمٹنے کے لیے میں نے ٹرپل ٹو رائفل اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ یہ رائفل کار کے اندر ہی موجود تھی اور اس کا اہتمام مائیکل نے کیا تھا۔

بہرحال کسی پیچیدگی کے بغیر یہ معاملہ نمٹ گیا۔ ہم لڑکیوں کے ساتھ ڈونگے پر پہنچ گئے۔ ڈونگے کا "ڈرائیور" اپنی جگہ چوکس موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کردیا۔ اسی دوران میں ایک پولیس جیپ ہمارے سامنے سے گزری۔ چاپر کی شیورلیٹ کے پاس سے ہوکر وہ آگے نکل گئی۔ چالیس پچاس گز آگے جاکر جیپ نے بریک لگائے اور ریورس ہوکر واپس شیورلیٹ کے پاس آگئی۔ غالباً پولیس والوں کو شیورلیٹ پر کسی قسم کا شک گزرا تھا۔ ہم یہ سارا منظر ڈونگے کے اندر سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس پارٹی چھلانگیں لگا کر جیپ سے نیچے اتر آئی' پھر میں نے دیکھا کہ پارٹی کا انچارج جو یقیناً ڈی ایس پی تھا' چاپر سے مکالمہ کررہا تھا۔ اچانک ماؤزر کے دو فائر ہوئے' میں نے دو پولیس والوں کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی روپا کی سُریلی چیخ سنائی دی تھی۔ ماؤزر یقیناً چاپر کے ہاتھ میں تھا۔ فائرنگ ہوتے ہی پولیس والے ایک دم تتر بتر ہوگئے۔ چاپر روپا اور ان کا ایک ساتھی کنارے کی طرف بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے چاپر نے پولیس والوں کی طرف تین فائر کیے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چاپر کنارے پر کھڑے ایک بڑے لوڈر کے عقب میں پوزیشن لینا چاہ رہا ہے مگر ابھی وہ لوڈر سے کچھ دور ہی تھا کہ اندھیرے میں شرارے چمکے اور اوپر تلے تین چار دھماکے ہوئے۔ یہ فائرنگ پولیس والوں کی طرف سے تھی۔ چاپر کے ساتھی کو پشت میں گولیاں لگیں اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ چاپر اور روپا لوڈر کے عقب میں پوزیشن لینے میں کامیاب ہوگئے۔

ڈرائیور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "وڑی بڑا زبردست لفڑا ہوگیا ہے۔ اپن نکل چلیں یہاں سے۔"

میں نے اس کا کندھا دبایا "نہیں ابھی رکو۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ چاپر اپنی ساتھی سمیت پولیس والوں میں گھر گیا تھا۔ وہ تین اطراف سے اس پر گولیاں چلا رہے تھے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم بہ آسانی یہاں سے نکل سکتے تھے لیکن نجانے کیوں مجھے اس عورت کا خیال آرہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا' اسے شادی کی تقریب سے اٹھا کر یہاں لانے کے ذمے دار ہم ہی تھے۔ میرے ذہن نے قبول نہیں کیا کہ ہم دونوں ان کو نصف درجن مسلح پولیسوں کے نرغے میں چھوڑ کر یہاں سے نکل جائیں' خاص طور سے ایسی صورت میں کہ ہم بہ آسانی ان کی مدد بھی کرسکتے تھے۔ پھر ایک اور خاص بات۔۔۔ بہت خاص بات بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمکی اور

میں نے پولیس والوں کی مزاحمت کا فیصلہ کرلیا۔۔۔ میں نے ملتجی طلب نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اثبات میں سرہلایا۔ اس کے ہاتھوں میں تو بڑی دیر سے کھجلی ہورہی تھی۔ میں اس کے مزاج کو بخوبی سمجھتا تھا' جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر گھڑی ہنگامے اور ہلچل میں گزرے۔ ہم دونوں راہ چلتے جھگڑے مول لیں۔ مارکٹائیاں کریں اور ضروری نہیں کہ ماریں ہی' بے شک مار بھی کھائیں۔ اس کا خیال تھا کہ بوقتِ ضرورت مار کھانے اور زخمی ہونے کا بھی ایک لطف ہوتا ہے اور جو شخص مار کھانے سے ڈرتا ہے وہ کسی کو مار بھی نہیں سکتا۔

میں نے صفدر کی طرف سے تائید ہوتے ہی میں نے ڈونگے کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ڈونگے کو کنارے کے ساتھ چلا کر سڑک پر کھڑے لوڈر کی طرف لے جائے۔ ڈرائیور نے تذبذب دکھایا تو میں نے ہیرو کو اشارہ کیا۔ ہیرو کے کہنے پر وہ ڈونگے کو لوڈر کی طرف لے گیا۔ ہیرو بل مین کار سے ٹرپل ٹو نکال کر ڈونگے میں ہی لے آیا تھا۔ میں نے ٹرپل ٹو تھامی اور چلا کر کہا "چاپر! پیچھے ڈونگے میں آجاؤ۔"

چاپر نے میری بات سن لی اور سمجھ بھی لی۔ میں نے اور صفدر نے ڈونگے سے پولیس والوں پر فائر کھول دیا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ یہ شیر دل پلیسے اکیلے بندے کو دیکھ کر بہادر بنے ہوئے تھے' جب انہیں اندازہ ہوا کہ مزاحمت کرنے والے زیادہ ہیں تو ایک دم پوزیشنیں چھوڑ کر مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اس موقع پر چاپر نے ہوشیاری کا مظاہرہ کیا اور روپا کے ساتھ بھاگ کر ڈونگے میں کود گیا۔ اسے فرار ہوتے دیکھ کر دو ڈھیٹ قسم کے پولیس والے ایک دم ڈونگے کی طرف لپکے' میں نے بے دریغ ان کی ٹانگوں پر فائر مار کر انہیں زخمی کردیا۔ اسی دوران میں صفدر نے ڈرائیور کا کندھا دبا کر اسے چلنے کا اشارہ کردیا تھا۔ ڈونگا مڑا اور برق رفتاری سے کھلے سمندر کی طرف روانہ ہوگیا۔ چلتے ڈونگے پر کسی نے فائر نہیں کیا۔ جس جگہ ڈونگا کھڑا تھا وہاں اردگرد کوئی دوسرا ڈونگا یا لانچ وغیرہ موجود نہیں تھی۔ پولیس والے ہمارا پیچھا کرنے سے قطعی طور پر قاصر تھے۔ جب تک وہ طویل چکر کاٹ کر شپ یارڈ کی دوسری جانب پہنچتے اور کوئی سواری حاصل کرنے کی کوشش کرتے' ہم دور نکل سکتے تھے مگر خاص بات یہ تھی کہ ہم دور نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اپنا رخ گودی کی طرف رکھے۔ ڈرائیور الجھن سے میری طرف دیکھنے لگا۔

صفدر نے میرے کان میں کہا "اگر ہم سیدھا جہاز کی طرف نکلیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

"لیکن میں "زیادہ اچھا" نہیں چاہتا۔" میں نے بھی جوابی سرگوشی کی "میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے پیچھے آئیں۔"

"کون؟"

"پولیس والے!" میں نے کہا۔

صفدر نے تعجب سے میری طرف دیکھا' پھر جیسے ایک دم ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس کے چہرے پر روشنی سی لپک گئی تھی۔۔۔ وہ جان گیا تھا کہ اگر ہم پولیس کی نظروں میں آجاتے ہیں اور ہماری وجہ سے مائیکل کا مال بردار "ہرکولیس" مشکوک ہوجاتا ہے تو اس میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہے۔ جہاز پر پولیس کی چڑھائی ہوجاتی تو اس "غیر قانونی و مجرمانہ سفر" کو بریک لگ جاتے جو ہمیں اور سیکڑوں دوسرے لوگوں کو کسی انجانی منزل کی طرف لے جارہا تھا۔ اس وقت اس اذیت ناک سفر کا رکنا باقی سب باتوں سے زیادہ اہم تھا۔

قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک بجرا کھلے سمندر میں لنگر انداز تھا۔ اس کی بیشتر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہمارے ڈونگے کو بجرے کے قریب سے گزرنا تھا۔ میں نے چاپر سے کہا۔

"چاپر ڈیئر! تم اور تمہاری ڈارلنگ چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم اس بجرے پر آسانی سے پناہ حاصل کرلوگے۔"

چاپر نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور روپا کا بازو پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ روپا کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ پانی میں ہاتھ پاؤں چلانا جانتی ہے۔

چاپر بولا "میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن افسوس کہ ہمارا رشتہ دشمنی کا ہے۔"

"چلو تمہارا ایک لفظ بچ گیا۔"

"تمہارے بھی تو ستر لاکھ بچ گئے۔" چاپر نے طنز کیا۔

"چلو پھر حساب کتاب کرلیں گے۔" میں نے کہا "شنکر سے بولنا کہ یہ قرض بھی ڈائری میں لکھ لے۔"

بجرا بالکل قریب آگیا تھا۔ اس کا ڈیک زیادہ اونچا نہیں تھا۔ چاپر نے پہلے ماؤزر ڈیک پر پھینکا' پھر بھی سنوری روپا کے ساتھ ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یہی وقت تھا جب کہیں دور۔۔۔ عقب میں کسی لانچ کی متحرک روشنیاں دکھائی دیں اور مخصوص ہارن کی آواز آئی۔

"کوسٹ گارڈز آرہے ہیں۔" ہیرو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کوسٹ گارڈز آرہے ہیں۔ اب کیا کریں؟" ہیرو نے دوبارہ چیخ کر کہا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کوسٹ گارڈز ہیں؟"

"وڈی آپ نے سائرن کی آواز نہیں سنی۔ یہ کوسٹ گارڈز کا خاص سائرن ہے۔ پھر آپ بڑی لائٹس کے اوپر وہ چھوٹی سرخ لائٹ بھی تو دیکھ رہے ہیں۔ یہ لائٹ گارڈز کی لانچوں پر ہی ہوتی ہے۔" اس نے دور لانچ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟" صفدر نے مصنوعی گھبراہٹ سے کہا۔

"اپن کا پرسنل خیال ہے کہ ہم دائیں طرف جائیں۔ وہاں کنارے پر بڑے بڑے جہاز کھڑے ہیں۔ ان کی اوٹ میں پہنچ کر ہم ڈونگے سے نکل بھاگتے ہیں۔"

"لیکن ان جہازوں تک پہنچتے پہنچتے یہ لانچ ہمیں آلے گی۔"

"وڈی آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری رائے تو یہ ہے کہ ہم "ہرکولیس" کی طرف ہی جائیں۔ سیڑھی لٹک رہی ہوگی، ہم لانچ کے پہنچنے تک شپ پر پہنچ جائیں گے۔ خالی ڈونگا چالو حالت میں سمندر پر چھوڑ دیں گے۔ وہ خود ہی کسی طرف نکل جائے گا؟"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر اپن کو جلدی کرنا ہوگی۔" ہیرو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، پھر وہ میرے بولنے سے پہلے ہی ڈونگے کے ملاح کو احکامات جاری کرنے لگا۔

ڈونگے کی رفتار تیز ہوگئی اور اس کا رخ سیدھا مال بردار جہاز "ہرکولیس" کی طرف ہوگیا۔ ہرکولیس کا ہیولا سمندر میں صاف نظر آرہا تھا۔ وہ دو دوسرے جہازوں کے پہلو میں لنگر انداز تھا۔ اس کی بیشتر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ تاریک افق کے پس منظر میں وہ ایک طویل پرچھائیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ہمارا ڈونگا تاریک پانی کو کاٹتا ہوا تیزی سے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ملاح نے اس کی لائٹس آف کردی تھیں، مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کو ہیڈلائٹ آن کرنا پڑتی تھی۔ تینوں لڑکیاں ہماری افراتفری سے بے نیاز ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھیں۔ تیز رفتاری کے سبب کسی وقت ڈونگے کو زور سے ہچکولا لگتا تو وہ ایک دوسری کے اوپر ڈھیر سی ہوجاتیں۔ ایک مرتبہ تو ہچکولا اتنا زوردار تھا کہ ایک لڑکی کے منہ سے ہلکی چیخ نکل گئی۔ جوں جوں ہم جہاز کے قریب پہنچ رہے تھے اس کی جسامت اور بلندی زیادہ محسوس ہورہی تھی۔ سیڑھی جہاز کی دوسری جانب تھی۔ ہمیں کلداکاٹ کر سیڑھی کی طرف جانا تھا۔ لانچ اب کافی نزدیک آچکی تھی۔

ہیرو نے مایوسی سے کہا "اپن کا خیال ہے کہ ہم اوپر نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"چلو کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"اس کوشش میں انہوں نے گولی چلا دی تو ہم سب پھڑک جائیں گے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"پھر اب کیا کریں؟"

"تت... تم نے سخت بے وقوفی کی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی پھنسا دیا ہے۔"

ڈونگا اب چکر کاٹ کر سیڑھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لانچ کی روشنیاں بالکل واضح دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان کا فاصلہ بمشکل دو ڈھائی سو گز تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ ایک پرچھائیں سی ڈونگے سے اچھل کر سمندر میں جاگری۔ یہ ہیرو تھا۔ اس نے ڈونگے کے پچھلے حصے سے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی اور سطح کے نیچے غائب ہوگیا تھا۔ ابھی میں اور صفدر ہیرو کو ہی دیکھ رہے تھے کہ ڈونگے کو پھر جھٹکا لگا۔ اور ایک پرچھائیں اچھل کر سمندر میں غائب ہوگئی۔ اس مرتبہ ڈونگا چلانے والے نے سمندر میں جست لگائی تھی۔ میں اور صفدر ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں احساس ہوا کہ یہ دونوں افراد کوسٹ گارڈز سے کتنے دہشت زدہ تھے۔

ڈونگا بغیر کسی کنٹرول کے برق رفتاری سے اڑا چلا جارہا تھا۔ وہ بے مہار تھا لہٰذا اپنی مرضی سے بائیں رخ پر مڑتا چلا جارہا تھا۔ میں نے صفدر سے کہا "ان لڑکیوں پر نظر رکھو۔"

صفدر اپنا ریوالور نکال کر چوکس کھڑا ہوگیا۔ میں نے ڈونگے کا کنٹرول سنبھالا۔ اس سے پہلے میں نے کنٹرول کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ویسے بھی تاریکی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے وہیل گھمایا تو ڈونگا ایک دم بائیں رخ پر جھک گیا۔ لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے ایکسیلریٹر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اسی دوران میں ڈونگے کی رفتار کم ہوگئی اور اسے جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔ جہاز سے لٹکتی ہوئی سیڑھی ہمیں سامنے نظر آرہی تھی۔ اوپر عرشے پر چند ایک ہیولے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً انہوں نے ڈونگا پہچان لیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا رہے تھے اور بلند آواز میں چلا رہے تھے۔ ڈونگا اب ایک دائرے کی شکل میں گھومتا چلا جارہا تھا۔ شاید میں کوشش کرتا تو اسے سیدھا کرنے میں کامیاب ہوجاتا لیکن اسے سیدھا کرنے میں مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میری خواہش تھی کہ کوسٹ گارڈز کی لانچ جلد از جلد ہم تک پہنچ جائے... اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جس وقت ہمارا ڈونگا سمندر میں جھولتی ہوئی سیڑھی کے قریب پہنچا، ساحلی محافظوں کی لانچ بھی موقع پر پہنچ گئی۔ لانچ کو دیکھتے ہی جہاز والوں نے رسے

کی سیڑھی فوراً اوپر کھینچ لی۔ لانچ کافی بڑی تھی۔ اس کے اوپر لمبی نال کی گن صاف نظر آرہی تھی۔ گن کے عقب میں باوردی محافظوں کی ٹوپیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لانچ پر سے میگا فون کے ذریعے اعلان کیا گیا "خبردار! تم لوگ ہمارے نشانے پر ہو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو پار ہوجاؤ گے۔ اپنی بتیاں جلا دو اور انجن بند کردو۔"

ہم بھاگنا کون کافر چاہتا تھا۔ ہماری تو خواہش تھی کہ ہم پکڑے جائیں اور نتیجے میں یہ مال بردار "ہرکولیس" بھی پکڑا جائے۔ ہرکولیس پکڑا جاتا تو "غلاموں" کی وہ کھیپ بھی پکڑی جاتی جو اس جہاز کے ذریعے نامعلوم منزل کی طرف لے جائی جارہی تھی۔

لانچ پر سے دوبارہ اعلان کیا گیا "اپنی رکھشا چاہتے ہو تو بتیاں جلا دو اور انجن بند کردو۔"

میں نے دائیں بائیں ہاتھ چلا کر اگنیشن سوئچ تلاش کیا اور انجن بند کردیا۔ لانچ ہمارے ڈونگے کے ساتھ آن لگی۔ کوسٹ گارڈز چھلانگیں لگا کر ڈونگے پر آگئے۔ ان کے پاس خودکار رائفلیں تھیں اور تیور خطرناک تھے۔ ہمیں ہینڈز اپ کرایا گیا۔ پھر ہمارے ریوالوروں کے علاوہ ٹریل ٹورا تفل بھی قبضے میں لے لی گئی۔ کوسٹ گارڈز کے ساتھ پولیس کا ایک ڈی ایس پی بھی تھا، یقیناً یہ وہی ڈی ایس پی تھا جس نے پولیس پارٹی کے ساتھ چاپر کو روکا تھا اور نتیجے میں فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ کوسٹ گارڈز کا انچارج لحیم شحیم جسم والا ایک خطرناک صورت شخص تھا۔ اس نے بے حد للچائی ہوئی نظروں سے تینوں لڑکیوں کو دیکھا اور اپنی مونچھوں کو بل دینے لگا "کھڑی ہوجاؤ!" اس نے گرج کر کہا۔

وہ تینوں سہم کر کھڑی ہوگئیں۔ انچارج نے ہمارے علاوہ ان تینوں کی جامہ تلاشی بھی لی۔ اس کی تلاشی کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ "دست درازی" کررہا ہے۔ کوئی اور لڑکیاں ہوتیں تو انچارج کی اس واہیاتی پر سخت احتجاج کرتیں مگر وہ تو زر خرید کنیزیں تھیں۔ پچھلے چند ماہ میں ان کی عزت نفس اور احساس خودی کو اتنے چرکے لگ چکے تھے کہ وہ مٹی کی مورتیں بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کا اپنا کوئی ارادہ تھا نہ احساس اور نہ سوچ... ان کی حالت دیکھ کر ترس آتا تھا، کیونکہ عورت کی اصل کشش اس کی آن بان اور ادائے بے نیازی میں ہی ہوتی ہے۔

ہم کانچوں کو ڈونگے میں سے نکال کر لانچ پر سوار کردیا گیا۔ ڈونگے کو رسی کی مدد سے لانچ کے پیچھے باندھ دیا گیا۔ انچارج جو ایک سیاہی مائل ہندو تھا، مجھ سے مخاطب ہو کر کرخت لہجے میں بولا "ہاں جی! سرکاریں کدھر سے تشریف

محی الدین نواب کی نایاب کہانیاں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کردینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
دو جلدیں
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20 اردو بازار لاہور Ph: 7247414

لائی ہیں اور ان چھوکریوں کو کہاں سے اڑایا ہے؟"

"ہم یہیں بمبئی کے رہنے والے ہیں اور یہ لڑکیاں ہماری دوست ہیں۔"

ڈی ایس پی غرایا "اس دوستی کی تو بڑی اچھی طرح تفتیش کریں گے ہم۔ پہلے یہ بتاؤ کہ چاپر اور اس کی ساتھی لڑکی کہاں ہیں؟"

"مجھے ان دونوں کا نام معلوم نہیں۔" میں نے کہا "بہرحال وہ جو بھی تھے انہوں نے راستے ہی میں کہیں چھلانگ لگا دی تھی۔ اردگرد بہت سی کشتیاں موجود تھیں۔ مجھے نہیں امید کہ تم انہیں ڈھونڈ سکو گے۔"

ڈی ایس پی نے کہا "انہیں ڈھونڈنا ہمارا کام ہے بچو۔ تم بتاؤ کہ اپنے اس مامے چاپر سے کیا سمبندھ (تعلق) ہے تمہارا؟"

"میں نہیں جانتا کہ تم کس چاپر کی بات کر رہے ہو۔ ہم نے بس اتنا دیکھا کہ ایک اکیلے بندے اور اس کی ساتھی لڑکی پر بہت سے لوگ فائرنگ کر رہے ہیں۔ اس ڈونگے کے ملاح نے ان دونوں کی مدد کے لیے انہیں ڈونگے میں بلا لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ فائرنگ کرنے والے تو پولیس کے بندے ہیں، بس اتنی سی بات ہے۔"

ڈی ایس پی نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور دانت پیس کر کہا "بس اتنی سی بات ہے۔ اور وہ پولیس پر فائرنگ کس بہن کے پھنکنے نے کی تھی؟"

صفدر بولا "مہاراج! ہم سوگند کھا سکتے ہیں کہ ہم نے فائرنگ نہیں کی۔ بلکہ ہمیں پتا چل جاتا کہ مقابلے میں پولیس ہے تو شاید ہم ان دونوں کی مدد بھی نہ کرتے۔"

ڈی ایس پی نے صفدر کو گالی دی اور "ٹرپل ٹو" پر ہاتھ رکھ کر بولا "یہ ماں جو تمہارے ڈونگے سے نکلی ہے یہ کس کی ہے۔ اسی سے فائرنگ کر کے دو پولیس اہلکاروں کو زخمی کیا گیا ہے۔"

"رائفل بے شک ہماری تھی لیکن فائر اسی بندے نے کیا تھا جسے تم چاپر کہہ رہے ہو۔"

کوسٹ گارڈز کے انچارج نے بڑی کمینی نظروں سے لڑکیوں کو گھورا اور بولا "جب تمہارے سامنے تمہاری ان چھوکریوں کی "عزت افزائی" کروں گا تو یہ سب کچھ بتائیں گی اور تم بھی بتاؤ گے۔"

صفدر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غالباً وہ انچارج کی بات کا کوئی کڑا کے دار جواب دینا چاہ رہا تھا مگر پھر اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ جہاز کے اوپر سے لانچ پر نہایت تیز روشنی پھینکی گئی۔ ہم سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر جہاز کے اوپر سے نائب کپتان نے میگا فون کے ذریعے لانچ والوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ وہ جہاز کا نائب کپتان فلیمنگ بول رہا ہے اور وہ ان کے عملے سے بات کرنا چاہتا ہے۔

لانچ پر سے کوسٹ گارڈز کے انچارج نے کہا "جو بھی بات کرنا چاہتا ہے، وہ نیچے آ کر بات کرے اور خبردار! اسے بے مسلح ہونا چاہیے۔"

نائب کپتان نے کہا "ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ ہم نیچے آ رہے ہیں۔"

اس کے فوراً بعد جہاز کے پہلو سے لٹکتی ہوئی سیڑھی پر تین افراد نظر آئے۔ کم روشنی کے باوجود میں پہچان گیا۔ ان میں سے ایک مائیکل خود تھا۔ سیڑھی سے اتر کر وہ ایک ڈونگے پر بیٹھے اور ہماری لانچ کے قریب پہنچ گئے۔ مائیکل نے لانچ پر دونوں مطلوبہ لڑکیوں کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم ٹھیک تو ہو؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہی رہو گے۔" مائیکل نے کہا۔ اس کے لہجے میں گہرا اعتماد تھا۔

میں نے ایک خاص چیز نوٹ کی۔ مائیکل کو دیکھ کر کوسٹ گارڈز کے چہرے پر شناسائی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کے چہروں پر نظر آنے والی درشتی بھی کم ہو گئی تھی۔

"آپ سے شاید کہیں پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔" انچارج نے مائیکل سے کہا۔

"ضرور ہوئی ہو گی۔ بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارا نام امرناتھ ہے شاید۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے بھی آپ کا اسم شریف یاد آ رہا ہے۔" امرناتھ نے کہا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈونگے میں چلے گئے۔ ڈی ایس پی بھی ان کے پیچھے ڈونگے میں چلا گیا، مسلح کوسٹ گارڈز نے ہم پر رائفلیں تان رکھی تھیں اور کسی طرح کا رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے اور صفدر کو قیدیوں کی طرح لانچ کے فرش پر بٹھا رکھا تھا اور خود ہمارے سروں پر مسلط تھے۔ یہ کل چار افراد تھے۔ ان میں سے دو قدرے سست تھے جبکہ دو تیز تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اور صفدر مزاحمت پر اتر آئیں تو ان چاروں افراد کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتے ہیں۔ لیکن مزاحمت ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھی اور نہ ہی ہم کرنا چاہتے تھے۔

ڈونگے میں مائیکل، وائس کپتان فلیمنگ، کوسٹ گارڈز کے انچارج اور ڈی ایس پی کے درمیان مذاکرات طویل

ہو گئے۔ ڈونگے کے سامنے والے حصے میں سائبان سا موجود تھا۔ وہ چاروں سائبان کے عقب میں تھے۔ ہمیں ان کی صورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں، تاہم بلند آواز میں کہا گیا کوئی کوئی فقرہ ہم تک پہنچ رہا تھا۔ قریباً پندرہ منٹ بعد کوسٹ گارڈز کا انچارج امرناتھ اپنے ساتھی ڈی ایس پی کے ساتھ نمودار ہوا اور ان دونوں نے تینوں لڑکیوں کو بڑے احترام کے ساتھ ڈونگے میں واپس پہنچا دیا۔ یہ ایک حیرت ناک واقعہ تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر حیرت ناک واقعہ یہ تھا کہ ہمیں بھی ہماری "ٹرپل ٹو" رائفل سمیت بصد احترام ڈونگے میں پہنچا دیا گیا۔ نہ صرف ڈونگے میں پہنچا دیا گیا بلکہ ڈی ایس پی نے میرے بال کھینچے اور انچارج نے ہمیں زمین پہ بٹھانے پر باقاعدہ معذرت بھی کی۔ یہ طرفہ تماشا تھا۔ ہم نے واضح طور پر چاپر اور اس کی داشتہ کی مدد کی تھی، بلکہ ان دونوں کی طرف سے لڑتے ہوئے پولیس والوں پر گولیاں بھی برسائی تھیں۔ اس فائرنگ سے دو پولیس اہلکار زخمی ہوئے تھے اور ٹھیک ٹھاک زخمی ہوئے تھے۔ مگر ہمارے یہ سارے پاپ پلک جھپکتے میں معاف ہو گئے تھے اور ہم باعزت بری ہو کر لانچ سے ڈونگے میں جا رہے تھے۔ یہ ساری تعلقات کی کرامات تھی اور مایا دیوی کا کرشمہ تھا۔ پتا نہیں کہ افسران اور جہاز رانوں کی ملی بھگت کے ذریعے اس بندرگاہ پر کیا کیا ہو رہا تھا۔ ڈونگے میں پہنچ کر میرا اور صفدر کا چہرہ لٹک گیا۔ جو ہم نے سوچا تھا وہ نہیں ہو سکا تھا۔ ہم بھارت دیش کے محترم "قانون" کو اپنے پیچھے لگا کر جہاز تک لے آئے تھے لیکن اس کے باوجود قانون بردہ فروشوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ بلکہ لانچ میں قانون اور بردہ فروشوں کے درمیان راز و نیاز ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں تینوں لڑکیوں سمیت واپس جہاز پر پہنچا دیا گیا۔ مائیکل اور نائب کپتان فلیمنگ انڈین افسران سے نمٹ کر واپس جہاز پر آ گئے تھے۔ انڈین افسروں کو کچھ قیمتی تحفے تحائف پیش کیے گئے تھے۔ یہ تحائف ایک پیٹی میں بند تھے۔ اس کے علاوہ یقیناً ان کی مٹھیاں بھی ٹھیک ٹھاک گرم کی گئی تھیں۔ پولیس افسران سے فارغ ہو کر مائیکل میرے اور صفدر کے پاس آ بیٹھا۔ وہ اس واقعے کی پوری تفصیل جاننا چاہ رہا تھا۔ میں نے شروع تا آخر سب کچھ مائیکل کے گوش گزار کر دیا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ بسواجیت چاپر سے لڑکیوں کا سودا طے کرنے میں ناکام ہو کر ہم نے اس کی داشتہ اغوا کر لی تھی۔ عین ساحل پر پیش آنے والے واقعے کے متعلق بھی میں نے سب کچھ بتایا۔ اس معاملے میں سچ بولنا بہتر تھا۔ کیونکہ اگر ہیرو یا ڈونگے کا ملاح جہاز پر پہنچ جاتے

شناخت

تو انہوں نے ساری حقیقت مائیکل کو بتا دینا تھی۔ ایسی صورت میں ہماری غلط بیانی ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے مائیکل کو بتایا کہ ہم نے صرف چند فائر دو پولیس والوں کو زخمی کرنے کے لیے کیے تھے۔ اس کے علاوہ اس پولیس مقابلے میں ہمارا کوئی کردار نہیں تھا۔

مائیکل بولا "تمہیں کیا ضرورت تھی ہیرو بننے کی؟ لڑنے مرنے دیا ہوتا اس حرامی (چاپر) کو پولیس والوں کے ساتھ۔"

"اس کے ساتھ لڑکی تھی اور وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی، اس وقت ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان پر حملہ کرنے والے پولیس کے بندے ہیں۔ لڑکی کی چیخ و پکار سن کر بس کیڑا رینگ گیا دماغ میں۔ ایسے موقعوں پر یہ رینگ ہی جایا کرتا ہے۔"

میں مائیکل کو کیسے بتا سکتا تھا کہ دماغ میں کیڑا ویڑا کوئی نہیں رینگا تھا۔ ہم نے اپنے انداز میں اسے اور اس کے جہاز کو مشکوک بنانے کی ایک کوشش کی تھی جو ناکام ہو گئی۔

مائیکل نے کہا "تم نے خواہ مخواہ ٹانگ اڑا کر غلطی کی۔ اس غلطی سے ہمیں شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ یہ تو ہماری خوش بختی ہے کہ جہاز کی چیکنگ کی نوبت نہیں آئی۔"

مائیکل شاید زیادہ غم و غصے کا اظہار کرتا لیکن ہم چونکہ کامیاب لوٹے تھے اور ہماری "کامیابی" تین نہایت خوب صورت لڑکیوں کی صورت میں مائیکل کے پاس تھی لہٰذا اس نے زیادہ سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ جہاز میں سوار ہوتے ہی "ٹرپل ٹو" رائفل ہم سے لے لی گئی تھی۔ وہ کرنسی نوٹ جو مائیکل نے روانگی کے وقت ہمیں دیے تھے، میں نے اسے جوں کے توں واپس کر دیے۔ وہ قدرے خوش نظر آنے لگا۔ بات تھی بھی خوش ہونے والی۔ ہم نہ صرف دو کے بجائے تین لڑکیاں جہاز پر لائے تھے بلکہ مائیکل کی وہ خطیر رقم بھی بچالی تھی جو وہ لڑکیوں کے عوض بسواجیت چاپر کو دینے پر آمادہ تھا۔

ہمیں واپس جہاز کے نچلے حصے میں بھیج دیا گیا۔ تاہم بھیجنے سے پہلے ہمیں وہی براؤن پائجامہ کرتہ پہنا دیا گیا جو اب تک ہم نے یہاں زیب تن کیے رکھا تھا۔ یہاں کیبن میں ہمارے ساتھی ہمارے منتظر تھے۔ وہ حیران تھے کہ تین دن تک ہم کہاں غائب رہے ہیں اور اب واپس کیسے آ گئے ہیں۔

شاید ان کو خدشہ تھا کہ ہمیں کسی غلطی کی پاداش میں سمندر کی نذر کردیا گیا ہے اور اب تک ہماری لاشیں مچھلیوں کے نظامِ ہضم میں پہنچ چکی ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ظاہر ہے کہ زریں گل کو ہی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ دل ہی دل میں وہ یقیناً کوئی طربیہ قسم کا گانا گنگنا رہا تھا۔ ایک ایسے ہی موقع پر اس نے ہمیں گا کر سنایا تھا "ام کو خوشیوں کے نال۔۔۔ آج چڑھ گئے ہیں حال۔۔۔ اور پھر وہ اردو گانا "ام خوشی سے کیوں نہ گائے' امارا دل بھی تو گا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے کیبن کے ساتھی حسبِ معمول گم صم اور سہمے ہوئے جانوروں کی طرح نظر آرہے تھے۔ زخمی چہرے والے اسلم کو پھر بخار تھا اور وہ غنودگی کی حالت میں بار بار نسرین کا نام پکار رہا تھا۔ بڑا کرب تھا اس کی آواز میں۔ کسی وقت وہ کسی جمشید کا نام لیتا اور اس سے معافیاں مانگنے لگتا۔ کبھی بالکل ناقابلِ فہم باتیں کرتا۔ اس کے چہرے کے زخم جو چند دن پہلے ٹھیک نظر آرہے تھے اب پھر خراب ہوگئے تھے۔ بخار بھی شاید انہی زخموں کی وجہ سے تھا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ترس آرہا تھا۔ زریں گل نے بتایا کہ کل پھر اس پر شدید دورہ پڑگیا تھا۔ اٹھ اٹھ کر بھاگتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے نسرین کے پاس لے چلو۔ وہ دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھ رہی ہوگی' وہ اور جمشید کیا سوچیں گے۔

ہمیں کیبن میں پہنچے بمشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ جہاز حرکت میں آگیا' بندریج اس کی رفتار بڑھتی گئی۔ بندرگاہ کی حدود سے نکل کر وہ درمیانی رفتار سے کسی نامعلوم سمت میں بڑھنے لگا۔ (ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا کہ شاید مائیکل اور ہیرو کی ملاقات پھر ہوجائے) ساری رات یہ سفر جاری رہا۔ مغضوب اسلم رات بھر کراہتا رہا۔ اس کا ادھیڑ عمر ساتھی نثار اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتا رہا۔ صبح تک اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ چہرے کی ایک جانب سوج گئی تھی اور انفیکشن کے آثار بڑے واضح تھے۔ مغضوب کو طبی امداد کی شدید ضرورت تھی لیکن یہاں کوئی سننے والا نہیں تھا۔ یہ اجڈ حبشی ہر وقت خوں خوار کتوں کی طرح ہمیں گھورتے رہتے تھے' خاص طور سے آدم خور منیامی پہرے دار تو جہاز کے اس حصے میں موت کا سناٹا سا چاہتے تھے۔ ان آدم خور منیامیوں کی تعداد تین تھی اور اگر مائیکل کو بھی شمار کرلیا جاتا تو یہ چار تھے۔

میرا اور صفدر کا خیال تھا کہ ہمارے کارنامے کے صلے میں مائیکل ہمارے ساتھ کچھ نہ کچھ رعایت ضرور برتے گا اور کچھ نہیں تو ہمیں ان بدبودار سرد کیبنوں سے نکال کر نسبتاً بہتر جگہ پر منتقل کردیا جائے گا' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا' بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے پہرے دار پہلے سے زیادہ سختی کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں۔ بمبئی کی بندرگاہ سے جو نئے افراد "بردوں" کی حیثیت سے سوار ہوئے تھے' ان میں عورتیں اور چند بچے بھی تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی ایک ہی قبیلے یا برادری کے لوگ ہیں۔ ان عورتوں اور بچوں میں سے کوئی کسی وقت گھبرا کر رونے دھونے لگتا تو حبشی شعلۂ جوالہ بن جاتے۔ وہ رونے والے کو بری طرح ڈراتے دھمکاتے تھے اور مار پیٹ سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

یہ اسی شام کا ذکر ہے۔ میں اور صفدر کیبن کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے' صفدر نے پائجامے کے نیفے میں ہاتھ ڈالا اور سونے کا ایک چھوٹا سا ہار مجھے دکھانے لگا۔ ہار میں زمرد کے ٹکڑے تھے اور یہ چھوٹا ہونے کے باوجود خاصا قیمتی تھا۔ میں نے پوچھا "یہ کس کا ہے؟"

وہ مسکرایا "چاپر کی بیوی نما داشتہ روپا کا۔"

"تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

"ہار کیا ہے۔" وہ آنکھ میچ کر بولا۔

"مگر۔۔۔ کیسے؟" میں حیران رہ گیا۔

وہ بولا "یہ ہیرو بڑی دھانسو قسم کی چیز تھا۔ شکل ششی کپور جیسی تھی لیکن اندر سے پریم چوپڑہ تھا۔ جب پولیس مقابلے سے بچ کر چاپر اور روپا ہمارے ڈونگے میں کودے تو یہ ہار روپا کے گلے سے نکل کر گر گیا تھا۔ ہیرو نے سب کی نظر بچا کر جیب میں ڈال لیا۔ میں نے دیکھ لیا اور موقع دیکھ کر اس کی جیب سے نکال لیا۔ اس وقت تک روپا اور چاپر ڈونگے سے اتر چکے تھے لہٰذا یہ میرے پاس ہی پڑا رہ گیا۔"

اس دلچسپ سچویشن پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی طرف سے ہیرو نے تیر مارا تھا اور جب وہ ڈونگے سے سمندر میں کودا تھا تو اس زعم میں تھا کہ ہار اس کی جیب میں ہے۔

"بدبخت شکل سے ہی اول درجے کا خرانٹ نظر آتا تھا۔"

"خرانٹ جیسا خرانٹ جناب۔۔۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ ہماری جیبوں میں کرنسی نوٹ موجود ہیں۔ میرے سامنے بار بار اپنی بیوی کی بیماری کا رونا رو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقتِ رخصت ہم سے اچھی خاصی ایڈ حاصل کرلے گا۔ وہ تو اسے افراتفری میں بھاگنا پڑا ورنہ اس کھوچل سے جان چھڑانا مشکل ہوجاتی۔"

"وڈی جان تو اس لیے چھوٹی کہ لفڑا ہوگیا تھا' ورنہ

بمبئی کا یہ بابو این کو ضرور کوئی چوٹ دے جاتا۔" میں نے ہیرو کے لہجے میں کہا تو صفدر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

میں اور صفدر باتوں میں مصروف رہے' رات قریباً نو بجے کا وقت تھا جب ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ غزالہ بچے "تابی" کو اٹھائے سیڑھیاں اتر رہی ہے۔ اس کے عقب میں رائفل مین تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ غزالہ کو بھی اب انہی کیبنوں میں رکھا جائے گا۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ تین دن پہلے اپنی آخری ملاقات میں غزالہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جہاز کے نائب کپتان کا علاج کررہی ہے اور اس کے حلے میں اسے جہاز کے بالائی حصے میں آرام دہ رہائش دی گئی ہے وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی سفارش پر گلثوم کو بھی کیبنوں سے نکال کر اس کے پاس منتقل کیا جارہا ہے۔ لیکن اب بالکل الٹی گنگا بہتی نظر آرہی تھی۔ غزالہ خود بھی ان سیلن زدہ کیبنوں میں آرہی تھی۔

غزالہ اور تابی ہمارے کیبن کے سامنے سے گزر کر آگے چلے گئے۔ غزالہ کی نگاہ ایک ثانیے کے لیے مجھ سے ملی۔ اس کی نگاہ میں کئی سوال تھے اور دوری کا احساس تھا۔ کچھ دیر بعد خوفناک منیامی پہرے دار دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ ہمارے دروازے کے سامنے پہنچا۔ یہ تینوں افراد مسلح تھے۔ صفدر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جزاؤ ہار دوبارہ نیفے میں ڈال لیا۔ حسبِ سابق کیبن کا دروازہ کھولا گیا۔ سب سے پہلے مجھے باہر نکلنے کا حکم ملا۔ پھر صفدر اور زریں' دروازہ پھر بند کردیا گیا۔ دو رائفلوں کے نشانے پر ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا "کہاں لے جارہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری لاٹری نکل آئی ہے۔" ایک حبشی نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم لوگوں کو تمہاری معشوقاؤں کے ساتھ بند کیا جارہا ہے۔ کھاؤ پیو اور رات کو اندھیرا کرکے موج اڑاؤ۔" حبشی نے کہا۔

یہ پہلی بار تھا کہ وہ ڈھنگ سے کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ میں نے کہا "پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ابھی سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔" حبشی نے مجھے رائفل سے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

کیبنوں کی طویل قطار کے سامنے سے گزر کر ہم آخری کیبن کے سامنے پہنچ گئے۔ منیامی حبشی نے آگے بڑھ کر کیبن کا دروازہ کھولا۔ یہ کیبن پہلے کیبن سے نسبتاً کشادہ اور آرام دہ تھا۔ میری نگاہ سب سے پہلے غزالہ اور گلثوم پر پڑی "گلثوم تم یہاں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ سسک پڑی۔ غزالہ نے اسے کندھے سے لگالیا۔

مجھے کیبن میں بھیج کر دروازہ باہر سے بند کردیا گیا۔ میں نے گلثوم سے اس کا حال چال پوچھا اسی دوران میں کیبن کا دروازہ دوبارہ کھل گیا۔ اس مرتبہ دروازے پر جو ہستی نظر آئی اسے دیکھ کر گلثوم کا چہرہ گلنار ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔ یہ زریں گل تھا۔ گلثوم نے جلدی سے آگے بڑھ کر زریں گل کی دونوں پنڈلیاں پکڑلیں۔ یہ کوئی قبائلی رسم تھی جس سے زریں گل قطعی ناواقف تھا۔ وہ بری طرح بدکا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ دونوں ایک دوجے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے تحاشا پشتو بولنے لگے۔ یوں لگا جیسے یہ پشتو بہت دنوں سے ایک جگہ جمع ہورہی تھی' اب بند ٹوٹا ہے اور پشتو کا سیلاب سا آگیا ہے۔

مطلع ذرا صاف ہوا تو میں نے کہا "زریں! اگر ہم کہیں تمہارے سامنے انگریزی بول بیٹھیں تو تم ہماری جان کو آجاتے ہو۔ اب یہ جو پشتو کی آندھی چلا رہے ہو یہ کس حساب میں ہے۔"

وہ بولا "استاد صیب! یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ جانتا ہے کہ میاں بیوی کو ایسی باتیں بھی کرنا ہوتی ہیں جو وہ سب کے سامنے نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "ایسی ساری باتیں تم کرچکے ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔" آخری الفاظ میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہے تھے۔

یہ کیبن قریباً دس ضرب پندرہ فٹ کا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا ٹوائلٹ بھی موجود تھا۔ دروازے اور دروازے میں پیدا ہونے والے خلا کا سسٹم وہی تھا جو دوسرے کیبنوں میں تھا۔ ہم سب تو ایک دوسرے کے حال سے واقف تھے' ہاں گلثوم سے اس جہاز پر پہلی دفعہ ملاقات ہورہی تھی۔ ہم نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پہلے تو یہاں کافی سختی تھی اور سیاہ فام پہرے دار بڑی بدتمیزی سے پیش آتے تھے لیکن جب سے غزالہ نے وائکس کپتان فلیمنگ کا علاج کیا تھا اور اسے افاقہ ہوا تھا' غزالہ کے ساتھ ساتھ گلثوم سے بھی نرمی کا سلوک ہونے لگا تھا۔

آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ ہم نے کیبن کے فرش پر بستر وغیرہ بچھالیے اور گپ شپ میں مصروف ہوگئے۔ ایک لحاظ سے ہم قیدِ سخت سے "قیدِ نرم" میں آگئے تھے۔ یہ تبدیلی ہمیں بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ ہم نہ صرف آرام دہ کیبن میں تھے بلکہ اکٹھے بھی تھے۔ شاید یہی اس کارکردگی کا

انعام تھا جو میں نے اور صفدر نے لڑکیوں کو جہاز پر لانے کے حوالے سے دکھائی تھی۔ مگر سوال پھر وہی ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ہمیں عرشے پر کوئی اپارٹمنٹ دینے کے بجائے یہاں جہاز کے نچلے حصے میں کیوں رکھا گیا تھا اور تو اور اب غزالہ کو بھی یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بار بار میرے ذہن میں آرہی تھی اور یہی بات صفدر نے بھی نوٹ کی تھی۔ جہاز کی رفتار معمول سے کافی زیادہ تھی۔ ہمیں ویسے تو باہر سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا' زیادہ اسپیڈ کا اندازہ اس تھرتھراہٹ سے ہوتا تھا جو جہاز میں محسوس ہو رہی تھی یا پھر ان ہچکولوں سے ہوتا تھا جو ہمیں مسلسل لگ رہے تھے۔

میں نے کہا "یار صفدر! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی جہاز کے پیچھے لگا ہوا ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس علاقے میں انڈیا کی ساحلی پولیس اور نیوی گشت پر رہتی ہے۔ ممکن ہے کسی کو "ہرکولیس" پر شک پڑ گیا ہو۔"

"تو کیا انڈیا کا پولیس ام سب کو پکڑ لے گا؟"

میں نے کہا "دعا کرو زریں گل کہ ایسا ہو جائے۔ انڈیا کی پولیس سے تو ہم چھوٹ بھی سکتے ہیں مگر ان حبشیوں کے جال سے نکلنا آسان نظر نہیں آتا۔ پتا نہیں یہ کہاں لے جائیں گے اور کس کنوئیں میں دھکیلیں گے۔"

"مگر استاد صیب! انڈیا کی پولیس کے ہاتھ آنا بھی تو کوئی عزت کا بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں عزت کی خاطر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ام کو تیل دیکھنا چاہیے اور تیل کا دھار دیکھنا چاہیے۔ ابھی صیدر صیب ام کو بتا رہا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ کالا لنگور ام کو افریقہ میں لے جانا چاہتا ہو۔ افریقہ میں جانا تو امارے لیے بالکل اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیوں اچھا نہیں ہوگا۔ وہاں انڈین پولیس کا دور دور تک پتا نہیں ہوگا اور یوں تمہاری عزت محفوظ رہے گی۔"

"خود وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہاں اور بھی تو کئی طرح کا مسئلہ ہوگا۔ سنا ہے کہ وہاں بڑا بڑا مچھر ہوتا ہے اور لوگوں کو زرد بخار ہو جاتا ہے۔ وہاں کا ملیشیا (ملیریا) بھی مشہور ہے۔ پھر گھنے جنگلوں میں بڑا خطرناک قسم کا دلدلیں ہوتا ہے جو لوگوں کو زندہ نگل جاتا ہے۔ کانگو کے جنگلات میں ایک ایسی دلدل کو ام نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک شیر اور بھینسا لڑتے لڑتے اس دلدل میں گر گئے تھے۔"

"یہ تم خیر سے کس سن میں افریقہ گئے تھے؟"

"افریقہ نہیں گیا تھا' ام نے فلم دیکھا تھا۔"

"میرے خیال میں تو سدھیر کی کسی فلم کی شوٹنگ افریقہ میں نہیں ہوئی۔"

"آپ مذاق فرما رہا ہے استاد صیب۔ ام تو انگریزی فلم کی بات کر رہا ہے۔ خیر اس قسم کا خطرات تو ہر علاقے اور ملک میں ہوتا ہے' مگر ایک خطرہ ام کو ذاتی قسم کا بھی برحق ہے۔"

"برحق نہیں لاحق۔" صفدر نے تصحیح کی۔

"جی ہاں' یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اب دیکھیں ناں کلثوم کا گود ہرا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر لوگ فرماتا ہے اور خود غزالہ بی بی بھی فرماتا ہے کہ جب عورت کا گود ہرا ہونے والا ہو تو اس کو اچھے اچھے منظر دیکھنا چاہیے۔ اس کے اردگرد خوب صورت بچوں کا تصویر ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ام لوگ افریقہ پہنچ گیا تو وہاں تو چاروں طرف یہی چپٹی ناک والا حبشی ہوگا اور ان کا بچہ لوگ ہوگا۔ اوہ خدایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امارے گھر میں کالا پٹھان پیدا ہو جائے۔"

کالے پٹھان کی اصطلاح پر ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور تو اور' غزالہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم سب بھول گئے کہ ہم ایسے قید خانے میں بند ہیں جو پانی پر رواں دواں ہے اور ہمیں آدم خور پہرے داروں سمیت کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ جہاز کی رفتار گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اب پورا جہاز کانپ رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم ایک دیو ہیکل مال بردار جہاز کے بجائے کسی لانچ میں بیٹھے ہیں جو متلاطم سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ جہاز کے نچلے حصے سے ایک مہیب آواز پیدا ہو رہی تھی۔ یہ پانی کی کاٹ کا شور تھا۔ درحقیقت یہ کسی حد تک پرانا جہاز تھا۔ اب اسے انتہائی رفتار سے چلایا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے "جسم" پر لرزہ طاری تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر اس کی اسپیڈ مزید بڑھائی گئی تو شاید یہ ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر میں بکھرنا شروع ہو جائے گا۔

اسی دوران میں جہاز کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی ٹھوس چیز نے پہلو سے جہاز کو زوردار ٹکر ماری ہے۔ کیبنوں میں بند قیدی چیخ اٹھے۔ ہمارے کیبن میں بھی سب کے چہرے پر ہراس نظر آنے لگا۔ کلثوم کے منہ سے تو باقاعدہ چیخ نکل گئی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے استاد صیب؟" زریں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ جہاز کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ اس مرتبہ کسی دیو ہیکل شے کے ٹوٹنے کی آواز بھی آئی۔ کیبنوں میں موجود عورتیں اور بچے بری طرح چیخنے لگے۔ ان میں سے کچھ تو ہندی میں واویلا کر رہے تھے اور کچھ کوئی ناقابلِ فہم زبان بول رہے تھے۔ اس دوسرے جھٹکے کے سبب غزالہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی تھی اور اس کی گود میں تالی ڈر کر رونے لگا تھا۔ زریں گل بھی لڑھک کر میری گود میں آن گرا تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھ گئے اور اگلے جھٹکے کا انتظار کرنے لگے۔ اگلا جھٹکا تو نہیں لگا لیکن غور سے سننے پر ایک خوفناک انکشاف ضرور ہوا۔ باہر سے فائرنگ کی مدھم آواز آرہی تھی۔ یہ بھاری ہتھیاروں کی فائرنگ تھی اور ان میں "ایم ۶۱" قسم کی مشین گن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جہاز کا کسی دوسرے جہاز یا بڑی کشتی وغیرہ سے تصادم ہو گیا ہے۔ گمان غالب یہی تھا کہ یہ کوئی' قانون نافذ کرنے والا ادارہ ہے جس نے "ہرکولیس" کو روکنے کی کوشش کی ہے۔

فائرنگ کی آوازیں وقفے وقفے سے مسلسل آرہی تھیں۔ جہاز کی رفتار میں بھی مطلق کمی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو مرتبہ جہاز نے کافی تیزی سے موڑ کاٹا تھا اور ہمارے کیبن میں رکھی ہوئی مختلف اشیا سلپ کر کے دیوار سے جا لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دو حبشی محافظ دوڑتے ہوئے ہمارے کیبن کے سامنے پہنچے' وہ تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے کیبن کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا گیا اور غزالہ کو باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ غزالہ کے چہرے پر تذبذب تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں میں اسے کہا کہ وہ پہرے داروں کی بات مانے۔ وہ بچے سمیت کیبن سے نکل آئی۔ پہرے دار نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اسے حکم دیا کہ وہ بچے کو یہیں کیبن میں چھوڑ دے۔

غزالہ نے پہرے دار کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ بچہ اس کے بغیر نہیں رہے گا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہرے داروں کے پاس بحث کا وقت نہیں ہے۔ وہ نہ چاہتے کے باوجود غزالہ کو بچے سمیت باہر لے گئے۔

"یوں لگتا ہے جیسے کچھ لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔" صفدر نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں پہرے داروں کی گھبراہٹ سے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔"

فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی مگر اب اس میں وقفہ پڑنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی لگ رہا تھا کہ فائرنگ کے جواب میں ہونے والی فائرنگ دائیں جانب کچھ فاصلے سے ہو رہی ہے۔

کیبنوں میں موجود لوگ مسلسل چیخ و پکار کر رہے تھے۔ انہیں خاموش کرانے کے لیے حبشی پہرے داران سے بھی بلند آواز میں چیخ رہے تھے۔ قیدیوں کو دھمکانے کے لیے وہ کیبنوں کے دروازوں کو چھڑی کے ذریعے زور زور سے بجاتے تھے اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ قریباً بیس پچیس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر غزالہ کو لے جانے والے دونوں حبشی پہرے دار دوبارہ اندر آگئے۔ انہوں نے حسبِ سابق ہمارے کیبن کا دروازہ کھولا اور رائفل کے اشارے سے مجھے باہر آنے کا حکم دیا۔ باہر نکلتے ہی مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی گئی اور سیڑھیاں چڑھا کر اور گودام کے خفیہ دروازے سے نکال کر عرشے پر پہنچا دیا گیا۔

ساری رات گزر چکی تھی۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ مشرقی افق سرخ ہو رہا تھا اور سمندر پر اُجالے کی چادر سی پھیلتی جا رہی تھی۔ چادلوں کی بوریوں کی طویل قطاروں سے گزر کر ہم کھلی جگہ پر آئے' منظر چونکا دینے والا تھا۔ زریں عرشے پر ایک جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ قریباً دس مربع فٹ جگہ جل کر کوئلہ ہو چکی تھی اور جہاز کا باوردی عملہ آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بجھا دیے گئے اور متاثرہ جگہ کے اردگرد گاڑھا سفید دھواں پھیل گیا۔ عرشے کے جنگلے کے پاس مجھے ایک تنومند حبشی کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کی خودکار رائفل بھی پاس ہی پڑی تھی۔ یقیناً یہ شخص فائرنگ کا شکار ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا عرشے کے ایک حصے پر لگنے والی آگ بھی فائرنگ ہی کا نتیجہ تھی۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آرہی تھی کہ غزالہ کو جہاز کے نچلے حصے میں کیوں بھیج دیا گیا تھا اور پہرے دار ہمیشہ سے زیادہ محتاط کیوں نظر آرہے تھے۔ درحقیقت کچھ لوگ جہاز کے تعاقب میں تھے اور جہاز والوں کے لیے صورتِ حال کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بالائی عرشے پر پہنچے۔ اب اردگرد کا سمندر میں زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ جہاز کے عقب میں دور قریباً نصف میل کی دوری پر مجھے ایک چھوٹے جہاز کا ہیولا نظر آیا۔ ایسے جہاز کو ایک بڑی کشتی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ جہاز سمندر میں بڑی تیزی سے حرکت کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور عام طور سے کوسٹ گارڈز اپنی سمندری حدود کی

محمد اشت کے لیے انہیں استعمال کرتے ہیں (سفید رنگ کا یہ جہاز کافی فاصلے پر تھا اس کے باوجود اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری طرح مسلح ہے) بالائی عرشے پر بھی مجھے خون کے دھبے دکھائی دیے اور گولیوں کے بے شمار خول پڑے ملے۔

اچانک دور مار رائفل کی تڑتڑ گونجی' میرے ساتھ چلنے والے دونوں حبشی بے اختیار جھک گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی مجھے بھی جھکنا پڑا' ہم بھاگ کر برج کی اوٹ میں ہوگئے۔ اسی دوران میں ہر گولیس کے بالائی عرشے سے جوابی فائرنگ ہوئی' اور تڑتڑاہٹ سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ ہم تینوں جھک کر بھاگتے ہوئے ان لگژری اپارٹمنٹس میں داخل ہوگئے جہاں اس سے پہلے تین چار مرتبہ مائیکل سے ملاقات ہو چکی تھی۔

مائیکل اب بھی اپنے شان دار اپارٹمنٹ میں موجود تھا' وہ بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا اور وہاں تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ کی سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں خوفناک نیمائی سیاہ فام "ایم جی" لیے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب بھی درجنوں خول بکھرے تھے اور دو رمین پڑی تھی۔ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک اس کھڑکی میں سے اندھا دھند فائرنگ کی جاتی رہی ہے۔

مائیکل نے میرے ساتھ آنے والے پہرے داروں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "اس بے وقوف کو سمجھاؤ۔ وہ بچوں کی طرح ضد کر رہی ہے۔ اگر فلیمنگ کو کچھ ہو گیا تو وہ بری طرح پچھتائے گی۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

فلیمنگ جہاز کے وائس کپتان کا نام تھا۔ میں نے مائیکل سے پوچھا "کیا ہوا ہے فلیمنگ کو؟"

وہ پریشان لہجے میں بولا "اسے گولی لگی ہے۔ یہاں سینے میں' دل کے بالکل پاس۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ہم ڈاکٹر غزالہ سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اس کا آپریشن کر کے گولی نکالنے کی کوشش کرے' لیکن وہ مان نہیں رہی۔۔۔ ڈر رہی ہے۔ فلیمنگ کا خون بڑی تیزی سے ضائع ہو رہا ہے۔ اگر آپریشن نہ بھی ہوا تو وہ پانچ دس منٹ میں ختم ہو جائے گا' تو پھر کیوں نہ آپریشن کا چانس لے لیا جائے۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری بات مان جائے گی' تم اس بے وقوف کو سمجھاؤ کہ وہ آپریشن کر ڈالے۔"

"کہاں ہے ڈاکٹر غزالہ؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" مائیکل نے کہا "لیکن ذرا ٹھہرو' پہلے تمہارے ہاتھ کھلوا دوں۔"

اس نے پہرے داروں کو آواز دی۔ وہ لپک کر اندر آئے اور مائیکل کے اشارے پر میری الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ مائیکل مجھے ساتھ لے کر جہاز کے درمیانی حصے میں آگیا۔ یہاں دو تین کمروں کو ملا کر چھوٹا سا کلینک بنایا گیا تھا۔ اس کلینک میں ضروری ادویات کے علاوہ سرجری کے ہنگامی آلات بھی موجود تھے۔ بہرحال اس کلینک نما جگہ کو آپریشن تھیٹر ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک اسٹریچر پر زخمی فلیمنگ پڑا تھا' غزالہ پریشانی کے عالم میں اسے ایک انجکشن لگا رہی تھی۔ فلیمنگ کی حالت واقعی بہت خراب نظر آتی تھی۔ اس کے کپڑے خون میں لت پت تھے اور وہ گہری بے ہوشی کی حالت میں کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ ایک باوردی ملازم گیس کا سلنڈر لے کر دوڑتا ہوا آیا اور اس نے گیس ماسک وائس کپتان کے منہ پر چڑھا دیا۔

غزالہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "شاہ جہاں! یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ پورا سینہ کھول کر آپریشن کرنا پڑے گا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔۔۔ اور یہاں تو ایسا سامان ہی نہیں کہ یہ آپریشن کیا جا سکے۔"

میں نے کہا "غزالہ! یہ ویسے بھی تو مر رہا ہے۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ یہ مر رہا ہے۔ تم کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے اس کی جان بچ جائے۔"

غزالہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ شاید وہ خود بھی یہ بات سمجھ رہی تھی کہ معنوب کو بچانے کی ایک کوشش کی جانی چاہیے۔ وہ بے چارگی کے ساتھ کبھی جراحی کے آلات کی طرف دیکھ رہی تھی اور کبھی فلیمنگ کے زخمی سینے کی طرف "کوشش کرو غزالہ! تم ایک تجربے کار ڈاکٹر ہو' تم یہ کر سکتی ہو۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

اسی دوران میں دور مار رائفل کا ایک برسٹ آیا اور کسی قریبی اپارٹمنٹ کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ گئے۔ غزالہ اور میں بے اختیار نیچے جھک گئے۔

"بتائیں۔ میں یہاں آپریشن کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"سب کچھ ہو جائے گا' تم بسم اللہ کرو۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں ایک جواں سال حواس باختہ عورت بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں خون کے دو بیگ تھے۔ وہ انگلش میں بولی "یہ لو ڈاکٹر۔ خون مل گیا ہے۔ پلیز اب کچھ کرو۔"

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' گرے بالوں والی یہ اٹالین عورت فلیمنگ کی بیوی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ

انگارہ ہو گئی تھیں اور وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی تشفی دے کر کمرے سے باہر بھیج دیا اور غزالہ سے کہا کہ وہ جاں بلب شخص کے لیے جو کچھ کر سکتی ہے کر گزرے۔

غزالہ نے قمیص اور بنیان وغیرہ کاٹ ڈالی۔ اس کے کہنے پر میں نے کلینک نما کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بڑی گھبراہٹ میں لیکن بڑی تیزی کے ساتھ غزالہ نے معنوب کو خون کی منتقلی کا انتظام کیا۔ اس کے بعد میں نے آپریشن کا ایک ایسا منظر دیکھا جو میرے لیے تو ناقابلِ فراموش تھا ہی یقیناً غزالہ کے لیے بھی ناقابلِ فراموش تھا۔ بالکل ناکافی سامان کی مدد سے اس نے معنوب کا پیٹ پسلیوں سے اوپر تک چیر ڈالا۔ آنتیں' پھیپھڑے' معدہ سب کچھ ہمارے سامنے تھا۔ غزالہ کے ہاتھ لرز رہے تھے اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا اور ساتھ ساتھ حوصلہ بھی دیتا جا رہا تھا۔ معنوب کو آکسیجن لگی ہوئی تھی اور خون اس کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا لیکن جتنا منتقل ہو رہا تھا اس سے زیادہ نکل رہا تھا' اور اس خون میں غزالہ کے دستانے بلکہ کہنیاں تک لتھڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کے باہر سے گاہے گاہے مسز فلیمنگ کے رونے کی آواز آجاتی تھی اور کبھی کبھی فائرنگ کی زوردار آواز بھی در و دیوار کو لرزا جاتی تھی۔ جہاز کی رفتار بدستور طوفانی تھی۔ اس رفتار کی وجہ سے شدید ہچکولے لگ رہے تھے' یہ ہچکولے' غزالہ کے نہایت دشوار کام کو دشوار تر بنا رہے تھے۔

غزالہ نے جلد ہی گولی کا زخم ڈھونڈ لیا۔ گولی بائیں پھیپھڑے سے سلپ کرتی ہوئی دل کی طرف گئی تھی اور اسے زخمی کر کے عقبی پسلیوں میں کہیں گم ہوئی تھی۔ غزالہ کو نامناسب آلات کی مدد سے معنوب کے دل تک پہنچنا پڑا۔ وہ خون آلود گوشت کا ایک گولا نظر آرہا تھا' جس میں زندگی ایک بے قرار دھڑکن کی صورت میں موجود تھی۔ دل کا نچلا حصہ زخمی تھا اور ہر دھڑکن کے ساتھ خون اگل دیتا تھا جو مسلسل جوفِ سینہ میں جمع ہو رہا تھا۔ غزالہ کی ہدایت پر میں روئی کے بڑے بڑے پھاہوں کی مدد سے یہ خون صاف کرتا جا رہا تھا اور غزالہ زخم تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ آپریشن یوں ہو رہا تھا جیسے پوسٹ مارٹم ہو رہا ہو۔ دل کا ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر غزالہ نے ہمت ہار دی "شاہ جہاں' یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ یہ مر رہا ہے۔"

"تم جو کر سکتی ہو' وہ کرو۔" میں نے اسے پچکارا۔

دل کی کچھ رگیں کٹی ہوئی تھیں اور خون وہیں سے ابل رہا تھا۔ غزالہ نے آلات سنبھالے اور ان رگوں کو "اسٹیچ" کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مسئلہ وہی خون کے بہاؤ کا تھا۔ اخراجِ خون کے سبب کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوسری رکاوٹ حرکتِ قلب تھی۔ مسلسل حرکت کرتے ہوئے ٹشوز کو ٹانکے لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر جب غزالہ ایک بار اس کام میں لگ گئی تو پھر لگی رہی۔ کئی کوششیں ناکام ہوئیں لیکن وہ ہر بار نئے عزم سے شروع ہوگئی۔ رکوع کے بل جھکے جھکے اسے قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد تھے مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے چند لمحے ستانے کی کوشش کی تو موت سے اس جنگ میں ہماری شکست ہو جائے گی۔

مسز فلیمنگ اور دیگر افراد بار بار ایک کھڑکی سے اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غزالہ کی ہدایت پر میں نے کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا۔ خون کی کمی کے سبب فلیمنگ کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا' دل کی دھڑکن بھی بہت سست ہو گئی تھی' لگتا تھا کہ اب وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے "اب میں کیا کروں شاہ جہاں۔" غزالہ نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

غزالہ کی مایوسی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ٹانکے لگانے کی ناکام کوششوں کے بعد فلیمنگ کے دل کا نچلا حصہ قیمے کی سی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ ایسے پارہ پارہ دل کے ساتھ ابھی تک زندہ کیسے ہے۔ "طب کی دنیا" میں محیر العقول واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں' شاید یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یا پھر شاید یہ مجھے زیادہ محیر العقول لگ رہا تھا۔ جب غزالہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے دل کے مسخ شدہ حصے کو گول گول لپیٹا اور ٹانکے لگا دیے' جو پورشن ٹانکے لگانے کے قابل ہی نہیں تھا اسے کسی "لیس دار مادے" کی مدد سے جوڑ دیا۔ کوئی ہارٹ سرجن یہ کارروائی دیکھتا تو شاید اپنا سر پیٹ لیتا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس صورتِ حال میں اس کے علاوہ کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات ہمارے لیے یہی تھی کہ فلیمنگ اب تک زندہ تھا اور سانس لے رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور ہر دھڑکن قدرت کی کرشمہ سازی کا ثبوت تھی۔ غزالہ نے جیسے تیسے معنوب کا سینہ بند کر دیا اور پیٹ کو ٹانکے لگا دیے۔ لیکن اس سے پہلے وہ معنوب کی عقبی پسلیوں سے گولی نکالنا نہیں بھولی تھی۔ یہ دور مار رائفل کی گولی تھی اور جہاں لگی تھی وہاں سے سلپ ہو کر کافی دور نکل گئی تھی۔۔۔ غزالہ قریباً دو گھنٹے اس کام میں ہمہ تن مصروف رہی تھی' آپریشن کے دوران میں غزالہ کا ہاتھ بٹانے اور حوصلہ بڑھانے کے لیے میں مسلسل اس کے ساتھ موجود رہا

تھا۔ آپریشن کے بعد ہم نے دروازہ کھول دیا۔ مسز فلیمنگ روتی ہوئی آئی اور شوہر کے پاؤں سے چہرہ رگڑنے لگی۔ دیگر افراد بھی اندر آگئے۔ ان میں مائیکل بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ حسبِ معمول ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔

اب دن چڑھ آیا تھا لیکن سطحِ آب پر ہلکی ہلکی دھند تھی اور سورج بھی بادلوں کی اوٹ سے پوری طرح برآمد نہیں ہوا تھا۔ جہاز کی رفتار اب بھی خاصی تیز تھی مگر فائرنگ کا سلسلہ رک چکا تھا۔ میری نگاہ برج کی طرف گئی۔ وہاں عملے کے دو سینئر افسران موجود تھے۔ انہوں نے آنکھوں سے طاقت ور دوربینیں لگا رکھی تھیں اور اپنے عقب میں جھانکنے کی کوشش کررہے تھے۔ غالباً ہلکی دھند کی وجہ سے انہیں دشواری پیش آرہی تھی۔ تاہم ان کا اندازیہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ جہاز کا تعاقب ابھی تک جاری ہے۔

مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو مائیکل کھڑا تھا۔ وہ بولا "تمہاری لیڈی ڈاکٹر نے کافی محنت کی ہے۔ امید نہیں تھی کہ فلیمنگ تادیر سانس لے سکے گا۔"

"مگر اسے زخمی کرنے والے کون ہیں؟"

"شاید تم یہ پوچھنا چاہ رہے ہو کہ ہمارا تعاقب کون لوگ کررہے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"یہ کچھ پرانے دوست ہیں۔ اکثر ہم سے محبت جتاتے رہتے ہیں، ہم بھی ان کی محبت کا جواب پوری گرم جوشی سے دیتے ہیں۔"

"کیا ان کا تعلق انڈین فورسز سے ہے؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں، ان میں اتنا کس بل کہاں۔"

"تو پھر؟"

"بھئی کہا ناں۔۔۔ ہیں کچھ پرانے دوست۔۔۔"

اچانک برج میں کھڑے دونوں افسران مضطرب نظر آنے لگے۔ ان میں سے ایک افسر نے ہاتھ کے اشارے سے مائیکل کو کچھ سمجھایا۔ مائیکل بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھا اور برج میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے دوربین اس کی آنکھوں پر تھی اور وہ بڑے غور سے اپنے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے میگافون کے ذریعے اپنے عملے کو افریقی زبان میں کچھ ہدایات دیں۔ ایک دم عملے میں شدید اضطراب نظر آنے لگا۔ بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ کچھ مسلح افراد جہاز کے مختلف حصوں میں پوزیشنیں لینے لگے، کچھ کنٹرول روم کی طرف دوڑے، برج میں بھی غیر معمولی سرگرمی نظر آنے لگی۔ چار پانچ منٹ بعد جہاز کے فرش میں واضح طور پر ارتعاش محسوس ہونے لگا۔ یہ ارتعاش اس امر کا اشارہ تھا کہ جہاز کی رفتار ایک دم بڑھا دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جہاز نے ایک قوس کی شکل میں بائیں رخ پر مڑنا شروع کردیا۔ میرے قریب ہی ایک نیگرو نے خالی ڈرموں کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی اور قریب ہی کئی بھرے ہوئے میگزین فرش پر رکھے تھے۔ مسلح نیگرو نے اپنی دوربین بھی فرش پر رکھ دی تھی۔ وہ پھسلتی ہوئی کچھ دور چلی گئی۔ میں نے دوربین اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ قریباً ڈھائی تین میل کے فاصلے پر مجھے دو جہازوں کے ہیولے نظر آئے۔ ان میں سے ایک تو وہی ہلکا پھلکا کشتی نما سفید جہاز تھا جو اس سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ دوسرا جہاز قدرے بڑا تھا۔ دونوں جہازوں پر کوئی شناختی نشان نظر نہیں آیا تاہم دونوں جہازوں پر مسلح افراد موجود تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ جو جہاز نسبتاً بڑا تھا اس پر موجود افراد وردی میں تھے۔ یہ دونوں جہاز بڑی تیزی سے ہرکولیس کے قریب آرہے تھے۔ ایک تو وہ وزن میں ہلکے تھے، دوسرے ہرکولیس کے مقابلے میں کہیں تازہ دم اور نئے تھے۔ بوڑھا "ہرکولیس" کم از کم دو ڈیزل تو ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ عقب میں آنے والے ایک جہاز کا رخ تھوڑا سا تبدیل ہوا تو میں چونک گیا۔ مجھے اس کے مستول پر ایک چھوٹا سا جھنڈا نظر آیا تھا، یہ ایران کا جھنڈا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والوں کا تعلق ایران سے ہے۔ میں دل ہی دل میں ان دونوں جہازوں کے لیے دعائے خیر کرنے لگا۔ درحقیقت یہ دونوں جہاز ہمارے لیے امید کی دو روشن کرنوں جیسے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ کرنیں کہاں سے اور کیسے طلوع ہوئی ہیں۔ بہرحال اس وقت یہ مجھے روشن اور واضح تر نظر آرہی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا برج کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں بلندی پر سے دور دور تک صاف نظر آرہا تھا۔ برج کے چاروں طرف شیشہ لگا تھا۔ اندر زبردست قسم کی سرگرمی نظر آرہی تھی۔ جہاز کا اصل کپتان جم نام کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی آنکھیں کثرتِ شراب نوشی کے سبب ہر وقت سوجی رہتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کچھ سست اور بیمار نظر آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جہاز کی اصل کمانڈ مائیکل ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جم ہر کام مائیکل سے مشورے کے بعد کرتا تھا۔ اس وقت بھی برج میں مائیکل بہت سرگرم نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک بڑا نقشہ پھیلا رکھا تھا اور کپتان جم کے ساتھ گرما گرم بحث میں مصروف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خطرناک صورتِ حال کے باوجود مائیکل کے لب و لہجے میں پریشانی کی بجائے جوش و خروش کی

جھلک تھی۔ وہ ایک ایسے پیدائشی جنگ جو کی طرح نظر آرہا تھا جس کا چہرہ اپنے مسلح دشمن کو دیکھ کر تمتما اٹھتا ہے۔

اچانک میں پروفیسر اللہ دتا کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ مہینوں کا بیمار نظر آرہا تھا اور بے دم سا ہو کر برج سے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح گردش کر رہی تھی اور ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ شاید میری طرح وہ بھی دعا گو تھا کہ ایرانی جہاز ہرکولیس کو گھیر لیں اور اس سفر کو فل اسٹاپ لگ جائے جو ہمیں نامعلوم خطرات کی طرف لے جا رہا تھا۔

میں نے قریب جا کر پروفیسر کا حال چال دریافت کیا۔ وہ پہلے تو بالکل گم صم رہا' یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بات کا جواب ہی نہیں دے گا' مگر پھر اس نے حوصلہ کر لیا۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا "ہمارے پیچھے آنے والا سفید جہاز پہلے تو بہت قریب آگیا تھا' پھر دور کیوں چلا گیا؟"

"مائیکل کے آدمیوں نے زبردست مزاحمت کی تھی۔" پروفیسر نے سرگوشی میں کہا' قریباً ایک گھنٹے تک بڑی زوردار فائرنگ ہوئی ہے۔ مائیکل کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ تین چار زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ان میں نائب کپتان فلیمنگ بھی ہے۔"

میں نے کہا "غزالہ نے دو گھنٹے تک اس کا نہایت خطرناک آپریشن کیا ہے' وقتی طور پر تو اس کی جان بچ گئی ہے۔"

پروفیسر نے سرگوشی میں کہا "زبردست مزاحمت کے بعد ایرانی جہاز پیچھے چلا گیا تھا' مگر اس نے پیچھا پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر رہ کر وہ مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دوسرے جہاز کا انتظار کر رہا تھا' جونہی دوسرے جہاز کی کمک پہنچی ہے' وہ پھر قریب آنے لگا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دوسرے جہاز میں وافر ہتھیار اور مسلح افراد موجود ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ۔۔۔ حرامی مائیکل اور اس کے ساتھی ان دونوں ایرانی جہازوں سے ٹکر لے سکیں گے؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ باقی یہ لوگ ہیں بڑے خطرناک' مرنا مارنا ان کے لیے کھیل کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ لگتا ہے کہ ایسی لڑائیوں بھڑائیوں کا انہیں وسیع تجربہ بھی ہے۔ ہر بندہ پُراعتماد اور چوکس ہے۔"

"کچھ اندازہ ہے کہ کُل کتنے بندے ہیں یہاں؟"

"میرے خیال میں عملے کے افراد ملا کر کُل تیس کے قریب لوگ ہیں اور سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو سو فی صد خوں خوار درندوں کے مانند ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ مائیکل ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے؟"

"کچھ معلوم نہیں۔" پروفیسر اللہ دتا نے مایوسی سے سر ہلایا "میں نے شائستہ بیٹی سے بھی پوچھا تھا' وہ بھی لاعلم ہے۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

ایک دم پروفیسر بولتے بولتے سہم کر خاموش ہو گیا۔ برج میں موجود ایک سیاہ فام ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے سرگوشی میں کہا "تم دوسری طرف چلے جاؤ۔ یہ شک کریں گے۔"

میں اٹھا اور اس کلینک نما کمرے کی طرف آگیا جہاں نائب کپتان فلیمنگ اپنے کرشماتی آپریشن کے بعد لیٹا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوشی میں تھا۔ آکسیجن کے علاوہ خون بھی لگا ہوا تھا۔ غزالہ پلک جھپکائے بغیر اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ سرخ بالوں والی مسز فلیمنگ بھی وہیں موجود تھی۔ تیز رفتاری کے سبب جہاز کو لگنے والے ہچکولوں کی وجہ سے فلیمنگ کا بے ہوش جسم بری طرح ہل رہا تھا۔ غزالہ پریشانی سے بولی "یہ کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں' ان لوگوں نے جہاز کی رفتار پھر کیوں بڑھا دی ہے۔ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

مسز فلیمنگ غزالہ سے بھی زیادہ پریشان دکھائی دیتی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ انگلش میں بولی "یہ کیپٹن جم کیا کر رہا ہے۔ خدا اس کو سمجھے۔ یہ شرابی ضرور ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرے گا۔"

"کیا بات ہے محترم خاتون۔" میں نے پوچھا۔

وہ سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "جہاز کا رخ دیکھو۔۔۔ یہ ساحل کی طرف جا رہا ہے۔ میں اس علاقے کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں سمندر بہت اتھلا ہے۔ "ہرکولیس" جیسا جہاز اتنی کم گہرائی میں چل ہی نہیں سکتا۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ کہیں نہ کہیں پھنس جائے گا۔ اوہ گاڈ۔۔۔ یہ بہت بڑی مصیبت ہو گی۔"

اسی دوران میں عملے کا ایک اطالین اہلکار اندر داخل ہوا۔ وہ بھی پریشان نظر آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مسز فلیمنگ بولی "یہ کیا ہو رہا ہے بھئی۔ یہ کیپٹن جم خودکشی پر کیوں تلا ہوا ہے۔ تم جانتے ہو سمندر اس ساحل کے قریب کتنا اتھلا ہے۔"

"میں جانتا ہوں میڈم! اور میں بھی وہی خطرہ محسوس کر رہا ہوں جو آپ کر رہی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جناب مائیکل کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔ بلکہ وہی سب کچھ کر رہے

ہیں۔" اس نے ایک کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور کنٹرول روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہ دیکھیے میڈم! مسٹر مائیکل وہاں خود موجود ہیں۔"

میں نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ کنٹرول کی ایک کھڑکی میں سے اندر کا منظر نظر آرہا تھا۔ مائیکل جہاز کے کیپٹن جم کے ساتھ اس پہیے کے قریب کھڑا تھا جس کو گھما کر جہاز کا رخ متعین کیا جاتا ہے۔ وہ بڑی توجہ کے ساتھ کیپٹن جم اور دیگر عملے کو ہدایات دے رہا تھا۔ ان لمحوں میں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کیپٹن وہ خود ہے۔

"مائیکل کا ارادہ کیا ہے؟" مسز فلیمنگ نے الجھن سے کہا۔

عملے کا رکن بولا "میڈم' جہاں تک میرا اندازہ ہے جناب مائیکل کی یہ سوچی سمجھی چال ہے کہ وہ جہاز کو کم گہرے پانی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ شاید وہ اس پانی کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ انہیں وہ خاص راستے معلوم ہیں جہاں پانی بہت کم نہیں ہے۔ وہ دیکھیں۔ وہ کیپٹن جم کو ساتھ ساتھ بتاتے جا رہے ہیں۔" اس شخص نے کنٹرول روم کی طرف اشارہ کیا۔

کنٹرول روم میں واقعی بہت سرگرمی نظر آرہی تھی۔ جہاز کی رفتار بہت زیادہ تیز تو نہیں تھی' تاہم وہ بار بار اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا۔ سمندر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ساحل کہیں قریب ہی ہے۔ پانی کے اندر سے کہیں کہیں مونگے کی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ آسمان پر اکا دکا آبی پرندے بھی نظر آرہے تھے۔ ان کی دور افتادہ آوازیں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مطلع اب بالکل صاف ہو گیا تھا۔ ہم ان کی دوربین کے بغیر بھی اپنے عقب میں دونوں "ایرانی" جہازوں کو دیکھ سکتے تھے۔ جہاز اب کافی قریب آگئے تھے۔ ہم ان کے عرشوں پر افراد کی نقل و حرکت دیکھ سکتے تھے اور دور مار رائفلوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔ جس جہاز پر باوردی افراد نظر آرہے تھے وہ زیادہ قریب تھا۔ اچانک اس جہاز پر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ چند طویل برسٹ بالائی عرشے کے آس پاس کہیں لگے۔ جواب میں مائیکل کے کارندوں نے بھی زوردار فائرنگ کی۔ پروفیسر اللہ دتا اپنی جگہ پر حیران بیٹھا تھا۔ وہ کھلی جگہ پر تھا اور یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ پروفیسر کو جا کر کمرے میں لے آؤں کہ ایک طرف سے کوئی دوڑتا ہوا آیا۔ یہ پروفیسر کی بیٹی شائستہ تھی۔ اس نے چیخ کر پروفیسر سے کچھ کہا' پھر اس کا بازو پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ اسے لے کر محفوظ آڑ کی طرف بھاگی' مگر ابھی راستے ہی میں تھی کہ ایک اور زوردار برسٹ آیا وہ پروفیسر کو لے کر ایک دم بیٹھ گئی۔ ان کے قریب پڑا ہوا ایک ڈرم الٹ کر دور جا گرا۔ پتا چلا کہ گولیاں ان کے بالکل قریب سے گزری تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں دوربین سے دیکھ کر باقاعدہ نشانہ بنایا گیا ہو۔ کنٹرول روم سے مائیکل نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اب وہ باپ بیٹی پر بڑی قہر آلود نگاہ ڈال رہا تھا۔ اگلا برسٹ آنے سے پہلے پہلے شائستہ اور پروفیسر جھک کر دوڑتے ہوئے ایک "فینس" کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ باپ بیٹی کی محبت کے بارے میں کچھ اندازہ تو مجھے تھا اب اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت بھی مل گیا تھا۔ شائستہ امید سے تھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ یوں بھاگ دوڑ کرتی' مگر وہ خود کو شدید خطرے میں ڈال کر والد کے لیے باہر نکل آئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ تک جہاز نے مزید زگ زیگ راستے پر سفر کیا۔ اس دوران میں عقب سے وقفے وقفے کے ساتھ فائرنگ بھی ہوتی رہی۔ پھر یہ دیکھ کر میرے سینے میں مایوسی سی پھیل گئی کہ ہمارے عقب میں آنے والے دونوں جہاز بہت سُست ہو گئے ہیں اور ہمارے ساتھ ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ اتنے میں بالائی عرشے سے شور و غل کی آواز آئی۔ وہاں چند ملاح خوشی سے ناچ رہے تھے' پھر ان میں سے ایک نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ میں باہر نکلا' کنٹرول روم اور برج میں بھی شادمانی کے مناظر نظر آئے۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ ہمارے عقب میں۔۔۔۔ آنے والے دونوں جہاز سمندر کے بیچوں بیچ رک چکے تھے۔ رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ مائیکل کی شاطرانہ چال کامیاب رہی ہے۔ وہ خود تو کچھ مخصوص راستوں سے گزر کر آگے نکل آیا ہے' جبکہ تعاقب کرنے والے جہازوں کو اس نے ریت میں دھنسا دیا ہے۔ اب وہ لوگ اپنے آپ پر غصہ کھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے کنٹرول روم میں جھانکا۔ سب افراد خوش نظر آرہے تھے لیکن مائیکل کے چہرے پر ابھی تک تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ بار بار میٹرز کا معائنہ کر رہا تھا اور ایک نقشہ دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت وہ الیکٹرانک دوربین کے ذریعے اپنے عقب میں بھی جھانک لیتا تھا۔ تعاقب میں آنے والے بہت دور رہ گئے تھے۔ اب ہم جہازوں کے بس بالائی حصے ہی دیکھ سکتے تھے۔ اچانک "ہرکولیس" کو جھٹکا لگا۔ بالکل جیسے کسی گاڑی کو بریک لگائے گئے ہوں۔ کیپٹن جم سمیت تمام سیلرز کے چہرے اترے ہوئے نظر آنے لگے۔ کنٹرول روم میں ایک بار پھر سرگرمی نظر آنے لگی۔ کیپٹن جم اور مائیکل بلند آواز میں بول

رہے تھے۔ میں کنٹرول روم کے کچھ قریب گیا تو آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

کیپٹن جم کہہ رہا تھا "جہاز کا باٹم قریباً چالیس فٹ پانی کے اندر ہے' اب تم خود اندازہ لگالو۔"

"لیکن بائیں رخ پر جائیں گے تو اور مصیبت میں پڑیں گے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں آگے کیا ہے۔"

"لیکن چانس تو ہوگا۔ یہاں تو سب کچھ سامنے نظر آرہا ہے۔" کیپٹن جم بولا۔

"چانس ادھر بھی ہے پیارے۔ تم حوصلہ کرو۔" مائیکل نے کہا۔

"اگر حوصلے کے ساتھ جہاز ریت میں چل سکتے تو پھر صحراؤں میں اونٹوں وغیرہ کی ضرورت نہ رہتی۔" کیپٹن جم نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ صحرا نہیں سمندر ہے۔ ہاں تم مجھے ضرور" اونٹ والے" لگ رہے ہو۔"

کیپٹن جم نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ جہاز ایک بار پھر روانی سے چلنے لگا تھا لیکن اردگرد کے سمندر کو دیکھ کر اندازہ سا ہوتا تھا کہ آگے بھی کم گہرا پانی موجود ہے۔ "رفتار تیز کرو۔" مائیکل نے کیپٹن جم کو مشورہ دیا۔

معمولی تذبذب کے بعد کیپٹن جم نے کنٹرول پینل سے چھیڑ چھاڑ شروع کی' چند لمحے بعد جہاز کے درودیوار میں ایک بار پھر تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے کوئی بیمار شخص نقاہت کے باوجود دوڑ کر سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کررہا ہو۔ جہاز کے اطراف میں لگے ہوئے "کٹر" یقیناً بڑی تیزی کے ساتھ پانی کو کاٹنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ کنٹرول روم میں موجود افراد کے چہروں پر شدید تناؤ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے بہت سے افراد نے مختلف اشیاء کو سہارے کے لیے تھام رکھا ہے۔ یقیناً جہاز کو جھٹکا وغیرہ لگنے کا امکان تھا۔ میں نے بھی ایک پائپ کا سہارا لیا۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزرے' پھر ایک دم جہاز کو بریک لگے اور وہ بری طرح تھرا گیا۔ ایک عجیب گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ جہاز کی "بریک" طویل ہوتی جارہی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ جہاز اتھلے پانی میں ہے اور اس کا پیندا ریت اور کیچڑ سے رگڑ کھا رہا ہے۔ یہ ساری "موسیقی" کی کارفرمائی تھی' ہزاروں ٹن وزن اپنی زبردست "جھونک" کے سبب ریت اور کیچڑ پر پھسلتا چلا جارہا تھا۔ یہ پُرخطر لمحات تھے' کسی بھی وقت کوئی خوفناک حادثہ رونما ہوسکتا تھا۔ جہاز کو نقصان پہنچ سکتا تھا' وہ کسی ایسی جگہ پھنس سکتا تھا جہاں سے مہینوں نہ نکالا جاسکے۔ کم و بیش دو منٹ تک جہاز نے ریت اور کیچڑ پر اپنا سفر جاری رکھا' تب اسے ایک بار پھر ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ گہرے پانی میں پہنچ گیا۔ جہاز کے درودیوار میں جاگنے والی زبردست... تھرتھراہٹ معدوم ہوگئی' پھر بتدریج اس کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا۔ مائیکل سمیت اب سب کے چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا۔ میں نے برج کے قریب بلندی پر جاکر دیکھا جہاز کے عقب میں سمندر کے نیلے پانی پر ایک چوڑی سی گدلی پٹی نظر آرہی تھی۔ درحقیقت یہ وہ کیچڑ اور ریت تھی جو جہاز کے پیندے کی رگڑ کے سبب سطح آب پر نمودار ہوئی تھی۔ یہ گدلی پٹی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھیل کر کافی وسیع ہوگئی۔ جہاز نے نیم دائرے کی شکل میں ایک طویل موڑ کاٹا اور کھلے سمندر میں پہنچ گیا۔ یہ صورت حال مائیکل اور اس کے جہاز رانوں کے لیے یقیناً بڑی خوش کن تھی' لیکن مجھ جیسے ان تمام لوگوں کے لیے بدقسمتی کی علامت تھی جو اس جہاز میں بابہ زنجیر تھے۔ اگر جہاز پکڑا جاتا یا پھر کہیں ریت میں دھنس جاتا تو ہماری رہائی کے امکانات پیدا ہوسکتے تھے' لیکن ابھی قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔

میں کلینک نما کمرے میں واپس پہنچا تو غزالہ اور مسز فلیمنگ جس کا نام ڈورتھی تھا' بہت پریشان نظر آرہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا تو ڈورتھی نے چھوٹتے ہی پوچھا "جہاز کھلے سمندر میں پہنچا یا نہیں؟"

"لگتا ہے کہ پہنچ ہی گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تھینکس گاڈ!" ڈورتھی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سکھ کی سانس لی۔ جو اطلاع ڈورتھی کے لیے نیک فال تھی وہ ہمارے لیے بدفال تھی۔ ڈورتھی نے خود کلامی کے انداز میں کہا "خدا کرے' اب دوسرا مسئلہ بھی حل ہوجائے۔"

"کون سا مسئلہ؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ایک دم بات بدل گئی۔

شاید اسے یاد آگیا تھا کہ ہم کتنے بھی "اچھے" سہی' ہیں تو زرخرید بردے ہی۔ ہمارے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں تھا اور نہ ہی یہ ضروری تھا کہ ہمیں اندرونی معاملات میں شریک کیا جائے۔ اور اگر وہ ایسا کرتی تو ممکن تھا کہ اس کا بگ باس مائیکل اس سے ناراض ہوجاتا۔

فلیمنگ کی بے ہوشی برقرار تھی۔ تاہم اس کی سانس میں اب روانی آگئی تھی اور کبھی کبھی پلکوں میں جنبش بھی پیدا ہوتی تھی۔ غزالہ نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی آرام نہیں کیا

تھا' آپریشن کے آغاز سے لے کر اب تک وہ ہمہ تن مصروف تھی۔ اسے جیسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کمرے سے باہر کیا ہورہا تھا اور کیا ہورہا ہے۔ شاید ان لمحوں میں تابی کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکلا ہوا تھا۔ اس نے تابی کو خواب آور دوا کھلا دی تھی اور وہ چہرے پر معصومیت سجائے ایک صوفے پر گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے کہا "غزالہ! تھوڑی دیر آرام کرلو۔"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ فلیمنگ کا آکسیجن ماسک درست کرتے ہوئے بولی۔

مسز ڈورتھی فلیمنگ نے کہا "بیٹی' تم بہت تھک گئی ہو۔ تین گھنٹے سے کھڑی ہو۔ کچھ دیر بیٹھ ہی جاؤ۔"

غزالہ فلیمنگ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی لیکن ایک دو منٹ بعد ہی دوبارہ اٹھ گئی اور فلیمنگ کا ٹمپریچر وغیرہ لینے میں مصروف ہوگئی۔

شام تک مائیکل دو تین بار اپنے وائس کپتان کی مزاج پرسی کے لیے آیا اس کا اپنا ہاتھ بھی زخمی تھا۔ دو طرفہ فائرنگ میں کارتوس کے باریک چھرّے اس کے ہاتھ کی پشت پر لگے تھے۔ غزالہ نے اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی بھی کردی تھی' تاہم میں نے دیکھا تھا کہ مائیکل کے جسم کو چھوتے ہوئے غزالہ کے چہرے پر نفرت آمیز جھلک نظر آتی تھی۔ مائیکل نے اپنی کامیاب چال سے تعاقب کرنے والوں کو مات دے دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ کچھ پریشان سا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے جہاز میں کسی گڑبڑ کا احساس ہورہا تھا۔ یہ احساس مجھے بھی ہوا تھا بلکہ شاید جہاز میں موجود دیگر مسافروں کو بھی ہوا تھا۔ جہاز کے عقب سے گھر گھر کی ایک مسلسل آواز سنائی دیتی تھی۔ جہاز کی رفتار بڑھتی تھی تو یہ آواز نسبتاً زیادہ بلند ہوجاتی تھی' غالباً یہی وجہ تھی کہ رفتار بار بار کم کردی جاتی تھی۔

شام کے وقت جب سورج دور مغربی افق پر ایک بہت بڑے سرخ گولے کی طرح نظر آرہا تھا' میں نے مائیکل اور کچھ دیگر لوگوں کو جہاز کے عقبی حصے میں جنگلے کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ ان میں سفید بالوں اور ورم زدہ آنکھوں والا کپتان جم بھی تھا۔ عملے کے چند افراد جن کی نیلی وردیوں پر 111 کے الفاظ پرنٹ تھے کپتان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ میں بھی ٹہلتا ہوا اس طرف جا نکلا۔ جنگلے پر سے جھک کر نیچے دیکھا تو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا کہ جہاز کے عقبی حصے میں پانی کی سطح سے ذرا اوپر ایک بہت بڑا "لنٹ" نظر آرہا تھا۔ قریباً پندرہ ضرب پانچ فٹ کے رقبے میں جہاز کی بیرونی چادر پیک کر اندر چلی گئی تھی اور اس میں کریکس بھی نظر آرہی تھیں۔ اسی مقام پر جہاز کا وہ دیوہیکل پہیہ تھا جو پانی کو پیچھے کی سمت دھکیلتا تھا' یہ پہیہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور نظر نہیں آرہا تھا' مگر عین ممکن تھا کہ جہاز کی پگھلی ہوئی چادر کی طرح اس پہیے کو بھی نقصان پہنچا ہو۔

جہاز کے اس متاثرہ حصے کو دیکھ کر مجھے فوراً وہ زبردست دھچکا یاد آگیا جو علی الصباح ہم نے محسوس کیا تھا۔ اس دھچکے کے نتیجے میں کوئی شے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی اور کیبنوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ درحقیقت اس زوردار دھچکے کا سبب تعاقب کرنے والے جہاز تھے۔ ان دونوں میں سے ایک جہاز نے "ہرکولیس" کو ٹکر ماری تھی۔ یہ ٹکر ایسے زاویے سے لگی تھی کہ "ہرکولیس" کو خاصی مہنگی پڑی تھی۔ اب جہاز کے تکنیکی کارسرجوڑ کر یہ مشورہ کررہے تھے کہ اس نقصان کی تلافی کیسے کی جائے۔ غالباً آج دوپہر مسز ڈورتھی نے بھی اسی مسئلے کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا' خدا کرے ہمارا دوسرا مسئلہ بھی حل ہوجائے۔ میں نے مسئلے کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ جواب گول کرگئی تھی۔

جہاز کا رخ بدستور مغرب کی طرف تھا' اس کا مطلب تھا کہ ہم بحیرہ ہند سے نکلنے کے بعد بحیرہ عرب کی طرف جارہے ہیں۔ ایرانی ساحل ہماری دائیں جانب تھا۔

میں کلینک نما کمرے میں پہنچا تو غزالہ بدستور اپنے "سیریس مریض" کے سرہانے موجود تھی۔ فلیمنگ اب ہولے ہولے کراہ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ جب اس کے زخم زخم دل کا تصور میرے ذہن میں آتا تھا تو حیرانی ہونے لگتی تھی کہ وہ زندہ کس طرح ہے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی وال کلاک کے بکھرے ہوئے پرزوں کی پوٹلی سی باندھ کر وال کلاک میں رکھ دی جائے اور اس کی سوئیاں حرکت کرنے لگیں۔

مسز ڈورتھی نے مجھے دیکھ کر کہا "مسٹر شاہ! میں نے مائیکل سے بات کرلی ہے۔ تم نیچے کیبن میں نہیں جاؤ گے' رات کو یہیں ہمارے پاس رہو گے۔"

"میرے یہاں رہنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"تمہاری موجودگی سے ڈاکٹر کو حوصلہ رہے گا۔ وہ زیادہ اچھے طریقے سے مسٹر فلیمنگ کی دیکھ بھال کرسکے گی۔"

"آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میری موجودگی سے ڈاکٹر کو حوصلہ رہے گا؟"

مسز ڈورتھی ہولے سے مسکرائی "میں سب جانتی ہوں۔ مائیکل نے مجھے بتایا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے

سے پیار کرتے ہو' اور اکٹھے ہی رہتے ہو۔"

غزالہ کا چہرہ سرخ ہوگیا' وہ جلدی سے بولی "آپ کو غلط بتایا گیا ہے' ایسی کوئی بات نہیں۔ مم۔ میں شادی شدہ ہوں۔"

"میں جانتی ہوں تم شادی شدہ ہو' لیکن شاید تمہاری علیحدگی ہو چکی ہے۔ علیحدگی کے بعد اور DIVORCE سے پہلے جوان خواتین کو عموماً نئے ساتھی کی تلاش ہوتی ہے' اگر تم نے ایسا کرلیا ہے تو اس میں کوئی برائی کی بات نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔" غزالہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"پھر تم اکٹھے کیوں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "دیکھیں مسز ڈورتھی! ہمارے ہاں اکٹھے رہنے کا مطلب وہ نہیں جو آپ کے ہاں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں قربت اور دوری کے پیمانے اور ہیں۔ یہ ایک طویل اور غیر متعلق موضوع ہے' میرے خیال میں ہم کسی اور موضوع پر بات کرلیں۔"

"تم مشرقی لوگ بھی عجیب ہوتے ہو۔" مسز ڈورتھی نے کہا "سیدھا کام بھی پُر پیچ طریقے سے کرتے ہو۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہو۔ پھر ایک ہی جگہ رہتے ہوئے ایک ہی کمرے میں سوتے ہوئے تم۔۔۔"

"خدا کے لیے آپ چپ رہیں۔" غزالہ نے مسز ڈورتھی کی بات کاٹی "اگر آپ یہ موضوع چھوڑنا نہیں چاہتیں' تو میں یہ کمرا چھوڑ دیتی ہوں۔"

"کون کمرا چھوڑ رہا ہے؟" دروازے کی طرف سے مائیکل کی گرج دار آواز ابھری اور وہ دندناتا ہوا اندر آگیا۔

غزالہ سہم کر چپ ہوگئی۔ مسز ڈورتھی جلدی سے بولی "نہیں کوئی بات نہیں۔۔۔ ہم یونہی آپس میں بات کررہے تھے۔ ڈاکٹر اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہی۔۔۔ میں تہِ دل سے اس کی مشکور ہوں۔"

مائیکل غزالہ سے مخاطب ہو کر غرایا "یہ بات مت بھولنا ڈاکٹر۔۔۔ تمہاری حیثیت یہاں قیدی کی سی ہے۔ یہاں وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔ اگر زیادہ پھیلو گی تو یہاں ڈنڈے کے زور پر بھی مسیحائی کرائی جاسکتی ہے۔"

شاید مائیکل کچھ اور بھی بکتا مگر اسی دوران میں فلیمنگ نے "پانی پانی" پکارا۔ یہ پہلی آواز تھی جو زخمی ہونے کے بعد اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ مسز ڈورتھی جلدی سے پانی لینے کے لیے اٹھی۔

"نہیں۔۔۔ ابھی پانی نہیں پلایا جاسکتا۔" غزالہ نے تیزی سے کہا۔

مسز ڈورتھی ٹھٹک کر رک گئی۔ مائیکل نے کڑے تیوروں سے غزالہ کو دیکھا۔ اسے غزالہ کا تحکمانہ لہجہ ناگوار گزرا تھا۔ وہ غرایا "دیکھو ڈاکٹر! اپنا لہجہ درست کرو' ورنہ میں چیر دیا کرتا ہوں۔"

غزالہ کا چہرہ پھر سرخ ہوگیا اور ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ مائیکل نے حکم دیا "چلو اپنے لہجے کی وجہ سے سوری بولو مسز ڈورتھی کو۔"

غزالہ نے سٹپٹائی ہوئی نظروں سے مائیکل کو دیکھا۔ پھر وہ ڈورتھی کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈورتھی جلدی سے کھڑی ہوگئی "اوکے۔۔۔ اوکے' میں نے بالکل مائینڈ نہیں کیا۔" پھر وہ مائیکل سے مخاطب ہوئی "سب ٹھیک ہے مائیکل! پلیز جاؤ۔ ڈاکٹر کو معائنہ کرنے دو۔ وہ ہوش میں آرہے ہیں۔ پلیز۔"

مائیکل غزالہ کو خونی نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ غزالہ اسٹیتھ اسکوپ کے ذریعے فلیمنگ کی دھڑکنیں چیک کرنے لگی۔ مائیکل کی دہاڑیں سننے کے بعد اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد فلیمنگ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سرگوشیوں میں بولنے لگا اور ڈورتھی اس پر جھک کر اس کی سرگوشیاں سننے لگی' کہا ہے وہ شوہر کے ہونٹوں پر بوسہ بھی دے لیتی تھی' کچھ دیر وہ گفتگو کرتے رہے۔ فلیمنگ نے ہاتھ سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اور غزالہ باہر آگئے۔ میاں بیوی دس پندرہ منٹ تنہائی میں باتیں کرتے رہے۔ پھر غزالہ اندر چلی گئی۔ اس نے ڈورتھی سے کہا کہ مریض کا زیادہ بولنا اس کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔

اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ بولنے کے بعد فلیمنگ پر کپتان کی سانس اکھڑی اکھڑی محسوس ہونے لگی تھی۔ غزالہ نے ایک بار پھر اس کے ساتھ جُت گئی۔ وائٹل سائنز لینے کے بعد وہ جلدی جلدی اس کے لیے انجکشن تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ سر کی چوٹوں کے بعد وہ ابھی خود بھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی' مگر اپنے مریض کے لیے وہ تگ و دو انتہا کو چھو رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹا فلیمنگ کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد وہ قدرے مایوس نظر آنے لگی۔ فلیمنگ ایک بار پھر غنودگی میں چلا گیا تھا' اس کا مسئلہ یہ ہوا تھا کہ اس کا بلڈ پریشر اوپر نہیں آرہا تھا۔ غزالہ بار بار بی پی آپریٹس استعمال کررہی تھی۔ آخر اس نے آپریٹس طرف پھینک دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"کتنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ساٹھ اور پچاس۔۔۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"اسے کسی اچھے اسپتال کی فوری ضرورت ہے۔"

"اور اسپتال کا فاصلہ یہاں سے سیکڑوں میل ہوگا۔"

ہم سرگوشی میں بات کررہے تھے۔ مسز ڈورتھی کے کان کھڑے ہوگئے "تم کیا کہہ رہے ہو۔ ان کی حالت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ آپ دعا کریں۔" غزالہ نے کہا۔

"دعا تو میرا رواں رواں کررہا ہے۔ فلیمنگ کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ تم نے جس طرح میرے شوہر کی زندگی کے لیے جدوجہد کی ہے' میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔ خدا ان کو زندگی دے' ہم دونوں ساری عمر تمہارے شکر گزار رہیں گے۔"

غزالہ نے تسلی تشفی دے کر مسز ڈورتھی کو باہر بھیج دیا اور ایک بار پھر فلیمنگ کی حالت سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس رات پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنے پیشے کے حوالے سے کتنی محنتی اور جفاکش ہے۔ وہ رات بھر جاگتی رہی اور میں بھی جاگتا رہا۔ رات تیسرے پہر تابی اٹھ گیا۔ وہ مچل مچل کر غزالہ کی گود میں جانا چاہ رہا تھا لیکن غزالہ کو بالکل فرصت نہیں تھی۔ میں نے تابی کو اٹھالیا اور باہر نکل کر برآمدے پر ٹہلنے لگا۔ تاریک آسمان کے نیچے حد نگاہ تک تاریک سمندر تھا اور ان دونوں لامتناہی تاریکیوں کے درمیان یہ نیم روشن جہاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ جہاز کے انجن حصے سے گھڑگھڑاہٹ کی آواز مسلسل بلند ہورہی تھی' بلکہ اب یہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔

ہوا کی خنکی قابلِ برداشت تھی۔ میں تابی کو لے کر ٹہلتا رہا' وہ میرے کندھے سے لگا لگا سوگیا۔ میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور تابی کو دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں مجھے نتاشا کی یاد آگئی' بچپن میں وہ بھی تو اسی طرح میرے کندھے سے لگی لگی سوجایا کرتی تھی اور اپنے گھر برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے میں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ یہ بھی کچھ ویسی ہی روشن تھی۔ سمندری ہوا سے تابی کے خوب صورت گھونگریالے بال ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ جیسے صحرائی رقص کررہے ہوں۔ میں یہ رقص دیکھنے لگا۔ اس وقت مار دھاڑ کرنے والا اور اپنی زندگی سے کھلونے کی طرح کھیلنے والا تاوان جہانی مجھ سے جدا ہو کر کہیں دور چلا گیا تھا' اب وہ شاہ جہاں رہ گیا تھا' جسے خوب صورت تصویروں سے اور موسیقی سے پیار تھا۔ جسے پھول پرندے اور پہاڑی مناظر پسند تھے' اور جو بچوں کو کائنات کی سب سے حسین چیز تصور کرتا تھا۔

ایک دم ایک مدھم آہٹ سے میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا' غزالہ نجانے کب سے میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے ریشمی بال ہوا سے منتشر ہو کر اس کے ملیح چہرے پر اٹکھیلیاں کررہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "لائیے' تابی کو مجھے دے دیجیے۔"

میں نے بڑی آہستگی کے ساتھ تابی کو غزالہ کی گود میں دے دیا' ایسا کرتے ہوئے ہم دونوں بالکل قریب آگئے تھے' میرے ہاتھ غزالہ سے چھو رہے تھے اور ہمارے درمیان صرف تابی تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ایک مرد اور عورت کے درمیانی فاصلے کو مٹانے کا سبب بن جاتا ہے۔ میری احتیاط کے باوجود تابی کسمسا کر جاگ گیا۔ غزالہ کے گلے میں باہیں ڈال کر وہ اس سے چپک گیا۔ غزالہ اس کا سر اور رخسار چومنے لگی۔ شاید دانا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بچہ گود میں ہو تو عورت مکمل نظر آتی ہے اور بچے کی موجودگی میں اس کی نسوانیت اور دلکشی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

میں نے تابی کو دیکھتے ہوئے کہا "شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بچہ قدرت کی سب سے حسین تخلیق ہے۔"

اس نے ایک بار پھر تابی کا سر چوما "آپ کو۔۔۔ بچے اچھے لگتے ہیں؟" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"ہاں۔ بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"تو پھر آپ۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

میں نے کہا "میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ تم کہنا چاہتی ہو کہ پھر آپ شادی کیوں نہیں کرلیتے۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں۔"

اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر اثبات میں سر ہلایا "تو پھر کوئی اچھی لڑکی ڈھونڈو ناں میرے لیے۔ تم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا کہ مجھے کیسی لڑکی پسند آئے گی۔ اس لڑکی کا ظاہر باطن سب کچھ تمہیں معلوم ہے۔" وہ خاموش رہی۔ میں نے کہا "بولتی کیوں نہیں؟ ڈھونڈو گی ناں؟"

"آہچھا۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"لیکن' میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں۔ تم نہیں ڈھونڈ سکو گی۔ کیونکہ اپنے جیسی تم بس خود ہی ہو۔" وہ گڑبڑا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی' کلینک نما کمرے کے اندر سے مسز ڈورتھی کی آواز آئی۔ اس نے غزالہ کو بتایا کہ مسٹر فلیمنگ پانی مانگ رہے ہیں۔

"اچھا میں خود آتی ہوں۔" غزالہ نے کہا۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور تالی کو لے کر اندر چلی گئی۔ چار پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے' تب میں نے مسز ڈور تھی کو تیزی سے ایک طرف جاتے دیکھا۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کوئی میڈیسن وغیرہ تھی۔ صرف چند سیکنڈ بعد غزالہ کی چیختی ہوئی سی آواز اندر آئی "شاہ جہاں۔ جلدی سے اندر آئیں۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میں اندر پہنچا تو فلیمنگ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مسز ڈور تھی دھاڑیں مار رہی تھی' اور بار بار شوہر سے لپٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ غزالہ نے چیخ کر کہا "شاہ جہاں! انہیں سنبھالو۔"

میں نے مسز ڈور تھی کو بانہوں میں لے لیا۔ غزالہ بار بار دونوں ہاتھوں سے فلیمنگ کا سینہ دبا رہی تھی۔ یہ ڈوبتی ہوئی دھڑکن کو بحال کرنے کی آخری کوشش تھی۔ چند سیکنڈ بعد فلیمنگ کی سانس بالکل رک گئی اور آنکھیں پتھرا گئیں' وہ مر چکا تھا۔ غزالہ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر فلیمنگ کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کرتی رہی' پھر اس نے اپنے ہاتھ سے فلیمنگ کی آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے ڈور تھی کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے محبوب شوہر سے لپٹ کر چیخ و پکار کرنے لگی۔ ننھا تالی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا اور وہ بھی زور زور سے رونے لگا۔ دو تین منٹ کے اندر کپتان جم اور مائیکل سمیت کئی افراد کمرے کے اندر اور باہر جمع ہو گئے۔

مائیکل نے غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک سیاہ فام سے کہا "ڈاکٹر کا کام اب ختم ہو گیا۔ اس کو اور اس کے ساتھی کو واپس کیبن میں پہنچا دو۔"

سیاہ فام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اس نے اپنی "ایم جی" ہاتھ میں لی اور مجھے غزالہ سمیت نیچے لے آیا۔ چاول کی بوریوں کے بہت بڑے انبار میں سے گزر کر ہم خفیہ دروازے تک پہنچے اور وہاں سے نکل کر زیریں کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔ ہم قریباً چوبیس گھنٹے بعد لوٹے تھے۔ ہمارے کیبن میں زرین گل اور کلثوم' صفدر سمیت سخت پریشان تھے جونہی ہم کیبن میں داخل ہوئے انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں وہ بھی سنتے رہے تھے' ہم نے انہیں بتایا کہ یہ فائرنگ کس کی طرف سے تھی اور اس کا انجام کیا ہوا ہے۔ ہم نے وائس کپتان فلیمنگ کی موت کا احوال بھی بتایا۔

ایک دم شور کی آواز آئی۔ میں پہچان گیا۔ یہ مصنوعی اسلم کی آواز تھی۔ وہی اسلم جس کے چہرے پر چند دن پہلے چھڑیاں برسا برسا کر حبشیوں نے اس کا حشر کر دیا تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں بولا تھا "میں جاؤں گا' مجھے کوئی نہیں روک سکتا' میں نسرین کے پاس جاؤں گا میں جاؤں گا۔"

ہمارے کیبن میں اضافی سہولتیں موجود تھیں اور ان میں سے ایک سہولت "چھوٹا سا ایک سوراخ" بھی تھا۔ ہم اس سوراخ سے آنکھ لگا کر باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر سوراخ سے آنکھ لگائی اور باہر کا منظر دیکھ کر چونک گیا۔ اسلم کیبن سے باہر کھڑا تھا' اور اپنے ادھیڑ عمر ساتھی نثار کو بازو سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا "چاچا! آ جا' یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"

نثار کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں' وہ اسلم کی منت سماجت کر رہا تھا "اسلم پاگل مت بن۔ وہ یہیں کہیں ہوں گے۔ وہ زندہ نہیں چھوڑیں گے تجھے۔ کیوں موت کو آواز دیتا ہے۔" وہ اسے اندر کیبن میں کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کوئی نہیں ہے۔ سب چلے گئے ہیں۔" اسلم نے دانت پیس کر کہا اور پورا زور لگا کر نثار کو کھینچنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ کیبن کے دروازے کی چابی دروازے کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ بے خیالی میں حبشی پہرے دار کیبن کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہے اور دروازہ کھلا پا کر اسلم نامی یہ نوجوان قسمت آزمائی پر تل گیا ہے (بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ وائس کپتان فلیمنگ کی موت کا سن کر اس کمپارٹمنٹ میں موجود حبشی افراتفری میں اوپر چلے گئے تھے اور یہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا) اسلم نامی یہ نوجوان جذباتی بلکہ کسی حد تک مخبوط الحواس نظر آتا تھا۔ اس کا ساتھی نثار اس کی نسبت کہیں باہوش اور دور اندیش تھا۔ وہ بجا طور پر اسلم کو واپس کیبن میں کھینچ رہا تھا' مگر اس پر تو جیسے بھوت سوار تھا' وہ دیوانہ وار زور لگا رہا تھا۔

میں نے سوراخ میں سے پکار کر کہا "نثار! اس کو نکلنے مت دینا۔ وہ چھوڑیں گے نہیں۔"

لیکن میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اسلم نے خود کو نثار کی گرفت سے چھڑا لیا اور سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ نثار اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا۔ یہی وقت تھا جب ایک طرف سے خوں خوار نمایاں پہرے دار نمودار ہوا' اس نے خود کار رائفل سیدھی کی اور چیخ کر کچھ کہا۔ اس وقت تک اسلم اور نثار آگے پیچھے بھاگتے سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ سیڑھیوں کے ساتھ دیوار پر ایک رائفل آڑھی ترچھی ٹنگی ہوئی تھی۔ اسلم شاید اس رائفل تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ابھی اس نے سیڑھیوں پر پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ نمایاں حبشی نے عقب سے گولی چلا دی۔ گولی پیچھے آنے والے نثار علی کی پشت میں لگی اور سینہ پھاڑ کر سامنے سے نکل گئی۔ وہ سیڑھیوں کے بالکل سامنے پٹ سے فرش پر گرا اور گرتے ہی ساکت ہو گیا۔

اسلم نے نثار کو گولی کھا کر گرتے دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر چیخ کر پلٹا اور نثار کی لاش سے لپٹ گیا۔ وہ اسے جھنجوڑنے لگا "اٹھ چاچا۔ اٹھ جا۔ میں کہتا ہوں اٹھ جا۔"

لیکن "چاچا" وہاں کہاں تھا۔ وہ تو دور جا چکا تھا' اپنے جسم سے دور اور اس قید خانے سے بھی دور۔ اب کوئی قانون' کوئی لاک اپ' کوئی زنجیر اسے پابند نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسلم اس سے لپٹ کر اسے جھنجوڑتا رہا' پھر ایک دم بجلی کی طرح تڑپ کر وہ نمایاں پہرے دار پر جھپٹ پڑا۔ اس کے انداز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ نمایاں پہرے دار نے اپنی رائفل استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی' وہ... لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا' مگر کچھ بھی تھا وہ اسلم کے مقابلے میں کہیں زیادہ جسیم اور طاقت ور تھا۔ وہ پلک جھپکتے میں سنبھل گیا' دونوں کے درمیان چند لمحے تک زبردست کشمکش ہوئی پھر نمایاں غالب آ گیا۔ وہ اسلم کو گرا کر اس پر سوار ہو گیا۔ وہ سرتاپا ایک مشتعل درندہ نظر آ رہا تھا' ایک درندے ہی کی طرح اس نے اسلم کے کندھے میں اپنے دانت گاڑے اور گوشت کا ایک لوتھڑا اکھاڑ لیا۔ اسلم کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے اپنے دوست کی موت پر دیوانہ سا ہو گیا تھا' اب بالکل بے بس نظر آیا۔ اس کا پُرجوش حملہ چند ہی لمحے کے اندر کربناک بے چارگی میں ڈھل گیا تھا۔ حقیقت ایسی ہی ناہموار اور کھردری ہوا کرتی ہے۔ یہ فلم نہیں تھی جس میں اپنے دوست کی موت پر سراپا غضب بن جانے والا شخص دشمن کے لیے موت بن جاتا ہے' یہ زندگی تھی جس میں کبھی کبھی جرأت کو بھی سرنگوں ہونا پڑتا ہے اور دلیری بھی پشیماں ہوتی ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اسلم کی دلدوز چیخوں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ منظر ایسا دردناک تھا کہ مجھ جیسے شخص کو بھی اپنا دل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ نمایاں حبشی واقعی درندہ بن گیا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی طور پر چوڑے اور مضبوط جبڑوں کی مدد سے اسلم کو بھنبوڑ رہا تھا اور اس کی کھال ادھیڑتا چلا جا رہا تھا' خدا کی پناہ' یہ منظر "نگاہ کا عذاب" تھا اور ناقابل برداشت عذاب تھا۔ مجھے لاہور میں پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی کا منظر یاد آ گیا۔ وہاں سائن نام کے حبشی نے اسی طرح فلم ایکٹریس نوشین کے ڈرائیور رمضان کو بھنبھوڑا تھا اور جان سے مار ڈالا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے مصنوعی اسلم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ میری آنکھوں کے عین سامنے نمایاں حبشی نے اپنے دانت گاڑ کر اسلم کی گردن سے گوشت کا ایک لوتھڑا نکالا اور اس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں اس سے آگے نہیں دیکھ سکا اور سوراخ پر سے آنکھ ہٹالی۔ صفدر نے جلدی سے آگے بڑھ کر میری جگہ لی' تاہم چند ہی لمحے بعد وہ بھی زرد چہرے لیے پیچھے ہٹ آیا۔ زرین گل آگے آنا چاہتا تھا مگر صفدر نے اسے منع کر دیا۔ کیبن کے باہر چند گز کی دوری سے نمایاں حبشی کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں' اور انہیں سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ انسانی آواز ہے۔

اسی دوران میں ایک اور شور برپا ہو گیا۔ یہ شور ان کیبنوں کی طرف سے بلند ہو رہا تھا جہاں بمبئی کی بندرگاہ سے سوار ہونے والے قیدی رکھے گئے تھے۔ یہ لوگ عجیب دہشت زدہ آوازوں میں واویلا کر رہے تھے اور رو رہے تھے۔ میرا اور صفدر کا خیال تھا کہ ان میں سے زیادہ تر قیدی کسی ایک ہی قبیلے یا برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کورس کی شکل میں روتے تھے اور ان کا لب و لہجہ بھی مختلف قسم کا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر شور مچایا تو پھر مچاتے ہی چلے گئے۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار ان پر اس قسم کا دورہ پڑا تھا مگر پہرے داروں کی ڈانٹ پھٹکار سن کر وہ جلد ہی چپ ہو گئے تھے' تاہم اس مرتبہ وہ چپ ہونے میں نہیں آ رہے تھے' صفدر کا قیافہ تھا کہ انہوں نے نمایاں پہرے دار کو آدم خوری کرتے دیکھ لیا ہے' اور غیر معمولی طور پر دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ بعد ازاں صفدر کا یہ تجزیہ درست ثابت ہوا۔ جس وقت وحشت زدہ اسلم نے کیبن سے فرار ہونے کی کوشش کی دو کیبنوں میں دوپہر کا کھانا پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کیبنوں کے دروازوں میں موجود خلا کھلے ہوئے تھے۔ اندر بند قیدیوں نے نہ صرف نثار کو گولی لگتے دیکھی بلکہ بدنصیب اسلم کی موت کا دلدوز منظر بھی دیکھا۔ نمایاں حبشی کی "آدم خوری" دیکھ کر ان کی دہشت انتہا کو پہنچ گئی اور انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ پورے کمپارٹمنٹ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ قیدی آہ و بکا کر رہے تھے۔ دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے اور پہرے دار ان سے بھی زیادہ شور مچا رہے تھے۔ وہ انہیں خاموش کرانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ جتنی زیادہ کوشش کرتے تھے قیدیوں کا واویلا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا۔ قیدیوں سے مار پیٹ بھی ہو رہی تھی' ہمیں یہ منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی قیدی

کو شکنجے کی سزا دی جا رہی ہے۔ وہی گردن میں پیتل کا پھندا لگا کر چہرے پر چھریاں برسانے والی سزا۔ جس بدنصیب کو مارا جا رہا تھا اس کی چیخیں فلک شگاف تھیں۔ وہ اپنی آواز سے کوئی نوجوان ہی لگتا تھا۔ اس کی سزا کا خوفناک منظر دیکھ کر اس کے ساتھیوں کی آوازیں سہم سی گئیں۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا کہ مضروب کے چہرے کی کھال ہڈیوں سے جدا ہو کر لٹک رہی ہے اور خون سے کمپارٹمنٹ کا فرش سرخ ہو رہا ہے۔ چند ہی لمحوں میں کیبنوں کے اندر موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ پہرے دار قیدیوں کو چپ کرانے کی کوششوں میں بالآخر کامیاب رہے تھے۔ بس چند بچے رو رہے تھے یا پھر ایک عورت چیخ رہی تھی۔ یہ عورت سزا پانے والے کی کوئی قریبی عزیز تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گندمی رنگت کی جواں سال عورت تھی' سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ حلیے اور لباس سے وہ شمالی ہند اور اتر پردیش کی سائیڈ کی لگتی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ دو حبشیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور کمپارٹمنٹ کے عقبی حصے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ عورت ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ حبشیوں کی نیت عورت کے بارے میں درست معلوم نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کا بچہ چھین کر واپس کیبن میں بھیج دیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے عقبی حصے میں لے گئے۔

قیدیوں نے ایک بار پھر دبی دبی آوازوں میں آہ و بکا شروع کر دی تھی' مگر جونہی یہ آوازیں ذرا بلند ہوئیں پہرے دار دوبارہ گرجنے برسنے لگے۔ ان کی دہاڑیں سن کر قیدیوں کی آوازیں حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں صاحب! یہ لوگ تو ظلم کی انتہا کر رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

میں نے کہا "انتہا تو کسی چیز کی نہیں ہوتی' نہ ظلم کی نہ صبر کی۔ نہ غم کی نہ خوشی کی۔ بعض اوقات ہم جسے انتہا سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ محض ابتدا ہوتی ہے۔"

زریں بولا "خوچے! جہاز میں کتنا پہرے دار ہوگا۔ کتنا عملہ ہوگا۔ یہ سارا لوگ ملا کر بھی تیس چالیس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اب آپ دیکھیں ادھر تین سو کے قریب قیدی لوگ ہے' اگر یہ سب بغاوت کر دے تو ان بردہ فروشوں کا ایک ایک بوٹی بھی حصے نہ آئے۔"

"تو تم لیڈر بن جاؤ اس جنگِ آزادی کے۔" صفدر نے مشورہ دیا۔

"اگر آپ بنائے گا تو ام بن بھی جائے گا اور سب سے پہلے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے گا۔"

"اب بات بات پر نذرانہ پیش نہ کیا کرو۔ اس نذرانے میں کسی اور کا حصہ بھی ہے۔" صفدر نے کلثوم کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ بھی اماری طرح پٹھان کا بچی ہے۔ ام کو ایک دم اجازت مرحمت فرمائے گا۔ کیوں کلثوم؟ ام ٹھیک کہہ رہا ہے ناں۔"

"ہاں ہاں۔ جب بھی وقت آیا۔۔۔ ام آپ کو ایک دم شہید کرائے گا۔۔۔ انشاءاللہ۔" وہ بڑے جوش سے بولی۔

"یہ تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" صفدر نے آنکھیں گھمائیں۔

"آں۔ ام کو بھی لگتا ہے۔" کلثوم بولی۔

"کیا لگتا ہے؟"

"کہ آوا بگڑا ہوا ہے۔ بلکہ اب تو۔۔۔ شاید۔۔۔ رک بھی گیا ہے۔"

"کیا رک گیا ہے؟"

زریں بولا "جناب! وہ جہاز کو آوا سمجھ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ آوا۔۔۔ امارا مطلب ہے کہ جہاز رک گیا ہے۔"

جہاز واقعی رکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ بولا "لگتا ہے کہ رک گیا ہے' یا پھر بہت آہستہ ہو گیا ہے۔"

"نہیں' میرا خیال ہے کہ رک ہی گیا ہے۔" میں نے کہا "کھڑکھڑ کی آواز بالکل نہیں آ رہی۔"

میں نے سوراخ سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا۔ حبشی پہرے دار رائفلیں ہاتھ میں لیے ٹہل رہے تھے۔ وہ معمول سے زیادہ چوکس نظر آتے تھے۔ جس کیبن میں سے کسی قیدی کی مدھم سی آواز بھی سنائی دیتی وہ اس کیبن کا دروازہ چھڑی کے ساتھ زور سے بجاتے اور خوفناک آواز میں دہاڑتے۔ جو چھڑی وہ استعمال کرتے تھے وہ عجیب سی تھی۔ اس کی لمبائی قریباً پانچ فٹ تھی۔ یہ دستے کی طرف سے موٹی تھی پھر بتدریج پتلی ہوتی چلی جاتی تھی۔ اسے کوڑے کی جدید قسم بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہ بید کی اس چھڑی کو مقامی زبان میں "شال" یا پھر "کی بو کو" کہتے تھے۔ میں نے دیکھا کمپارٹمنٹ کے فرش پر سیڑھیوں کے قریب دو جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ایک تو اس جگہ جہاں نثار علی کو گولی لگی تھی اور دوسرے جہاں منیامی حبشی نے بدنصیب اسلم کو اپنے دانتوں سے ادھیڑا تھا۔ اس اندوہناک واقعے کا اصل سبب اسلم ہی تھا۔ اس نے اپنی ہیجانی کیفیت میں ایک خطرناک بے وقوفی کی تھی

اور لقمۂ اجل بنا تھا۔ نثار علی صرف اسلم کو روکنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا تھا مگر موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میرے ذہن میں "نسرین" کا نام گونجنے لگا۔ یہی نام تھا جو اسلم ہوش میں اور بے ہوشی میں بار بار پکارتا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نام کے پیچھے کوئی کہانی تھی۔ یہ کہانی اسلم جانتا تھا یا پھر نثار علی کو معلوم تھی۔ یہ دونوں راہیٔ عدم ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی کہانی بھی ناپید ہو گئی تھی۔ اب ہمیں کسی نے نہیں بتانا تھا کہ وہ دونوں کہاں سے آئے تھے' ان کے دلوں میں کیا ارمان اور ارادے تھے۔ وہ اپنے پیچھے اپنے کن کن پیاروں کو دست بدعا چھوڑ آئے تھے۔ انہیں آج کسی وقت سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جانا تھا اپنی تمام خواہشوں اور آرزوؤں سمیت۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان کی لاشوں کے کچھ منتخب حصے قاتلوں کی آتش شکم کو بجھانے کے لیے فریج میں محفوظ کر لیے جاتے' اور باقی اجزا پکڑا گوشت مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر کی سطح پر پھینک دیا جاتا۔

صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! ان دو موتوں سے مائیکل کو دہرا نقصان ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک تو دو بردے ضائع ہوئے' دوسرا قیدیوں میں خاص طور سے انڈین قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سراسیمگی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔"

"ہاں دبی دبی آوازیں تو اب بھی آ رہی ہیں۔"

"ویسے زریں گل کی بات کوئی ایسی ناممکن بھی نہیں۔ اگر یہاں موجود سارے لوگ مزاحمت پر اتر آئیں تو مائیکل اینڈ کمپنی کو چھٹی کا دودھ یاد آ سکتا ہے۔"

"لیکن اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "ان لوگوں نے یہ کاروبار کوئی نیا نیا شروع نہیں کیا۔ تم یہ کیبن ہی دیکھ لو' اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عرصۂ دراز سے ہم جیسے بردوں کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے ہم جیسی ترکیبیں سوچی ہوں گی اور مائیکل اینڈ کمپنی نے اس کا توڑ کیا ہوگا۔"

"لیکن پہلے لوگوں میں کوئی استاد جہانی تو نہیں ہوگا ناں۔"

"اور نہ ہی صفدر صیب ہوگا۔" زریں گل نے لقمہ دیا۔

فضا میں عجیب سی سراسیمگی اور دہشت رچی ہوئی تھی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے اور وہ ماتم کناں دبی دبی آوازیں سنتے رہے جو انڈین قیدیوں کے کیبنوں سے بلند ہو رہی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں رونے دھونے کی ہوتی تھیں اور کبھی ان میں پوجا پاٹ کا آہنگ محسوس ہوتا تھا۔ جہاز واقعی رک چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی مرمت کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہو۔ ایسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ساحل یا بندرگاہ پر رکا ہو۔۔۔ لیکن کوئی ایسی آواز ابھی تک ہم تک نہیں پہنچی تھی جس سے پتا چلتا کہ ہم واقعی بندرگاہ پر ہیں چار سو مکمل سکوت تھا۔ اس سکوت کی وجہ سے یہ خیال آتا تھا کہ شاید جہاز چلتے چلتے اچانک خراب ہو گیا ہے اور اسے کہیں ویران سمندر میں رکنا پڑ گیا ہے۔

ہم باتوں سے ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے' مگر یہ کوئی ایسی کامیاب کوشش نہیں تھی۔ باتوں کے باوجود ہمارا دھیان انہی اموات کی طرف لگا ہوا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں ہوئی تھیں' کانوں میں رہ رہ کر اس انڈین لڑکی کی آہ و بکا گونج رہی تھی جسے سیاہ فام ہمارے سامنے گھسیٹتے ہوئے کسی کمرے میں لے گئے تھے۔

O☆O

اگلے چار روز بڑی گومگو کی کیفیت میں گزرے۔ جہاز ویران سمندر میں اسی مقام پر رکا رہا۔ بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے مسلسل مغرب کی طرف سفر کیا تھا۔ اس کا یقینی مطلب یہ تھا کہ ہم بحیرہ عرب میں سفر کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے کہیں راستے میں رخ تبدیل نہیں کیا تھا تو ہو سکتا تھا کہ ہم خلیج عدن کے آس پاس پہنچ چکے ہوں۔ ان چار دنوں میں کمپارٹمنٹ کی فضا سوگوار ہی رہی تھی۔ اس سوگواری کی سب سے بڑی وجہ ان انڈین قیدیوں کی آہ و زاری تھی جو کسی دور دراز علاقے سے پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ وہ عجیب سی زبان بولتے تھے اور کسی وقت جانوروں کے ایک ڈرے ہوئے ریوڑ کی طرح یک لخت چیخنے چلانے لگتے تھے۔ ایسے میں پہرے داروں کی دہاڑوں سے کمپارٹمنٹ گونجنے لگتا تھا۔ ان انڈین قیدیوں میں سے کئی ایک کے ساتھ سخت مارپیٹ بھی ہو چکی تھی۔ لیکن اس مارپیٹ سے الٹا اثر ہوتا تھا' وہ مزید خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ اس ماحول نے دیگر محبوس افراد پر بھی اثر کیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ گم صم نظر آنے لگے تھے۔ خاص طور سے جس کیبن میں سے نکلنے والے دو افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا وہاں ہراس کی فضا کچھ زیادہ تھی۔

غیر یقینی صورت حال کے باوجود ہمارے کیبن میں زریں گل اور کلثوم کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں۔ کلثوم ہر ذکر کو

مونث اور ہر مونث کو مذکر بنا دیتی تھی۔ اس کے علاوہ زریں گل کی زیرِ ہدایت انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کا استعمال اتنا زیادہ کرتی تھی کہ اکثر باتیں مذاق بن جاتی تھیں۔

یہ پانچویں روز کی بات ہے۔ علی الصباح ایک نیامی پہرے دار دو دیگر حبشیوں کے ساتھ ہمارے کیبن کے دروازے پر پہنچا۔ پہلے مجھے کیبن سے نکال کر الٹی ہتھکڑی لگائی گئی' پھر غزالہ کو باہر نکال لیا گیا۔ تابی سو رہا تھا' غزالہ نے اسے گلثوم کے سپرد کیا اور میرے ساتھ سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ مسلح پہرے دار ہمارے عقب میں تھے اور پوری طرح چوکس تھے۔ حسبِ معمول پہلے ہم اسٹور میں پہنچے اور وہاں خفیہ راستے کے ذریعے چاولوں کے عظیم الشان گودام میں پہنچ گئے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔ عرشے پر پہنچے تو دور تک کھلا سمندر اور اوپر نیلا آسمان نظر آیا۔ چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر کسی چھوٹے سے جزیرے کے آثار نظر آرہے تھے۔ جزیرے پر سبزہ تھا اور بلند و بالا درخت تھے۔ ہوا میں وہ خوشگوار حرارت موجود تھی جو عرب اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی خصوصیت ہے۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ ہم کہاں اور کس مقام پر ہیں لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مائیکل کے آرام دہ کمرے میں اس کے سامنے موجود تھے۔ وہ حسبِ معمول پھیل کر صوفے پر بیٹھا تھا اور وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ اس کا موڈ قدرے خوشگوار نظر آیا۔

میرا حال چال پوچھ کر غزالہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا "اچھا کیا تم اس بچو نکڑے کو ساتھ نہیں لائی ہو۔"

"کیا کام ہے ہم سے؟" میں نے پوچھا۔

"کام بھی بتا دیتے ہیں' پہلے کپڑے تو بدل لو۔۔۔ تمہیں کہیں لے کر جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو۔ کیا جہاز کچھ زیادہ پسند آگیا ہے؟"

"کیا مطلب۔ ہم جہاز سے باہر جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں' جلد ہی واپس آجائیں گے۔"

"اگر۔۔۔ ہم نہ جانا چاہیں تو۔۔۔؟"

"اگر مگر کی گنجائش تو تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔"

مائیکل کے لہجے میں سختی عود کر آئی "چلو کپڑے بدل لو۔"

ایک اینگلو انڈین ملازمہ ہم دونوں کے لباس لیے موجود تھی۔ اس نے میرا لباس مجھے تھما دیا اور دوسرا لباس غزالہ کو تھما کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ مائیکل کے اشارے پر میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور میں کپڑے بدلنے کے لیے ایک بغلی کمرے میں چلا گیا۔ مجھے پہننے کے لیے کارڈرائے کی پتلون اور آدھے بازو کی پھول دار بوشرٹ دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ پالش شدہ جوتے تھے اور سفید براق رومال تھا۔ جس وقت میں کپڑے بدل رہا تھا کمرے کے باہر سے مجھے پروفیسر اللہ دتا کی آواز آئی۔ وہ مائیکل سے مخاطب ہو کر بڑی التجا سے بولا "میں شائستہ سے ذرا دیر کے لیے مل لوں؟"

"وہ باتھ روم میں ہے۔" مائیکل نے خشک لہجے میں کہا۔

"وہ کب تک آجائے گی؟"

"اب مجھے کیا پتا کہ اس نے کتنی دیر میں نہانا ہے۔" مائیکل نے بھڑک کر جواب دیا۔

"مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ جہاز پر کب واپس آجائے گی؟"

"کل تک آجائے گی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر پروفیسر کی گھگیائی ہوئی آواز آئی "کیا میں۔۔۔ کیا میں ساتھ جا سکتا ہوں۔ ذرا میرا بھی جی اور ہو جائے گا۔"

"تم اپنا جی یہیں پر رہ کر بہلاؤ۔" مائیکل نے کہا۔

"میں۔۔۔ تمہارا۔۔۔ سامان وغیرہ اٹھا لوں گا بیٹا۔"

"بڑا شوق ہے تمہیں سامان اٹھانے کا۔ کیا گودام کے مزدوروں میں بھیج دوں تمہیں؟"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"تم تو صرف یہ چاہتے ہو کہ سایہ بن کر رات دن بیٹی کے ساتھ رہو۔ خبطی بڈھے' وہ اب دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ اس کی جان چھوڑ دو۔ ذرا آزادی سے جینے دو اسے' کیوں اس کے دماغ کا روگ بن رہے ہو۔ اس دن صرف اور صرف تمہاری وجہ سے وہ پاگل پن پر اتر آئی تھی۔ کیا اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ برستی گولیوں میں بھاگ دوڑ کرتی اور تمہاری پھٹی پرانی زندگی کو بچانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگاتی۔۔۔"

پروفیسر اللہ دتا' مائیکل کی کڑوی کسیلی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی پروفیسر اللہ دتا ہے جس کے کلینک کے باہر گاڑیوں کی طویل قطار نظر آتی تھی

اور جس کے ایک فون پر سرکاری دفاتر میں ہر طرف "افی نینی" کا دور دورہ ہو جاتا تھا۔ اپنی اولاد کی محبت میں تنکے سے حقیر ہو کر یہ شخص سمندر کے تھپیڑے کھا رہا تھا اور بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی منت سماجت کا مائیکل نے مثبت جواب نہیں دیا اور اسے واپس بھیج دیا۔

میں کپڑے بدل کر باہر نکلا تو تھوڑی ہی دیر بعد شائستہ بھی کمرے میں آگئی۔ وہ اُجلے پھول کی طرح نظر آرہی تھی۔ رنگین کپڑوں میں اس کا ملول حسن ایک خوب صورت "کنٹراسٹ" پیش کر رہا تھا۔ مائیکل نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے سامنے ہی اس کی کمر میں بازو حمائل کر دیا۔۔۔ کچھ دیر بعد غزالہ بھی لباس بدل کر آگئی۔ مائیکل نے نیامی کو آواز دی۔ اس نے اندر آکر مجھے دوبارہ ہتھکڑی لگا دی' تاہم اس مرتبہ اتنی رعایت کی گئی کہ ہتھکڑی سامنے کی طرف لگائی گئی۔

"چلو آؤ۔" مائیکل نے تحکم سے کہا۔

ہم مائیکل اور شائستہ کے پیچھے پیچھے چلتے باہر زیریں عرشے پر آگئے۔ یہاں سے جزیرہ نسبتاً صاف نظر آرہا تھا۔ اس چھوٹے سے جزیرے کی شکل پان کے پتے یا دل سے ملتی جلتی تھی۔ جزیرے کا فاصلہ تقریباً ایک میل رہا ہوگا۔ اردگرد سمندر گہرا نیلا تھا اور دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ جہاز کے پہلو سے رسے اور پائپ کی بنی ہوئی مضبوط سیڑھی لٹک رہی تھی' اس سیڑھی کی لمبائی پچیس فٹ سے زائد نہیں تھی۔ نیچے سمندر میں جہاز ہی کی ایک کشتی موجود تھی۔ اس کشتی میں ایک نیامی سمیت تین مسلح سیاہ فام موجود تھے۔ کینوس کے دو بڑے تھیلوں میں کھانے پینے کا سامان تھا' اس کے علاوہ درمیانے سائز کے دو واٹر کولر بھی کشتی میں رکھے تھے۔ ہم یکے بعد دیگرے سیڑھی اتر کر کشتی میں پہنچے۔ ہتھکڑی کے سبب مجھے اترنا خاصا دشوار محسوس ہوا۔ ہمارے بیٹھتے ہی تنومند حبشیوں نے چپو سنبھالے اور کشتی کو جزیرے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مائیکل ہمیں جزیرے پر کیوں لے جا رہا ہے اور یہ کہ جزیرے پر لے جانے کے لیے اس نے ہم دونوں کا انتخاب ہی کیوں کیا ہے۔

کشتی جہاز سے سو ڈیڑھ سو گز دور گئی تو ہمیں جہاز کی عقبی سمت بھی نظر آنے لگی۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق یہاں جہاز کے متاثرہ حصے کی مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ تین کشتیاں رسوں سے باندھ کر ایک پلیٹ فارم سا تیار کیا گیا تھا۔ چھ سات باوردی مکینک اور دیگر افراد یہاں موجود تھے۔ دو افراد غوطہ خوری کے لباس میں بھی نظر آرہے تھے۔ جہاز کی متاثرہ چرخی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ "غوطہ خوری" کا لباس اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

میں نے مائیکل سے پوچھا "کیا زیادہ نقصان ہوا ہے؟"

"نہیں اتنا زیادہ تو نہیں' بہرحال ایک دن اور لگ جائے گا۔"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جزیرے پر۔۔۔ میں نے سوچا چلو اس دوران میں تھوڑی سی تفریح ہی ہو جائے' یہ جزیرہ جو تم دیکھ رہے ہو' بڑا خاص جزیرہ ہے۔ اس کی شکل انسانی دل سے ملتی ہے۔ اس لیے یار لوگ اسے محبت کا جزیرہ کہتے ہیں۔ جن جہاز رانوں کو موقع ملتا ہے اور وہ کیپٹن جم کی طرح بڈھے کھوسٹ بھی نہیں ہوتے' وہ اس جزیرے پر ایک آدھ رات کے لیے ضرور رکتے ہیں۔ ہمیں تو جہاز کی مرمت کے سبب خصوصی موقع ملا ہوا ہے۔"

"تو کیا۔۔۔ ہم یہاں رات گزاریں گے؟"

"اس میں حرج بھی کوئی نہیں۔ یہ بہت صاف ستھرا جزیرہ ہے۔ کوئی کیڑا مکوڑا نہیں۔ کوئی پریشانی نہیں' موسم تو تم دیکھ ہی رہے ہو' بغیر خیمے کے بڑے مزے سے رات گزاری جا سکتی ہے۔ تھوڑا بہت مچھر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے لیے آئل ہے ہمارے پاس۔۔۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم ہمیں کیوں لے جا رہے ہو اپنے ساتھ؟"

"کیوں' تم کیوں نہیں جا سکتے؟ تم دونوں محبت نہیں کرتے ایک دوسرے سے؟"

میں نے چونک کر غزالہ کی طرف دیکھا' وہ ذرا فاصلے پر بیٹھی تھی اور سمندر کی طرف متوجہ تھی۔ تابی کی دوری اسے پریشان کر رہی تھی۔ مائیکل نے کہا "تم مشرقی لوگ بدکتے کیوں ہو محبت کے نام سے؟"

میں نے کہا "معاف کرنا' تمہارے خون آشام منہ سے "محبت' خوب صورتی" اور اس قسم کے دوسرے لفظ کچھ اچھے نہیں لگتے۔"

"میں نے تمہیں تبصرہ فرمانے کو نہیں کہا ہے۔" مائیکل غرایا "اگر کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو چونچ بند کر کے بیٹھے رہو۔"

خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ پُرسکون نیلے سمندر میں چپوؤں کی چھپ چھپ موسیقی کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ جہاز لمحہ بہ لمحہ ہم سے دور ہو رہا تھا اور جزیرہ قریب تر آرہا تھا۔ غزالہ کی پریشان سوالیہ نگاہیں بار بار میری طرف اٹھ جاتی تھیں۔ لیکن مجھے خود کچھ معلوم نہیں تھا اسے کیا بتاتا'

اور اگر معلوم ہوتا بھی تو ان لوگوں کے سامنے کیسے بتا سکتا تھا۔ چپو چلانے سے سیاہ فاموں کو پسینہ آگیا اور ان کے بدن کا فولاد سورج کی روشنی میں چمکنے لگا۔ منیامی پہرے دار ہاتھوں میں "ایم جی" لیے بالکل چوکس بیٹھا تھا۔ دوسرے سیاہ فاموں کی طرح اس کے جسم پر بھی صرف ایک پتلون تھی۔ اس نے بڑے سنگے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس منیامی کو دوسرے سیاہ فاموں سے جو شے جدا کرتی تھی وہ اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے جبڑے تھے۔ ان جبڑوں کو دیکھنے سے ہی ان کی مضبوطی اور خوں خواری کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے میں ہم جزیرے کے ساحل سے جا لگے۔ ہم "دل" کے چونچ والے حصے کی طرف اترے تھے۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ واقعی خوب صورت اور پُرسکون تھا۔ ہوا بلند و بالا درختوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ہر جھونکے میں جنگلی پھولوں اور دیگر نباتات کی مہک رچی بسی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جوں جوں سورج اوپر آئے گا اس دل آویز مہک میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہم کنارے پر کھڑے ہو کر جہاز کو دیکھتے رہے۔ "ہرکولیس" کے حروف جہاز کے پہلو پر چمک رہے تھے۔ عرشے پر حرکت کرتے ہوئے افراد نقطوں کی طرح نظر آتے تھے۔ ایک لہر شور مچاتی جھاگ اڑاتی ہوئی آئی اور ہمیں پنڈلیوں تک بھگو گئی۔

مائیکل کی ہدایت کے مطابق منیامی پہرے دار کشتی کے قریب پہرے پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا پہرے دار جزیرے پر کچھ آگے چلا گیا اور ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ تیسرے سیاہ فام نے ہمارا سامانِ خورد و نوش اٹھایا اور ہمارے ساتھ چل دیا۔ ہم جزیرے کے قریباً وسط میں آگئے۔ یہاں کھجوروں کے کئی جھنڈ تھے اور خود رو پودے نظر آرہے تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھار یہاں اِکّا دُکّا لوگ آتے رہتے ہیں۔ کئی درختوں کے تنوں پر عورتوں اور مردوں کے نام کندہ تھے۔ کہیں کہیں خالی ٹن اور خالی بوتلیں وغیرہ بھی پڑی نظر آجاتی تھیں۔ کسی فنکار سیاح نے فرصت کے اوقات میں کھجور کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے کو بڑی خوب صورتی سے تراشا تھا اور دوبارہ سے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ اس چار پانچ فٹ اونچے تنے کو بڑی چابک دستی مگر بے حیائی سے مرد و عورت کی شکل دی گئی تھی۔ وہ برہنہ حالت میں ایک دوسرے کے اندر غرق تھے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں ایک دو ایسے ہی مکمل اور نامکمل مجسمے نظر آرہے تھے۔ کچھ پر لوگوں نے اپنے نام بھی کندہ کر رکھے تھے۔ ایسے ہی دو ناموں کے نیچے مارکر کی پکی روشنائی سے لکھا تھا "محبت کے جزیرے پر تین حسین راتوں کی یاد میں!"

سیاہ فام خدمت گار نے ایک ہموار جگہ پر بڑی سی قالین نما دری بچھا دی اور سامان رکھ دیا۔ ایک ایسی ہی دری اس نے چند گز دور کھجوروں کے نیچے بچھا دی۔ مائیکل نے شائستہ سے کہا "ڈاکٹر کو لے کر کھومو پھرو۔"

شائستہ نے اثبات میں سر ہلایا اور غزالہ کو لے کر کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی۔ غزالہ کے چہرے پر تذبذب اور پریشانی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

میں نے مائیکل سے کہا "یہ سب کیا ہے؟"

"تفریح ہے اور کیا ہے۔ ہم یہاں شب گزاریں گے، کل جہاز پر واپس چلے جائیں گے۔ پرانے جہاز رانوں کا عقیدہ ہے کہ جو جوڑے اس جزیرے پر رات گزارتے ہیں، ان کی محبت کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔"

"تمہیں نئی زندگی کی ضرورت ہوگی، ہمارے لیے پرانی زندگی ہی کافی ہے۔"

"ناشکری مت کرو۔" وہ تحکم سے بولا "تمہیں پورے چوبیس گھنٹے آزادی اور تفریح کے مل رہے ہیں اور تمہاری سویٹ ہارٹ بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

"اس مہربانی کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"بہت خاص تو نہیں۔ بہرحال تم نے بمبئی جا کر اور وہاں سے دونوں لڑکیوں کو پار کر کے میرا ایک مسئلہ حل کیا ہے۔ سمجھو اسی کا انعام ہے یہ۔"

"میرے خیال میں یہ اتنا بڑا انعام نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اور ڈاکٹر اس انداز میں یہاں رات نہیں گزار سکتے جس انداز میں تم چاہتے ہو۔"

"وہ کیوں؟" مائیکل نے آنکھیں نکالیں "کیا تم ایک دوسرے سے پیار نہیں کرتے ہو؟"

"کرتے ہیں۔ لیکن تمہارے پیار اور ہمارے پیار میں فرق ہوتا ہے۔"

"میں کسی بوگس فرق کو نہیں مانتا۔ کیا تم جسمانی طور پر اسے حاصل کرنا نہیں چاہتے؟"

"شاید چاہتا ہوں۔"

"کیا وہ جسمانی طور پر تمہارے قریب آنا نہیں چاہتی؟"

"شاید چاہتی ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ زیادہ سادھو اور اوتار بننے کی کوشش مت کرو۔ اگر اس کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہے یا

اس کا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں دو منٹ میں یہ مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔"

"کیا تم نفسیاتی ماہر بھی ہو؟"

"ہاں نفسیاتی ماہر بھی ہوں اور یہ دیکھو میری ڈگری!" اس نے اپنے کوٹ کے نیچے سے ۳۸ بور کا ریوالور نکالتے ہوئے کہا "تمہاری سویٹ ہارٹ کو بلکہ تم دونوں کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔"

"یہ تو ایسے ہی ہے جیسے دھوپ سے نڈھال شخص کو آگ تاپنے پر مجبور کیا جائے۔ محبت کوئی زبردستی والی چیز نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں تبصرے کرنے کی اجازت نہیں دی، صرف تفریح کی اجازت دی ہے۔" اس نے ریوالور کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔

مائیکل کے نادر شاہی حکم کے مطابق میں نے دن کا باقی حصہ غزالہ کے ساتھ گھومتے پھرتے گزارا۔ جزیرے کا رقبہ بمشکل ایک مربع میل ہوگا۔ مائیکل کی اطلاع کے مطابق یہ واقعی ایک صاف ستھرا جزیرہ تھا، حشرات الارض نہ ہونے کے برابر تھے۔ کھجوروں اور تاڑ کے درمیان کہیں کہیں ریتلے رقبے بھی تھے۔ ہم نے جوتے اتار دیے اور ساحل کے ساتھ ننگے پاؤں گھومتے رہے۔ غزالہ نے کہا "یہ شخص ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟"

"کہتا ہے کہ تفریح کے لیے لایا ہوں۔"

"مگر ہمیں ہی کیوں لایا ہے؟"

"بس اس کی مرضی ہے۔"

"میں تابی کے لیے بہت پریشان ہوں۔ وہ جاگتے ہی مجھے ڈھونڈنا شروع کر دے گا۔"

"چلو گلشوم تو ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سنبھال لے گی۔"

"ہاں، اس کے ساتھ تھوڑا بہت وقت گزار لیتا ہے۔"

"ویسے یہ تابی بڑا پیارا بچہ ہے، اور جتنا پیارا ہے اتنا ہی خوش قسمت بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارا پیار ملا ہے اسے۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی، پھر بات بدل کر بولی "کیا آپ نے مائیکل سے معلوم کیا کہ ہم کس جگہ پر ہیں؟"

"ہاں، میں نے ابھی پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہم اومان کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اب خلیج عدن کے آس پاس ہیں۔ ہماری بائیں جانب "حدی بُو" کا مشہور جزیرہ ہے۔ اگر مائیکل کی بات کو درست مانا جائے تو پھر میرے نالج کے مطابق ہم افریقہ کے مشرقی ساحل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم سیدھے چلتے رہیں تو غالباً صومالیہ کے علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اگر بائیں رخ پر مڑ گئے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ منزل کون سی ہو۔"

"میرا دل۔۔۔ بہت ڈر رہا ہے شاہ جہاں! پتا نہیں آنے والے دنوں میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں، یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے، میں ہی بدقسمت ہوں۔"

"کیوں، تم نے کیا کیا ہے؟"

"نہ آپ مجھے لاہور میں ڈھونڈتے، نہ پروفیسر اللہ دتا سے آپ کی ملاقات ہوتی اور نہ یہ سارا چکر چلتا۔"

"بدقسمتی کا یہ معیار ہے تو پھر دنیا میں آج تک کوئی خوش قسمت پیدا نہیں ہوا۔ خوشگوار اور ناخوشگوار قسم کے تمام واقعات انسانوں کے وسیلے سے ہی جنم لیتے ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے ہم سمندر سے دور درختوں میں چلے آئے۔ کھجوروں کے جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے غزالہ کا چہرہ ایک بار پھر حیا سے سرخ ہو گیا۔ یہیں پر کسی نامعلوم سیاح کی "فنکاری" عریاں مجسمے کی صورت میں نصب تھی۔ ہم نگاہیں چُرا کر آگے بڑھ گئے۔ اگر زریں گل ساتھ ہوتا تو وہ یقیناً مجسمے پر بھرپور لعنت ارسال کرتا، اور بار بار لعنت ارسال کرنے کے لیے بار بار بھرپور نظروں سے دیکھتا۔

رات کا کھانا ہم نے سورج غروب ہوتے ہی کھا لیا۔ یہ ایک پُرتکلف کھانا تھا لیکن ایک آدم خور کی صحبت میں یہ کھانا زہر لگ رہا تھا۔ غزالہ تو بس ایک دو لقمے لے کر ہی رہ گئی۔ میں اس کی احتیاط پر دل ہی دل میں محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے گوشت کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ یہ بھی کسی اشرف المخلوقات کا گوشت ہوگا۔ شائستہ البتہ کھا رہی تھی اور گاہے گاہے مائیکل سے بات بھی کر رہی تھی۔ مائیکل اسے یہاں تنہائی کے لمحات گزارنے کے لیے لایا تھا، یہی وجہ تھی کہ پروفیسر شدید خواہش کے باوجود یہاں ہمارے ساتھ نہیں آسکا تھا۔ مائیکل نے اسے جہاز پر ہی رہنے پر مجبور کیا تھا۔ شائستہ جاذبِ نظر لگ رہی تھی۔ اس کے بال بار بار اڑتے تھے جنہیں وہ سمیٹ کر کانوں کے پیچھے اُڑس لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر ترس بھی آتا تھا، ابھی اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یونیورسٹی کی طالبہ لگتی تھی، مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ بچے کی ماں بننے والی تھی، اور اس بچے کا باپ ایک ایسا شخص

تھا جسے انسان کہتے ہوئے بھی زبان لڑکھڑاتی تھی۔ وہ ایک غیر قوم' غیر مذہب اور غیر فطرت کا شخص تھا اور اس کا پیشہ دنیا کا بدترین پیشہ بردہ فروشی تھا۔

کھانے کے بعد میں اور مائیکل اکیلے ہی دری پر بیٹھے رہ گئے' مشرق کی طرف چاند روشن تر ہوتا جارہا تھا۔ یہ انیسویں بیسویں تاریخ کا چاند تھا۔ اس کی روشنی میں درختوں سے جھانکتا ہوا سمندر کا پانی چمکنے لگا اور جزیرے کی نیم ریتلی زمین پر اندھیرے اُجالے کی بساط بچھ گئی۔ مائیکل تکیے سے ٹیک لگا کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا' وہ آج تھری پیس سوٹ میں ہی یہاں آیا تھا مگر سہ پہر کے بعد اس نے لباس بدل لیا تھا' اب وہ افریقی طرز کے ایک رنگ دار لبادے میں تھا۔ اسکرٹ سے مشابہ اس طویل لبادے کی دونوں جانب دو بڑی بڑی جیبیں تھیں اور ان میں سے ایک جیب کے اندر بھرا ہوا ریوالور تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس ریوالور کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔ اس کی ہدایت پر خدمت گار حبشی نے آگ جلائی اور جن کی بوتل' پیالے سمیت مائیکل کے سامنے رکھ دی۔ مائیکل نے مجھے دعوت دی پھر اکیلا ہی گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ میں نے کہا "مائیکل! ایک بات پوچھوں؟"

وہ بولا "مجھے یہ فقرہ بہت اچھا لگا ہے' میں چاہتا ہوں کہ تم ہر سوال سے پہلے یہ فقرہ بول لیا کرو۔"

میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "کیا شائستہ پر واقعی پروفیسر کے ملازم "منشا" نے مجرمانہ حملہ کیا تھا؟"

"کیوں' تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ خود سے حاملہ ہوگئی ہے۔"

"نہیں' یہ خیال تو نہیں لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ اس تہ خانے میں کسی اور کی مجال نہیں تھی کہ وہ شائستہ تک رسائی حاصل کرسکتا۔ اسی طرح تمہاری یہ بات بھی کچھ دل کو نہیں لگتی کہ تم نے منشا کو مجرمانہ حملے کی پاداش میں قتل کیا اور دوسرے ملازم اشرف کو اس لیے مارا کہ وہ منشا کی موت سے آگاہ ہوگیا تھا۔"

مائیکل خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا' سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہنے لگا "اچھا' تم بتاؤ' تمہارا کیا تجزیہ ہے ان واقعات کے بارے میں؟"

"میرا تجزیہ شاید تمہیں پسند نہ آئے۔"

"میری پسند کی فکر نہ کرو۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک رات نشے میں دھت ہوکر تم شائستہ کے کمرے میں جا گھسے اور پروفیسر اللہ دتا کے ساتھ کیا ہوا یہ وعدہ بھول گئے کہ شائستہ دس سال بھی تمہاری تحویل میں رہے تو اس کی عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ تم نے تہ خانے کی تاریکی میں بے بس ولاچار لڑکی کو ہوس کا نشانہ بنایا۔ تمہاری اس کارروائی کو منشا نے دیکھ لیا۔ وہ تمہارا رازدار اور ساتھی تھا مگر اس کے علاوہ منشا کی ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ وہ پروفیسر اللہ دتا کے گھر میں بچپن سے تھا اور دل ہی دل میں شائستہ کو پسند کرتا تھا۔ اس نے شائستہ کی چیخ وپکار سنی تو خود پر قابو نہ رکھ سکا اور نتائج سے بے پروا ہوکر تم پر پل پڑا' تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاش غائب کردی۔ تمہارے دوسرے رازدار ساتھی اشرف کو شبہ ہوگیا کہ تم نے منشا کو مار ڈالا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اشرف کا یہ شبہ تقویت پکڑتا گیا' یہاں تک کہ تمہیں خوف محسوس ہوا کہ اشرف تہ خانے میں تمہاری موجودگی کا راز فاش کردے گا۔ تم نے اسے بھی مار ڈالا۔ تمہاری درندگی کا ثبوت اشرف کے گوشت کی شکل میں ہمیں تمہاری فریج سے ملا۔"

میں خاموش ہوکر مائیکل کی صورت دیکھنے لگا۔ شراب کے اثر نے اس کا چہرہ تمتما دیا تھا آگ کی روشنی میں یہ تمتمایا ہوا سیاہ چہرہ کچھ اور بھی عجیب لگ رہا تھا۔ وہ بولا "جو کچھ تم نے کہا ہے یہ سب تمہارا تصور ہے اور ذہن کی اختراع ہے۔ اصلیت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ سو فی صد حقیقت ہے۔"

اس کے آخری الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے سفید دانت دیکھ کر کسی درندے کا تصور ذہن میں آجاتا تھا "ہاں۔۔۔ تمہارا تجزیہ سو فی صد نہیں تو پچانوے فی صد ضرور درست ہے۔ اب معلوم نہیں اتفاقاً ایسا ہوا ہے یا واقعی تم نے شیطان کا دماغ پایا ہے۔ بہرحال جو کچھ ہوچکا ہے مجھے اس پر شرمندگی نہیں۔ اگر ہم کاتب تقدیر کے وجود کو مانتے ہیں تو ہمیں کسی انسان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے۔"

"لیکن تم نے اس وقت جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"اس وقت کچھ مجبوریاں تھیں' جو اب نہیں ہیں۔"

اچانک غزالہ کی چیخ سنائی دی۔ میں اور مائیکل دوڑ کر غزالہ تک پہنچے' شائستہ بھی پاس ہی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ ان دونوں کی نگاہیں ریت پر جمی ہوئی تھیں۔ مدھم چاندنی میں ریت پر کوئی چھپکلی قسم کی شے نظر آرہی تھی۔ اسے مینڈک اور چھپکلی کی درمیانی شکل کہنا چاہیے۔

مائیکل نے قہقہہ لگایا "یہ واحد جاندار ہے جو یہاں کھلے بام گھومتا پھرتا نظر آتا ہے' بالکل بے ضرر ہے۔"

اس نے مینڈک نما چھپکلی کو ہاتھ میں پکڑلیا' پھر کمال بے تکلفی سے اس نے اس جاندار کا سر اپنے منہ میں ڈالا اور دانتوں سے کاٹ کر علیحدہ کردیا۔ شائستہ اور غزالہ کی چیخیں نکل گئیں' مائیکل نے سر ایک طرف تھوک کر دھڑ زمین پر پھینک دیا۔ وہ ذرا دیر تڑپ کر ساکت ہوگیا۔

غزالہ جھپٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ مائیکل نے کہا "تم تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہو ڈاکٹر۔ ایک طرف اتنے بڑے بڑے آپریشن کرلیتی ہو دوسری طرف مینڈک کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' اگر زیادہ پریشانی ہے تو میں تمہارے بستر کے قریب بھی آگ جلوا دیتا ہوں۔"

پھر اس نے حبشی خدمت گار کی طرف منہ کرکے ہانک لگائی۔ خدمت گار بھاگتا ہوا آیا۔ مائیکل نے افریقی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ وہ کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا اور اس دوسری دری کے قریب آگ جلانے لگا جو کھجوروں کے عین نیچے بچھائی گئی تھی۔

آگ جل چکی تو مائیکل نے کہا "جاؤ' اب تم دونوں بھی آرام کرو۔"

میں اور غزالہ کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چل دیے۔ ہم پندرہ بیس قدم آگے گئے ہوں گے جب مائیکل نے مجھے آواز دے کر واپس بلالیا "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مجھے غصہ مت دلانا۔ ورنہ تم دونوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"دھوکا بازی نہیں چلے گی۔ تمہیں یہ رات ویسے ہی گزارنی ہے جیسے میں نے کہا ہے۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اس کا لہجہ ایک دم خطرناک ہوگیا "یہ میرا حکم ہے' اور یاد رکھو' میرا حکم یہاں قانون ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے' لیکن تمہیں ہمارے مزاج کا تو خیال رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں' اکٹھے رات کیسے گزار سکتے ہیں؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب ہے کہ ہم اپنے بستر کہیں اور بچھا لیتے ہیں۔"

"اور کیا سمندر میں اتر جاؤ گے' بس ٹھیک ہیں جہاں بچھے ہیں۔ اب جاؤ' جو میں نے کہا ہے' وہ ذہن میں رکھنا۔"

نشے نے اس کی آواز کو بھاری بھرتم بنا دیا تھا۔

میں غزالہ کے ساتھ کھجوروں کے نیچے بچھی دری پر جا بیٹھا۔ چاند دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کررہا تھا' چاندنی کے پاؤں میں لہروں کے شور نے پائل سی باندھ رکھی تھی۔ بڑا خوب صورت منظر تھا' لیکن یہ خوب صورتی ایک بخشش کی طرح تھی اور اس پر جبری تہمت بھی لگی ہوئی تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا مائیکل؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ بے فکر ہوکر سو جاؤ۔"

"کچھ اور بھی کہہ رہا تھا؟" غزالہ کے لہجے میں شک تھا۔

"نہیں بھئی۔ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔"

میں لیٹ گیا' غزالہ بیٹھی رہی' کچھ دیر بعد وہ بھی لیٹ گئی۔ وہ دری کے بالکل کنارے پر لیٹی تھی۔ اس کے کانوں کے بندے چاندنی میں دمک رہے تھے۔

مائیکل اور شائستہ کے بستر کے قریب جلا ہوا الاؤ نظر آرہا تھا اور ان کے مدھم ہیولے بھی دکھائی دیتے تھے۔ میں چت لیٹا اپنی ہتھکڑی کو دیکھتا رہا' کیسی آزاد فضاؤں میں یہ کیسی تکلیف دہ پابندی تھی۔ ہتھکڑی کی بندش سے میری کلائیاں جلنے سی لگی تھیں۔ اچانک میں چونک گیا' ہمارے سروں کی طرف کوئی موجود تھا۔ اس کا سایہ میرے اور غزالہ کے درمیان خالی جگہ پر رینگ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیکھا۔ وہاں مائیکل کھڑا تھا۔ نشے میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"میں نے کیا کہا تھا تم سے؟" وہ بے حد سخت لہجے میں بولا۔

"تم نے یہی کہا تھا کہ۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ کسی درندے ہی کی طرح دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ کچھ دیر خونی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا' پھر بولا "میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ یاد رکھو کہ یہ آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد۔۔۔ میں تمہاری جگہ خدمت گار جوزف کو بھیج دوں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟ تمہاری جگہ میں جوزف کو بھیجوں گا۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا۔ لیکن بہت دور نہیں گیا' وہ ہمارے اردگرد ہی منڈلا رہا تھا۔ کسی بھی وقت وہ ہماری خبرگیری کے لیے دوبارہ آسکتا تھا۔ میں نے کہا "غزالہ! ہمیں۔۔۔ ایک دوسرے کے قریب لیٹنا پڑے گا ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"ورنہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں آپ سے پوچھ رہی تھی ناں کہ کیا بات ہے' اور آپ مجھ سے چھپا رہے تھے۔ ابھی کیا کہا ہے مائیکل نے؟"

"کچھ نہیں کہا۔ بس تم قریب آجاؤ۔"

کتنی ہی دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ ساکت لیٹے رہے۔ مائیکل کے دھمکی آمیز لہجے کی بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور شاید۔۔۔ غزالہ کے کانوں میں بھی گونج رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے قریب ... سرسراہٹ محسوس کی' غزالہ میرے قریب سرک آئی تھی۔ اس کے بدن کی خوشبو اور اس کی قربت کا ریشمی احساس میرے آس پاس تھا' لیکن یہ جبر کی قربت تھی اس میں خود سپردگی کو نہیں مصلحت کو دخل تھا۔ میں نے دیکھا مائیکل کسی آسیب کی طرح ہمارے قریب منڈلا رہا تھا۔ اس کا فاصلہ ہم سے پندرہ بیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ چاندنی میں اس کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی' میں نے اپنے بازوؤں کا حلقہ سا بنایا اور غزالہ کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ میری بانہوں میں آگئی۔ یہ بڑی ہوش ربا قربت تھی۔ ایک عرصے بعد۔۔۔ ایک طویل عرصے بعد میں غزالہ کے بدن کو محسوس کررہا تھا' اس کے دل کی دھڑکن سن رہا تھا' اس کے سانسوں سے چھو رہا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نہیں تھا۔ اس خوب صورت زنجیر میں "آمادگی" کی کڑی غائب تھی۔

مگر قربت پھر بھی قربت ہوتی ہے۔ بے شک یہ مصنوعی قربت تھی مگر مجھ پر ستم کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ میرے ہونٹ غزالہ کے مہکے بالوں سے چھو رہے تھے۔ یہ میرے جانے پہچانے بال تھے' یہ میری جانی پہچانی مہک تھی' لیکن اب اس جان پہچان پر اجنبیت کا سایہ تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا "غزالہ! تم اس مجبوری کو سمجھ رہی ہو۔ مجھے معاف کرنا' ہم ایک جنونی کے رحم و کرم پر ہیں۔"

وہ خاموش رہی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس رات کے دامن میں کیسی سنسنی تھی' اس چاندنی کی گٹھڑی میں کیسا انوکھا پن تھا۔ ساحلی ہوا کا لمس ایک طلسم کی طرح میرے بدن میں سرایت کررہا تھا۔ کچھ دیر ہمارے اردگرد منڈلانے کے بعد مائیکل اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا۔ غالباً وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ ہم اس کے کہے پر چل نکلے ہیں' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پوری طرح مطمئن نہ ہوا ہو مگر اس کا نشہ اسے شائستہ کی خوب صورتی کی طرف کھینچ رہا ہو۔ وہ اسے بانہوں میں بھر کر اس رات کو رنگین کرنا چاہ رہا ہو۔ مائیکل چلا گیا تو میرے سینے میں ایک سرد لہر سی پھیل گئی۔ میں جانتا تھا کہ اب غزالہ مجھ سے دور ہٹ کر لیٹ جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ہاں ایسا ہوا نہیں۔ میرے لیے یہ شادیِ مرگ کا مقام تھا کہ ہم اسی طرح لیٹے رہے۔ میں ان لمحات کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو شاید نہ کرسکوں۔ مجھے لگا جیسے میں ایک ناقابلِ یقین خواب دیکھ رہا ہوں اور ابھی یہ سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ چند منٹ اسی طرح گزرے پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاند کھجور کے گھنے جھنڈ کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ ہم جہاں لیٹے تھے وہاں گہری تاریکی پھیل گئی۔ آگ بھی بجھ چکی تھی اور ہم مکمل اندھیرے میں تھے۔ میرے ذہن میں خیال جاگا کہ غزالہ اب ضرور میری بانہوں کے حصار سے نکل جائے گی۔ مگر اس مرتبہ بھی میرے ان بدترین خدشات نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کی نیم گرم سانسیں میری گردن کے نچلے حصے سے ٹکراتی رہیں۔ یہ ان اجنبی لمحوں کی مٹھی میں خوشی کی کیسی کہکشائیں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کہکشائیں اچانک ہی میرے سامنے آئی تھیں اور مجھے ایک مہربان روشنی کے سمندر میں غرق کردیا تھا۔ غزالہ پہلے بھی میرے قریب تھی مگر پہلے سینے کے گنبد میں دل نقارے کی طرح نہیں بج رہا تھا۔ وارفتگی کے عالم میں میرے ہونٹ پھسلتے ہوئے غزالہ کے ہونٹوں سے جا ٹکرائے۔ وہ ایک طویل بوسہ تھا' ایک طلسمی لمس جس کو بیان کرنے کے لیے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ خبر نہیں کہ کتنی دیر بعد میں اس طلسم سے آزاد ہوا۔ غزالہ کی کراہتی ہوئی سی سرگوشی میرے کانوں میں پڑی "شاہ جہاں۔۔۔ یہ۔۔۔ گناہ ہے۔"

"نہیں غزالہ! میری محبت گناہ نہیں ہے۔" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

غزالہ نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں کی زد سے ہٹالیے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے نرم ریشمی بالوں میں دھنسا دیا۔ محبت کے اس جزیرے میں زلفوں کی ایسی چھاؤں میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ مجھے لگا جیسے میں مزید کسی خواہش کے بغیر اسی طرح آنکھیں بند کیے اس مقام پر پوری زندگی گزار سکتا ہوں۔ سالہا سال اسی طرح لیٹا رہ سکتا ہوں اندھیروں اُجالوں اور موسموں سے لاتعلق۔ غزالہ کے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوئے اور اس کی زلفوں کے سائے میں آرام کرتے ہوئے مجھے بھلا کس شے کی خواہش ہوسکتی تھی۔۔۔ ہم اسی طرح پڑے رہے' میں اپنے بدن کو جنبش تک نہیں دے رہا تھا کہ مبادا یہ طلسم ٹوٹ جائے اور میں خود کو جدائی کے خارزار میں بھٹکتا ہوا پاؤں۔ وہ طویل رات جیسے

[illegible] گزر گئی۔

[illegible] سحر طلوع ہوا تو صحرا کی تاریکی نے دامن سمیٹ [illegible] سمندر میں پناہ لی تھی اور شائستہ کو بھی پانی میں بلا [illegible] میں اور غزالہ بھی اٹھ بیٹھے۔ ایک عجیب سا خمار تھا [illegible] کے چہرے پر لیکن وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ [illegible] اپنی آنکھوں میں رت جگا ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ [illegible] ایک گھنٹے بعد ہم سمندر کے عین کنارے پر بیٹھے ناشتا [illegible] تھے۔ ناشتے میں ٹن پیک کھانے تھے جنہیں حبشی [illegible] کار جوزف نے گرم کیا تھا' اس کے علاوہ پائن ایپل [illegible] تھا اور پھلوں کی سلاد تھی۔

ناشتے کے فوراً بعد مائیکل نے اپنا تھری پیس سوٹ پہن [illegible] اور ٹائی کس لی تھی۔ جیسے وہ جزیرے کی سیر کے لیے [illegible] آفس میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے جارہا ہے۔ وہ [illegible] چوکس نظر آتا تھا اور کسی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح [illegible] تھا۔ مجھے اس کی وہ شاطرانہ چال یاد آگئی جب اس [illegible] ایرانی جہازوں کو اپنے پیچھے لگا کر ریت میں پھنسا دیا تھا۔ [illegible] اور شائستہ کی طرح میں اور غزالہ بھی جزیرے میں [illegible] اِدھر گھومتے رہے۔ غزالہ تابی کے لیے پریشان تھی۔ [illegible] کی نگاہ بار بار سمندر کی طرف اُٹھ جاتی تھی' قریباً ایک [illegible] کے فاصلے پر ہرکولیس صاف نظر آرہا تھا۔ اسی ہرکولیس [illegible] اندر تابی تھا اور ہمارے دیگر ساتھی بھی تھے۔ یقینی بات [illegible] کہ وہ ہمارے لیے از حد پریشان ہوں گے۔ مائیکل ہمیں [illegible] بٹھائے وہاں سے اٹھالایا تھا' تابی اس وقت سو رہا تھا' [illegible] کے بعد اس نے جو کچھ کرنا تھا وہ غزالہ کو اچھی طرح [illegible] تھا' ان دونوں کے درمیان بالکل ماں اور بچے والی [illegible] ایشن "پیدا ہوچکی تھی۔

نو دس بجے کے قریب مائیکل کی طرف سے حکم صادر ہوا [illegible] ہم واپس جہاز پر جارہے ہیں۔ ہم کشتی پر پہنچے تو ہمارا سارا [illegible] پہلے ہی وہاں رکھا جاچکا تھا۔ دونوں پہرے دار بھی [illegible] تھے۔ میں نے الوداعی نظروں سے محبت کے اس مختصر [illegible] کو دیکھا۔ یہاں گزری ہوئی رات میرے لیے یادگار [illegible] اس رات نے میرے دامن میں وصل کی چند ایسی [illegible] ڈالی تھیں جنہیں فراموش کرنا میرے لیے ناممکن [illegible] غزالہ کے ہونٹوں کا "طویل" لمس میری رگ رگ میں [illegible] گیا تھا۔۔۔ اور اس لحاظ سے یہ واقعی محبت کا جزیرہ ثابت [illegible] تھا۔ کشتی لمحہ بہ لمحہ محبت کے جزیرے سے دور ہوتی گئی [illegible] کے قریب پہنچتی گئی۔ جہاز کے زیریں عرشے پر کپتان [illegible] اور مزدور بھی سمیت کئی افراد مائیکل کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ بہرحال ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ میرا دھیان فوراً ان انڈین قیدیوں کی طرف چلا گیا جو پچھلے کئی دنوں سے ان بردہ فروشوں کے لیے مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ مسئلہ زیادہ گمبھیر ہوگیا ہے۔ جہاز پر پہنچنے کے بعد میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ کپتان جم نے چھوٹتے ہی مائیکل کو بتایا کہ دو انڈین قیدیوں نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی ہے اور باقی سخت خراب حالت میں ہیں۔ جم نے بتایا "وہ کچھ بھی کھانے پینے سے انکار کررہے ہیں' اور ان میں کئی بیمار بھی ہوگئے ہیں۔"

"یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔" مائیکل غرایا "دو چار کو الٹا لٹکا کر چمڑی ادھیڑ دو حرام زادوں کی!"

"یہ بھی کرکے دیکھ لیا ہے۔" جم نے کہا۔

میں اور غزالہ دیگر افراد کے ساتھ ہی جہاز کے زیریں کمپارٹمنٹ میں پہنچے۔ یہاں کیبنوں کے بیچوں بیچ ذرا کشادہ جگہ پر دو قیدی الٹے لٹک رہے تھے' یہ دونوں مرد تھے۔ وہ سرتاپا برہنہ تھے اور ان کے جسم پر "ٹی بوکو" (مخصوص چھڑی) کے سیکڑوں نشانات تھے۔ کھال جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی اور زخموں سے خون رس رہا تھا۔ ان کے زخموں پر کچھ سفید سفید بھی نظر آرہا تھا' غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ نمک ہے۔ ان کے زخموں پر محاورتاً نہیں حقیقتاً نمک چھڑکا گیا تھا۔ یہ دونوں قیدی نیم بے ہوش تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اذیت سہہ سہہ کر اب ان کے لیے اذیت کا احساس ہی ختم ہوگیا ہے۔ کیبنوں کے اندر نیم جان قیدیوں کا واویلا مسلسل جاری تھا۔

"کب سے کھانا نہیں کھایا ان لوگوں نے؟" مائیکل نے کپتان جم سے پوچھا۔

"آج تیسرا دن ہے۔" جم نے جواب دیا۔

مائیکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کیبنوں کی طرف گیا جہاں انڈین قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔ اس نے ایک کیبن کے دروازے کے تختے کو پیچھے ہٹوایا۔ آٹھ نو انچ چوڑا اور تین فٹ لمبا خلا پیدا ہوگیا۔ اندر قریباً پندرہ افراد بند تھے۔ ان میں تین عورتیں' دو بچے اور باقی مرد تھے۔ یہ سب کے سب گندمی یا سیاہی مائل رنگت کے تھے۔ لباس نہایت غریبانہ تھا اکثر مردوں نے دھوتیاں اور شلوکے پہن رکھے تھے۔ عورتیں نہایت میلی کچیلی ساڑیوں میں تھیں' انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق سیتاپور اور بریلی کے آس پاس کے علاقے سے ہے۔

فاقہ کشی اور مسلسل رونے دھونے کے سبب یہ تمام افراد خاصے کمزور نظر آرہے تھے۔ مائیکل نے پریشانی کے عالم میں انہیں دیکھا۔ یہ پریشانی اس پولٹری فارم کی سی پریشانی تھی جو اپنی بیمار مرغیوں کو دیکھ کر فکر مند ہوجاتا ہے کہ اپنے پیسے کیسے پورے کرے گا "یہ تو مرجائیں گے اس طرح!" وہ تھیلے لہجے میں بولا۔

کپتان جم بولا "ہاں ایسے ہی بھوک ہڑتال پر رہے تو جنت میں پہنچ جائیں گے۔"

"کل کتنی تعداد ہے ان کی؟"

"کل انڈین بردے تو دو سو ہیں' لیکن ان بھوک ہڑتالی بے وقوفوں کی تعداد ۸۰ کے لگ بھگ ہے۔ چار کیبنوں میں رکھے گئے ہیں۔"

"باقی سب کی بھی یہی پوزیشن ہے؟"

"بالکل یہی۔" کپتان جم نے کہا۔

"یہ تو زبردست نقصان ہے بھئی۔ انہیں کسی طرح سنبھالنے کی کوشش کرو۔" مائیکل نے تاسف سے کہا۔

کھانے کی دو ٹرالیاں پاس ہی کھڑی تھیں۔ مائیکل نے اپنے دو کارندوں کو اشارہ کیا کہ وہ کھانا اندر لے کر جائیں۔ جونہی دو لمبے تڑنگے حبشی کھانا لے کر اندر پہنچے۔ قیدیوں کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ عورتیں سہم کر دیواروں سے لگ گئیں' مرد بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے اور ایک طرف سمٹنے لگے۔ کارندوں نے کھانے کی ٹرے فرش پر رکھ دیں' اور اشاروں سے انہیں کہا کہ کھانا کھاؤ۔ کسی نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حبشی کارندے نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو بازو سے پکڑ کر کھانے کی ٹرے کے قریب کھینچ لیا' وہ لرزیدہ لہجے میں بولا "ہمیں۔ ہم قسم کھاوت ہیں' ہم کو کوئے بھوک نہیں۔ ہم قسم کھاوت ہیں۔"

ایک عورت کے منہ میں زبردستی لقمہ ڈالنے کی کوشش کی گئی' تو وہ ہسٹیریائی انداز میں چلانے لگی اور چلاتی چلی گئی۔ وہ بار بار ہاتھ جوڑ رہی تھی اور کارندے کے پاؤں پڑ رہی تھی' جیسے اسے خدشہ ہو کہ کھانے کی جگہ اسے زہر دیا جارہا ہو۔ اچانک جھماکا سا ہوا ایک کم سن لڑکی کیبن کے اندر سے نکل بھاگی۔ وہ بڑی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ سیڑھیاں طے کرکے کسی بازار میں نکل جائے گی اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنی مدد کے لیے بلالے گی۔ کم از کم اس کے انداز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا' وہ بے چاری کیا جانتی تھی کہ اس کے چاروں طرف اس کی جان کے دشمن ہیں اور اس سے آگے بیکراں سمندر ہے۔ اس نے ابھی دس بندرہ فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ پہرے داروں نے اسے پکڑ لیا اور کھینچ کر واپس مائیکل کے پاس لے آئے۔ یہ چودہ پندرہ سال لڑکی مسلسل چیخ رہی تھی "امار کا کوئے دوش نہیں۔ امار چھوڑ دیو۔ بھگوان کا واسطہ چھوڑ دیو۔"

لیکن اسے پکڑنے والوں نے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا تھا۔ مائیکل کا غصہ انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں ایک ضیامی پہرے دار کو مخاطب کیا اور غرا کر حکم دیا۔ اس حکم کو سنتے ہی پہرے دار نو عمر لڑکی کو کھینچ کر لے گئے۔ پہلے تھپڑوں سے اس کی تواضع کی پھر اسے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

میں نے آگے بڑھ کر پہرے داروں سے کہا کہ وہ رک جائیں۔ وہ ٹھٹک کر مائیکل کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" مائیکل نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا "مائیکل! میں کسی حد تک ان لوگوں کی زبان سمجھتا ہوں۔ تم مجھے ایک موقع دو' میں انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کچھ نہیں ہوگا' تمہاری کوشش سے۔"

"تشدد سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "میں اس نسل اور علاقے کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔"

"تھوڑا جاننے سے بہتر ہے کہ نہ جانا جائے۔ تم انہیں جتنا ڈراؤ گے یہ اپنے آپ میں سمٹتے جائیں گے۔ مجھے خدشہ ہے کہ تم ان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر یہ سارے نہ بھی مرے تو بیس تیس ضرور مرجائیں گے اور باقی اتنے لاغر ہوجائیں گے کہ تم ان کے بدلے کچھ بھی حاصل نہ کرسکو گے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"تم مجھے ان سے بات کرنے دو۔ میں اپنے طور پر ان کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

مائیکل کی پیشانی پر سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں۔ وہ دیر مجھے گھورتا رہا' پھر بولا "ٹھیک ہے۔ تم کوشش کرکے دیکھ لو۔ لیکن کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اس چالاکی کا انجام تمہارے تصور سے بھی زیادہ دردناک ہوسکتا ہے۔"

"تم کچھ نہ بھی کہو تو تمہاری سفاکی اور خوں خواری تمہارے چہرے پر لکھی ہے۔"

"تمہیں ہتھکڑی لگی رہے گی اور تم از خود کسی کیبن میں جاؤ گے۔"

"اگر ہتھکڑی لگی رہی تو پھر میں کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔ یہ مجھے بھی اپنی ہی طرح کا بے بس قیدی سمجھیں گے اور میری بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔"

"اس کے برعکس بھی تو ہوسکتا ہے' ایک ساتھی قیدی کی حیثیت سے تم ان کا اعتماد جیت سکتے ہو اور وہ تم پر بھروسا کرنے لگیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کی نفسیات میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میری بات مان لینے میں تمہارا فائدہ ہوگا۔ ان کی کسی بھی منڈی میں یہ ڈھائی تین لاکھ ڈالر کا مال ہے۔"

"فکر کررہے ہو؟"

"صرف تمہاری زبان میں بات کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم پر پرزے نکالنے کی کوشش کررہے ہو۔"

"یہ صرف تمہارا اندرونی خوف ہے۔ ورنہ میری بے وفائی کا کیا شبہ ہے۔ ڈاکٹر غزالہ اور کلثوم سمیت میرے سارے ساتھی تمہاری جابرانہ تحویل میں ہیں۔ میں ان کی جانوں کے لیے خطرہ مول لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد مائیکل میری ہتھکڑی کھولنے پر آمادہ ہوگیا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ناپسندیدہ تدبیر یہ کی کہ غزالہ اور تانی کو کیبن سے نکلوا کر واپس پولٹری اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا اور ان کی نگرانی پر مسلح گارڈ مقرر کردیا۔ یہ سب کچھ اس نے مجھے سنا کر کیا' تاکہ مجھے معلوم رہے کہ میری کسی غلطی کے نتیجے میں غزالہ مشکل میں پڑ سکتی ہے۔

میری ہتھکڑی کھول دی گئی تو میں اس کیبن میں چلا گیا جس سے نو عمر لڑکی بھاگی تھی۔ لڑکی اب واپس کیبن میں آچکی تھی۔ اسے بے لباس کرنے کی کوشش میں ہٹے کٹے پہرے داروں نے اس کا گریبان ادھیڑ دیا تھا اور وہ بار بار اس سے اپنا آپ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ درمیانی عمر کی ایک گہری سانولی عورت نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا اور اسے پچکارنے کی کوشش کررہی تھی۔ لڑکی سردی سے کانپتے چوزے کی طرح مسلسل کانپتی چلی جارہی تھی۔ میں کیبن میں داخل ہوا تو لڑکی' عورت کی گود میں کچھ اور بھی سہما ہوا باقی افراد کے چہروں پر بھی ہراس نمایاں تر ہوگیا۔

میں اپنے قیمتی کپڑوں کی پروا کیے بغیر عورت کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "مجھ سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی بھارتی ہوں اور آپ ہی جیسا ایک شخص ہوں۔ میں یہاں جہاز پر موجود نہیں تھا' ورنہ آپ لوگوں سے ایسا سلوک کبھی نہ ہوتا اب بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

کیبن میں موجود افراد بس ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔ نو عمر لڑکی کے سر سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے سفید رومال نکالا اور اس کی پیشانی پر بہہ آنے والا خون صاف کیا۔ بعد میں' میں نے رومال عورت کو تھما دیا۔ اس نے رومال کو روئی کی طرح زخم پر رکھ کر دبا دیا۔ نو عمر لڑکی مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر قریب پڑا آٹھ نو ماہ کا ایک لاغر سا بچہ بھی ریں ریں کرنے لگا تھا۔

میں نے نو عمر لڑکی سے پوچھا "یہ تمہاری ماں ہے؟" لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا "اور تمہارا باپ؟"

لڑکی نے کانپتی ہوئی انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ وہی ادھیڑ عمر شخص تھا' جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا "ہم قسم کھاوت ہے ہمیں بھوک نہیں ہے۔"

"تمہارے سر کی چوٹ میں درد تو نہیں ہورہا؟" میں نے لڑکی سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہیں مجھ سے خوف تو نہیں لگ رہا؟" اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کئی سوال کیے۔ اس نے ہر سوال کا جواب سر ہلا کر ہاں یا نہ میں دیا' مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ میں نے ننھے بچے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "یہ تمہارا بھائی ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلایا "بھانجا یا بھتیجا ہے؟" اس نے پھر نفی میں سر ہلایا "تمہارا کچھ نہیں لگتا؟" میں نے پوچھا۔ اس بار بھی لڑکی کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے زور دے کر پوچھا "آخر یہ کیا لگتا ہے تمہارا؟"

اس نے پہلی بار زبان کھولی "یہ۔ ہمارا۔ بچہ ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ دبلی پتلی فاقہ زدہ لڑکی کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی اور وہ بچے کی ماں تھی۔ ہندوؤں میں نچلی ذات کے لوگ اکثر غربت کی چکی میں پستے ہیں۔ اور یہ غربت ان پر ہزار ہا مسائل کے دروازے کھول دیتی ہے۔ میں نے لڑکی سے نام پوچھا' تو وہ ڈرتے ڈرتے بولی "نام کملا ہے۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"بریلی کے ایک گاؤں کی۔"

"تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

اس نے پہلے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

پھر منہ میں گنگنا کر رہ گئی۔ میں نے کہا "دیکھو' میں تمہارا دشمن نہیں' دوست ہوں' تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

لڑکی ہکلا کر بولی "ہم بھٹہ مج دور (مزد ور) ہیں' ہم کو جبو ستی۔"

"چپ رہ سسری' یہ ہمارا بھید لیوت ہیں۔" لڑکی کا باپ دانت پیس کر بولا۔

باقی تمام افراد بھی منہ میں خبر نہیں کیا بدبدانے لگے۔ وہ سب اس بات پر ناراض اور خوف زدہ تھے کہ لڑکی نے مجھ سے بات چیت شروع کردی ہے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' تم لوگ نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں یہ سب کچھ جانے بغیر بھی تمہارا دوست ہوں۔"

میں کیبن سے باہر آگیا۔ اس وقت تک الٹا لٹکائے گئے دونوں افراد کو مائیکل کی ہدایت پر نیچے اتارا جاچکا تھا۔ ان دونوں افراد کا تعلق ساتھ والے کیبن سے تھا۔ میں نے ان کے زخم اپنے ہاتھ سے صاف کیے اور مرہم پٹی بھی کی۔ باقی قیدی بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بہرحال ان میں سے کسی نے مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ضیامی پہرے دار کے ذریعے مائیکل کو پیغام بھجوایا کہ تمام انڈین قیدیوں کو صاف ستھرے لباس مہیا کیے جائیں اور اگر ہوسکے تو ان کے لیے نہانے کا انتظام کیا جائے۔ میری ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شام تک قریباً 70 فی صد انڈین قیدی نہانے پر آمادہ ہوگئے اور اکثریت نے لباس بھی تبدیل کرلیا۔ یہ لباس وہی براؤن کرتہ پائجامہ تھا جو کیبنوں میں موجود تمام افراد کو دیا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے جہاز کے یہ کیبن جیل کی بیرکوں جیسا منظر پیش کرتے تھے۔ بہرحال ابھی تک یہ لوگ کھانا کھانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے بات چیت کی تھی۔ حبشیوں اور خاص طور سے ضیامی حبشیوں کو دیکھتے ہی ان پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ ان میں سے کچھ قیدیوں نے اپنی آنکھوں سے ایک ضیامی کو بدنصیب اسلم پر جھپٹتے اور اسے اپنے دانتوں سے بھنبوڑتے دیکھا تھا۔

شام سے کچھ دیر پہلے ہی جہاز کی مرمت کا کام مکمل ہوگیا تھا' سورج غروب ہوتے ہی وہ ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ اگلے روز بھی میں اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح ان قیدیوں کو کھانے پر آمادہ کرسکوں اور یہ نہیں تو وہ کم از کم مجھ سے بات چیت ہی کرلیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہورہے تھے' گزرنے والے وقت کے ساتھ ان کی جسمانی حالت بھی بگڑتی جارہی تھی۔ جن دو افراد نے کل صبح خودکشی کرلی تھی' وہ سگے بھائی تھے۔ ان کی بڑی بہن بھی ان قیدیوں میں موجود تھی۔ وہ دھیمی دھیمی آواز میں کل سے مسلسل رو کررہی تھی اور کسی وقت اس پر غشی بھی طاری ہوجاتی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے دیکھ کر ہی چیخیں مارنے لگی۔ اچانک کوئی دھماکا انداز سے مجھ پر جھپٹا اور عقب سے میری گردن دبوچ لی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک چنگھاڑ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت مضبوط تھی۔ میں حملہ کرنے والے کو ضرب بھی لگانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ حملہ آور ان مظلوم قیدیوں میں سے ہی کوئی ایک ہے۔ میں نے بمشکل اپنا رخ موڑا۔ اسی دوران حملہ آور نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ مجھے عقب سے ٹھوکر لگی اور میں گر گیا۔ حملہ آور اس کیبن کا سب سے توانا اور صحت مند قیدی تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پیشانی پر زخم کا نشان تھا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں اور وہ ہذیانی انداز میں چنگھاڑتا چلا جارہا تھا۔ تب اس نے ایک بار پھر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں دھات کی کوئی نکیلی شے تھی جس سے وہ میرے چہرے پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دائیں بائیں جھک کر اس کے دو تین وار بچائے۔ اس نے ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ مجھ سے لپٹ گیا۔ میں وہاں سے جاگا۔ دیگر افراد میں سے کسی نے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے جارہے تھے۔ میں نے حملہ آور کا دایاں ہاتھ غیر محسوس طور پر یوں موڑا کہ نکیلی شے اس کے ہاتھ سے گر گئی اسی دوران میں حبشی پہرے داروں نے دروازے کے خلا میں سے وہ راڈ اندر گھسا دی جس کے ایک سرے پر پیتل کی چین منحوس حلقہ تھا۔ پلک جھپکتے میں یہ حلقہ حملہ آور کی گردن میں آگیا اور اسے زوردار جھٹکوں کے ساتھ دروازے کے آٹھ فٹ تک کھینچ لیا گیا۔ اب حملہ آور کا سر دروازے کے آٹھ فٹ چوڑے خلا سے باہر تھا اور دھڑ اندر کیبن میں مچل رہا تھا۔ حملہ آور اب بھی ہیئت بائی انداز میں چلا رہا تھا مگر گردن میں پھندا لگنے سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔

میں نے پہرے داروں کو اشارے سے منع کیا کہ وہ اس شخص پر تشدد نہیں کریں گے' تاہم میرے منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے چند چھڑیاں اس پر برسا ہی دیں۔ میں نے حملہ آور کے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے اور اسے کی بوکو کی بے رحم ضربوں سے بچایا۔

بعد ازاں مسلح پہرے دار کیبن میں آگئے۔ انہوں نے

حملہ آور کی مشکیں کس دیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ اس کا چہرہ اور گلے کی پھولی ہوئی رگیں بتا رہی تھیں کہ وہ مسلسل گلا پھاڑ رہا ہے۔ میں نے مسلح پہرے داروں سے کہا کہ وہ کیبن سے چلے جائیں اور دروازہ حسب سابق باہر سے بند کردیں۔ پہرے دار متذبذب نظر آرہے تھے' غالباً ان کا خیال تھا کہ میں غیر ضروری دلیری دکھانے کی کوشش کررہا ہوں' اور مجھے کیبن سے باہر آجانا چاہیے۔ بہرحال میرے کہنے پر وہ چلے گئے۔ کچھ دیر بعد حالات ذرا پرسکون ہوئے تو میں نے نو عمر کملا سے پوچھا "یہ کون ہے؟" میرا اشارہ حملہ آور کی طرف تھا۔

وہ پہلے تو ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہی پھر ہکلا کر بولی "اس کی لوگائی وہ لے گیو۔"

یعنی اس شخص کی بیوی کو پہرے دار اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً وہ پانچ روز پہلے کا تکلیف دہ منظر گھوم گیا۔ حبشی پہرے دار ایک جواں سال عورت کو گھسیٹتے ہوئے سیہنوں کے عقب میں لے گئے تھے۔ نشے میں دھت سیاہ فاموں نے یقیناً اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا تھا۔

میں نے کملا سے پوچھا "وہ جس کے منہ پر چھڑیاں ماری گئی تھیں وہ کون تھا؟"

وہ حملہ آور کی طرف اشارہ کرکے بولی "ہمارے کو جیادہ نہ خبر۔ سایدا اس کا بھیالا گے تھا۔"

یعنی' مجھے زیادہ خبر نہیں' میرا خیال ہے کہ وہ اس کا بھائی تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ اپنے دیور یا جیٹھ کو پٹے جانے پر اس بدنصیب عورت نے دہائی مچائی تھی اور نتیجے میں اسے کیبن سے نکال کر بسترِ ہوس پر روند ڈالا گیا تھا۔ اب اس کا پتی نیم پاگل ہورہا تھا اور اس نے نتائج سے بے پروا ہوکر مجھ پر حملہ کردیا تھا۔ کیبن کے ٹوائلٹ میں جو دھاتی لوٹا پڑا تھا' اس کا پیندا اکھڑا ہوا تھا۔ اسی اکھڑے ہوئے پیندے کو سیدھا کرکے حملہ آور نے نکیلی سلاخ کی شکل دے دی تھی۔ اس نکیلے آلے کی وجہ سے میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چھل گئی تھیں اور تین چار انگلیوں سے خون رسنے لگا تھا۔

میں نے کیبن سے باہر آکر پہرے دار جوزف سے پوچھا "جس لڑکی کو ہفتے کے دن کیبن سے لے جایا گیا تھا' وہ کس کے پاس ہے؟"

جوزف ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا "یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔"

سامون

نہایت منفرد پراسرار سلسلہ

★

مکمل تین حصوں میں شائع ہوگیا ہے

فی حصہ ۵۰/- روپے

"جاؤ اور مائیکل کو میرا پیغام دو۔ اس سے کہو کہ وہ لڑکی جس حالت میں بھی ہے' جلد سے جلد واپس آنی چاہیے۔"

"میرے خیال میں اس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ واپس آسکے۔" حبشی کے چہرے پر مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"وہ مچھلیوں کا فضلہ بن کر سمندر میں بکھر چکی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس کا شوہر تو جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ کیوں پاگل ہورہا ہے۔ اس لیے ہورہا ہے کہ اس نے کل دوپہر اپنی آنکھوں سے بیوی کی لاش دیکھی ہے۔"

"کیا ہوا تھا اسے؟" میں نے غم ناک لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ۔۔۔ اس نے خودکشی کرلی تھی۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہیں جھوٹ بتایا گیا ہے' بلکہ تم خود ہی جھوٹ بک رہے ہو' تمہیں علم ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی۔"

حبشی جوزف ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس مسکراہٹ کی پاداش میں اس مردود کی گردن مروڑ دوں' لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں میں نظر نہ آنے والی بڑی مضبوط زنجیریں تھیں۔ میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دل و دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ مال بردار ہرکولیس کے اس منحوس کمپارٹمنٹ میں چند روز کے اندر میں نے کیسے کیسے مناظر دیکھے تھے۔ حوادث کے سمندر میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے اندر بھی کبھی کبھی انسانی رشتے اور اخلاقی تقاضے اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ اسلم کے دوست نے اس کی خاطر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنی جان دی تھی' ایک لڑکی اپنے دیور پر ہونے والا جبر دیکھ نہیں سکی تھی اور احتجاج کی پاداش میں قتل ہوگئی تھی' اب ایک خاوند اپنی بیوی کی موت کے غم میں پاگل ہورہا تھا اور اس نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ پر

حملہ کیا تھا۔

میں خیالات کے اسی گورکھ دھندے میں الجھا ہوا کیبن میں واپس آگیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کیبن کے اکثر فاقہ زدہ قیدی نقاہت کے سبب نیم غنودگی کی کیفیت میں تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو گہری نیند سو رہے تھے۔ حملہ آور کا نام راجن تھا۔ اس کی مشکیں بدستور کسی ہوئی تھیں' وہ بھی نڈھال سا ہو کر پڑا تھا۔ میں کیبن میں گیا تو نو عمر کملا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا بچہ اپنی نانی کے زانو پر سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔ بچے کی طرح نانی بھی سو رہی تھی۔ میں کملا کے قریب بیٹھ گیا' پیار سے اس کے خشک بوسیدہ سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ بچی تھی اور دکھ کا مقام تھا کہ اس کی گود میں بھی بچہ تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا "کملا! تم لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے ہو' جب تمہارے جسم میں دودھ نہیں اترے گا تو تمہارے بچے کو کیا ملے گا۔ دیکھو وہ کتنا لاغر ہو گیا ہے' سوکھے کا مریض لگتا ہے۔"

"ہم کا کرے؟" وہ منمنائی۔

"تم میری مدد کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کیسے سنبھلو گے۔ تمہارا خوف کیسے دور ہو گا؟"

وہ بولی "ایک اوپائے (طریقہ) ہے۔ سہار میں آج کل شولی ماتا کا تہوار ہووت ہے۔ اس میں ہم لوگ کھاص بھوجن کھاوت ہے۔ اگر آپ وہ بھوجن پکائیں تو ہم کو پتو ہے' کوئے بھی کھانے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر ہم تہوار کا خاص کھانا پکائیں تو سب لوگوں کو کھانا پڑے گا۔"

"ہاں یہی مطلب۔۔۔ مگر وہ بھوجن پکانا بڑو مسکل (مشکل) ہووت۔"

"میں مشکل کو آسان کر لوں گا۔ تم بتاؤ۔"

وہ اپنے مخصوص لہجے میں مجھے بتانے لگی۔ بڑی انوکھی سی ترکیب تھی اور اس سے بھی انوکھا کھانا تھا۔ میں دھیان سے سنتا رہا اور ذہن نشین کرتا رہا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے ان لوگوں کو کھانا کھلا کر چھوڑوں گا۔ یہ سب کچھ میرے لیے اب ایک چیلنج بن گیا تھا۔ ان لوگوں کو قریب سے دیکھ کر مجھے ان پر اور بھی ترس آیا تھا اور بے تحاشا ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کسی نہایت دور دراز اور پس ماندہ علاقے کے رہائشی تھے۔ بہت سادہ اور بہت معصوم۔ وہ ہندوؤں کی ایک پسی کچلی ہوئی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ اب تک مجھے جو کچھ کملا سے معلوم ہوا تھا اس کے مطابق وہ لوگ کسی اُجڈ ٹھاکر فیملی کے بھٹوں پر کام کرتے تھے۔ ان کی حیثیت وہاں بھی غلاموں کی سی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے تھے اور کرتے بھی کیسے' ان پر قرضوں کا اتنا بوجھ تھا کہ ان کی آئندہ نسلیں بھی نہیں اتار سکتی تھیں۔ ان کی بے بسی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ نو عمر لڑکی کملا تھی۔ وہ کسی ٹھاکر زادے کی تفریح طبع کا شکار ہو کر اپنی عمر میں بچے کی ماں بن چکی تھی۔ ایسے نجانے کتنے ظلم و ستم ان لوگوں کے سینوں میں دفن تھے۔

اگلے روز علی الصباح پہرے دار جوزف کمپارٹمنٹ میں پہنچا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ مائیکل کے حکم پر مجھے اوپر عرشے پر لے جانا چاہتا ہے۔

"کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں کام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو کام ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" پہرے دار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ مجھے گن پوائنٹ پر باہر لے آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں بالائی عرشے پر غزالہ کے رہائشی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر غزالہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ یقیناً جزیرے پر ہونے والی آخری ملاقات کا احوال اس کے ذہن میں آگیا تھا۔ وہ لمحات جتنے عجیب و غریب تھے' اتنے ہی ناقابل فراموش بھی تھے۔

وہ بولی "مجھے۔۔۔ پتا چلا ہے کہ آپ پر کسی نے حملہ کر دیا تھا۔"

"حملہ تو نہیں تھا' چھوٹی سی جملی تھی۔ انڈین قیدیوں میں سے ایک اپنے غم و غصے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ خالی ہاتھ مجھ پر پل پڑا تھا۔"

"میں نے تو سنا ہے اس نے آپ کو کچھ مارا بھی تھا؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دے رکھے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ زخمی انگلیاں دیکھ کر وہ خوامخواہ پریشان نہ ہو۔ مگر وہ بھی ایسی کم فہم نہیں تھی۔ اس نے شکایت کناں نظروں سے میرے پوشیدہ ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب سا رنگ اس کے چہرے پر آکر گزر گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ پیار کا رنگ تھا یا ناراضگی کا۔

وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی "پوچھیں گے نہیں' کیوں بلایا ہے؟"

"کیوں بلایا ہے؟"

"ایک۔۔۔ ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔" اس کے چہرے پر سرخی تھی۔ اور یہ سرخی گواہی دے رہی تھی کہ وہ کوئی خاص بات کہنے جا رہی ہے۔

"کیا کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

"ہاں خاص ہی سمجھیں۔" اس کے چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ پورے بدن میں سنسنی کی لہری دوڑنے لگی تھی۔ دل سے آواز آئی کہ غزالہ میرے اور اپنے برسوں پرانے تعلق کے حوالے سے کوئی خوشگوار بات کہنے جا رہی ہے۔ کوئی ایسی بات جو اس جاں گسل تڑپ کا صلہ ہو گی جو لڑکپن سے میری جاں کا روگ رہی ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میری ساکت نگاہ غزالہ کے چہرے پر جمی تھی۔ وہ پلکیں جھکائے کھڑی تھی اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ۔۔۔" وہ خاموش ہو گئی اور فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ میں بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر حوصلہ جمع کیا اور بولی "شاہ جہاں! میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ میں کسی صورت آپ کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتی' لیکن حالات جو بھی ہیں آپ کے سامنے ہیں' ان حالات میں۔۔۔ ان حالات میں ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے اپنے راستے پر چلتے رہیں۔" غزالہ کی آنکھ سے آنسو نکل کر اس کے شفاف رخسار پر پھسل گیا۔

میرے سینے میں مایوسی کی سرد لہر دوڑ گئی۔ دل گیر لہجے میں' میں نے کہا "میں تو اپنے راستے پر چل رہا ہوں غزالہ۔۔۔ اور آخری سانس تک چلتا رہوں گا۔"

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمیشہ مجھے کانٹوں پر گھسیٹتے رہیں گے۔ میں روز جیتی اور روز مرتی رہوں گی۔"

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے غزالہ؟"

"یہی تو بات ہے کہ آپ کچھ کہتے نہیں۔ بس خاموشی سے ایک زہر پیے جا رہے ہیں' میں نہیں چاہتی کہ آپ یہ زہر پئیں۔ آپ سب کچھ اپنے دل میں سے ختم کر دیں۔"

"کیا یہی کہنے کے لیے مجھے بلایا تھا؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ہاں شاہ جہاں! میرے دل پر بہت بوجھ ہے' پرسوں والے واقعے کے بعد سے یہ بوجھ اور بڑھ گیا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پرسوں رات جزیرے پر پیش آنے والے واقعے کی طرف ہے۔ میں نے پوچھا "تم کس بوجھ کی بات کر رہی ہو؟"

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! میں نہیں چاہتی کہ آپ کے دل میں کوئی آس پیدا ہو۔ آپ مجھ سے کوئی توقع لگائیں۔ جو آس اور توقع پوری نہ ہو سکے وہ بہت دکھ دیتی ہے۔"

"بڑا خیال ہے میرے دکھ کا۔" میں نے کہا۔

"آپ جتنا چاہیں طنز کر لیں' جو چاہیں سزا مجھے دے لیں مگر میں جو کہہ رہی ہوں' دل کی گہرائی سے کہہ رہی ہوں۔ میں آپ کے قابل شاید پہلے بھی نہیں تھی۔۔۔ اور اب تو بالکل نہیں ہوں۔ آپ کو شادی کے لیے اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے' آپ اپنا گھر بسا سکتے ہیں۔ اپنے بچوں میں' ان کی خوشیوں میں خود کو مشغول رکھ سکتے ہیں۔ بہت جلد آپ کو سب کچھ بھول جائے گا۔ آپ کی زندگی نئے راستے پر چل نکلے گی' پلیز شاہ جہاں! آپ میری بات مان لیں۔ آپ ایسا کریں گے تو میرے دل کو بھی تھوڑا سا سکون نصیب ہو جائے گا۔ اگر میری تھوڑی بہت زندگی باقی ہے تو وہ آسانی سے کٹ جائے گی۔ میں اور تابی ایک دوسرے کے سہارے جی لیں گے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "تو تم میری آس ختم کرنا چاہتی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ میں نے کہا "اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ آس میرے لیے کوئی نئی شے ہے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ یہ آس تو ہمیشہ سے میرے ساتھ رہی ہے اور میری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ اگر تم اس آس کو ختم کرنا چاہتی ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔" وہ اپنی اشک بار آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دو۔"

وہ نڈھال سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔ میں نے کہا "یہ کوئی فلمی ڈائیلاگ نہیں ہے۔ اگر تمہاری زندگی میرے "نہ ہونے سے" سکھی ہو سکتی ہے تو پھر اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دو۔ پستول تمہیں میں منگوا دیتا ہوں' تم مجھے کاغذ قلم دو' میں ابھی لکھ دیتا ہوں کہ اپنی موت کا ذمے دار صرف اور صرف میں خود ہوں۔۔۔"

"آپ چلے جائیں۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میں ایسے نہیں جاؤں گا۔ اگر تم مجھے زندہ واپس بھیجنا چاہتی ہو تو پھر تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا اور ابھی کرنا ہو گا۔ بولو کرو گی وعدہ؟"

اس نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں پر سے نہیں ہٹایا۔ میں نے دو تین بار کہا کہ وہ میری طرف دیکھے جب اس نے نہیں دیکھا تو میں نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کا سینہ

ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ میں نے کہا "مجھے اپنی آس اپنی جان سے بھی عزیز ہے' اب کبھی بھی اسے ختم کرنے کی بات نہ کرنا۔ میں نے زندگی میں تم سے کچھ مانگا ہے اور نہ آئندہ مانگوں گا لیکن اگر تم نے آئندہ آس ختم کرنے کی بات کی تو پھر تمہیں ایک چیز دینی ہوگی۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے موت دینی ہوگی۔"

میں گھوما اور تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔ ابھی میں نے دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ غزالہ کی بھیگی ہوئی آواز آئی "ٹھہریے!"

میں ٹھٹک کر رک گیا "کیا بات ہے؟" میں نے کمرے میں واپس آتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ سے ناراض مت ہوں۔" وہ بولی "میں نے پہلے ہی بہت دکھ دیے ہیں آپ کو۔۔۔ اب اور دکھی کرنا نہیں چاہتی۔"

"تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہ دکھ میری قسمت میں لکھے ہیں۔"

"آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور مجھ سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔ میری مجبوریاں میرے پاؤں کی زنجیر ہیں۔ میں نے۔۔۔"

"خدا کے لیے غزالہ!" میں نے اس کی بات کاٹی "بار بار یہ ذکر مت کرو۔ میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا۔ کسی طرح کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ پھر تم کیوں اتنی آزردہ ہوتی ہو۔"

"مجھ سے۔۔۔ مجھ سے آپ کی مایوسی دیکھی نہیں جاتی۔"

"میں مایوس نہیں ہوں اور نہ انشاءاللہ زندگی کی آخری سانس تک ہوں گا' بس تم حالات کو جوں کا توں رہنے دو۔ ہم دونوں انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مستقبل کے پردے سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

"اور اگر۔۔۔"

"اگر حالات بدترین بھی ہوئے تو میں انہیں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ اتنا حوصلہ ہے مجھ میں' اور اس کا ثبوت گزرے ہوئے دس پندرہ سال ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ میں تمہارے غم سے گھبرایا نہیں ہوں اور نہ ہی بھاگا ہوں' بلکہ اسے گلے سے لگایا ہے اور پیار کیا ہے۔"

اتنے میں قریب ہی بستر پر سویا ہوا تابی کسمسانے لگا اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ غزالہ نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ تابی نیند سے اٹھا تھا اس لیے رونے لگا۔ غزالہ اسے بازوؤں میں لے کر ٹہلنے لگی اور چپ کرانے لگی۔ اسے بھوک لگی تھی جس کے سبب موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔ غزالہ نے اسے صوفے پر بٹھایا اور بولی "آپ ذرا اس کا خیال رکھیے۔ میں فیڈر بنا کر لاتی ہوں۔"

میں نے تابی کو بانہوں میں اٹھا لیا اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ حدِ نگاہ تک نیلگوں سمندر تھا اور اس پر جھکا ہوا نیلا آسمان تھا۔ ان دو نیلاہٹوں کے درمیان انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی واحد شے یہ "ہرکولیس" تھا' جو پانی کو کاٹتا ہوا نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں تابی کو باتوں میں لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے چپ ہوتا تھا پھر وہی "ریں ریں" شروع کر دیتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے اپنے پہلو میں نیم گرم سیال کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے تابی کو پیچھے ہٹایا۔ اس نے پیشاب کر دیا تھا۔ میری قمیص ایک جانب سے نیچے تک بھیگ گئی تھی۔ اتنے میں غزالہ بھی فیڈر لیے اندر داخل ہو گئی "اوہو' یہ تو بہت گندا بچہ ہے۔" اس نے میری قمیص دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے قمیص کو چٹکی میں پکڑتے ہوئے کہا۔

تابی اب نہ صرف چپ ہو گیا تھا بلکہ شرمیلے انداز میں مسکرا بھی رہا تھا۔ غزالہ نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی اور لٹا کر فیڈر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر اس نے کھینچ کر اس کا ٹراؤزر اتارا اور ٹانگیں صاف کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے سرزنش بھی کرتی جا رہی تھی۔

تابی سے فارغ ہو کر اس نے مجھے قمیص اتارنے کو کہا۔ میں نے کہا "رہنے دو' نیچے جا کر بدل لوں گا۔"

"نہیں' آپ اتاریں' ایک سائیڈ ہی گیلی ہوئی ہے' میں ابھی دھو دیتی ہوں۔ یہاں "ڈرائر" بھی ہے' ابھی سوکھ جائے گی۔"

میں نے قمیص اتار دی۔ نیچے سے بنیان بھی گیلی تھی۔ وہ بھی اتارنا پڑی۔ اسی دوران میں غزالہ کی نگاہ میری زخمی انگلیوں پر پڑ گئی۔ وہ ناراض لہجے میں بولی "آپ کی غلط بیانی پکڑی گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب آپ سمجھ ہی گئے ہیں۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں تابی کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ قریباً دس منٹ بعد غزالہ آئی تو اس کے ہاتھ میں میری استری شدہ قمیص تھی۔ میرے عریاں جسم پر نگاہیں ڈالے بغیر اس نے بنیان قمیص مجھے تھمائی اور تابی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"حملہ کس نے کیا تھا آپ پر؟" اس نے تابی کے کپڑے

بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہے ایک سر پھرا۔ بے چارے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ جس دن ہم جزیرے پر تھے اس کی بیوی یہاں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔"

"کیا ہوا اسے؟"

"وہ رو چلا رہی تھی۔ پہرے داروں نے اسے زدوکوب کیا۔ کہیں کوئی خطرناک چوٹ لگ گئی اور وہ جاں بر نہ ہو سکی۔" میں اصل بات چھپا گیا۔

غزالہ الجھن سے بولی "ان لوگوں کی بھی تو سمجھ نہیں آتی۔ انہیں معلوم بھی ہے کہ پہرے دار انتہائی غصیلے اور سفاک ہیں۔ حکم عدولی برداشت نہیں کرتے' پھر بھی یہ لوگ احتجاج کرنے اور چیخنے چلانے سے باز نہیں آتے۔"

میں نے بتایا "سارے انڈین قیدی ایسے نہیں ہیں۔ ان میں اتنی کے قریب افراد اتر پردیش کے ایک دور دراز علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت ہی سیدھے سادے اور ڈرپوک لوگ ہیں یہ۔۔۔ انہیں اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے۔ اور تو اور' خوف کے سبب کھانا بھی ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ پچھلے کئی روز سے بالکل بھوکے پیاسے ہیں۔ حبشی پہرے داروں کی صورت دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ان میں سے دو افراد نے دہشت کے سبب خودکشی کر لی تھی۔"

غزالہ بولی "اب کیا ہوگا ان کا۔ وہ پہلے ہی فاقہ زدہ ہیں۔ اکثر میں خون کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ بھوکے پیاسے رہ کر تو ختم ہو جائیں گے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں انہیں کھلانے کی۔ ان دنوں وہ کسی شولی دیوی کا تہوار مناتے ہیں اور خاص پکوان تیار کرتے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے لیے خاص کھانا تیار کیا جائے۔"

میں نے غزالہ کو خاص پکوان کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اگر انہوں نے وہ بھی نہ کھایا تو۔" غزالہ نے کہا۔

"پھر تم ہو ناں۔"

"کیا مطلب؟"

"انہیں وٹامن کے انجکشن لگانا شروع کر دیں گے یا کوئی ایسا ہی اور طریقہ اختیار کریں گے۔"

میں اور غزالہ کافی دیر اس بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ وہ جو ایک شدید تلخی سی کچھ دیر پہلے پیدا ہو گئی تھی آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ ہم دونوں میں سے کسی نے وہ موضوع دوبارہ چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری گفتگو کے درمیان میں تابی اپنے حال میں مگن رہا۔ وہ کبھی میری اور کبھی غزالہ

اچھوت

کی گود میں بیٹھ جاتا' ساتھ ساتھ وہ میری آنکھ چھونے کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں غزالہ اور تابی کو خدا حافظ کہہ کر اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ باہر حبشی جوزف رائفل لیے چوکس کھڑا تھا۔ عرشے پر چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ میں جہاز کے عملے کی نیلی وردیاں چمک رہی تھیں۔ میں نے کچھ فاصلے پر تنومند طیامی حبشی ٹام کو دیکھا۔ وہ ویٹ لفٹنگ میں مصروف تھا۔ اس کے گہرے سیاہ جسم کا ایک ایک مسل نمایاں ہو کر دمک رہا تھا۔ ٹام نے بڑی شعلہ فشاں نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دو تین روز پہلے مائیکل نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا ایک ساتھی مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے خوب تیاری کر رہا ہے' کہیں یہ میرا وہی مدِمقابل تو نہیں تھا۔

میں نے پہرے دار جوزف سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

وہ بولا "تمہیں پتا نہیں؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ جوزف بولا "سمجھو' کہ یہ تمہارے لیے ایک "بہت بڑی مصیبت" ہے اور اس مصیبت کو دعوت دینے والے بھی تم خود ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم نے باس سے کہا تھا ناں کہ تم ہمارے میں سے کسی کے ساتھ دوبدو مقابلہ کرنا چاہتے ہو۔"

"میں نے کسی اور کو نہیں' مائیکل کو چیلنج کیا تھا۔"

"ٹام سے بھگت لو تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ باس سے کیا لڑو گے تم۔"

"تو یہ مجھ سے لڑنے کی تیاری کر رہا ہے؟"

"بالکل کر رہا ہے۔ جب سے سائن تمہارے ہاتھوں مرا ہے' اسے ایک پل چین نہیں۔ میں اسے تمہاری بدقسمتی سمجھوں گا کہ تمہیں ٹام کے مقابل آنا پڑ رہا ہے۔"

میں نے دیکھا پروفیسر اللہ دتا کسی خدمت گار کی طرح تولیہ پکڑے ٹام کے قریب کھڑا ہے۔ ٹام ورزش کا ایک۔۔۔ "STEP" مکمل کر کے اٹھا اور پروفیسر کے ہاتھوں سے تولیہ لے کر اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔

میں حیرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ منظر دیکھتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آگیا اور پھر جوزف کے آگے آگے چلتا جہاز کے زیریں کمپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ میں نے جوزف سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ مقابلہ کب ہوگا؟"

وہ شانے اچکا کر بولا "میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جب بھی ہوگا تمہارے لیے قیامت سے کم نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی کچھ اندازہ تو ہوگا تمہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ مقابلہ منزل پر پہنچنے کے بعد ہوگا۔ دراصل جہاز پر اس قسم کا ہنگامہ مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ خاص طور سے کیپٹن جم تو ایسے ہلے گلے کے بے حد خلاف ہے۔ وہ اسے بدشگونی سمجھتا ہے۔ بہرحال تمہیں زیادہ ریلیکس ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہت جلد تم خود کو نام کے رو برو پاسکتے ہو۔ لہٰذا ڈنر وغیرہ پیل لو اور خود کو تیار کرلو۔"

جوزف مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اب صبح کے دس بجنے والے تھے۔ کیبنوں میں موجود تمام قیدی جاگ گئے تھے اور ناشتے سے فارغ ہوچکے تھے' صرف اُتر پردیشی ایسے تھے جنہوں نے حسب معمول ناشتے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ فام پہرے دار قیدیوں کی صحت و تندرستی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کو بہترین کھانا دیا جاتا تھا۔ گرمی سردی سے بچانے اور نہانے دھونے کا بھی خاص انتظام تھا۔ تاہم یہ ساری احتیاط انسانیت کے ناتے سے نہیں تھی' تجارت کے ناتے سے تھی۔ یہ لوگ بکاؤ مال تھے اور فروخت کے وقت ان کا تندرست و توانا ہونا ضروری تھا۔

میں اپنے ساتھیوں کے کیبن کے سامنے سے گزرا تو دروازے کا مستطیل خلا کھلا ہوا تھا یہ لوگ ناشتا کرکے فارغ ہوچکے تھے۔ میں نے اندر جھانکا' صفدر ٹوائلٹ میں تھا' کلثوم نیم دراز تھی جبکہ زریں گل کیبن میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپک آیا۔

"استاد صیب! آپ خود تو کھلی ہوا میں گھوم پھر رہا ہے' ام کو یہاں باندھ چھوڑا ہے۔"

"میں یہاں تفریح نہیں کررہا ہوں۔"

"گستاخی معاف' تفریح بھی تو کررہے ہیں۔ ام کو خود غزالہ بی بی نے بتایا ہے کہ آپ جزیرے پر گئے تھے اور خوب جوائن (انجوائے) کیا تھا۔"

"ایسا جوائن تمہیں کرنا پڑے تو نانی یاد آجائے۔ بہتری ہے کہ تم اپنی چونچ بند رکھو اور آرام سے بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔"

"مگر استاد صیب! اللہ اللہ کرنے کے لیے بھی تو دل کا سکون چاہیے اور ام اتنا پریشان ہے کہ آپ کو بتا نہیں سکتا' سخت تکلیف میں ہے ام۔"

"کیوں تمہاری عقل داڑھ نکل رہی ہے؟"

"خو عقل داڑھ تو بارہ سال کی عمر میں نکل آیا تھا' اب تو خود "عقل" ہمارے دماغ سے نکلتا جارہا ہے۔ ام کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔"

"مگر مسئلہ کیا ہے؟"

"خو کلثوم کا فکر لاحق ہے ام کو۔ وہ اچھا نہیں ہے' اس کے پیٹ میں کچھ ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کہ کچھ ہے۔ کچھ ہوگا تو تم ابا جان بنو گے۔"

"نہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کو کل بھی تکلیف مکلیف ہورہا تھا۔ ام چاہتا ہے کہ آپ غزالہ بی بی کو ایک بار یہاں لے آئیں۔ وہ کلثوم کو دیکھ لے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

اتنے میں کلثوم اٹھ کر ہمارے قریب چلی آئی "سلام لیکم صیب جی۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جاکر سلام کیا۔

"وعلیکم سلام' کلثوم تم کیسی ہو؟"

"ام ماشاء اللہ ایک دم ٹھیک۔۔۔ زریں گل خواہ مخواہ پریشان ہوتا۔۔۔ بالکل خبیث ہے۔" وہ غالباً شرارتی کہنا چاہ رہی تھی' لیکن ابھی اس کے پاس لفظ زیادہ نہیں تھے اور نہ لفظوں کا صحیح استعمال آیا تھا۔ بے عزتی کے احساس سے زریں گل کا رنگ سرخ ہوگیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔

میں نے کہا "کلثوم! میں تم سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے۔"

"امارا اتنا خیال کرتا کہ ماشاء اللہ ام خود پریشان ہوجاتا۔ ام کو ڈاکٹر کا ضرورت نہیں۔ اس کو ضرورت' اس کے دماغ کو ضرورت۔"

"بے شک ضرورت ہے۔ میں انشاء اللہ لے کر آؤں گا ڈاکٹر غزالہ کو۔"

"انشاء اللہ۔۔۔ انشاء اللہ۔ ام کو غزالہ بی بی ویسے بھی بہت شان دار لگتا' امارا دل ان کی طرف بھاگتا۔"

"تمہارا دل زریں گل کی طرف نہیں بھاگتا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو ہماری شوہر ہے' اس کی طرف تو بھاگتا' بلکہ بہت زور سے بھاگتا۔ لیکن ادھر ام کو موقع نہیں ملتا۔" وہ کھلے

دلے لہجے میں بولی۔

زریں بوکھلایا "اوئے چپ کر۔ چپ کر جا۔ مگدھی کے مافق جو منہ میں آئے بک دیتی ہے۔"

"جب ام بولتا تم ناراض ہوتا۔ جب نہ بولتا تب ناراض ہوتا۔ تم کیا ہوتا؟"

"ہاں بتاؤ زریں گل! تم کیا ہوتا۔ انسان ہوتا کہ جانور ہوتا۔" میں نے کہا۔

زریں گل سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ معصومیت سے بولی "کیا ام نے کوئی بکواس کیا؟"

"نہیں نہیں' تم نے ارشاد کیا' تمہارے منہ سے پھول جھڑا۔" زریں نے کراہ کر کہا "بکواس تو ام کرتا ہے' امارا اگلا پچھلا کرتا ہے۔"

ان دونوں کو نوک جھوک کرتے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔ اس کمپارٹمنٹ کا کچن کافی بڑا تھا۔ یہاں دو شفٹوں میں دس دس افراد کام کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں ہوتی تھیں۔ ان سب خدمت گاروں کا تعلق قیدیوں سے تھا۔ گیس سے جلنے والے کئی برنر یہاں لگے ہوئے تھے۔ میں نے کچن میں پہنچ کر حبشی جوزف کو بتایا کہ میں کیا کرنا چاہ رہا ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہڑتالی قیدیوں کو کھانا کھلانے کے لیے ہمیں ان کے واسطے تہوار کا خصوصی بھوجن پکانا ہوگا۔ اس بھوجن کی مکمل تفصیل اور ترکیب بھی میں نے جوزف کو بتائی۔ اس کھانے میں چاول دالیں اور پانچ چھ طرح کی سبزیاں استعمال ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ مسالا جات تھے۔ قریباً سب ہی اچھی اشیاء تھیں' سوائے ایک چیز کے۔ اور اسی چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ جس طرح پلاؤ وغیرہ بنانے کے لیے یخنی نکالی جاتی ہے' اسی طرح اس کھانے میں بھی ایک نامعقول چیز کی یخنی شامل تھی۔

اس کھیلے کی روایت کے مطابق تہوار کے اس خصوصی بھوجن میں کم از کم دو خوب صورت کنواری لڑکیوں کے سر کے بال استعمال ہوتے تھے۔ دوسرے معنوں میں ان دو لڑکیوں کو اپنے بالوں کی بھینٹ دینا پڑتی تھی۔ ان بالوں کو استرے وغیرہ کے ذریعے سر سے اتار کر ایک مضبوط سوتی کپڑے میں پوٹلی کی شکل میں باندھا جاتا تھا۔ پھر یہ پوٹلی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دی جاتی تھی۔ بعد ازاں یہی پانی دالیں اور چاول وغیرہ کے گلانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

اس رسم کی حکمت اور افادیت ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ بہرحال حالات کا تقاضا تھا کہ یہ کام کرگزرا جائے۔ میں نے جوزف کو سب کچھ بتایا تو وہ بولا "باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے اور کسی نہ کسی طرح انتظام بھی ہوجائے گا لیکن اس دوسرے تماشے کے لیے باس (مائیکل) سے اجازت لینا پڑے گی۔"

"تم لڑکیوں کے سر مونڈنے کی بات کررہے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ لڑکی کے سر پر بال نہ ہوں تو اس کی خوب صورتی ایک چوتھائی رہ جاتی ہے اور اسی حساب سے قیمت بھی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے جاؤ' اس سے پوچھ کر آؤ۔ ساری بات تفصیل سے بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے' میں جاتا ہوں۔ اگر تمہاری ضرورت ہوئی تو آکر لے جاؤں گا۔"

جوزف کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ باس نے اجازت دے دی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ آج رات تک ہر صورت ان لوگوں کی بھوک ہڑتال ٹوٹ جانی چاہیے۔

اگلے دو گھنٹے میں جوزف اور میں بے حد مصروف رہے۔ سب سے پہلے اُتر پردیشی قیدیوں کے ایک کیبن میں پہنچے۔ میں نے نوعمر کملا کو بتایا کہ ہم تمہارے لیے بھوجن تیار کررہے ہیں اور اس کے لیے دو کنواری کنیاؤں کے بال درکار ہیں۔ شاید عام حالات میں اس شبھ کام کے لیے دو کنواری کنیائیں فوراً دستیاب ہوجاتیں اور وہ خوشی خوشی اپنے بال بھی دان کردیتیں لیکن خوف و ہراس کے اس ماحول میں سب الٹ پلٹ ہورہا تھا۔ بہرحال تھوڑی سی پریشانی کے بعد ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور دو اُتر پردیشی لڑکیاں سر مونڈوانے پر آمادہ ہوگئیں۔ انہیں کیبن سے باہر لاکر ان کے بال اتارے گئے۔ میرا خیال تھا کہ پہلے لمبے بال قینچی سے اتار لیے جائیں اور بعد میں سر مونڈ دیا جائے لیکن کملا کی زبانی پتا چلا کہ بالوں کو کاٹا نہیں جائے گا بلکہ اُسترے کے ذریعے سر سے مونڈا جائے گا۔ بہرحال اس پابندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے دونوں لڑکیوں کے بال حاصل کیے۔ ان خستہ حال' الجھے سلجھے بالوں کو پہلے دھویا گیا' پھر پوٹلی میں باندھ کر ابلتے پانی میں ڈال دیا گیا۔ دو گھنٹے بعد اس پانی کی مدد سے دالیں اور چاول وغیرہ پکائے گئے' بعد میں سبزیاں ڈال دی گئیں۔ بعد میں ڈالی جانے والی چند سبزیوں کے سوا سب کچھ گل گیا اور ایک حلیم سا تیار ہوگیا۔ اس پکوان میں ایک مخصوص خوشبو تھی۔ کم از کم مجھے تو یہ خوشبو بہت کراہت آمیز محسوس ہورہی تھی۔

کھانا پک گیا تو اسے کھلے برتنوں میں ڈال کر کیبنوں کے

اندر پہنچا دیا گیا۔ اس قبیلے کے دو معمر ترین افراد اسی کیبن میں بند تھے جس میں کملا اور اس کی ماں بند تھیں۔ میں اب تک کے مشاہدے میں یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ اگر اس کیبن کے لوگوں نے کھانا کھالیا تو باقیوں کو کھلانا مشکل نہیں ہوگا۔ جب باقی افراد دیکھیں گے کہ ان کے بزرگوں نے بھرت توڑ دیا ہے تو وہ بھی توڑ دیں گے۔ میری ہدایت پر حبشی پہرے دار کیبنوں میں داخل نہیں ہوئے (کیونکہ انہیں دیکھ کر قیدی بدک جاتے تھے) میں نے کچن میں کام کرنے والی خدمت گار عورتوں سے ہی کہا کہ وہ کھانا قیدیوں کے سامنے رکھیں۔ میں نے دونوں بزرگ افراد سے کہا "یہ شولی دیوی کے تہوار کا بھوجن ہے۔ میں نے بڑی چاہت سے تمہارے لیے بنوایا ہے۔ مجھے آشا ہے کہ تم لوگ مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

دونوں بوڑھوں نے ڈری سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر تذبذب صاف پڑھا جاتا تھا۔ یہ بات تو کملا نے یقیناً انہیں پہلے ہی بتا دی تھی کہ بھوجن آرہا ہے۔ ویسے بھی جب لڑکیوں کے سر مونڈے گئے تھے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ بھوجن تیار کیا جائے گا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک خود کو آمادہ نہیں کرسکے تھے۔ میں نے بے حد نرم لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اور کچھ نہیں تو وہ اس بھوجن کی لاج ہی رکھ لیں۔

میری طویل تقریر بھی انہیں ٹس سے مس نہیں کرسکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوف کے ساتھ ساتھ شدید قسم کے شک میں بھی مبتلا ہیں۔ غالباً انہیں ڈر تھا کہ کھانے میں زہر یا بے ہوشی وغیرہ کی دوا ہوگی۔ معلوم نہیں کہ یہ شک ان کے ذہن میں کیسے داخل ہوا تھا۔ بہرحال اس شک کے سبب وہ نہایت شدید تذبذب میں مبتلا تھے۔ کھانے کے لیے ان کی آنکھوں میں عقیدت اور خواہش موجود تھی مگر ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھنے سے انکار کررہے تھے۔

حبشی جوزف کیبن سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے ان سب کو ایک مشترکہ گالی دی اور گلابی انگلش میں بولا "میرا خیال ہے کہ ان کو زہر کا شک ہے۔"

"کیا تم اس شک کو دور کرسکو گے؟" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اگر تم ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دو لقمے اٹھالو۔"

حبشی نے بمشکل اپنی ابکائی روکی "میں لعنت بھیجتا ہوں اس کھانے پر۔"

"بہت خوب۔ کیا نفاست ہے۔" میں نے کہا "ایک طرف انسانی گوشت کھا جاتے ہو' دوسری طرف احتیاط کا یہ عالم ہے۔"

"گوشت منیامی کھاتے ہیں' ہم نہیں کھاتے۔ ویسے بھی گوشت کھانا اور بات ہے۔ گندے بالوں کی یخنی پینا اور بات۔"

"انسانی جانیں بچانے کے لیے خود پر تھوڑا سا جبر بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"تو تم کرو ناں یہ جبر۔"

"میں تو کروں گا ہی' لیکن تمہاری نفاست اور نزاکت پر سو جان سے قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔"

جوزف کچھ نہیں بولا۔ میں نے دل کڑا کیا اور آلتی پالتی مار کر ان لوگوں کے درمیان ہی بیٹھ گیا۔ دل میں کراہت موجود تھی' مگر میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجالی اور بے تکلفی سے کہا "بزرگوار! چلیں آئیں' مل کر کھاتے ہیں۔ آپ کو کوئی شبہ ہے تو دور ہوجائے گا۔ ویسے بھی یہ شولی دیوی کے تہوار کا بھوجن ہے۔ اس کا کھانا بھی پن ہے۔"

میں نے خوش دلی سے ایک چمچ بھر کر منہ میں رکھا' پھر دوسرا چمچ' پھر تیسرا۔ معدہ الٹنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دونوں معمر افراد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں اپنائیت کے آثار نظر آئے۔ ان لمحوں میں خوف کسی پردے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ پھر ایک معمر شخص کا ہاتھ کھانے کی طرف بڑھا۔ اس نے میری تقلید میں ایک لقمہ لیا۔ حلق سوکھا ہوا تھا' اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور دوسرے لقمے کے لیے تیار ہوگیا۔ اسے دیکھ کر دوسرے بوڑھے نے بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ان دونوں بوڑھوں کے دو دو لقموں نے پورے کیبن کی صورتِ حال تبدیل کردی۔ ڈرے ڈرے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ سب کھانے لگے۔ ان کے جبڑے چلنے لگے' ہر لقمے کے بعد وہ میری طرف دیکھتے تھے جیسے میری موجودگی سے انہیں کھانے کی تحریک مل رہی ہو۔ پانچ دس منٹ کے اندر چاروں کیبنوں میں موجود اتر پردیشی قیدی ندیدوں کی طرح کھانے پر جھپٹ رہے تھے۔ ان بھوکی پیاسی روحوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر ترس آرہا تھا اور خوشی بھی محسوس ہورہی تھی۔ ان تمام قیدیوں میں سے اگر کوئی اب بھی کھانے سے دور تھا تو وہ راجن تھا۔ جوان سال پتنی کی موت کا غم اب بھی انگارے کی طرح اس کی آنکھوں میں دہک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوجائے گا۔

میں نے آنکھوں آنکھوں میں کملا کو اشارہ کیا کہ وہ راجن کو کھلانے کی کوشش کرے۔ اس نے کوشش کی لیکن راجن زیادہ مشتعل نظر آنے لگا۔ میں نے اشارے سے ہی کملا کو منع کردیا۔

کھانے کے بعد سب کے چہرے پر قدرے رونق آگئی۔ نوعمر کملا کا شیر خوار بچہ مسلسل "ریں ریں" کررہا تھا۔ اس کی ماں اتنی چھوٹی تھی کہ اسے ٹھیک سے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ درحقیقت بچے کی نانی ہی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ جب کملا کھانا کھا چکی تو وہ ادھیڑ عمر عورت کملا اور نواسے کو ایک طرف لے گئی۔ اس نے ایک بڑی سی چادر بیٹی کے اوپر ڈال دی اور بچے کو اس کے اندر گھسا دیا۔ وہ بچے کو دودھ پلانے کے سلسلے میں بیٹی کی مدد کررہی تھی۔

میں ان لوگوں میں گھلنے ملنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُتر پردیش کے لب ولہجے سے مجھے واقفیت تھی۔ میں اسی لہجے میں بولنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو باور کرایا کہ میں ایک سیکولر قسم کا انڈین ہوں اور ہندو' مسلم' سکھ ہر طبقے کے مذہب کو مانتا ہوں۔ میرے دس فقروں کے جواب میں وہ لوگ ایک فقرہ بولتے تھے اور وہ بھی ڈرا سہما ہوا۔ ان کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا۔ انہیں چھوڑ دیا جائے اور گھروں کو واپس جانے دیا جائے۔ کیسا معصوم مطالبہ تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کی حیثیت درندے کے نوالے کی سی ہے۔ اور درندہ اپنا نوالہ واپس نہیں کرتا۔ کیبن میں موجود سب سے معمر شخص کی عمر قریباً ساٹھ سال تھی۔ اس کا نام سیوک کمار تھا۔ سیوک کی باتوں سے اس امر کی تصدیق ہوئی کہ اُتر پردیش کے علاقے سے تعلق رکھنے والے یہ سارے لوگ بھٹا مزدور تھے اور مالکوں کے پاس گروی تھے۔ اس قسم کی "بانڈڈ لیبر" علاقے میں عام تھی۔ مالکوں نے انہیں بال بچوں سمیت کسی نامعلوم شخص کے ہاتھ فروخت کردیا تھا۔ وہ شخص انہیں یہ کہہ کر بریلی سے بمبئی لے آیا کہ یہاں انہیں نسبتاً آسان کام دیا جائے گا اور کھانے پینے کو بھی اچھا ملے گا۔ بمبئی میں وہ لوگ قریباً دو ہفتے ایک بہت بڑی فیکٹری کے گودام میں رہے۔ ان دو ہفتوں میں انہیں فیکٹری کے گودام سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا۔ یہاں انہیں کھانے پینے کو بہت اچھا دیا گیا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ نئے مالک اور اس کے بیٹوں نے ان کی عورتوں کے ساتھ زیادتی بھی کی۔ (بہرحال یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے معمول کی حیثیت رکھتا تھا) دو ہفتے بعد انہیں بتایا گیا کہ وہ گودی پر کام کے لیے جائیں گے۔ سب بچوں بڑوں کو تین ٹرکوں میں ٹھونسا گیا اور بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد جہاز پر سوار کردیا گیا۔ کیبنوں میں بند ہونے تک ان سادہ لوح لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں کہیں اور لے جایا جارہا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ انہیں جہاز سے سامان وغیرہ اتارنے کے کام پر لگایا جائے گا۔

ان لوگوں سے بات چیت کے بعد ان کے بے تحاشا خوف کی اصل وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ یہ درحقیقت تین وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو وطن سے دوری تھی' دوسری وجہ سمندری سفر تھا۔ ان لوگوں کے عقیدے اور توہمات ایسے تھے کہ سمندری سفر ان کے لیے ایک خوفناک چیز بن کر رہ گیا تھا۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ تو وطن سے دوری تھی' دوسری وجہ سمندری سفر تھا۔ ان لوگوں کے عقیدے اور توہمات ایسے تھے کہ سمندری سفر ان کے لیے ایک خوفناک چیز بن کر رہ گیا تھا۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ وہی تھی جس کا اندازہ میں پہلے لگا چکا تھا۔ ان لوگوں نے اتفاقاً وہ روح فرسا منظر دیکھ لیا تھا جس کا تعلق منیامی حبشی اور اسلم نامی بدنصیب قیدی سے تھا۔ منیامی حبشی نے مشتعل ہوکر اسلم پر کسی درندے ہی کی طرح حملہ کیا تھا اور سب کے سامنے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس منظر کی دہشت ان لوگوں کے ذہنوں سے مٹائے نہیں مٹتی تھی۔ جونہی وہ حبشی پہرے داروں کی صورت دیکھتے تھے ان کے دل ان کے سینوں میں سمٹ سکڑ کر رہ جاتے تھے۔

رات تک ان لوگوں کی جھجک سو فی صد سے کم ہوکر پچاس ساٹھ فی صد رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس سے ایک بار پھر یہ لوگ بدک گئے۔ کھانا کھانے کے پانچ چھ گھنٹے بعد ساتھ والے کیبن میں دو افراد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ انہیں قے آرہی تھی اور پیٹ میں شدید درد تھا پھر تیسرے کیبن میں بھی ایک نوعمر بچہ اسی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ ان اُتر پردیشی قیدیوں میں یک بارگی پھر سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ ان کے ذہنوں میں دبا ہوا یہ شک ایک دم ابھر کر سامنے آگیا کہ ان کے کھانے میں کچھ ملا دیا گیا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر چار پانچ مزید افراد کی طبیعت خراب ہوگئی۔ یہ بڑی پریشان کن صورتِ حال تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کھانا بالکل ٹھیک تھا اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو پھر سب کے سب بیمار پڑتے۔ یقیناً طویل فاقہ کشی کے بعد پیٹ بھر کر کھا لینے سے چند افراد کا نظام گڑبڑ ہوگیا تھا۔

کراہوں کی آواز سے کیبن گونجنے لگے۔ کاہے کاہے قے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ بیمار ہونے والے افراد کی تعداد

دس بارہ سے زائد نہیں تھی مگر یوں لگتا تھا کہ تمام کے تمام لوگ جان کنی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ کورس کی صورت میں رو رہے تھے اور واویلا کر رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ چمٹا بجانے کی بات بھی کر رہے تھے۔ اس "چمٹے" کی مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی اور نہ ہی بعد میں کسی نے بتایا۔ شاید مصیبت ٹالنے کے لیے یہ لوگ چمٹا وغیرہ بجاتے ہوں گے۔ کچھ دیر پہلے جو دوستانہ فضا پیدا ہوئی تھی وہ یکسر ختم ہو گئی۔ اب ایک بار پھر وہ لوگ مجھے شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی طویل پرچھائیاں رینگنے لگی تھیں۔

میں نے فوری طور پر مائیکل کو اطلاع بھجوائی۔ وہ غزالہ کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا' دو کارندے دوائیں اور دیگر سامان اٹھائے ہوئے غزالہ کے ساتھ آ رہے تھے۔ غزالہ نے آسٹینیں اڑسیں اور فوری طور پر متاثرین کے علاج معالجے میں لگ گئی۔ انجکشن لگوانے سے وہ لوگ اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا رائفل کی گولی سے ڈرا جاتا ہے۔ ایک ایک مریض کو تین تین افراد نے جکڑا جس کے بعد غزالہ نے انہیں انجکشن لگائے۔ جس وقت انجکشن لگ رہا ہوتا تھا اردگرد بیٹھے افراد نوحہ کناں ہو جاتے تھے' جیسے انجکشن نہ لگایا جا رہا ہو ان کے "پیارے" کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ غزالہ سرتاپا ایک پروفیشنل ڈاکٹر نظر آ رہی تھی۔ کسی بھی طرح کی کراہت کا مظاہرہ کیے بغیر وہ بڑی دل جمعی سے مریضوں کو ٹریٹ کر رہی تھی۔ اسے مختلف کیبنوں میں آنا جانا پڑ رہا تھا لہٰذا میرے مشورے پر مائیکل نے تمام بیمار قیدیوں کو ایک ہی کیبن میں منتقل کر دیا۔ یوں غزالہ کا کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ ہم ساری رات مصروف رہے۔ صبح تک باقی مریض تو ٹھیک ہو گئے لیکن ایک بچے اور عورت کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ وہ شدید ہیضے میں مبتلا تھے اور جسم ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو رہا تھا۔ جہاز میں موجود گلوکوز کا آخری بیگ بھی غزالہ بچے کو لگا چکی تھی۔ اب اس کے جسم میں مزید پانی نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ بچے کی عمر نو دس سال تھی۔ وہ پہلے ہی کچھ کمزور تھا' اب بالکل ہی ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ہی رات نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بچے کی ماں بھی وہاں موجود تھی۔ وہ رو رہی تھی اور مسلسل پرارتھنا کر رہی تھی۔ اس کی پرارتھنا میں بار بار شولی دیوی کا نام آتا تھا۔ گاہے گاہے وہ بھجن پڑھنے کا انداز بھی اختیار کر لیتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچے کی حالت ابتر ہونے لگی۔ اسے سانس ہچکیوں سے آنے لگا' آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہ ہو گئے تھے۔ مایوس کن صورتِ حال کے باوجود غزالہ اپنی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اپنی قابلیت اور دستیاب دواؤں کے مطابق وہ ہر چارہ کر رہی تھی۔ آخر بچے کے حلق سے "خرر خرر" کی منحوس آواز نکلنے لگی۔ کیبن میں موجود قیدیوں کے چہرے مجسم خوف بنے ہوئے تھے اور ان میں سب سے ترس ناک چہرہ بچے کی ماں کا تھا۔ اچانک ایک چنگھاڑ سنائی دی۔ کونے میں بیٹھا ہوا تنومند راجن ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کے حملے میں کہیں زیادہ شدت اور وحشت تھی۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا "تم قاتل۔۔۔ تم کو جندہ نائیں چھوڑت۔۔۔ تم کو جندہ نائیں چھوڑت۔۔۔"

اس نے عقب سے میرا گلا دبوچ لیا اور سر بار بار دیوار سے ٹکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بازوؤں میں غیر معمولی طاقت تھی یا شاید غیظ و غضب نے طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا یا کرتا' بچے کی ماں بھی زخمی جانور کی طرح چلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر ایک ساتھ دو اور افراد نے بھی جنونی انداز میں مجھ پر حملہ کر دیا۔ راجن نے مجھے پہلو کے بل گرا دیا تھا۔ اس کے بازو شکنجے کی طرح میری گردن کے گرد کسے ہوئے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے کوئی سنگین ضرب لگانا نہیں چاہتا تھا بلکہ قیدیوں میں سے کسی کو بھی زخمی کرنا یا چوٹ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور قریب ہونے کے لیے مکالمات کا نہیں ملاقات کا سہارا لیا جاتا ہے۔

کیبن میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ غزالہ نے جب مجھے سخت مصیبت میں دیکھا تو میری مدد کے لیے آگے بڑھی۔ حملہ آوروں میں سے کسی ایک نے غالباً راجن نے ہی ٹانگ چلائی۔ ضرب غزالہ کے پیٹ میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ مگر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ پھر میری مدد کے لیے لپکی۔ اس نے عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے کھینچ کر ایک طرف لے گئی۔ ساتھ ساتھ وہ پہرے داروں کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ان سنگین لمحات میں بھی مجھے غزالہ کی پریشانی اور جدوجہد اچھی لگی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ایسے ہی میری مدد کے لیے وہ دیوانہ وار مائیکل کی طرف بڑھی تھی۔ وہ واقعہ لاہور میں پروفیسر اللہ دتا کے تہ خانے میں پیش آیا تھا۔ مجھے مائیکل سے بچانے کے لیے غزالہ نے اپنے سر پر بندوق کے دستے کی ضربیں برداشت کی تھیں اور لہولہان ہو گئی تھی۔

چند ہی لمحے میں جوزف اور دیگر پہرے دار دندناتے

ہوئے اندر آ گئے۔ اس دوران میں' میں نے بھی راجن کی پسلیوں میں چند ہلکی ضربیں لگا کر اپنی گردن چھڑا لی تھی۔ تاہم میرے چہرے پر ناخنوں سے کئی خراشیں آ گئی تھیں اور انگلیوں کے زخموں سے بھی دوبارہ خون رسنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ کھینچا تانی میں میری قمیص کا گریبان بھی "وسیع تر" ہو کر ناف پر پہنچ گیا تھا۔

پہرے داروں نے حملہ آوروں کو دبوچ لیا اور "کی بوکو" سے پیٹنے لگے۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہے تھے اور فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ یقیناً ان کی خواہش تھی کہ انہیں تڑپانے کے بجائے ایک ہی دفعہ ان کی جان لے لی جائے۔ میں نے آگے بڑھ کر پہرے داروں کو روکا۔ ایک پہرے دار کے ہاتھ سے میں نے "کی بوکو" چھین لیا۔ میں نے انگلش میں جوزف سے چیخ کر کہا "ان بدبختوں کو روکو' ورنہ میں ان کے منہ توڑ دوں گا۔"

جوزف کے سمجھانے پر پہرے دار پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ کیبن سے نکل جائیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے میں خود ہی سلجھا لوں گا۔ وہ تذبذب کا مظاہرہ کرنے کے بعد باہر چلے گئے۔ صرف جوزف کیبن میں رہ گیا۔ اس نے راجن کو دبوچ رکھا تھا جو مسلسل سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ ان میں سب سے خطرناک یہی راجن ہی تھا۔ میں نے جوزف سے کہا کہ اسے دوسرے کیبن میں لے جاؤ اور الٹی ہتھکڑی لگا دو۔ اس سے بعد میں بات کریں گے۔ باقی دونوں حملہ آور "کی بوکو" کی شدید ضربیں سہنے کے بعد بے دم سے ہو کر فرش پر پڑے تھے۔ نیم جان بچے کی ماں کو بھی چند ضربیں لگی تھیں۔ وہ دیوار سے لگی بیٹھی تھی اور بین کرنے والے انداز میں روتی چلی جا رہی تھی۔ اب اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے جاں بلب بچے کا چہرہ بھی دیکھ سکے۔

غزالہ بھی اس ہنگامے کے بعد تھر تھر کانپنے لگی تھی' میں نے اس کی نیچے گری ہوئی اوڑھنی اس کے کندھے پر رکھی اور اسے کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھے۔ غزالہ خود کو سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اس کی ماں سے کہا "رونا دھونا مت کرو۔ اوپر والے سے اپنے بچے کا جیون مانگو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے اشک بار نظروں سے میری طرف دیکھا "ہمار کچھ ہم کو واپس دے دیو' ہم تم سب کی بنتی کرت ہے۔"

اس نے باقاعدہ میرے اور غزالہ کے سامنے جھولی پھیلا دی۔

میں نے کہا "ہم سے نہیں خدا سے مانگو۔"

آسیب، خوف، دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکٹی بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۷۵ روپے

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

"خدا ہمار نہیں ہووت ہے۔ خدا امیروں کا ہووت ہے ٹھاکروں کا ہووت ہے۔"

وہ اپنا سر بے قراری سے اپنے گھٹنے پر پٹخنے لگی۔

غزالہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ اس نے پُر امید انداز میں سرہلایا۔ میں نے دیکھا کہ بچے کے سانس میں روانی آگئی ہے اور اس کی پلکوں میں بھی جنبش موجود ہے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں بچے کی حالت مزید بہتر ہوگئی۔ غزالہ نے رسک لے کر بچے کی نس میں ایک انجکشن لگایا تھا اور یہ انجکشن مفید ثابت ہوا تھا۔ ہم دونوں رات گئے تک بچے کی دیکھ بھال میں لگے رہے۔ اس نے چمچ کی مدد سے تھوڑا تھوڑا پانی لینا شروع کردیا تھا اور یہ علامت تھی اس بات کی کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔ بچے کی ماں مسلسل خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔ دیگر افراد بھی اب بیماری کے شدید حملے سے سنبھل گئے تھے اور ان کی نگاہوں میں میرے اور غزالہ کے لیے احسان مندی کی جھلک تھی۔ عمر رسیدہ سیوک کمار بار بار دُزدیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ اس کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کررہا تھا۔ وہ اس بات سے بہت متاثر نظر آتا تھا کہ میں نے پچھلے چند دنوں میں دو مرتبہ سیاہ فام پہرے داروں کو "کی بوکو" کے وحشیانہ استعمال سے روکا ہے۔ پہلا واقعہ ہفتے کے دن پیش آیا تھا' جب راجن نے طیش سے بے قابو ہوکر مجھ پر حملہ کردیا تھا اور نتیجے میں سیاہ فام پہرے دار اتر پردیشی قیدیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس وقت میں نے "کی بوکو" کی ضربیں اپنے ہاتھوں پر روکی تھیں۔ اسی طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے سیاہ فام بے حد غضب ناک نظر آئے تھے' اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو وہ یقیناً چند لمحوں میں راجن اور تین دیگر افراد کی چٹنی ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہنے کے بعد سیوک کمار میرے قریب چلا آیا۔ اس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا "ہمار کو شما کردیو۔ ہمار کو وسواس ہوگیئو کہ آپ دیالو ہے۔" (ہمیں معاف کردیں۔ ہم کو اب یقین ہوگیا ہے کہ آپ رحم دل ہیں)

میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میری زخمی انگلیوں سے رسنے والا خون دیکھ کر سیوک کچھ اور بھی شرم سار نظر آنے لگا۔ وہ بولا "ہمار کو شما کردیو۔ ہم نے آپ کے ساتھ جیادتی کیا۔"

"اور تمہارے ساتھ جو یہاں ہورہا ہے' کیا وہ زیادتی نہیں ہے۔"

"ہمار کے تو نصیبن ہی بھگوان نے ایسو لکھت رکھے ہیں۔"

"بھگوان نصیب نہیں لکھتا' نصیب ہم خود بناتے ہیں۔ تم بھی بنا سکتے ہو۔ میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا' نہ تمہیں کوئی مارے گا' نہ تمہاری کسی عورت کے ساتھ برا سلوک ہوگا' نہ تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام لیا جائے گا۔ شرط صرف یہی ہے کہ تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ وقت پر کھانا کھانا ہوگا۔ رونے دھونے سے پرہیز کرنا ہوگا اور جو بیمار ہیں انہیں ڈاکٹر غزالہ کی ہدایت کے مطابق دوا لینا ہوگی۔"

"ہمار کو منجور ہے۔" وہ بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"تمہیں تو منظور ہے مگر کیا دوسرے لوگوں کو بھی منظور ہوگا۔"

"ہم پوری کوسس کرے گا کہ سب لوگن یہ بات مانیں۔"

"بہت اچھے۔ مجھے تم سے یہی آشا تھی۔"

"مگر ہم کو یہ تو بتادیو کہ ہم غریبن کو آپ لوگن کہاں لے جاوت ہیں۔ اور ہمارے ساتھ وہاں کا ہووے گا۔"

"ان سوالوں کے جواب فی الحال میں نہیں دے سکتا' لیکن تم لوگوں کو نراش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ میرا بہت ممنون نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا کہ اسے میرا انداز بہت پسند آیا ہے۔

میں نے پوچھا "کون سا انداز؟"

وہ بولا "آپ نے ہم غریبن کے ساتھ جمین (زمین) پر بیٹھ کے ہمار کا بھوجن کھایا۔"

"یہ تو کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے۔" میں نے کہا "جو کھانا تم کھاسکتے ہو وہ ہم بھی کھاسکتے ہیں۔ ہم ایک ہی جیسے انسان ہیں۔"

اس کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک گئے "ہم ایک جیسو نہیں۔ ہم ہریجن آپ بڑے لوگن بھگوان لوگن۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے میرے پاؤں چھوئے۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ میں نے کہا "اگر تم میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے' اپنی صحت کا خیال رکھو اور اپنے ساتھیوں کی صحت کا بھی۔"

بیمار بچے کی والدہ نے بھی میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی جو میں نے ناکام بنادی۔ اس نے چھم چھم آنسو بہائے اور

مخصوص لہجے میں واویلا کرنے لگی۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں آئیں ان کا لب لباب یہ تھا کہ وہ غزالہ سے بچے کی سے معافی مانگ رہی تھی۔ اسے بے حد افسوس ہورہا تھا کہ اس نے ہمیں غلط کیوں سمجھا۔ کیوں یہ شبہ کیا کہ ہم نے بچے کی موت میں کچھ ملایا ہے اور ان کی جان لینے کی سازش کی ہے۔

میں نے عورت کو تسلی تشفی دی اور اسے کہا کہ وہ ڈاکٹر غزالہ کے ساتھ مل کر مریضوں کی دیکھ بھال کرے۔

اگلے دو تین دن میں نے اتر پردیشی قیدیوں کے ساتھ ہی گزارے۔ میرا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ مائیکل کا خیال تھا کہ مجھے ان کے ساتھ سونا نہیں چاہیے۔ ان کا کوئی بھروسا نہیں' کہیں وہ سوتے میں میرے خلاف کچھ کر نہ گزریں لیکن مجھے یقین تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں ان کا اعتماد جیتنے میں کافی حد تک کامیاب ہوچکا تھا۔ میں رات کو یہ لبنان ان کے درمیان رہتا تھا۔ ان سے باتیں کرتا تھا' ان کے مسائل معلوم کرتا تھا اور پھر بے فکر ہوکر سوجاتا تھا۔ اب دو روز کے اس ساتھ نے ہمارے درمیان انڈراسٹینڈنگ پیدا کردی تھی۔ بیمار ہونے والے تمام دس بارہ افراد کی حالت اب ٹھیک تھی اور اپنے ساتھیوں کی طرح انہوں نے معمول خوراک کھانا شروع کردی تھی۔ صرف راجن ایسا تھا جس کے تیور ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے تھے' بہرحال بھوک ہڑتال اس نے بھی ختم کردی تھی۔

تیسرے روز مجھے جہاز میں کچھ گہما گہمی نظر آئی۔ پہرے دار نئے لباس پہنے ہوئے تھے۔ کچن میں قیدیوں کے لیے خصوصی کھانے کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ بہت سا میدہ بیکنگ پاؤڈر اور انڈے وغیرہ کچن میں گئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے کیک تیار کیا جارہا ہے کسی وقت سیڑھیوں والا دروازہ کھلتا تھا اور اوپر عرشے کی طرف سے میوزک کی مدھم آواز بھی آتی تھی۔ میں نے انگلش داں پہرے دار جوزف سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔

اس نے بتایا "آج ایسٹر ہے۔"

یہ تہوار ۲۱ مارچ کے لگ بھگ منایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم مارچ کے وسط سے گزر چکے ہیں۔ جہاز میں قید تو دور کی بات ہے' تاریخوں اور مہینوں کا حساب بھی ٹھیک سے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ صبح نو دس بجے کے لگ بھگ میرے لیے مائیکل کا بلاوا آگیا۔ مجھے ہتھکڑی لگانے کا تکلف اب ختم کردیا گیا تھا۔ مائیکل کو معلوم ہوچکا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کے لیے میں معمولی سا خطرہ بھی مول نہیں لوں گا۔ میں حبشی جوزف کی رائفل کے سائے میں اوپر مائیکل کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ وہ بڑے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ کالر میں گلاب کا مہکا ہوا پھول لگا تھا۔ یقیناً یہ پھول جہاز میں ہی کہیں اگایا گیا ہوگا۔ مائیکل کی "نصف بہتر" شائستہ اس کے قریب موجود تھی۔ وہ اسے یوں بغل میں لیے بیٹھا تھا جیسے کسی جسیم سیاہ بن مانس نے پلاسٹک کی گڑیا بغل میں دبوچ رکھی ہو۔ وہ بے تکلفی سے شائستہ کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتا جارہا تھا۔ میری آمد کے باوجود اس کے انداز اور اسٹائل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں تمہاری کارکردگی سے خوش ہوں۔" وہ بولا۔

"لیکن میں تمہاری کارکردگی پر ایسا تبصرہ نہیں کرسکتا۔"

"مجھے بردہ فروشی کے موضوع پر لیکچر نہیں چاہیے ورنہ موڈ سخت خراب ہوجائے گا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کس لیے بلایا ہے؟"

"پچھلے تین چار روز تم نے خاصی ٹینشن میں گزارے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تمہاری تھوڑی سی تفریح ہوجائے۔ آج ایسٹر نائٹ ہے۔ مین ہال میں ذرا ہلا گلا ہوگا تم بھی آجانا۔ وارڈ روب میں تمہارے لیے کچھ لباس پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک کا انتخاب کرلو۔"

میں نے کہا "میرے ساتھی تنگ و تاریک کیبن میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ میرے لیے مناسب نہیں کہ ایسٹر نائٹ مناتا پھروں۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"میرے ساتھی صفدر اور زریں تازہ ہوا اور روشنی کے لیے ترس رہے ہیں۔"

"وہ اکیلے نہیں ترس رہے' ان کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ بہرحال اب زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ ہم جلد ہی خشکی پر اتریں گے۔"

"خشکی سے تمہاری مراد منزل ہے یا پہلے کی طرح راستے کا کوئی جزیرہ؟"

وہ مسکرایا "بہت خوب۔ میں نے تمہیں یہاں بلایا تھا' تفریح میں اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے۔ تم نے حسب معمول انٹرویو شروع کردیا ہے' میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے انٹرویوز دینے سے سخت نفرت ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے مائیکل کہ تمہیں اپنے سوا ہر چیز سے نفرت ہے۔"

"بالکل غلط' مجھے بے شمار چیزوں سے محبت ہے۔ جیسے

ایسٹر کے جشن سے محبت ہے اور اس بات سے محبت ہے کہ تم ایسٹر نائٹ کی تقریب میں شرکت کرو اور تھوڑی دیر کے لیے اپنی پریشانیوں کو دھوئیں میں اڑاؤ۔"

"لیکن۔۔۔ میں اکیلا کیا خاک جشن مناؤں گا۔"

"تم اکیلے کہاں ہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور۔۔۔"

پھر ایک دم مائیکل کے ذہن میں کوئی بات آئی اور وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک ابھر آئی تھی۔ وہ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے مسٹر! ہم تمہارے اکیلے پن کا بندوبست کردیتے ہیں۔ تم اپنے ایک ساتھی کو اپنے ساتھ شریک کرسکتے ہو۔ مگر یہ ساتھی میری مرضی کا ہوگا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تمہاری سویٹ ہارٹ ڈاکٹر غزالہ تمہارا ساتھ دے گی۔"

"لیکن وہ تو۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہارا اس سے بدکنا مجھے زہر لگتا ہے۔ چلو جاؤ اب۔۔۔ زیادہ سوال جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ وارڈروب سے اپنی مرضی کا لباس لے لو۔"

"دیکھو مائیکل! ہم مشرقی لوگ ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں۔"

"تمہارے مشرق کی تو۔۔۔" اس نے ایک غلیظ گالی نکالی اور غرا کر بولا "تم لوگ سچ کو جھوٹ کے پردے میں چھپاتے ہو' اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "مائیکل! تمہارا سر بڑا ہے لیکن اندر مغز چھوٹا ہے۔ میں تمہارے ساتھ بحث مناسب نہیں سمجھتا ورنہ اس موضوع پر ایک طویل گفتگو کی جاسکتی تھی۔"

"جب جی چاہے یہ شوق بھی پورا کرلینا' بے شک میں افریقی ہوں اور کسی آکسفورڈ یا کیمبرج میں نہیں پڑھا ہوں لیکن تمہارے ہر سوال کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں۔"

اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور دھواں میری طرف چھوڑ دیا۔

شائستہ اس کے پہلو میں کسمسا رہی تھی' شاید اس بیکار بحث سے اکتا کر اٹھنا چاہتی تھی۔ مائیکل نے محبت سے اس کی طرف دیکھا' پھر بڑی ادا سے اپنا سگریٹ شائستہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی' تب شوہر کی منشاء کو سمجھتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا کش لیا۔ اسے کھانسی آگئی اور وہ رخ پھیر کر کھانسی روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم اب جاسکتے ہو۔" مائیکل نے کہا۔

میں باہر نکل آیا۔ حبشی جوزف راکفل بدست چوکس کھڑا تھا' وہ مجھے لے کر زیریں عرشے کی طرف روانہ ہوگیا۔ تنگ سیڑھیوں پر دیوہیکل ضیائی نام سے سامنا ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خشونت نظر آئی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولا لیکن میرے پاس سے یوں گزرا کہ اس کا کندھا ہتھوڑے کی طرح میرے کندھے سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی بجلی کوند رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اگر میں نے نام کی بدتمیزی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو یہاں پھڈا ہوجائے گا۔

میں خاموشی سے سیڑھیاں اتر آیا۔ جوزف نے کہا "مہم بڑی بے چینی سے ساحل پر پہنچنے کا انتظار کررہا ہے۔"

"کیوں' اسے کیا جلدی ہے؟" میں نے پوچھا۔

جوزف بولا "جب کوئی پہلوان مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہوجاتا ہے تو پھر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مقابلہ منعقد ہونے میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔ نام بھی اس وقت پوری طرح تیار ہے' اس کے لیے صبر کرنا مشکل ہورہا ہے۔ سنا ہے اس نے باس (مائیکل) سے یہ بھی کہا ہے کہ مقابلہ جہاز پر ہی منعقد کرا دیا جائے۔ مگر کیپٹن جم کو چونکہ جہاز میں اس طرح ہلا گلا پسند نہیں لہٰذا اس تجویز پر عمل نہیں ہوسکا۔"

نام کے متعلق گفتگو کرتے کرتے ہم گودام میں پہنچے اور وہاں سے زیریں کمپارٹمنٹ میں آگئے۔

اس شام مال بردار جہاز "ہرکولیس" پر واقعی جشن کا سماں تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تاریک سمندر میں یہ روشنی اور آوازوں کا چھوٹا سا جزیرہ محسوس ہوتا تھا۔ ایسٹر کے لیے خصوصی کھانے پکائے گئے تھے۔ بکرے اور سؤر کے بچوں کی گوشت کو ریفریجریٹروں سے نکال کر مختلف چائنیز اور یورپی ڈشوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہائی جارہی تھی' ہال نما کمرے کو کاغذی پھولوں اور جھالروں وغیرہ سے سجایا گیا تھا' یہاں میوزک اور ڈانسنگ پارٹی کا انتظام تھا۔ ڈنر سے پہلے ایک بڑا کیک بھی یہاں کاٹا جانا تھا۔ اس تقریب کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ بردوں کے طور پر لائی جانے والی کچھ عورتوں کو بھی زبردستی اس جشن میں شریک کیا گیا تھا۔ یہ انڈین لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے' بے شک ان کے چہروں پر مسکراہٹیں تھیں لیکن ان کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ اس جشن میں دل سے شریک نہیں ہیں اور ہو بھی کیسے سکتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں نادیدہ زنجیریں تھیں۔ انہیں "جبر" کے آتشیں کوڑے سے ہانکا جارہا تھا۔ وہ

عورتیں بھی اس تقریب میں نظر آرہی تھیں۔ انہیں نے اس جہاز میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ ہنسنے بھی تھی۔ وہ مائیکل اور کیپٹن جم کے ساتھ ہال کے درمیان میں ایک میز پر بیٹھی تھی۔ میں اور غزالہ گوشے ایک میز پر تھے۔ غزالہ نے ایک گاؤن نما لباس پہن رکھا تھا' کندھوں پر شال تھی۔ وہ خاصی پُرکشش نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی بیزاری تھی جو جشن میں مجبوراً شرکت کرنے والی انڈین لڑکیوں کے چہرے پر تھی۔

محفل کے شرکاء کے درمیان پیالے گردش کررہے تھے۔ حاضرین کا نشہ جوں جوں تیز ہورہا تھا ان کی خرمستیاں بڑھتی جارہی تھیں پھر جوڑے ڈانسنگ فلور پر رقص کرنے لگے۔ مائیکل بھی شائستہ کو لے کر بڑے مسحور انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہماری میز کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے اور غزالہ کو بھی رقص میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے انکار کردیا۔

"کیوں کیا تکلیف ہے تمہیں؟" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"سچ مچ تکلیف ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا تکلیف ہے؟"

"تمہارے پالتو سائنس کے ساتھ لڑائی میں آنکھ پر جو چوٹ لگی تھی وہ کبھی کبھی پھر سے درد کرنے لگتی ہے۔"

"بہانہ معقول ہے لیکن موقع کے لحاظ سے مضحکہ خیز ہے۔ رقص آنکھ سے نہیں ٹانگوں سے کیا جاتا ہے' بہرحال اگر تم ہماری خوشی میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو تمہاری مرضی۔"

مائیکل شائستہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ آرکسٹرا کا آہنگ اب تبدیل ہوگیا تھا۔ جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کناں ہوگئے۔ کچھ دیر بعد رقص اختتام کو پہنچا اور ڈنر کا آغاز ہوگیا۔ یہ بڑا پُرتکلف ڈنر تھا۔ کئی طرح کا روسٹ گوشت' بکرے کی بھنی ہوئی سالم رانیں اور چائنیز کھانے ڈنر میں شامل تھے۔ سویٹ ڈش کے طور پر فریش کریم کیک تھا اور خاص قسم کا اٹالین حلوہ تھا۔ میں نے تھوڑی تھوڑی سب چیزیں چکھیں لیکن غزالہ نے ایک دو نوالے ہی لیے۔ تابی کے بغیر کچھ بھی اس کے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ مشروبات میں ہم نے سوفٹ ڈرنکس لیے۔ ڈنر کے دوران مہمان رانوں نے بے تحاشا شراب پی اور آپے سے باہر ہونے لگے یہاں تک کہ کچھ لوگ دھول دھپا کرنے لگے اور ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ حالتِ مستی میں ان میں سے اکثر یہ بات بھول چکے تھے کہ صرف چند روز پہلے جہاز پر نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آچکا ہے جس میں ان کے دو ساتھیوں کے علاوہ جہاز کا نائب کپتان فلیمنگ بھی راہی عدم ہوچکا ہے۔ ڈنر کے بعد رقص کا ایک اور دور ہونا تھا۔ غزالہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں مائیکل پھر ہماری طرف نہ چلا آئے۔ وہ ہمیں پھر "رقص" کا مشورہ دے سکتا تھا۔ غزالہ کا اندیشہ غلط نکلا' مائیکل ہماری میز کی جانب نہیں آیا۔ تاہم اس نے ایک اور حرکت کی اور یہ حرکت "رقص کے مشورے" سے کہیں زیادہ بے ہودہ اور ناقابلِ قبول تھی۔ وہ ڈگمگاتا ہوا ڈانسنگ فلور پر آیا' اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا "خواتین و حضرات! توجہ کریں۔ ہمارے درمیان ایک نہایت پیارا جوڑا موجود ہے۔ مسٹر شاہ جہاں اور ان کی سویٹ ہارٹ ڈاکٹر غزالہ۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ ہماری پرانی روایت پر عمل کرتے ہوئے ڈانسنگ فلور پر تشریف لائیں گے اور ایک دوسرے کو KISS کریں گے۔"

غزالہ بھونچکی رہ گئی۔ حاضرین مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے اور پھر ایک دم ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہکی ہوئی مسرت آمیز چیخیں گونجیں اور ہم پر آوازے کسے جانے لگے۔ غزالہ کی پیشانی پر دیکھتے ہی دیکھتے پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔ وہ ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

مائیکل نے پکار کر کہا "شاہ جہاں' میں یہاں اسٹیج پر تمہارا اور تمہاری سویٹ ہارٹ کا انتظار کررہا ہوں۔"

میں اپنی جگہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔ مائیکل نے حاضرین سے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگ ایک بار پھر تالیاں بجائیں تاکہ اس خوب صورت جوڑے کو اندازہ ہو کہ آپ انہیں پیار کرتے دیکھنے کے کتنے خواہش مند ہیں۔" بدمست حاضرین نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں۔ اور گرے بالوں والے ایک اٹالین جوڑے نے اسٹیج پر پہنچ کر ہماری حوصلہ افزائی کے لیے ایک دوسرے کو چوما۔ میں نے غزالہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہلدی ہورہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

کیپٹن جم جو شراب کے نشے میں رہتا تھا آج بالکل ہی "غرق" تھا۔ اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "مائیکل تم خواہ مخواہ وقت ضائع کررہے ہو۔ یہ نہیں انھیں گے۔ یہ مشرقی لوگ ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی "تشریف" کرسی کے ساتھ چپک جاتی ہے۔"

ایک زبردست قہقہہ پڑا اور ہر طرف سے ہم پر ہوٹنگ ہونے لگی۔ مائیکل نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! یہ

میرا حکم ہے۔ اپنی ساتھی کے ساتھ اسٹیج پر آجاؤ۔"

ہم اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ کیپٹن جم نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا "چھوڑو مائیکل! تم کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ فنکشن کا مزہ ان بے وقوفوں کے لیے کرکرا مت کرو۔"

اتنے میں قریبی میز پر بیٹھا ہوا دیوہیکل ٹام میری طرف بڑھا۔ وہ افریقی زبان میں مجھ پر غرایا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن مفہوم یقیناً یہی تھا کہ وہ ہمیں مائیکل کا حکم ماننے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے غزالہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ تسلی دینے کا ایک انداز تھا۔ ٹام غصے میں بھنایا ہوا میری طرف بڑھا اور اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باقاعدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی گرفت میں شکنجے کی سی سختی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کا سیاہ چہرہ خون کے دباؤ سے کچھ اور سیاہ ہوگیا۔ اس نے دوبارہ میرا بازو تھامنے کی کوشش کی، میں نے پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کے حلق سے درندے کی سی غراہٹ نکلی اور اس نے میرا گریبان دبوچ لیا۔ میں نے بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کا گریبان پکڑ لیا دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال دھماکا خیز ہوگئی تھی۔ مائیکل نے اسٹیج پر سے چلا کر کہا۔

"رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔"

ٹام پر ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا۔ وہ میرا گریبان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا، میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ وہ خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چوڑے آدم خور جبڑے ان لمحوں میں کچھ زیادہ ہی چوڑے اور مضبوط نظر آرہے تھے۔ دو حبشی پہرے داروں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور دھکیل کر خیامی ٹام سے کچھ فاصلے پر لے گئے۔

اسٹیج پر سے مائیکل کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ وہ چند سیکنڈ تک مجھے اور ٹام کو گھورتا رہا پھر پُرجوش لہجے میں بولا "کیوں نہ ان دونوں کا مقابلہ آج ہی کروا دیا جائے۔ سب یہاں جمع ہیں، سب انجوائے کرنے کے موڈ میں ہیں۔ کیوں خواتین و حضرات! ایسٹر نائٹ کے اس پُرمسرت موقع پر آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب میں زبردست شور بلند ہوا۔ یہ شور اس امر کا گواہ تھا کہ حاضرین مائیکل کی رائے سے مکمل اتفاق کررہے ہیں۔ وہ کئی دنوں سے اس مقابلے کا انتظار کررہے تھے اور اب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا تھا۔ ویسے بھی نشے کے عالم میں اس قسم کا ہلّا گلّا بہت بھاتا ہے۔ مائیکل نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا "اگر اس مقابلے کے دونوں فریق اپنی جگہ تیار ہیں تو یہ مقابلہ ہم آج ہی منعقد کرا سکتے ہیں اسی جگہ اور ابھی۔"

ٹام نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر زور سے ہاتھ مارا اور بولا "میں تیار ہوں۔" اس نے یہ بات افریقی زبان میں کی تھی، تاہم اس کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس نے کیا "فرمایا" ہے۔

مائیکل نے مجھ سے پوچھا "کیا تم تیار ہو؟"

میں نے بلند آواز میں کہا "جس وقت سے تمہاری صورت دیکھی ہے اس وقت سے تیار ہوں۔ بہتر یہی تھا کہ تم خود مقابلے پر آتے، لیکن اس کے لیے دلیری چاہیے اور ظاہر شخص دلیر نہیں ہوسکتا۔"

"میں تمہارے مقابلے میں ضرور آتا مگر مجھے ایک سو ایک فی صد یقین ہے کہ ٹام تمہیں زیر کرلے گا۔"

ٹام کے چہرے اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ وہ ایسے خوں خوار کتے کی طرح نظر آرہا تھا جو زنجیر تڑا کر اپنے شکار پر جھپٹ پڑنا چاہتا ہو۔ جوزف نے مجھے بتایا تھا کہ ٹام اپنے سائنس کی موت کا بہت دکھ ہے اور وہ شب و روز انتقام کے لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے خاصا طاقت ور تھا۔ خصوصی خوراک اور سخت ورزشوں نے اسے سرتاپا فولاد رکھا تھا، اس کی جسمانی قوت کا کچھ اندازہ مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا۔ ٹام نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھانے کی کوشش کی تھی اور یوں لگا تھا کہ اس کی انگلیوں نے میرا گوشت مسل ڈالا ہے۔

حاضرین میں ایک دم زبردست جوش و خروش پیدا ہوگیا تھا۔ وہ بے چینی سے میری اور ٹام کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مائیکل اور کیپٹن جم اسٹیج سے اتر کر میرے قریب چلے آئے۔ مائیکل نے مجھ سے کہا "ایک بار پھر سوچ لو۔ یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں ہے۔ اس میں تم دونوں میں سے کسی ایک کی جان جاسکتی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ تمہاری جان جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ تمہاری یہ سویٹ ہارٹ جسے تم نے چومنے سے انکار کیا ہے، بالکل بے یارومددگار رہ جائے گی۔ ذرا سوچو، غور کرو، تمہاری یہ ضد جہاں تمہارے لیے جان لیوا ہے وہاں اس سویٹ ہارٹ کے لیے بھی بہت نقصان دہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے چوم لو اور ٹام کے ساتھ اپنے جان لیوا مقابلے کو کچھ عرصے کے لیے ٹال لو۔ یہ مقابلہ ہم پھر کبھی منعقد کرالیں گے۔ اور کیا معلوم خشکی پر پہنچ کر کیا حالات پیش آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مقابلہ ویسے ہی کینسل ہوجائے۔"

"تم مجھے جو "امید" دلا رہے ہو وہ میرے لیے "مایوسی" ہے۔ اب تو یہ مقابلہ ہو کر رہے گا، اگر تم نہیں کراؤ گے تو خود ہوجائے گا۔" میں نے ٹام کو گھورتے ہوئے کہا۔

ٹام نے بے قراری سے پہلو بدلا اور اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم لڑنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"ارادہ ہی نہیں رکھتا یہ میری شدید ترین خواہش بھی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ خواہش ابھی پوری ہو۔ کاش تم اندر سے اتنے بزدل نہ ہوتے اور اس پالتو کتے کے بجائے تم خود میرے مقابل آتے۔"

مائیکل نے ایک گہری سانس لی "تمہیں مقابلے کی شرائط معلوم ہیں؟"

"میں ضروری نہیں سمجھتا۔"

"لیکن میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مقابلہ تم دونوں میں سے کسی ایک کے مرنے کی صورت میں ہی ختم ہوسکتا ہے۔ اس میں ایک رعایت موجود ہے۔ مقابلے کے کل تین راؤنڈ ہوں گے۔ پہلے دو راؤنڈ میں اگر کوئی فریق شدید زخمی ہوجاتا ہے تو وہ ہاتھ اٹھا کر اپنی ہار کا اعلان کرسکتا ہے، لیکن تیسرے راؤنڈ کے آغاز کے بعد ایسا کوئی آپشن باقی نہیں رہے گا۔ پہلے دونوں راؤنڈ پانچ پانچ منٹ کے ہوں گے، تیسرا راؤنڈ حتمی فیصلے تک جاری رہے گا۔"

"تمہاری ہر شرط مجھے منظور ہے۔ تم مقابلہ شروع کراؤ۔"

"یہ میری شرطیں نہیں، مقابلے کی شرطیں ہیں۔ ایسے مقابلے جب بھی ہوتے ہیں، انہی شرطوں کے تحت ہوتے ہیں۔ میری صرف ایک شرط ہے۔ یہ شرط میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بشرطیکہ تم یہ شرط سننے کے لیے زندہ سلامت رہے۔"

"مقابلہ کہاں ہوگا؟"

"اسی خوب صورت ہال میں۔" مائیکل نے کہا "بے شک کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوگی لیکن ٹوٹ پھوٹ دیکھنے کا بھی ایک اپنا مزہ ہوتا ہے۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ یہ مقابلہ خالی ہاتھ ہوگا لیکن ایک سہولت حاصل ہوگی۔ مقابلے کے میدان میں موجود کوئی بھی شے تم لوگ ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتے ہو۔ چند ماہ پہلے ایک ایسے ہی مقابلے میں کرسی کی ٹوٹی ہوئی نوک وار ٹانگ سے مدِمقابل کا پیٹ پھاڑ دیا گیا تھا۔"

حاضرین محفل ایک بڑے دائرے کی صورت میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے ہونا شروع ہوگئے تھے۔ کئی ایک کی بغل میں لڑکیاں تھیں اور ہاتھوں میں جام تھے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں ہر شے دھندلی نظر آرہی تھی۔ جو پُرتکلف ڈنر کیا گیا تھا اس کے برتن ابھی میزوں سے سمیٹے نہیں گئے تھے۔ ٹام چٹلون قمیص میں تھا۔ اس نے قمیص اب اتار پھینکی تھی اور اپنے پہاڑ جیسے ورزشی جسم کو نمایاں کرنے کے لیے بازوؤں کو حرکت دے رہا تھا۔ مجھے ایک گوشے میں مسکین صورت پروفیسر اللہ دتا کھڑا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کی کیفیت واضح تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شائستہ اور غزالہ کے چہرے پر بھی نظر آرہی تھی۔ غالباً ان کے ڈرے ہوئے تصور نے انہیں ابھی سے ٹام کی آدم خوری کے مناظر دکھانا شروع کردیے تھے۔

کیپٹن جم نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ینگ مین! یہ ایک سنگین مقابلہ ہوگا، تم اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرلو۔"

"تم بھی ایک پالتو کی لاش اٹھانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"میں نے تمہاری بات کا برا نہیں منایا۔" جم لڑکھڑاتے لہجے میں بولا "مجھے نہیں یقین کہ میں تم سے دوبارہ بات کرسکوں گا۔"

"تم اپنے ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہو؟" مائیکل نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ضروری نہیں سمجھتا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری مرضی ہے۔ اگر تمہاری خواہش ہو تو، چند لمحوں کے لیے انہیں باری باری یہاں بلا سکتے ہیں۔"

"نو۔ تھینکس۔"

"اپنی سویٹ ہارٹ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہو تو کرلو۔"

"میں تمہاری اس لعنتی ہمدردی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم مجھے نفسیاتی دباؤ میں لانے کی بھونڈی کوشش بھونڈے طریقے سے کررہے ہو۔"

مائیکل کی آنکھوں میں طیش کی بجلی چمکی لیکن گرجنے کی آواز نہیں آئی۔ غزالہ کا جسم لرز رہا تھا اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ میں اسے ایک طرف لے گیا۔ نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما "غزالہ! یہ لوگ خواہ مخواہ سنسنی پیدا کررہے ہیں۔ ایسے مقابلے بڑے دیکھے ہیں ہم نے۔ تم حوصلہ رکھو۔ تمہارے حوصلے سے ہی مجھے حوصلہ ملے گا۔"

"آ۔۔۔ آپ نے خواہ مخواہ بات بڑھائی ہے۔"

"خواہ مخواہ نہیں بڑھائی ہے۔ یہ ہماری آن اور عزت کا مسئلہ تھا۔ باقی رہی مقابلے کی بات تو یہ تو ہونا ہی تھا۔ آج نہیں تو کل ہو جاتا۔ اچھا ہے ابھی ہو رہا ہے۔"

"آپ کی انگلیاں زخمی ہیں۔ آنکھ میں بھی درد ہوتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

مجھے یقین تھا کہ میں اسے گلے لگالوں تو وہ سب کچھ بھول کر مجھ سے لپٹ جائے گی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی لیکن میں خواہش کے باوجود ایسا نہیں کر سکا۔ زندگی میں پیار کرنے والوں کے لیے بے شمار ایسے مجبور لمحے آتے ہیں۔ کبھی موقع ہوتا ہے آمادگی نہیں ہوتی، کبھی آمادگی ہوتی ہے اور موقع نہیں ہوتا۔۔۔ اور کبھی سب کچھ ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

غزالہ کا ہاتھ آہستگی سے دبا کر اور "آنکھوں" سے اس کے غم ناک چہرے کو چوم کر میں حاضرین کی طرف پلٹ آیا۔ ہال نما کمرے میں ایک دائرہ بنالیا گیا تھا۔ درمیان میں سے میزیں اور کرسیاں ایک طرف ہٹا کر تقریباً پندرہ مربع فٹ جگہ بالکل خالی کردی گئی تھی۔ یہی لڑائی کا رنگ تھا۔ آدم خور ٹام مجھ سے پہلے ہی "رنگ" میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر جوش تو بے شک تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جان لیوا مقابلے کا تفکر بھی موجود تھا۔ میں نے اپنی قمیص اتار کر مسلح پہرے دار کے حوالے کردی، اس کے علاوہ دستی گھڑی بھی اتار دی۔ پہرے دار نے یہ دونوں اشیاء ایک کونے میں کھڑی غزالہ کے حوالے کردیں۔

تماشائی بکھے ہوئے تھے اور ان کا جوش و خروش دیدنی تھا لیکن ایک بات نوٹ کرنے والی تھی۔ مسلح پہرے داروں میں سے کسی نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور وہ ہال میں چاروں طرف چوکس کھڑے تھے۔ میں اور ٹام آمنے سامنے ہوئے۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے سفید دانت چمکائے، جیسے خاموشی کی زبان میں مجھے سمجھا رہا ہو کہ مجھے شروع میں ہی تم پر برتری حاصل ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں مگر میرے پاس یہ بتیس دانت ہیں جو تمہیں چیر پھاڑنے کے لیے بالکل تیار اور مستعد ہیں۔ اس مقابلے میں ریفری کے فرائض جہاز کا ایک فورمین انجام دے رہا تھا۔ اس تنومند انگلین کا نام ایڈی سن تھا۔ وہ افریقی زبان بھی جانتا تھا، اس نے مجھے انگلش میں اور ٹام کو افریقی میں ایک بار پھر مقابلے کی چیدہ چیدہ شرائط بتائیں۔ اس کے بعد ہم دونوں کی تلاشی لی کہ کہیں ہمارے پاس کوئی ہتھیار نما چیز نہ ہو۔ ہم دونوں کو آمنے سامنے کھڑا کرنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ یہ مقابلے کا پہلا راؤنڈ شروع ہونے کا اعلان تھا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آرکسٹرا نے زور و شور سے ڈرم بجانا شروع کردیے اور ہال ملی جلی آوازوں سے گونجنے لگا۔ ٹام میرے سامنے دونوں بازو پھیلائے کسی صفریت کی طرح کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ننگے پاؤں دیکھے۔ اس کے دائیں پاؤں پر دباؤ زیادہ تھا۔ اسٹریٹ فائٹر کو بڑی باریک بینی سے ایسی باتوں پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے۔ یہ باتیں باڈی لینگویج کے زمرے میں آتی ہیں اور انہیں نوٹ کرکے مدمقابل کی حرکات کا پیشگی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ٹام کے دائیں پاؤں پر نظر آنے والا اضافی دباؤ دو باتوں کی نشان دہی کرتا تھا۔ نمبر ایک یہ کہ وہ حملے میں پہل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، نمبر دو یہ کہ اگر میں حملہ کروں تو وہ میرا وار خالی دینے کے لیے دائیں رخ پر حرکت کرے گا۔ میں نے اسے جھکائی دی اور پھر اچانک اس پر جھپٹا مارا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ دائیں طرف ہٹا، میرا زوردار مکا اس کے بائیں گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر چار پانچ قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے غراہٹ بلند ہوئی اور وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ میں نے اس کے کئی طوفانی مکے ہوا میں خالی دیے اور جھکائی دے کر کونے میں سے نکل گیا۔ میری اڑتی ہوئی سی نگاہ غزالہ پر پڑی، وہ سراپا غم نظر آرہی تھی۔ دعا ایک غیر مرئی چیز ہے، اسے دیکھا نہیں جاسکتا لیکن ان لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں غزالہ کے ہونٹوں پر دعا کو دیکھ سکتا ہوں۔

ٹام ایک بار پھر سانپ کی طرح پھن پھیلا کر میرے سامنے آگیا۔ ہم دونوں وار کرنے کے لیے بہتر موقع تلاش کررہے تھے۔۔۔ مگر اچانک وہ کچھ ہوگیا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ آغاز کے چند سیکنڈ بعد ہی مقابلہ رک گیا۔ جہاز میں خطرے کی اطلاع دینے والی گھنٹیاں زور و شور سے بجنے لگی تھیں۔ آرکسٹرا ایک ہچکی لے کر خاموش ہوگیا۔ حاضرین پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رنگ میں بھنگ ڈالنے والی یہ گھنٹیاں مسلسل بجتی چلی جارہی تھیں۔ خطرہ کئی طرح کا ہوسکتا تھا۔ جہاز میں کہیں آگ بھڑک سکتی تھی۔ کوئی چیز جہاز سے ٹکرا سکتی تھی یا پھر قیدیوں کی طرف سے کوئی سنگین مسئلہ پیش آسکتا تھا۔ مائیکل اور کیپٹن جم دیگر عملے کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گئے۔ مسلح محافظ رنگ میں داخل ہوگئے اور انہوں نے مجھے اور ٹام کو ایک دوسرے سے دور ہٹا دیا۔ ہر طرف افراتفری نظر آرہی تھی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی ہال نما کمرے سے نکل کر عرشے پر پہنچا۔ اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہلکی چاندنی دور تک سمندر

بکھری ہوئی تھی۔ ہماری دائیں جانب صرف سوڈیڑھ سو گز کی دوری پر ایک جہاز دکھائی دے رہا تھا۔ جہاز کی روشنیاں دو طویل قطاروں کی صورت میں نظر آرہی تھیں۔ وہ ہمارے جہاز کے متوازی چل رہا تھا اور بڑے جارحانہ انداز میں قریب تر ہوتا جارہا تھا۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید ہم "بکانیرز" (بحری قزاقوں) سے ٹکرا گئے ہیں۔ قدیم زمانے کی طرح آج کے جدید دور میں بھی کھلے سمندر میں بحری قزاقی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا سدِباب کرنے کے لیے مختلف حکومتیں مختلف اقدامات اٹھاتی ہیں لیکن یہ سلسلہ کبھی بھی مکمل طور پر رک نہیں سکا۔ ہم ایک ویران سمندر میں تھے اور یہاں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں غور سے اس جہاز کو دیکھ رہا تھا جو ٹکر مارنے والے انداز میں ہر کولیس کے قریب تر ہو رہا تھا۔ جہاز کا اینگل تھوڑا سا تبدیل ہوا تو میں اسے زیادہ بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہوگیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہی سفید جہاز ہے جو ایرانی سمندر کے آس پاس ہمیں ملا تھا اور جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے مائیکل نے شاطرانہ انداز اختیار کیا تھا۔ یہ جہاز اپنے ساتھی جہاز سمیت ریت میں پھنس گیا تھا۔ تعجب کی بات تھی کہ اب وہ پھر ہر کولیس کے مقابل نظر آرہا تھا۔

۔۔۔مائیکل نے میگا فون پر پکار پکار کر اپنے ساتھیوں کو الرٹ ہونے کا حکم دیا۔ ابھی مائیکل نے بمشکل اپنا اعلان مکمل کیا تھا کہ سفید ایرانی جہاز پر سے ہر کولیس پر اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ یہ دور مار رائفلوں کی فائرنگ تھی۔ سفید جہاز بے شک ہر کولیس سے کافی چھوٹا تھا مگر نفری اور اسلحے کے لحاظ سے اس کی ہر کولیس پر برتری صاف نظر آتی تھی۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے مائیکل کے کارندوں نے عرشے پر پوزیشنیں لے لیں۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ہر کولیس سے بھی جوابی فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی چاروں طرف پرواز کررہی تھیں۔ تاریکی میں چمکنے والی روشن لکیریں درحقیقت موت کی لکیریں تھیں۔ یہ پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ہر طرف اپنے ہدف کو ڈھونڈ رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" مجھے اپنے عقب سے غزالہ کی آواز آئی۔

میں نے کہا "یہاں کھڑے ہونا خطرناک ہے۔"

میں غزالہ کو لے کر ایک کیبن کی اوٹ میں ہوگیا۔ میری رسٹ واچ اور قمیص ابھی تک غزالہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے یہ دونوں چیزیں مجھے دے دیں۔ میں نے جلدی جلدی قمیص پہن کر گھڑی باندھ لی۔ اسی دوران میں مجھے پروفیسر اللہ دتا کی صورت نظر آئی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا "ہم ایرانی جہاز کی مدد کرسکتے ہیں۔"

"کس طرح؟"

"بڑا آسان اور کارگر طریقہ ہے، آؤ میرے ساتھ۔" پروفیسر نے کہا۔

میں اور غزالہ پروفیسر کے پیچھے چلتے زیریں عرشے پر پہنچے۔ ہم مختلف چیزوں کی آڑ میں چل رہے تھے۔ گولیاں اور کارتوسوں کے مہلک چھرّے ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ دونوں جہاز اب اتنے قریب آگئے تھے کہ ہلکے ہتھیاروں سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم بالائی عرشے سے نیچے اترنے والی دیوہیکل سیڑھیوں کے نیچے پہنچے، یہاں ایک کمرے کا ادھ کھلا دروازہ نظر آرہا تھا۔ ایک جھٹکا وہاں سے ایک بیگ لے کر نکلا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیزی سے بالائی عرشے کی طرف چلا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق بیگ میں رائفل کا ایمونیشن تھا۔ پروفیسر اللہ دتا سرگوشی میں بولا "سارا ایمونیشن اسی کمرے میں پڑا ہے۔ یہ ایمونیشن ضائع ہوجائے تو کالے دس منٹ بھی مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ اگر تم۔۔۔"

ابھی پروفیسر کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ چند گز پیچھے چاولوں کے گودام کے پاس ایک زوردار دھماکا ہوا اور آگ بھڑک اٹھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ایک چھوٹے سائز کا راکٹ تھا جو ایرانی جہاز سے فائر کیا گیا تھا۔ ایسے ہی دو راکٹ بعد ازاں مزید فائر کیے گئے۔ ان میں سے ایک تو خطا ہوکر سمندر میں جاگرا اور دوسرا جہاز کے "پروپلر" کے پاس کہیں لگا، بہرحال اس سے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ یہ وہی PROPELLER (چرخی) تھا جس کی مرمت چند دن پہلے بمشکل کی گئی تھی۔ اصل نقصان پہلے راکٹ نے ہی کیا۔ گودام کے قریب کیبنوں میں لکڑی کا کام کیا گیا تھا، یہاں آگ بھڑک اٹھی۔ عملے کے چند افراد لڑائی چھوڑ کر آگ بجھانے میں مصروف ہوگئے۔

پروفیسر نے کہا "شاہ جہاں! یہ موقع غنیمت ہے۔ ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس ایمونیشن اسٹور میں پھینک دیتے ہیں۔"

پروفیسر کی تجویز معقول تھی۔ جہاز پر افراتفری مچی ہوئی تھی۔ عین جشنِ طرب کے موقع پر مارے جانے والے اس شب خون نے ہر کولیس کے رکھوالوں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ جو تھوڑی دیر پہلے نشے میں چور موج میلہ کر رہے تھے اب برستی گولیوں میں اپنا دفاع کرنے پر مجبور تھے۔ جہاز میں خطرے کی گھنٹیاں بدستور بجتی چلی جا رہی تھیں۔ شاید انہیں بجانے والا بند کرنا ہی بھول گیا تھا۔ فائرنگ کے شور میں گاہے گاہے مائیکل کی آواز میگا فون پر گونجتی تھی۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنے کارندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ کبھی وہ انگلش بولتا تھا اور کبھی افریقی زبان میں حکم جاری کرتا تھا۔ اس بدترین افراتفری سے فائدہ نہ اٹھانا واقعی بے وقوفی تھی۔ میں نے ایک نظر ایمونیشن اسٹور کا جائزہ لیا اور پھر آگ کی طرف بڑھا۔ آگ میں سے جلتی ہوئی لکڑی کھینچ کر ایمونیشن اسٹور میں پھینک دینا چنداں دشوار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی۔ جونہی میں شعلوں کی طرف بڑھا' شدید حدت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی میں آگ سے چند قدم دور ہی تھا کہ میری نگاہ دائیں طرف اٹھی۔ ایرانی جہاز ہرکولیس کے بالکل نزدیک آگیا تھا۔ یہ فاصلہ اتنا کم تھا کہ اگر کوئی شخص تیزی سے بھاگ کر ایرانی جہاز پر چھلانگ لگاتا تو وہاں پہنچ سکتا تھا۔ ایرانی جہاز پر پوزیشن لیے ہوئے کئی باوردی افراد کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔ میرے عین سامنے قریباً پندرہ گز کی دوری پر ایک دور مار رائفل کا رخ میری جانب ہوا۔ میری چھٹی حس نے چیخ کر مجھے خطرے کا احساس دلایا۔ میں نے جست لگائی اور سات آٹھ فٹ نیچے چاول کی بوریوں پر گرا' وہاں مجھ سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھا گیا اور میں لڑھک کر کئی فٹ نیچے جہاز کے پختہ فرش پر جا گرا۔ میں جہاں گرا تھا وہیں اوندھا پڑا رہا۔ گولیاں یہاں بھی مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ میں نے لیٹے لیٹے بائیں طرف دیکھا۔ قریباً ایک فٹ کی دوری پر ایک کیبن کی چوبی دیوار تھی۔ دیوار کے بالکل زیریں حصے میں برسٹ لگا تھا اور ایک مستطیل سوراخ سا ہو گیا تھا۔ اس سوراخ میں سے میری نگاہ نیچے گئی۔ ایک ہال نما کمرے کا منظر نظر آیا۔ یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ میں نے دیکھا کم و بیش بیس افراد یہاں موجود تھے۔ انہوں نے گوریلوں جیسی خاکی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ان میں سے چار پانچ سفید فام تھے باقی حبشی تھے۔ یہ افراد تین ہیوی گن کی گنیں اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ میں یہ گنیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ گنیں دیکھنے میں اینٹی ائر کرافٹ نظر آتی تھیں۔ قریباً آٹھ فٹ لمبے بیرل تھے۔ چھ سات انچ لمبی گولیوں کے اسٹرپ ان گنوں کے ساتھ اٹیچ تھے۔ یہ خوفناک گنیں اس سے پہلے میری نگاہ سے نہیں گزری تھیں اور نہ کمانڈو ٹائپ یونی فارم والے یہ افراد میں نے دیکھے تھے۔ کسی اندرونی کمرے سے ایمونیشن کے باکس بھی باہر لائے جا رہے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سیڑھیوں کے نیچے واقع وہ چھوٹا سا کمرا ہی جہاز کا واحد "ایمونیشن ڈپو" نہیں تھا۔ اگر ہم اسے اڑا بھی دیتے تو یہ لوگ نیچے سے اور ایمونیشن لے آتے۔ بھاری بھرکم گنوں کی جھلک دیکھنے کے بعد میری چھٹی حس دہائی دینے لگی تھی کہ ہم اب تک مائیکل کی طاقت کو "انڈر اسٹیمیٹ" کر رہے تھے۔ مائیکل نے ابھی تک اپنی پوری قوت استعمال ہی نہیں کی تھی۔ بیرونی "ایمونیشن" اسٹور کو بلاسٹ کرنے کا خیال ذہن سے نکال کر میں بھاگتا ہوا واپس غزالہ اور پروفیسر اللہ دتا کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں۔" غزالہ نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ پروفیسر کے ساتھ ایک کیبن کے عقب میں دبکی ہوئی تھی۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"اس لڑائی میں ہمیں مائیکل وغیرہ کا ساتھ دینا ہوگا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں دینا ہوگا؟"

"اس لیے کہ جیت ان کی ہی ہونی ہے۔"

پروفیسر کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پروفیسر کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ غزالہ کے ساتھ یہیں دبکا رہے۔ میں نیچے جھک کر دوڑتا ہوا برج کی طرف گیا' یہاں مائیکل آڑ لیے کھڑا تھا اور میگا فون کے ذریعے احکامات جاری کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں M16 رائفل تھی۔ گاہے گاہے وہ میگا فون نیچے رکھ کر ایرانی جہاز کی طرف چند فائر بھی کر لیتا تھا۔ جہاز کے زیریں حصے سے زبردست مزاحمت کی جا رہی تھی' اسی مزاحمت کا نتیجہ تھا کہ ایرانی جہاز جو تھوڑی دیر پہلے بے حد نزدیک آگیا تھا اور اس کے مسلح افراد ہرکولیس پر کودنے کی تیاری کر رہے تھے اب پھر پیچھے چلا گیا تھا۔

میں مائیکل کے قریب پہنچا تو وہ چیخ کر بولا "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ نیچے جاؤ۔"

میں نے اطمینان سے کہا "میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک سیکنڈ کے لیے رائفل دو۔" میں نے مائیکل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے چہرے پر شدید تذبذب نظر آیا۔ میں نے کہا "گھبراتے کیوں ہو۔ میرے ساتھی تمہارے قبضے میں ہیں۔ میں بمبئی جا کر واپس آگیا تھا تو اب رائفل بھی

ں کر دوں گا۔"

مائیکل نے اپنی رائفل تو نہیں دی لیکن پاس ہی رکھی ایک M16 نکال کر مجھے تھما دی۔ میں نے اوٹ میں کھڑے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا پھر اس کا رخ اوپر کی کیا اور چند برسٹوں میں ۳۶ گولی کا میگزین خالی کر دیا۔ جہاز کی زنگ آلود واٹر ٹینکی کو نشانہ بنایا تھا۔ واٹر ٹینکی درجنوں سوراخ ہو گئے اور پانی تیز دھاروں کی صورت بہہ نکلا۔ جہاز پر بھڑکنے والی آگ کا مقام بلند و بالا ٹینکی تھی نیچے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھنا شروع ہو گئی اور دھا سفید دھواں عرشے کو ڈھانپنے لگا۔ اسی دوران میں کے زیریں حصے سے ان ہیوی گنز کی فائرنگ سنائی دینے جو تھوڑی دیر پہلے میں نے اتفاقاً دیکھ لی تھیں۔ ان گنز فائرنگ شروع ہوتے ہی ایرانی جہاز تیزی سے پیچھے ہٹنے پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ قریباً ایک فرلانگ دور چلا گیا۔ دونوں کھلے سمندر میں تھے اور مغرب کی طرف جھکے ہوئے چاند بغیر روشنیوں کے بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ دونوں جہازوں رفتار بہت دھیمی تھی۔ تاہم دونوں ایک جیسی رفتار سے بڑھ رہے تھے۔

دونوں جہازوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے کے بعد فائرنگ ختم گئی۔ اس فائرنگ میں ہرکولیس کے عملے کا ایک گن مین گولی زخمی ہوا تھا' ہاں مالی نقصان کافی ہوا تھا۔ راکٹ لگنے سے جو آگ بھڑکی تھی اس نے جہاز میں قریباً دس مربع میٹر کی ہر شے کو خاک کر دیا تھا۔ ٹینکی سے نکلنے والی پانی کی دھاروں نے اس آگ کو بہت جلد سرد کر دیا تھا ورنہ یہ مزید پھیل سکتی تھی اور اگر چاول کے اسٹاک تک پہنچ جاتی تو پھر اس پر قابو پانا ناممکن تھا۔ اس اسٹاک کے قریب بمبئی سے اڑے جانے والے کسی کیمیکل کی بے شمار بوریاں رکھی تھیں اور یہ کیمیکل اس جہاز کو جہنم بنا سکتا تھا۔

مائیکل نے رائفل مجھ سے واپس لے کر اپنے ایک کارندے کو پکڑا دی۔ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "بہرحال! تمہارا آئیڈیا اچھا رہا ہے۔ واٹر ٹینک کا نقصان تو ہوا ہے مگر یہ نقصان ناقابلِ تلافی نہیں ہے۔"

اسے کیا معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے میں اسے "ناقابلِ تلافی" نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔۔۔ اور بوجوہ وہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا ہے۔

مائیکل نے جوزف کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے واپس نیچے والے کمپارٹمنٹ میں لے جائے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ ایرانی جہاز کیونکر اور کیسے دوبارہ ہرکولیس کے مدمقابل پہنچ گیا؟ ایرانی جہاز کے لوگ کیا چاہتے ہیں؟ اور اس لڑائی کا انجام کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ' لیکن میں یہ سارے سوال پوچھنے کے لیے یہاں نہیں رک سکتا تھا' کیونکہ مائیکل میری واپسی کا آرڈر جاری کر چکا تھا۔ جوزف نے مجھے آگے لگایا اور چور راستے سے گزار کر واپس کیبنوں والے کمپارٹمنٹ میں لے آیا۔ یہاں افراتفری نظر آ رہی تھی۔ کیبنوں میں موجود قیدی جان چکے تھے کہ اوپر جہاز پر کوئی زبردست گڑبڑ ہوئی ہے۔ تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں ان تک پہنچی تھیں' اس کے علاوہ عرشے پر آگ لگنے سے جو بھاگ دوڑ مچی تھی اس کی آہٹیں بھی انہوں نے سنی تھیں۔ میں جونہی اتر پڑی قیدیوں کے کیبن میں داخل ہوا وہ سب کے سب میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مخصوص زبان میں واویلا کر رہے تھے۔ سب کے سب ایک ہی بات پوچھ رہے تھے کہ اوپر کیا ہوا ہے؟

میں نے مناسب لفظوں میں انہیں سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بالکل محفوظ ہیں۔ سیوک کمار بولا "امار کو ساگر کا سفر کبھی راس نہیں آوت۔ امار کو خشکی پر اتار دیو' ورنہ جندہ نہیں بچے گا۔"

یعنی' ہمیں سمندر کا سفر کبھی راس نہیں آتا' تم لوگ ہمیں خشکی پر اتار دو ورنہ ہم زندہ نہیں بچیں گے۔

میں نے کہا "گھبراؤ نہیں سیوک۔ تمہیں تو دوسروں کو بھی حوصلہ دینا چاہیے۔ منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔"

نوعمر کملا کی ماں نے میرا بازو تھام لیا "ہمار کو تم پر بڑا وشواس ہے۔ تم کائے کو ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔"

"تم سے دور جا کر بھی میرا دھیان تم لوگوں کی طرف ہی رہتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

ان کے کیبن سے نکل کر میں اپنے ساتھیوں کے کیبن میں پہنچا' یہاں بھی تینوں کے چہروں پر پریشانی نظر آ رہی تھی۔ حسبِ توقع زریں گل سب سے بڑھ کر پریشان تھا۔ اس نے فوراً مجھے ٹٹول کر دیکھا "آپ ٹھیک تو ہے ناں استاد صیب؟"

"بالکل۔ جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آگیا ہوں۔ سارے پرزے گن لو۔ ایک بھی کم نہیں ہے۔"

"مگر اوپر فائرنگ تو ایسے ہو رہا تھا جیسے۔۔۔"

"پنجابی قلموں میں ہوتا ہے۔" صفدر نے فقرہ مکمل کیا۔

"مگر وہ ساری فائرنگ مجھ پر تو نہیں ہو رہی تھی زریں صاحب۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اور غزالہ بی بی کیسا ہے؟"

"وہ بھی بالکل خیریت سے ہے۔"

"رات کو ام نے بہت برا خواب دیکھا تھا' ام کو غزالہ بی بی ... کا بہت ہی فکر ہے۔"

صفدر بولا "خواب اس نے کلثوم کے بارے میں دیکھا ہے اور فکر غزالہ بی بی کا ہے۔ بات سمجھ رہے ہیں ناں آپ۔ یعنی غزالہ بی بی کا فکر نہیں 'لیڈی ڈاکٹر' کا فکر ہے۔"

"صفدر صیب! آپ کو تو اماری ہر بات میں ہیر پھیر نظر آتا ہے۔ حالانکہ ام جتنا "سینئر فارورڈ" ہے اتنا آپ بھی نہیں ہے۔ ام نے ہمیشہ سیدھی سادی بات کی ہے۔" غالباً وہ اسٹریٹ فارورڈ کہنا چاہ رہا تھا۔

"اچھا سینئر فارورڈ صاحب۔ میں الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

زریں گل نے ایک بار پھر مجھے ٹٹولا "ام کو معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ کسی کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرانے لگے تھے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"جوزف نے گول مول سی بات کی تھی۔" صفدر نے کہا۔

"ہاں ایک ایسا سلسلہ شروع تو کیا تھا انہوں نے لیکن پھر اوپر سے خدائی فوجدار آ گئے۔"

"کون سا فضائی روزگار؟" زریں نے پوچھا۔

"فضائی روزگار نہیں خدائی فوجدار' وہی ایرانی جہاز جس نے پہلے بھی اس جہاز کا پیچھا کیا تھا۔" زریں کے ساتھ ساتھ صفدر کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ پچھلے ایک گھنٹے میں کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے۔ وہ دونوں حیرت زدہ سے سنتے رہے۔ آخر میں ان کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ مایوسی ہی کی بات تھی۔ مائیکل اور اس کے کارندوں نے مہلک ترین اسلحے کی نمائش اور فائرنگ سے ایرانی جہاز کو "پسپا" ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اب کیا صورتِ حال ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ جب میں آیا تھا تو فائرنگ رک چکی تھی اور دونوں جہاز قریباً ٹھہر چکے تھے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ ایرانی جہاز واپس چلا جائے گا۔"

"اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے تو وہ بھی نہیں لگتے' لیکن اس جھڑپ کے بعد ایک بات بالکل واضح ہو گئی ہے۔ ہرکولیس کی طاقت اور نظری ایرانی جہاز سے زیادہ ہے۔"

"لیکن ممکن ہے کہ ایرانی جہاز کے پاس اور راکٹ ہوں۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ اور راکٹ ہوں گے۔ اگر ا... تو وہ ضرور چلا دیتے۔ ایک موقع ایسا آیا تھا کہ ہر کو... زبردست افراتفری پھیل گئی تھی' اس وقت ایرانی... بالکل قریب تھا' ایرانی ایک بار بھرپور حملہ کر کے جہاز پر... سکتے تھے۔"

ہمارے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہ... تھے۔ فائرنگ کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ جہاز کا ہوا... بہت معمولی رفتار سے چل رہا تھا۔ کیبنوں کے درمیان... جگہ پر خوں خوار صورتوں والے حبشی پہرے دار چکرا... تھے۔ اب اگر میں واپس عرشے پر جانا چاہتا تو وہ کسی صو... نہ جانے دیتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ با... ہو رہا ہے۔

ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی۔ جہاز... کھلے سمندر میں رکا رہا۔ اگلے دن بھی دوپہر تک حالات... کے توں رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بردہ فروشوں... ایرانی جہاز کے عملے میں کسی طرح کے مذاکرات ہو... ہیں۔ شاید لڑائی سے بچنے کے لیے کوئی درمیانی راستہ اخ... کیا جا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا حالات میں امید کی کرن موجود تھ...

دوپہر کے دو ڈھائی کا وقت تھا جب کمپارٹمنٹ کا... دروازہ کھلا اور مجھے سیڑھیوں پر مائیکل اور اس کے مسلح گا... کی شکلیں دکھائی دیں۔ مائیکل کے ساتھ ایک نیا شخص... تھا۔ اس کا ڈیل ڈول دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ بے حد ف... اندام تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی گنبد نما توند... طرح ہل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے سیڑھیاں اتر... سے پورا کمپارٹمنٹ لرزنے لگا ہے۔ وہ شکل و صورت... ایرانی نظر آتا تھا۔ اس نے گیلس والی پتلون پہن رکھی تھی... بالائی جسم کو نصف آستین کی بوشرٹ نے ڈھانپ رکھا تھا... حبشی پہرے داروں نے تمام کیبنوں کے دروازوں... موجود خلا کھول دیے۔ مائیکل اور فربہ اندام ایرانی معائ... کرنے والے انداز میں کیبنوں کے سامنے سے گزرنے... لگے۔ فربہ اندام شخص قریب پہنچا تو ہم اس کی صورت... طریقے سے دیکھنے لگے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور... داڑھی کانٹوں کی طرح تھی۔ چہرہ بسیار خوری اور شراب نوشی... کے سبب ورم زدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شریر... مسکراہٹ تھی۔ وہ کسی بھی زاویے سے مجھے اچھا شخص... نہیں آیا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا ایرانی جہاز کا تعلق...

...ں کے کوسٹ گارڈز سے تھا لیکن جو شخص اب یہاں نظر... آ رہا تھا وہ کسی طور بھی کوسٹ گارڈ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتنے... بڑے شخص کو تو کسی بھی قسم کی فورس میں بحال نہیں رکھا... جا سکتا تھا۔ وہ دلچسپی سے ہر کیبن میں دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ... مائیکل سے تبادلۂ خیال بھی کرتا جا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ یہ... سلسلہ جاری رہا پھر یہ لوگ واپس چلے گئے۔

صفدر نے کہا "یہ کیا چکر چل گیا ہے جناب۔ لگتا ہے کہ... یہ ایرانی جہاز سے یہاں آیا ہے۔"

"مجھے تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔"

"شاید مذاکرات کچھ زیادہ ہی کامیاب ہو گئے ہیں۔" زریں نے کہا۔

"مذاکرات کوئی نہیں ہے جی۔" زریں بولا "یہ سارے لوگ اندر سے ایک ہی ہوتا ہے۔ خو مسلمانوں سے... پنگا لینے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ام نے ایک... ...ں درجنوں فلموں میں ایسا دیکھا ہے۔ ایک دو فلموں میں تو... ...ٹ بولا جا سکتا ہے' ساری فلموں میں تو نہیں بولا جا سکتا۔... ...لم والوں نے بھی خدا کو جان دینا ہے۔"

صفدر بولا "لیکن یہ موٹا تو کافر نہیں ہے۔ یہ تو ایرانی... ہے۔"

"کافر نام سے نہیں ہوتا کرتوت سے ہوتا ہے صفدر... صاحب۔ اب آپ دیکھیں' سنتوش درپن وغیرہ کا نام... ...انوں جیسا نہیں تھا لیکن وہ کلمہ گو مسلمان تھا۔ اور تو اور... ...سدھیر سے اچھا مسلمان اور کون ہو گا۔ اس نے اپنا جان... ...ے میں ڈال کر جتنا فرنگی مارا ہے پوری ہسٹری میں کسی... ...نہیں مارا۔"

"لیکن وہ تو فلموں میں مارے تھے۔" صفدر نے کہا۔

"فلموں کے علاوہ بھی مارا تھا۔ ام نے تو... یہاں تک... ...ہے کہ وہ بھیس بدل کر ویت نام کی جنگ میں بھی گیا تھا۔"

صفدر اور زریں گل میں نوک جھوک شروع ہو گئی۔ یہ... ...جھوک خاصی طویل ہوتی مگر اسی دوران میں جوزف... ...ے کیبن کے دروازے پر آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا... مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"کیوں اب کیا مصیبت آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو کوئی نہیں آئی' ممکن ہے کہ تمہارے اوپر... ...نے کے بعد آ جائے۔"

میں اور جوزف اوپر پہنچے۔ اب شام ہونے والی تھی... ...سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ایرانی جہاز تھوڑے ہی فاصلے پر لنگر... ...انداز تھا۔ اس کے عرشے پر چلتے پھرتے کوسٹ گارڈز صاف... نظر آ رہے تھے۔ جہاز کا نام "نادر' اے ٹو" تھا اور صاف پڑھا... جا رہا تھا۔ مستول پر ایرانی جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ عملے کے... افراد عرشے پر ہاکی ٹائپ کا کوئی کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔... ان کی چیختی ہوئی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔... ہرکولیس کے عرشے پر جنگلے کے ساتھ چند میزیں رکھی تھیں۔... ان میزوں پر مختلف مشروبات رکھے تھے۔ مائیکل اور کپتان جم... کے علاوہ فربہ اندام ایرانی بھی یہاں موجود تھا۔ یہ لوگ باہمی... دلچسپی کے امور پر گفتگو کر رہے تھے۔ یہاں دو ایرانی کوسٹ... گارڈز بھی نظر آئے جو مائیکل کے ساتھیوں کے پاس بیٹھے... تاش کھیل رہے تھے۔ بڑا دوستانہ ماحول تھا۔ میں دنگ رہ... گیا۔ صفدر کی یہ بات درست ثابت ہو گئی تھی کہ ایرانی جہاز... کے لوگوں سے مائیکل وغیرہ کے مذاکرات ضرورت سے زیادہ... کامیاب رہے ہیں۔

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ایک روز پہلے ایرانی جہاز سے... جھڑپ کے دوران میں' میں نے ایرانیوں کی مدد کا ارادہ کیا... تھا۔ اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا کر یقیناً میں نے اچھا ہی... کیا تھا۔ اگر اس وقت میں اور پروفیسر ایرانی جہاز کی مدد کرتے... اور ہماری یہ "بغاوت" مائیکل کی نظر میں آ جاتی تو اب ہمارا... برا حال ہوتا۔

مائیکل نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فربہ اندام ایرانی... سے مخاطب ہو کر بولا "مارکوس' یہ ہے وہ دوسرا بندہ۔ اس کا... نام ماسٹر جہانی ہے۔"

مارکوس نامی موٹے نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ... لیا اور بولا "یہ کشتی وغیرہ تو پہلوانوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ تو ڈیل... ڈول سے پہلوان نظر نہیں آتا۔"

"ڈیل ڈول پر نہ جاؤ۔" مائیکل نے کہا "یہ کشتی کرتا... ہے۔ بلکہ جب کل تم نے ہم پر ہلا بولا' اس وقت یہ کشتی... کر رہا تھا۔ بڑے زوردار مقابلے کی امید تھی لیکن تمہاری... آمد کے سبب یہ مقابلہ آغاز ہی میں ختم ہو گیا۔"

"اوہو' پھر تو ہم نے تمہاری تفریح برباد کرنے کی غلطی... کی۔"

"ایسی غلطیاں تم دونوں بھائی پہلے بھی کرتے رہے ہو۔... بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا' ہم کل یہ مقابلہ دوبارہ منعقد... کرائیں گے۔"

"بہت خوب!" فربہ اندام ایرانی مارکوس نے کہا۔ نام... سے پتا چلتا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔

مائیکل مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "شاہ جہاں! ان سے... ملو۔ یہ ہیں ہمارے پرانے دوست مسٹر مارکوس! بڑی محبت...

کرتے ہیں ہم سے مشہد میں ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ تم سے محبت کرتے ہیں تو پھر ہمیں بھی ان سے بھرپور محبت کرنی چاہیے۔"

فریہ اندام مارکوس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں کھردرا پن اور قوت تھی۔ مائیکل بولا "شاہ جہاں! میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ ٹام سے دوبارہ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ کل شام آٹھ نو بجے تم دونوں میں پھر ہتھ جوڑی ہوگی۔ اس مرتبہ اس لڑائی سے لطف اندوز ہونے والوں میں ہمارے دوست مسٹر مارکوس اور ان کے ساتھی بھی شامل ہوں گے۔ تم کل تک ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو تیار کرلو۔"

میں نے کہا "میں اس وقت بھی ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں، تم یہ مقابلہ آج شام بھی منعقد کرا سکتے ہو۔"

"زیادہ تیزی اچھی نہیں ہوتی۔ آدھی اونٹھے منہ گر بھی جاتا ہے۔" مائیکل نے وارننگ دی۔

"میں اب جا سکتا ہوں؟"

"کہاں جاؤ گے؟"

"نیچے اپنے قید خانے میں۔"

"چلو تھوڑی دیر یہاں گھوم پھر لو۔ مقابلے سے پہلے یہ تمہاری آخری رات ہے۔ کل کیا پتا کیا ہو۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آج رات اپنی سویٹ ہارٹ کے پاس گزار لو۔"

"شاید تم پھر مجھ پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کوشش میں تمہیں اور ٹام کو صرف ناکامی "حاصل" ہوگی۔"

"اچھا چلو، تم اس وقت کو جس طرح گزارنا چاہو گزار لو۔" مائیکل نے فراخ دلی سے کہا۔

جہاز کے عملے کا ایک رکن اٹھا اور مجھے کھینچ کر اپنی میز پر لے گیا "چلو یار! یہاں بیٹھو ہمارے ساتھ۔ تاش واش کھیل لو۔"

میں خود بھی واپس کمپارٹمنٹ میں جانا نہیں چاہتا تھا، لہٰذا سیلر کی بات مانتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی خوشگوار شام تھی، اور بے حد خوب صورت بھی۔ موسم میں ہلکی سی حدت تھی، تاہم اس حدت کو شمالاً جنوباً چلنے والی ہوا کم کر رہی تھی۔ سورج کا آتشیں گولا دور مغرب میں نیلگوں سمندر کے اندر اتر رہا تھا۔ سمندر کی سطح بے حد پرسکون تھی۔ میں تاش کھیلنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں عقبی میز پر مائیکل، جم اور مارکوس کی باتیں سننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ پہلے یہ باتیں نئے ڈیزائن کی گاڑیوں اور زیورات وغیرہ کے گرد گھومتی رہیں، پھر اچانک نوادرات کا ذکر چھڑا اور اس کے ساتھ ہی دفینے کی بات ہونے لگی۔ یہ بات شروع کرنے والا ایرانی مارکوس ہی تھا۔ اس نے کہا "نہایت قیمتی نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ پاکستان سے چوری کرکے امریکا پہنچا دیا گیا ہے۔"

کپتان جم شرابی لہجے میں بولا "پاکستان سے نہیں، انڈیا سے امریکا پہنچایا گیا ہے۔ میں نے خود اخبار میں پڑھا تھا۔"

"انڈیا میں تو وہ نوادرات عارضی طور پر پہنچے تھے۔" مارکوس نے کہا "اصل میں وہ ذخیرہ پاکستان ہی کا تھا۔"

"اور پاکستانی ہی کی بے وقوفی سے امریکا میں پہنچا۔" جہاز کے نئے نائب کپتان آرتھر نے کہا۔

"یہ امریکی بڑے چال باز ہوتے ہیں۔ بندے کو پاگل کردیتے ہیں اور یہ امریکی مسٹر کلارک تو ویسے بھی بڑا ذہین فطین تھا۔" مارکوس نے کہا۔

"مگر اس پاکستانی کی بے وقوفی بھی تو دیکھو۔ اپنے ہاتھ سے سارا ذخیرہ امریکی کو سونپ دیا کہ جاؤ اسے اپنے ملک لے جاکر فروخت کرلو اور وہاں سے کیش ہمیں بھیج دینا۔"

نائب کپتان "آرتھر" نے کہا "مگر اس میں کوئی چکر ضرور ہوگا۔ سنا ہے کہ جہانی نام کے اس پاکستانی کو خطرہ تھا کہ کرپٹ بیوروکریٹس اور سیاست داں اس گراں قدر دفینے کی بندر بانٹ کرلیں گے، اور کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"یہ کوئی دلیل نہیں۔" کپتان جم نے کہا "اس کم عقل کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ کیسے بھی ہاتھوں میں رہے گا لیکن ملک کا اثاثہ رہے گا تو ملک میں۔"

"شاید ایک خبر آپ کی نظر سے نہیں گزری۔" آرتھر نے کہا "میں نے پڑھا تھا کہ جو نوادرات امریکا پہنچے ہیں، وہ دفینے کے تمام نوادرات نہیں ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ پاکستانیوں نے وہ تمام نوادرات "ذخیرے" میں سے نکال لیے ہیں جن کا تعلق پاکستانی سرزمین سے تھا۔"

"اگر ایسی بات تھی تو پھر ان نوادرات کو منظرِ عام پر آنا چاہیے تھا۔" مائیکل نے دلیل پیش کی۔

"ہو سکتا ہے کہ جان بوجھ کر انہیں منظرِ عام پر نہ لایا گیا ہو۔"

گفتگو کرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس سارے قصے کا ایک اہم کردار ان سے صرف چند گز کے فاصلے پر موجود ہے اور اپنے بارے میں پاس کیے گئے سارے ریمارکس سن رہا ہے۔ میں نے اب تک جس کی زبان سے سنا تھا یہی سنا تھا کہ میں نے دفینے کا سامان امریکی ارب پتی مسٹر کلارک کے

حوالے کرکے فاش غلطی کی ہے، حتیٰ کہ میرے نہایت قریبی ساتھی بھی اس سلسلے میں شکوک کا اظہار کرچکے تھے۔ لیکن میرا یقین متزلزل نہیں ہوا تھا۔ کم از کم ابھی تک تو میرے ذہن میں اس قسم کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ مسٹر کلارک اس اندھے اعتماد پر پورے اتریں گے جو میں نے ان پر کیا ہے۔ اچھے برے لوگ تو ہر قوم اور مذہب میں ہوتے ہیں۔ تاریک ترین راتوں کے بطن میں بھی روزِ روشن کی کرنیں موجود ہوتی ہیں۔ بہ حیثیت قوم امریکی کیسے بھی سہی مگر مسٹر کلارک مجھے مختلف فرد نظر آتے تھے۔

اندھیرا اب گہرا ہوگیا تھا۔ ستارے روشن تر ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم جہاز کے عرشے پر نہیں بیٹھے، کسی اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں اور مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میرے سامنے پائن ایپل کے جوس کا گلاس تھا اور میں گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا کچھ دیر بعد عرشے کی دائیں جانب واقع کیبن کے سامنے آرکسٹرا نے دھنیں بکھیرنی شروع کردیں۔ ردھم حاصل کرنے کے بعد سازندوں نے ایک بڑی میٹھی سی کمپوزیشن شروع کردی۔ کچھ عجیب سا تاثر تھا اس دھن کا، یہ دھن جیسے افریقہ کے گھنے جنگلوں میں سفر کر رہی تھی۔ صحراؤں میں بگولوں کی طرح چکرا رہی تھی، اور کسی دور دراز قبائلی بستی کی مہک اپنے ساتھ لا رہی تھی۔ میں نے دور مغرب کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹا پہلے غروب ہوجانے والے سورج کی سرخی ابھی افق پر باقی تھی۔ اس سرخی کے اردگرد گہری تاریکی تھی۔ اسی تاریکی میں تاریک براعظم افریقہ واقع تھا۔ ہم افریقہ کے مشرقی ساحل کی طرف سفر کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس موسیقی کا ساتھ دینے کے لیے ایک ڈانسر بھی آموجود ہوئی۔ وہ بڑے ہیجان خیز لباس میں تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے اور اس کی اونچی ایڑی موسیقی کے ساتھ عرشے کے فرش پر ٹھک ٹھک بج رہی تھی۔ میں نے اس خوب صورت رقاصہ کو غور سے دیکھا۔ یہ ان تین لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہیں میں بمبئی سے لے کر آیا تھا۔ یہ وہ تیسری لڑکی تھی جو براؤن آنکھوں والی دو لڑکیوں کے ساتھ بونس کے طور پر مائیکل کو مل گئی تھی۔ یہ سیدھی سادی لڑکی واضح طور پر کسی دیہی علاقے سے تعلق رکھتی تھی مگر اس کی دلکشی اور جسم کی موزونیت میں کلام نہیں تھا۔ نگاہ اس پر جس زاویے سے بھی پڑتی تھی چونک کر رہ جاتی تھی۔ اب مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ لڑکی بہت اچھا رقص کرنا بھی جانتی ہے۔ وہ جیسے موسیقی کے ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی۔ اگر اس کا چہرہ اداس نہ ہوتا اور آنکھوں میں ڈری ڈری پرچھائیاں نہ ہوتیں تو اس کے رقص کا تاثر کئی گنا بڑھ جاتا۔ حالانکہ اس کے اردگرد کوئی متنفس نہیں تھا مگر یہی لگتا تھا کہ کوئی کوڑا بردار حبشی اسے زبردستی نچا رہا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد اس کا خوف قدرے کم ہوگیا اور وہ نسبتاً زیادہ اچھے طریقے سے ناچنے لگی۔ سیلرز اور عملے کے دوسرے ارکان تالیاں بجا بجا کر اسے داد دے رہے تھے پھر ایک خوش پوش اٹالین نوجوان بھی اٹھ کھڑا ہوا اور رقص میں لڑکی کا ساتھ دینے لگا۔ یہ ہنگامہ جاری ہی تھا جب میں اٹھ کر غزالہ کے پاس چلا گیا، غزالہ اور تابی کی خیر خیریت دریافت کرکے میں ادھر ہی ایک گوشے میں لیٹ گیا۔ غزالہ نے پوچھا "نیچے کمپارٹمنٹ میں نہیں جائیں گے؟"

"آج مائیکل نے مجھے تھوڑی سی آزادی دی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"کل شام ٹام کے ساتھ میرا مقابلہ دوبارہ ہوگا۔ مائیکل کا خیال ہے کہ اس مقابلے کا انجام ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موت بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا اس نے آج کی رات اور کل دن بھر کے لیے مجھے گھومنے پھرنے کی آزادی دی ہے۔"

غزالہ کا رنگ زرد ہوگیا "میں تو سمجھی تھی کہ مقابلہ اب ٹل گیا ہے۔"

"جو بات تمہارے لیے اطمینان کی ہے، وہ میرے لیے پریشانی کی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جو بھی سانپ نکلنا ہے، جلد سے جلد نکل جائے۔"

غزالہ گہری سوچ میں گم ہوگئی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اگر میرے یہاں رہنے سے پریشانی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ ویسے بھی میں تھوڑی دیر کے لیے ہی لیٹا تھا، رات یہاں گزارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔"

غزالہ ذرا توقف سے بولی "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن دوسروں کے اعتراض سے ڈر لگتا ہے، یہ لوگ... یہ لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

اس نے بے اختیار میرا ہاتھ تھام لیا "اچھا، تھوڑی دیر بیٹھ تو جائیں۔"

میں نے اپنا ہاتھ دیکھا اس پر غزالہ کا ہاتھ مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ مجھے ہاتھ کی طرف دیکھتا پاکر غزالہ نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر سرخی لپک گئی تھی۔ میں بیٹھ

گیا۔ وہ روہانسی ہو کر بولی "شاہ جہاں' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتے؟"

"ہمارا پالا ایک عیار دشمن سے پڑا ہے۔ وہ ہم سب کی طرف سے بے حد چوکس رہتا ہے اور خاص طور پر میری طرف سے۔ پھر یہ کھلا سمندر ہے' یہاں سے بھاگ کر ہم جا کہاں سکتے ہیں۔ ہمیں صبر کرنا ہوگا اور کسی اچھے موقع کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"ایرانی جہاز کا عملہ بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ایرانی جہاز پر کچھ سویلین بھی سوار ہیں' جن میں ایک وہ موٹا مارکوس بھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہی لوگ سارے معاملات کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ابھی عرشے پر ہونے والی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ لڑائی سے بچنے کے لیے دونوں جہازوں کے سرکردہ افراد میں کسی طرح کا معاہدہ ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ مائیکل نے ایرانی جہاز کے لوگوں کو کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کردیا ہو۔ اس قسم کے کاموں میں یہ شخص بہت ماہر نظر آتا ہے۔"

"کیا اتنے لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کھلم کھلا ظلم کے خلاف کچھ کرسکے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اس پورے سمندر میں کوئی ایسا نہیں جو کچھ کرسکے۔ کراچی سے بمبئی تک اور پھر بمبئی سے یہاں تک کم و بیش ۳۵۰۰ کلو میٹر سفر ہم نے طے کیا ہے' لیکن بردہ فروشوں کا یہ جہاز ہر جگہ سے بخیر و عافیت گزر رہا ہے۔ بالکل جیسے منشیات فروشوں کا ٹرک لنڈی کوتل سے کراچی تک سیکڑوں پولیس ناکوں سے بحفاظت گزر کر اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔"

ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے' تابی ہمارے آس پاس ہی اٹکھیلیاں کرتا رہا۔ وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ ان حالات سے قطعی بے خبر تھا جن میں سے ہم سب گزر رہے تھے۔ میں نے غزالہ کو ان تین عدد خوفناک اینٹی ائرکرافٹ گنوں کے بارے میں بھی بتایا جو میں نے جہاز پر دیکھی تھیں۔ سوویت یونین کی بنی ہوئی ان لاریج کیلیبر گنوں میں قریباً ساڑھے چودہ سینٹی میٹر کی گولی چلتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ان گنوں کا اصل نام تو بہت طویل تھا' عرفِ عام میں انہیں ZPU-4 کہا جاتا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ خالص فوجی گنیں مائیکل وغیرہ کے پاس کیسے پہنچی تھیں۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

غزالہ نے پوچھا "کہاں جارہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ باہر عرشے پر جاکر سوجاتا ہوں۔ بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔"

"کیا آپ کو نیند آرہی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن تمہیں تو آرہی ہوگی۔"

"بالکل بھی نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"لیکن' تم خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ اگر میں یہاں رہوں گا تو مناسب نہیں ہوگا۔"

"چلیں پھر باہر عرشے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بڑی اچھی چاندنی ہوگی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا مگر اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ کہیں بالکل پاس کھٹکا ہوا اور ایک کراہ سی سنائی دی۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ میں نے اور غزالہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غزالہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کرکے میں باہر نکلا۔ دروازے پر رائفل بردار جوزف بالکل چوکس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح گردش کرنے لگیں۔ بہرحال اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ مائیکل کی طرف سے مجھے آج رات جہاز پر گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ میں ٹہلنے والے انداز میں جہاز کی "بو" کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے مختلف چیزوں کی آڑ میں چلتا ہوا واپس آیا اور اس مقام پر پہنچ گیا' جہاں آہٹ ابھری تھی اور پھر نسوانی کراہ سنائی دی تھی۔ یہاں ایک تنگ زینہ بل کھاتا ہوا برج کی طرف جاتا تھا۔ زینے کے ایک بل کے نیچے تنگ و تاریک خلا سا تھا' یہاں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ نیم تیرگی کے سبب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے عرشے کی طرف دیکھا' سرِ شام جہاں محفل جمی ہوئی تھی وہاں اب ویرانی کا ڈیرا تھا۔ نشے میں دھت جہاز کے دو خاکروب دو میزوں پر پڑے سو رہے تھے۔

اچانک مجھے کاٹھ کباڑ کے اندر معمولی سی حرکت محسوس ہوئی۔ یقیناً کوئی یہاں موجود تھا۔ میں تھوڑا سا مزید آگے بڑھا اور کاٹھ کباڑ میں جھانکا۔ چاندنی کی ایک شعاع دو ڈری سہمی آنکھوں پر پڑی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو سکڑی سمٹی خلا میں چھپی بیٹھی تھی "کون ہو؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

وہ کچھ نہیں بولی' کچھ اور سمٹ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا' یہ وہی رقاصہ تھی جو شام کو عرشے پر اپنے فن کا مظاہرہ کررہی تھی۔ اس لڑکی کو بمبئی سے لانے والا میں تھا لیکن اگر میں نہ بھی لاتا تو کوئی ایسا خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ بمبئی میں وہ زیادہ برے حالات کا شکار ہوتی۔ وہ

حسن فروشوں کے چنگل میں تھی اور اس چنگل میں اس کے لیے کہیں بھی اماں نہیں تھی۔ میں نے اسے باہر آنے کو کہا۔ وہ منمنائی "بھگوان کے لیے' مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"لیکن تم باہر تو نکلو۔ یہاں چھپنے سے تمہیں بھلا کیا فائدہ ہوگا۔ تم جہاں بھی چھپو گی جہاز کے اندر ہی چھپو گی' وہ لوگ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے' چلو شاباش باہر آؤ' مجھے بتاؤ' تمہارا کیا مسئلہ ہے؟"

وہ ایک دم بلک پڑی "بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔ میں واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی طرح میرے اندر نگر والے گھر پہنچا دو۔"

"یہ اندر نگر کیا ہے؟"

"میرا گاؤں ہے۔ یہاں میری شادی ہوئی ہے۔"

"مجھے اندازہ ہوا کہ لڑکی میری توقع سے زیادہ سیدھی سادی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں سے چلی تھی اور کن کن ہاتھوں سے گزر کر یہاں پہنچی تھی۔ اس کی معصومیت اور دوشیزگی پر نہ جانے کتنی خراشیں آچکی تھیں لیکن اس کا بھولپن اب بھی برقرار تھا۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا تو وہ کچھ اور سمٹ گئی "نہیں' میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ اس کی بدبو سے میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"کس کی بات کررہی ہو۔ کس کے پاس نہیں جاؤ گی؟"

"وہی موٹا' اس کے منہ سے مردار کی بو آتی ہے۔ میں رام کی سوگند کھاتی ہوں' اس کے منہ سے مرے ہوئے کتے کی بو آتی ہے۔ میں نہیں جاؤں گی اس کے پاس۔"

میں نے وضاحت چاہی تو معلوم ہوا کہ لڑکی اسی موٹے ایرانی مارکوس کی بات کررہی ہے۔ رقص کے دوران میں ہی مارکوس نے اس لڑکی کو اپنی رات چمکانے کے لیے چن لیا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر وہ لڑکی کو اپنے کیبن میں لے گیا۔ مگر کیبن میں پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد وہ بستر پر گر کر گہری نیند سو گیا۔ لڑکی اس کی بدبودار سانسوں کی زد سے نکل کر ایک گوشے میں جاکھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد گوشت کا پہاڑ مارکوس نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا اور لڑکی کی تلاش میں اندھوں کی طرح دائیں بائیں ہاتھ چلانے لگا۔ وہ کیبن کا دروازہ کھول کر نکلی اور سیڑھیوں کے نیچے پڑے کاٹھ کباڑ میں جا چھپی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد غالباً مارکوس پھر گہری نیند سو گیا تھا۔

دیہاتی مزاج کی یہ سیدھی سادی لڑکی سسک رہی تھی اور اپنی بپتا سنا رہی تھی۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ وہ بولی "انورادھا۔۔۔ گھر میں مجھے انو کہتے ہیں۔"

وہ اب میرے قریب کھسک آئی تھی اور اس کا حد سے بڑھا ہوا خوف بھی کچھ کم ہوگیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بچپن سے ہی کتھک ناچ جانتی ہے' وہ اپنے گاؤں کے مندر میں ناچتی تھی۔ اس کے خاوند کا نام "جواہر" تھا۔ وہ اس سے بہت بہت پیار کرتا تھا۔ جے پور سے آنے والے ایک میراٹھی سیٹھ نے گاؤں میں انو کا ناچ دیکھا اور اسے بہلا پھسلا کر گاؤں سے لے آیا۔ سیٹھ کا کہنا تھا کہ وہ شہر کے مندر میں ناچے گی اور وہاں میاں بیوی کو بہت پیسہ بھی ملے گا۔۔۔ لیکن اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ہندو سیٹھ نے شہر پہنچ کر انو اور اس کے پتی جواہر سے دھوکا کیا۔ وہ انو کو ہوٹل کے کمرے سے لے اڑا اور نجانے کہاں کہاں گھماتا ہوا آخر بمبئی لے آیا۔ انو روتی بلکتی رہی۔ اپنے شوہر سے ملنے کی التجائیں کرتی رہی لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ اسے ڈرا دھمکا کر خاموش کردیا گیا۔ وہ مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی بالآخر اس جہاز پر پہنچ گئی۔

ابھی انورادھا کی گفتگو جاری تھی کہ دو حبشی پہرے دار دندناتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں ایک تو وہی خوں خوار نیامی تھا جس نے چند روز پہلے اپنے دانتوں سے جیتے جاگتے اسلم کا تیا پانچا کیا تھا' دوسرا جوزف تھا۔ جوزف نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس کی نگاہ انو پر پڑی اور وہ بری طرح چونک گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ یہاں کیا کررہی ہے؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"بے چاری چھپنے کی کوشش کررہی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈاکو سے بچنے کے لیے ڈاکو کے گھر ہی میں چھپ جائے۔"

"تم زیادہ باتیں نہ بناؤ۔" جوزف نے منہ ٹیڑھا کرکے کہا "تم نے باس کی رعایت سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ تمہیں گھومنے پھرنے کی اجازت ملی تھی۔ سازشیں کرنے کی نہیں۔"

اتنے میں عملے کے دو اٹالین اہلکار بھی وہاں پہنچ گئے۔ جوزف نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایک اٹالین نے کہا "میرا خیال ہے باس کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"وہ سو رہے ہوں گے۔" دوسرے نے کہا۔

اتنے میں برج کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی

دی۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ مائیکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہماری ہی طرف آرہا ہے۔ رات کے اس پہر بھی وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ سرخ ٹائی چمک رہی تھی۔

"کیا بات ہے دوستو؟"

جوزف نے لنگڑی لولی انگلش میں مائیکل کو پوزیشن سے آگاہ کیا۔ مائیکل نے انو سے پوچھا کہ وہ کیبن چھوڑ کر یہاں کیوں چلی آئی تھی۔

انو انگلش نہیں جانتی تھی۔ وہ بس ڈری ڈری نظروں سے دیوہیکل مائیکل کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے تھے۔

جوزف نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "باس! یہ دونوں یہاں ضرور کوئی سازش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک دم گھبرا گئے تھے۔"

اٹالین اہلکار بولا "باس! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں' لیکن اس بندے کو آزادانہ گھومنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اور اگر ایسا کرنا ہی ہے تو پھر اسے ہتھکڑی لگائی جائے۔"

مائیکل بڑے اسٹائل سے مسکرایا۔ اس کے سپید آدم خور دانت چمکنے لگے "ہتھکڑی تو اسے لگی ہوئی ہے اور ہاتھوں کو ہی نہیں' پورے جسم کو لگی ہوئی ہے۔"

جوزف نے مؤدب ہو کر کہا "اس لڑکی کے بارے میں کیا حکم ہے باس؟"

"اسے مارکوس کے کیبن میں چھوڑ آؤ۔" مائیکل نے کہا۔

انو انگریزی سے نابلد ہونے کے باوجود تاڑ گئی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ سسک کر بولی "نہیں' میں نہیں جاؤں گی۔ اس کی بدبو سے میرا دم گھٹتا ہے۔ بھگوان کے لیے مجھ پر کرپا کرو' مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے میرے اندر نگر والے گھر پہنچا دو۔"

انو کی آہ و زاری دیکھ کر مائیکل بولا "ٹھیک ہے' اس روتی ہوئی کتیا کو نیچے دوسری لڑکیوں کے پاس بھیج دو۔ ویسے بھی اب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔"

مائیکل کا حکم ملتے ہی جوزف نے انو کو بازو سے پکڑا اور عرشے کے فرش پر گھسیٹتا ہوا' اندرونی حصے کی طرف لے گیا۔

مائیکل نے مجھ سے کہا "آؤ میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ اپنے لگژری اپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ تاہم اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کے بجائے وہ مجھے اپارٹمنٹ کے عقب میں لے گیا' یہاں اس نے ایک دروازہ کھولا' ایک گول کمرے میں پانچ ٹی وی اسکرینیں نظر آرہی تھیں۔ ایک شخص اسٹول پر بیٹھا انگلش ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا اور سیب کھا رہا تھا۔ مجھے اور مائیکل کو دیکھ کر وہ اٹین شین کھڑا ہو گیا۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ دو اسکرینیں تو تاریک تھیں مگر تین پر مناظر نظر آرہے تھے۔ ایک پر زیریں کپارٹمنٹ کے کیبنوں کا منظر تھا۔ حبشی کارندے یہاں چوکسی کے ساتھ پہرا دے رہے تھے۔ دوسرا منظر بالائی عرشے کا تھا۔ کیمرہ آٹومیٹک طور پر پین ہو رہا تھا' کیمرے کی حرکت پورے عرشے کو اسکرین پر لا رہی تھی۔ تیسرا منظر غزالہ کے اپارٹمنٹ کا تھا۔ یہ فکس کیمرہ تھا۔ پوری خواب گاہ اسکرین پر تھی۔ تابی بستر پر سو رہا تھا۔ غزالہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے کھڑکی کھول کر باہر بھی جھانکا۔ کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کمرے میں مائیکروفون بھی موجود ہے۔ غزالہ کی پریشانی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میں آہٹ سننے کے بعد قریباً آدھ گھنٹا پہلے کیبن سے باہر نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

مائیکل مسکرایا "تمہاری سویٹ ہارٹ بڑی بے چین نظر آرہی ہے تمہارے لیے۔ غالباً اسے آج کی رات ضائع جانے کا افسوس ہے۔"

اب یہ بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ مائیکل نے مجھے چوبیس گھنٹے کے لیے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت کیوں دی تھی۔ جہاز کے بیشتر حصوں کو کیمرے کی خفیہ آنکھ دیکھ رہی تھی۔ خاص طور سے غزالہ تو ہر وقت ان لوگوں کی نگاہ میں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک غزالہ اور تابی ان کے قبضے میں ہیں' میں آزاد ہو کر بھی قیدی ہی ہوں۔

مائیکل بولا "میں اس لیے تمہیں یہاں لایا ہوں کہ تمہیں اپنی حدود کا علم ہو جائے۔ تمہاری سویٹ ہارٹ ہر وقت ہماری نظریں ہے' ویسے یہ ہے بھی نظر میں رکھنے والی چیز۔ خوب ہاتھ مارا ہے تم نے۔" وہ آنکھ میچ کر بولا۔

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ مائیکل نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا اور ڈرامائی انداز میں بولا "بیڈ کے پاس یہ چھوٹی سی سائیڈ ٹیبل دیکھ رہے ہو۔ اس کے درمیان والی مقفل دراز میں چھوٹا سا لیکن طاقت ور بم موجود ہے۔ اس پورے اپارٹمنٹ کے پرخچے اڑا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اب تمہیں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے کہ اس بم کا ریموٹ کنٹرول میرے پاس موجود ہے۔"

"مجھے تمہاری شیطانیت اور سفاکی پر پورا یقین ہے۔"

میں نے کہا۔

"ابھی تمہارے اور تمہاری سویٹ ہارٹ کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ ساری اس کمرے میں سنی گئی تھی۔ پھر وہ منظر بھی دیکھا گیا تھا جب تم آہٹ سن کر جلدی سے باہر نکل گئے تھے۔ پہرے دار کو چکر دینے کے لیے پہلے تم یونہی اگلے حصے کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ٹہلتے ہوئے واپس سیڑھیوں کی طرف آگئے۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"تمہاری ہر بات سچ ہے اور سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔"

"ٹھیک ہے' اب تم جاسکتے ہو۔ حالات ٹھیک رہے تو کل شام نام کے ساتھ تمہارے دو دو ہاتھ ہوں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ غزالہ کے بیڈ روم والا منظر اب اسکرین پر نیم تاریک نظر آرہا تھا' غزالہ نے بیڈ روم کی بڑی روشنی بجھادی تھی اور میری واپسی سے مایوس ہو کر تابی کے پاس ہی لیٹ گئی تھی۔ دوپٹہ اس کے گلے میں تھا۔ جسم کے خدوخال نمایاں ہورہے تھے۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ کیمرے کی آنکھ پل پل اسے دیکھ رہی ہے۔ کمرے سے نکل کر میں غزالہ کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ غزالہ کو تادیر انتظار میں رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے دیکھا غزالہ کے دروازے کے سامنے مسلح محافظ الرٹ کھڑا ہے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ غزالہ کی صورت نظر آئی۔ میں نے بازو سے پکڑ کر اسے دروازے سے باہر نکال لیا "تمہارے کمرے میں ٹی وی کیمرہ موجود ہے اور یہاں کی ساری آوازیں بھی سنی جاتی ہیں۔" میں نے تیزی سے سرگوشی کی۔

غزالہ پہلے تو ہکا بکا میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔ ہم دونوں کمرے میں داخل ہوگئے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے باتیں کرتے گزار دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں سنسر شدہ تھیں کیونکہ دیکھنے والی آنکھ ہمیں دیکھ رہی تھی اور سننے والے کان سن رہے تھے۔ ناشتا میں نے غزالہ کے ساتھ اس کے کمرے میں ہی کیا۔ ناشتے کے دوران میں تابی خوب اٹکھیلیاں کرتا رہا اور کشیدہ صورتِ حال میں بھی میرے اور غزالہ کے مسکرانے کا سامان پیدا ہوتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ غزالہ کے حسین چہرے پر رہ رہ کر فکر کی پرچھائیاں لہرا جاتی تھیں۔ غالباً اس فکر و پریشانی کا تعلق اس مقابلے سے تھا جو آج شام میرے اور نام کے درمیان ہونا تھا۔ بیکار میں ایک جان لیوا مقابلے کا انعقاد میرے نزدیک بے وقوفی کا مظاہرہ تھا' مگر اس قسم کی اور بھی بہت سی بے وقوفیاں اس جہاز پر ہورہی تھیں۔ مائیکل اور اس کے ساتھی یقیناً صرف تفریح کے لیے یہ مقابلہ کرا رہے تھے اور اس بات کو نظرانداز کررہے تھے کہ اس تفریح کا انجام دونوں میں سے کسی ایک کی موت کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

ناشتے کے بعد میں باہر عرشے پر آگیا۔ جہاز پر اور عرشے پر سنہری دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ دور قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایرانی جہاز "اے ٹو" بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ بے شک ایرانی جہاز کے افراد ہر کولیس پر موجود تھے اور یہاں بڑے دوستانہ ماحول میں گھوم پھر رہے تھے' اس کے باوجود ہر کولیس کے مسلح گارڈز نے ابھی تک اپنی پوزیشنیں نہیں چھوڑی تھیں۔ غالباً اسی طرح ایرانی جہاز پر بھی لوگ غافل نہیں تھے۔ ایرانی جہاز کے عرشے پر کوئی بندہ نظر نہیں آتا تھا' جہاز کے ایک بلند ترین مقام پر ایک مورچہ ابھی تک موجود تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جہاز کے میٹنگ ہال میں نہایت سنجیدہ قسم کی گفتگو ہورہی ہے' اس گفتگو میں دونوں جہازوں کے با اختیار افراد حصہ لے رہے ہیں۔ ان با اختیار افراد میں مارکوس کے علاوہ ایرانی جہاز کا نائب کپتان جمشید اور چیف انجینئر ارژنگ شامل تھا۔ ہرکولیس کی طرف سے اس گفتگو میں مائیکل' کپتان جم اور نائب کپتان آرتھر حصہ لے رہے تھے۔ میٹنگ ہال کا دروازہ بند تھا اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں عرشے کی دھوپ میں بیٹھا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا "کیا ہوا پاؤں کو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یونہی پھسل گیا تھا۔" وہ مری مری آواز میں بولا۔

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے میٹنگ ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اندر کی کیا صورتِ حال ہے پروفیسر؟"

"ابھی تو مخدوش ہی ہے' کچھ کہا نہیں جاسکتا۔"

پروفیسر کی بات نے مجھے مزید چونکا دیا۔ میں نے کہا "مخدوش سے کیا مطلب ہے' صلح صفائی تو ہوچکی ہے۔ یقیناً کوئی معاہدہ ہوا ہوگا تو ایرانی اس جہاز پر نظر آرہے ہیں ناں۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ معاہدہ ہوا ہے۔ ابھی کوئی معاہدہ نہیں ہوا اور مجھے تو ہونے کی امید بھی کم ہی نظر آتی ہے۔"

"تو پھر یہ میل ملاپ کیسا ہے اور یہ دادعیش یہاں کیوں دی جارہی ہے؟"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ جس طرح تین چار ایرانی یہاں آئے ہیں' اس طرح دو تین سیاہ فام "ایرانی جہاز" پر بھی گئے ہیں۔ اگر مائیکل جہاز پر آنے والے ایرانیوں سے کوئی ناروا سلوک کرے گا تو ایسا ہی سلوک ایرانی جہاز پر جانے والے سیاہ فاموں کے ساتھ ہوسکتا ہے۔"

"گویا دونوں جہازوں پر توازن قائم کیا گیا ہے۔"

پروفیسر نے اثبات میں سرہلایا اور بولا "گفتگو نازک مرحلے میں ہے۔ دونوں جہازوں پر خطرناک اسلحہ موجود ہے' اگر لڑائی ہوئی تو دونوں کا شدید نقصان ہوسکتا ہے' لہٰذا درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

"کیسا راستہ؟"

"سنا ہے کہ ایرانی پولیس کے اہلکار ایک لاکھ ڈالر نقد اور کچھ تحفے تحائف مانگ رہے ہیں' اس کے علاوہ وہ ایندھن کا تقاضا بھی کررہے ہیں' جبکہ ایندھن ہرکولیس کے پاس بھی کم ہے۔ یہ جگہ بحری راستوں سے بہت ہٹ کر ہے۔ افریقی ساحل تک پہنچنے کے لیے ایندھن کم پڑگیا تو ہرکولیس کو سخت مشکل پیش آسکتی ہے۔"

"لیکن ایرانی جہاز سے اتنا خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے جہاز پر زبردست قسم کی روسی گنیں ZPU-4 دیکھی ہیں۔ وہ تو ایرانی جہاز کا بھرکس نکال کر رکھ دیں گی۔"

"بھرکس نکالنے والی کچھ چیزیں ایرانی جہاز کے پاس بھی ہیں۔ انہوں نے پچھلی جھڑپ میں جو تین راکٹ استعمال کیے تھے' اس سے تین گنا بڑے دو اور راکٹ ان کے پاس ہیں۔ لڑائی بند ہونے سے پہلے انہوں نے یہ راکٹ چلانے کی باقاعدہ دھمکی دی تھی۔ یہ راکٹ جہاز کو ناکارہ نہ بھی کرسکیں تو شدید قسم کا جانی اور مالی نقصان ضرور پہنچا سکتے ہیں۔"

"راکٹ کسی نے دیکھے بھی ہیں؟"

"بالکل دیکھے ہیں۔ اسی لیے تو لڑائی بند ہوئی تھی۔ ورنہ مائیکل اب تک اپنی ہیوی گنوں کے زور سے "اے ٹو" پر قبضہ کرچکا ہوتا۔"

"تو یہ بات ہے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اچانک میٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور بلند لہجے میں بولنے کی آوازیں سنائی دیں' پھر فربہ اندام مارکوس ایک اسمارٹ سے باوردی شخص کے ساتھ غصے میں تمتمایا ہوا باہر نکلا۔ باوردی شخص نے تیز لہجے میں کہا "آپ حد سے تجاوز کررہے ہیں۔ بات اس طرح طے نہیں ہوتی۔"

کپتان جم نے آگے بڑھ کر باوردی شخص کا بازو تھام لیا اور انہیں سمجھا بجھا کر چند قدم پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی میٹنگ روم کا دروازہ ایک بار پھر بند ہوگیا۔

پروفیسر اللہ دتا کی یہ اطلاع سچ نکلی تھی کہ اندر بڑی دھواں دھار قسم کی گفتگو ہورہی ہے۔ میں نے اور پروفیسر اللہ دتا نے دیکھا کہ میٹنگ روم کے دروازے پر پیش آنے والے اس واقعے کے بعد جن افراد نے جہاز کے عرشے پر پوزیشنیں لے رکھی تھیں وہ مزید چوکس ہوگئے۔ ان مسلح افراد کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ تھی۔ ان میں دو اٹالین اور باقی سیاہ فام تھے۔ سب کے پاس دور مار رائفلیں تھیں۔

میں اور پروفیسر ادھر ادھر گھوم کر جہاز کا جائزہ لیتے رہے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ پروفیسر نے دکھی لہجے میں بتایا کہ پچھلے دو روز سے شائستہ کے ساتھ اس کی بات نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ اس کی جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔ اس نے کہا "پہلے وہ ہر روز تین چار بار کھڑکی سے جھانک لیا کرتی تھی۔ پرسوں شام سے کھڑکی بھی بند پڑی ہے۔ اللہ خیر کرے اس کی طبیعت ٹھیک ہو۔"

میں نے پروفیسر کو تسلی تشفی دی۔ پروفیسر کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ مائیکل کا رویہ اس کے ساتھ نہایت توہین آمیز تھا۔ پروفیسر نے اس واقعے کا ذکر بھی کیا جب چند روز پہلے ایرانی ساحل کے قریب ایرانی جہاز اور ہرکولیس میں شدید جھڑپ ہوئی تھی۔ اس وقت شائستہ' پروفیسر اللہ دتا کو فائرنگ سے بچانے کے لیے باہر نکل آئی تھی اور پروفیسر کو سنبھالتے سنبھالتے خود بھی گر گئی تھی۔ مائیکل نے اس بات کا بہت برا منایا تھا۔ نہ صرف یہ کہ کئی روز شائستہ سے بات نہیں کی تھی بلکہ پروفیسر کو بھی بے نقط سنائی تھیں۔ پروفیسر کے پاؤں پر تختے کے قریب چوٹ آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس چوٹ کے بارے میں بھی پروفیسر نے جھوٹ ہی بولا ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ چوٹ کسی سخت سلوک یا مارپیٹ کا نتیجہ ہو۔

جب میں اور پروفیسر گفتگو کررہے تھے آدم خور حبشی نام کی صورت بھی ہمیں نظر آئی۔ دو گارڈز اس کے ہمراہ تھے' وہ مجھے بڑی خونی نظروں سے گھورتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے فحش اشارے کیے اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ پھر وہ نیچے والے عرشے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہ اور اس کے ساتھی باتیں کرنے لگے اور بلند آواز میں قہقہے لگانے لگے۔ وہ افریقی زبان میں بول رہے تھے لیکن ان کا انداز یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ میرے بارے میں

اشتعال انگیز گفتگو کر رہے ہیں۔ میں جب بھی ٹام کی طرف دیکھتا تھا وہ کوئی بے ہودہ اشارہ کرتا تھا۔ پروفیسر نے کہا "تم اس طرف مت دیکھو' وہ تمہیں غصہ دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"مجھے غصہ نہیں آئے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اگر آ بھی رہا ہے تو اس غصے کو نکالنے کا بہترین وقت شام کا ہوگا۔"

میٹنگ ہال کا دروازہ دوبارہ کھلا تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ یہ لنچ ٹائم تھا۔ لنچ کا انتظام کھلی فضا میں عرشے پر کیا گیا تھا۔ میٹنگ میں موجود تمام افراد کے چہرے پر زبردست تناؤ موجود تھا۔ وہ آپس میں زیادہ بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ خاص طور سے فربہ اندام مارکوس بہت برہم نظر آتا تھا اور یہ غصہ اس کے چہرے پر ہی نہیں پورے جسم پر نمایاں تھا۔ چلتے ہوئے اس کی توند ہل رہی تھی جیسے غصے میں تھر تھر کانپ رہی ہو۔ وہ اپنی پتلون کے گیلس میں بار بار انگوٹھے پھیر رہا تھا اور عرشے کے فرش پر تھوک رہا تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھنے کے بجائے وہ عرشے کے ایک گوشے میں چلا گیا اور جیب سے واکی ٹاکی نکال کر بات کرنے لگا۔ یقیناً وہ اپنے جہاز "اے ٹو" پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو دور اے ٹو کے عرشے پر بھی ایک شخص جنگلے کے سہارے کھڑا نظر آیا۔ اس کے کان سے بھی واکی ٹاکی لگا ہوا تھا۔ مارکوس سے میرا فاصلہ زیادہ تھا۔ میں اس کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا' تاہم اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ "مذاکرات" کی کشیدہ صورتِ حال کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ واکی ٹاکی بند کرکے وہ کھانے کی میز پر آ بیٹھا اور بڑے غصیلے انداز میں مرغ کی ٹانگ پھاڑنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ واکی ٹاکی پر مارکوس کی گفتگو کے تھوڑی دیر بعد ہی اے ٹو کے زیریں حصے میں ہلچل نظر آنے لگی ہے۔ میں نے ایک رائفل مین کے پاس پڑی ہوئی دوربین اٹھائی اور "اے ٹو" کا جائزہ لینے لگا۔ معمولی کوشش سے مجھے وہ دو عدد راکٹ نظر آگئے جن کا ذکر پروفیسر اللہ دتا نے کیا تھا۔ یہ راکٹ' میزائل سے مشابہ تھے۔ قطر کے مقابلے میں ان کی لمبائی زیادہ تھی۔ ان کی "سیرت" کے بارے میں تو معلوم نہیں تھا تاہم صورت بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھی۔ یہ دونوں راکٹ بالکل خاکستری رنگ کے تھے۔ بیرونی خول پر جو الفاظ لکھے تھے وہ فرنچ میں تھے' اس کا مطلب تھا کہ راکٹ فرانس ساختہ ہیں۔ ان کے لانچروں کے نیچے پہیے تھے۔ باوردی افراد ان پہیوں کے ذریعے راکٹوں کو آگے لا رہے تھے۔

میں نے جہاز کے نائب کپتان آرتھر کو بلا کر اسے بھی یہ منظر دکھایا۔ وہ دوربین کا فوکس تبدیل کرکے کچھ دیر "اے ٹو" کا جائزہ لیتا رہا پھر سر ہلاتا ہوا کھانے کی میز پر واپس چلا گیا۔ وہ مائیکل کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مائیکل کی طرف جھک کر اس نے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ مائیکل کھانا کھاتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ مائیکل نائب کپتان کو کچھ ہدایات دے رہا ہے۔ کھانے کی میز سے سب سے پہلے اٹھنے والا نائب کپتان آرتھر ہی تھا۔ وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ یہ سرگرمی اشارہ کر رہی تھی کہ "اے ٹو" پر راکٹوں کو "پوزیشن" کیے جانے کے بعد مائیکل اور اس کے ساتھی بھی کوئی جوابی اقدام کر رہے ہیں۔

"اے ٹو" پر موجود راکٹوں کے سامنے والے حصے اب بغیر دوربین کے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں ان کی سرخ خوفناک چونچیں خطرے کا جان لیوا نشان بن کر چمک رہی تھیں۔ یہ سوچنا اور محسوس کرنا بڑا سنسنی خیز تھا کہ ان تباہ کن فرنچ راکٹس کا نشانہ ہرکولیس ہے اور ہم ہیں۔

عجیب ڈرامائی سی کیفیت تھی۔ تین چار ہفتے پہلے جب میں میکلوڈ روڈ لاہور میں صفدر کے ساتھ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں مقیم تھا' میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کچھ دنوں بعد میں خود کو خلیج عدن کے کھلے پانیوں میں پاؤں گا۔ میرا ٹھکانا بردہ فروشوں کا ایک جہاز ہوگا۔ یہ جہاز ایک دوسرے جہاز کے روبرو یوں کھڑا ہوگا کہ کسی بھی وقت دونوں جہازوں پر بارود کی بارش ہو سکتی ہوگی۔ ہوٹل کے اس کمرے میں بیٹھ کر گنڈیریاں چوستے ہوئے افریقہ کے ساحل کے بارے میں سوچنا کتنا محال تھا۔ محبت کا دل نما جزیرہ ZPU-4 گنیں' فرانسیسی راکٹ' آدم خوروں سے ہتھ جوڑی' یہ سب باتیں اس وقت وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں مگر آج یہ سب کچھ حقیقت کے قالب میں ڈھل کر نگاہوں کے سامنے تھا اور ابھی معلوم نہیں کہ کیا کچھ سامنے آنا تھا۔ زندگی کی یہی نیرنگی اسے بھیانک بھی بناتی ہے اور خوب صورت بھی۔

تناؤ کی کیفیت پورے جہاز پر محسوس کی جا رہی تھی۔ مسلح افراد کے درمیان ہنسی مذاق کا سلسلہ موقوف ہوگیا تھا۔ ہتھیار چیک کیے جا رہے تھے اور میگزین وغیرہ بھرے جا رہے تھے۔ مائیکل اور چند سرکردہ افراد کے علاوہ اصل صورتِ

حال کسی کو معلوم نہیں تھی' لہٰذا ایک بے یقینی کی سی کیفیت تھی اور سب ایک دوسرے سے سوالیہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یقیناً دوسری طرف ایرانی جہاز "اے ٹو" پر بھی اسی قسم کی صورتِ حال تھی۔ عرشے پر چند افراد ہی نظر آ رہے تھے' باقی اپنی پوزیشنوں پر تھے۔ اسی دوران میں بند کمرے کے اندر مذاکرات کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

یہ مذاکرات سہ پہر تین بجے کے قریب شروع ہوئے تھے۔ ان کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا اور رات کے آٹھ بج گئے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ ٹام کے ساتھ میرے "مقابلے" کا پروگرام آج دھرے کا دھرا رہ گیا ہے۔ اس سنگین معاملے نے تمام افراد کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ چند کڑی شرائط کے حوالے سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں۔ ان طویل مذاکرات کے دوران میں سات بجے کے لگ بھگ ایرانی جہاز کا چیف انجینئر سنجیدہ صورت لیے باہر آیا اور عرشے کے ایک گوشے میں کھڑا ہوکر واکی ٹاکی پر دیر تک بات کرتا رہا۔ ایک مرتبہ ہرکولیس کے اسٹور انچارج کو بھی میٹنگ میں بلایا گیا' غالباً اس سے "فیول" وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی گئی تھیں۔

یہ طویل بات چیت رات نو بجے سے تھوڑی دیر قبل اختتام پذیر ہوئی "شرکائے کانفرنس" کے چہرے دیکھ کر سب نے اطمینان کی سانس لی۔ ان کے چہرے واشگاف اعلان کر رہے تھے کہ بالآخر معاملات طے ہوگئے ہیں۔ مارکوس کے لٹکے ہوئے چہرے پر مسرت کی چمک تھی۔ مائیکل بھی مسکرا رہا تھا۔ سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ فریزر میں رکھی ہوئی شراب کی ٹھنڈی بوتلیں کھل گئیں۔ بکری اور سؤر کا تلا ہوا گوشت سرو کیا جانے لگا۔ سب لوگ ریلیکس نظر آنے لگے تھے۔

جن شرائط پر معاملہ طے ہوا تھا وہ ہمیں معلوم نہیں ہیں' صرف اتنا پتا چلا کہ ہرکولیس سے فیول کے ایک درجن ایم نما کنٹینرز ایرانی جہاز اے ٹو پر پہنچائے جا رہے ہیں۔ سب لوگوں کی طرح پروفیسر اللہ دتا کے چہرے پر بھی اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ اسے اپنی جان کی مطلق پروا نہیں تھی۔ اس کی جان اپنے جسم میں تھی ہی کہاں' وہ تو شائستہ کے بدن میں تھی۔ وہ اب تک یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہا تھا کہ اگر ایرانی جہازوں نے ایک دوسرے پر واقعی بھرپور ہلّا بول دیا تو شائستہ کا کیا ہوگا۔ صبح سے اب تک اس کی انگلیاں تسبیح پر مسلسل گردش کرتی رہی تھیں اور گاہے گاہے اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگتی تھی۔

وہ بولا "خدا نے بڑا کرم کیا ہے۔ اگر یہ بدمعاش آپس میں لڑ پڑتے تو بڑا نقصان ہوتا۔ چاروں طرف سمندر ہے۔ تباہی کی صورت میں ڈوبنے کے سوا کیا چارہ رہ جاتا تھا۔ اور شائستہ بے چاری کو تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ وہ بڑا ڈرتی ہے پانی سے۔" بات کرتے کرتے وہ ایک دم جیسے ماضی میں کھو گیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولا "ایک مرتبہ میں نے اسے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں غوطہ دے دیا تھا۔ وہ بہت چھوئی سی تھی۔ چیخ کر مجھ سے چمٹ گئی تھی اور پھر کئی روز تک پانی سے ڈرتی رہی تھی۔ منہ ہاتھ تک نہیں دھوتی تھی۔ وہ اب بھی ویسی ہی ہے۔ دلیر نظر آنے کی کوشش کرتی ہے مگر اندر سے بہت کمزور دل کی ہے۔"

"وہ آج سارا دن بھی دکھائی نہیں دی؟" میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"نہیں۔ آج بھی کھڑکی بند ہی رہی ہے۔ سہ پہر کے وقت میں اس کا پوچھنے گیا تھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ اسے کل سے بخار ہے۔ دوا کھا کر سوئی ہوئی ہے۔"

جس وقت میں اور پروفیسر باتیں کر رہے تھے' عملے کے کئی افراد نچلے عرشے پر جمع ہوگئے۔ وہ ایک بڑی بوٹ سمندر میں اتارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مخصوص چرخیوں اور رسوں کے ذریعے پہلے بوٹ کو ہوا میں معلق کیا گیا پھر آہستہ آہستہ سمندر کی سطح پر اتار دیا گیا۔ اس بوٹ کو سمندر میں اتارنے کی وجہ کچھ دیر بعد سمجھ میں آئی۔ بارہ عدد "فیول کنٹینرز" کشتی میں اتارے گئے۔ ڈیزل سے بھرے ہوئے یہ کنٹینرز عام ڈرموں سے سائز میں قریباً ڈیڑھ گنا تھے اور ان پر سفید رنگ پھیرا گیا تھا۔ اندازے کے مطابق ان ڈرموں میں قریباً چار ہزار لٹر ڈیزل موجود تھا۔ یہ وہی ڈیزل تھا جو معاہدے کی شرائط کے مطابق ہرکولیس نے ایرانی جہاز کو دینا تھا تاکہ وہ ایرانی ساحل کی طرف اپنی واپسی کا سفر جاری رکھ سکے۔ اس کے علاوہ جو کچھ طے ہوا تھا۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ یقیناً نقد رقم کے علاوہ کچھ تحفے تحائف بھی مارکوس اور اس کے ساتھیوں نے حاصل کیے تھے۔

بڑے سائز کی اس بوٹ میں انجن کی سہولت موجود تھی یا شاید عارضی طور پر بوٹ سے انجن اٹیچ کیا گیا تھا۔ آٹھ دس منٹ میں بوٹ اے ٹو تک پہنچ گئی اور اس میں سے ڈیزل ان لوڈ کرکے اوپر "اے ٹو" کے عرشے پر پہنچا دیا گیا۔ چاندنی میں یہ سارا منظر دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے دوربین سے دیکھا۔ ایرانی جہاز کے بہت سے ارکان عرشے پر جمع تھے۔ ہرکولیس کی طرح اے ٹو پر بھی خوشی کی لہر محسوس ہو رہی

تھی۔ اسی دوران میں مائیکل، مارکوس اور ان کے ساتھی ڈنر سے فارغ ہو کر باہر نکل آئے۔ شراب نوشی کے سبب ان سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ عرشے پر کھڑے ہو کر ان سب نے اپنے جام ٹکرائے اور پینے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے دوربین کی مدد سے دیکھا۔ اے ٹو کے عملے نے دونوں تباہ کن راکٹ اب پیچھے ہٹا لیے تھے۔ ہرکولیس کے برج کے پاس کچھ افراد نے آتش بازی شروع کر دی۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹیں اور فضا میں روشنی کے پھول سے بکھر گئے۔ درحقیقت ایرانی جہاز کی آمد کی وجہ سے ہرکولیس پر ایسٹر کا تہوار ادھورا رہ گیا تھا۔ دو روز پہلے ایسٹر نائٹ کی تقریب اپنے عروج پر تھی جب "اے ٹو" کی آمد پر خطرے کی گھنٹیاں بجی تھیں اور سب "حالت جنگ" میں آ گئے تھے۔ اب صورت حال بہتر ہوئی تھی تو ہرکولیس کے عملے کو گزرے ہوئے تہوار کا خیال آ گیا تھا۔ آتش بازی کا یہ سامان بھی تہوار ہی کے لیے جمع کیا گیا تھا جو اب استعمال ہو رہا تھا۔ فضا میں ہر طرف پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں اور رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ یہ بڑا دلکش منظر تھا۔ جہاز کے سارے لوگ اس حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے عرشے پر جمع ہو گئے۔ "اے ٹو" کے عرشے پر بھی ازدحام نظر آنے لگا۔ آتش بازی کی تڑ تڑاہٹ فضا میں گونجتی اور جہازوں پر روشنی کے جھماکوں کا عکس نظر آتا تو سماں بندھ جاتا۔ جب "فائرورک" کے ذریعے آسمان پر کوئی زبردست قسم کا نمونہ بنتا تو دونوں جہازوں کے جہازی فلک شگاف نعرے لگاتے۔ اے ٹو قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر تھا، اس کے باوجود وہاں بلند ہونے والی آوازوں کی صدا ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ہرکولیس کے قریباً تمام آزاد افراد آتش بازی دیکھنے کے لیے عرشے پر پہنچ گئے تھے، مگر شائستہ اب بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں فکر لاحق ہو گئی۔ اسی اثناء میں مجھے پروفیسر اللہ دتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ اداس نظر آ رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں چلتا میرے پاس آ گیا۔

میں نے پوچھا "شائستہ کا کچھ پتا چلا؟"

وہ بولا "شائستہ جہاز میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"وہ ایرانی جہاز میں ہے۔" پروفیسر نے انکشاف کیا "اسے دو دوسرے لوگوں کے ساتھ ایرانی جہاز میں بھیجا گیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ تمہارا مطلب ہے کہ وہ ضمانت کے طور پر ایرانی جہاز میں ہے؟"

"ہاں۔" پروفیسر کے چہرے پر دکھ کا سایہ لہرا گیا "اس سے تم مائیکل کی فطرت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ ایک طرف وہ شائستہ کو "پیاری بیوی" کی حیثیت دیتا ہے، دوسری طرف مطلب بر آری کے لیے اسے مارکوس کی بیوی کے پاس ایرانی جہاز میں بھیج دیا ہے۔ مارکوس نے شرط رکھی تھی کہ وہ ہرکولیس میں اسی صورت آئے گا جب مائیکل اپنی بیوی اور دو قریبی ساتھیوں کو ایرانی جہاز میں بھیجے گا۔ مائیکل نے شائستہ کے علاوہ اپنے ایک چچا زاد بھائی اور ایک قریبی دوست کو "اے ٹو" پر بھیجا تھا۔"

واقعی یہ مطلب پرستی کی ایک "شاندار" مثال تھی۔ بظاہر تو وہ لوگ سیر سپاٹے کے لیے اے ٹو پر گئے تھے مگر حقیقت اے ٹو والوں کو معلوم تھی اور سیاہ فاموں کو بھی۔ وہ لوگ ضمانت کے طور پر وہاں جمع تھے۔ اگر یہاں مارکوس اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کوئی ناروا سلوک ہوتا تو ان ضمانتیوں کی جان فوراً عذاب میں آ جاتی۔

پروفیسر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شکر ہے خدا کا، یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اگر لڑائی کی نوبت آ جاتی یا کوئی اور گڑبڑ ہو جاتی تو ان تینوں کے لیے سخت مشکل کھڑی ہو جاتی تھی۔"

"کب واپس آ رہی ہے شائستہ؟" میں نے پوچھا۔

"آرتھر نے بتایا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں مارکوس اور اس کے ساتھی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وقت شائستہ اور مائیکل کے دونوں ساتھی ایرانی جہاز سے چل پڑیں گے۔ یوں دونوں طرف کے افراد کا تبادلہ ہو جائے گا۔"

اچانک میری نظر مائیکل پر پڑی، وہ مارکوس کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نچلے عرشے پر جا رہا تھا۔ دونوں جہازوں کے وائس کیپٹن بھی ساتھ تھے۔ مائیکل کے چہرے پر مجھے عجیب سی چمک نظر آئی۔ یہ وہی چمک تھی جو اس سوٹڈ بوٹڈ آدم خور کو عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ میں پروفیسر کو وہیں چھوڑ کر مائیکل وغیرہ کے پیچھے گیا۔ نچلے عرشے کے نیچے وہ جگہ تھی جہاں ZPU-4 گنیں موجود تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ تینوں گنوں کو پہیوں پر چلا کر ایسی جگہ لا کر کھڑا کیا گیا تھا جہاں سے وہ براہ راست "اے ٹو" کے پورے عرشے کو نشانہ بنا سکتی تھیں۔ گنوں کے پیچھے گن مین موجود تھے اور بالکل تیار حالت میں تھے۔ پروٹیکٹیو شیلڈز (حفاظتی آہنی چادروں) کے پیچھے یوں بیٹھے تھے جیسے ایک اشارے پر فائر کھول دیں گے۔

مارکوس اور "اے ٹو" کا نائب کپتان دونوں یہ منظر دیکھ

کر حیران نظر آنے لگے تھے۔ مجھ پر ابھی تک کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ میں تیزی سے حرکت کر کے ایک چوکور ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہاں تاریکی تھی، جب تک کوئی میرے بالکل پاس سے نہ گزرتا مجھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ لوگ چونکہ روشنی میں تھے لہٰذا میں انہیں بہ آسانی دیکھ رہا تھا۔

مائیکل کے چہرے پر نظر آنے والی حیوانی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ مارکوس سے مخاطب ہو کر بے حد گمبھیر لہجے میں بولا۔

"مارکوس! یہ لو اپنا دا کی ٹاکی۔"

"اس کو کیا کروں۔" مارکوس نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

"اپنے کپتان صاحب کو کال کرو۔ اسے کہو کہ "اے ٹو" کو ہرکولیس کے پاس لایا جائے۔"

"وہ کس لیے؟" نائب کپتان نے پوچھا۔

"اے ٹو پر موجود تمام افراد ہرکولیس پر آئیں گے۔"

"وہ کس لیے؟" مارکوس نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"خوشی منانے کے لیے۔ ناچنے گانے کے لیے، یہ ایسٹر کا موقع ہے بھئی۔"

"بات کیا ہے؟" مارکوس نے مائیکل کو تیز نظروں سے گھورا "تم۔ کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے ہو۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ سب تو معاہدے میں شامل نہیں۔"

"تو اب شامل کر لیتے ہیں۔" مائیکل کے چہرے پر درندگی کی چمک نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

"تو تم معاہدہ ختم کر رہے ہو۔" مارکوس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اے ٹو کے لوگ بھی ہمارے جہاز پر آ جائیں اور ہم مل کر اس صلح نامے کی خوشی منا سکیں۔" مائیکل کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو۔؟"

مائیکل نے اسٹینڈ پر لگی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگا کر "اے ٹو" کا جائزہ لیا پھر مارکوس سے مخاطب ہو کر بولا "اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں صرف پانچ سیکنڈ کے اندر تمہارے اس لعنتی "اے ٹو" کو آگ کا گولا بنا دوں گا۔ اے ٹو کے نام پر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ تم نے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" نائب کپتان چیخا۔

"میری بات مکمل ہونے دو۔" مائیکل گرجا، پھر اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور قدرے پُرسکون ہوتے ہوئے بولا "تم نے جو ڈیزل حاصل کیا ہے وہ سارے کا سارا ابھی تک عرشے پر پڑا ہے۔ تم دوربین سے وہ سفید کنٹینر بہ آسانی دیکھ سکتے ہو۔ تمہارے جہاز کے تمام افراد بھی اس وقت عرشے پر موجود ہیں۔ یہ تین گنیں بارود کی بارش کریں گی تو صرف دو سیکنڈ کے اندر سب کچھ جہنم بن جائے گا۔ اس جہنم کے اندر تمہارے وہ دو منحوس راکٹ بھی بلاسٹ ہوں گے، تنکا تنکا ہو جائے گا تمہارا یہ حرامی اے ٹو۔"

"ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔" مارکوس مہیب آواز میں بولا "ان تنکوں کے ساتھ تمہاری بیوی اور دونوں ساتھیوں کے ٹکڑے بھی بکھریں گے۔"

"مجھے پروا نہیں ہے۔" مائیکل نے عجیب خوفناک آواز میں کہا۔ ان لمحوں میں اس کے سفید دانت ہونٹوں سے جھانکنے لگے تھے۔ اس کا چہرہ انسان سے زیادہ حیوان کا دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا مطلب، تمہیں اپنی بیوی کی پروا نہیں ہے؟"

مائیکل مسکرایا "تم بہت بڑے دھوکے باز ہو مارکوس! لیکن یہاں تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ جو تین افراد اس جہاز سے تمہارے جہاز پر گئے ہیں، ان میں سے کسی کے جینے مرنے سے مجھے غرض نہیں۔ اگر تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے مجھے تمہارے جہاز پر حملہ کرنا پڑتا ہے اور اس حملے میں وہ تینوں بھی مرتے ہیں تو مجھے مطلق پروا نہیں۔ لہٰذا تمہارا یہ اہم ترین کارا ضائع ہو چکا ہے۔"

"تم۔ تم بکواس کر رہے ہو۔" مارکوس دانت پیس کر بولا۔

"میں تمہیں سچ سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور سچ یہی ہے موٹے بیل! کہ تم جیسے چند کو تاوان دینے سے بہتر ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت سمندر میں ڈوب مروں۔ بہت جلد تمہیں پتا چل جائے گا کہ تم نے ہمیں انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے، اور اس غلطی کی سزا میں، تمہیں اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال اتار کر اس میں بھس بھرنا پڑے گا۔ ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر تم اپنے دستِ مبارک سے خود کو حنوط کرو گے۔" مائیکل کی آواز خوفناک سے خوفناک ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"تم تباہی کے راستے پر چل رہے ہو۔" نائب کپتان نے کہا۔

"ہاں یہ تباہی کا راستہ ہے، لیکن یہ صرف تمہاری تباہی ہے۔ تم ان اجنبی ائر کرافٹ گنوں کی مار سے واقف نہیں ہو۔ سمجھو ان تین "گن مینوں" میں سے کسی ایک کی انگلی کا دباؤ بھی ٹریگر پر بڑھ گیا تو "اے ٹو" ناپید ہو جائے گا، چار ہزار لٹر

ڈیزل آگ کا دریا بن جائے گا۔"

میں نے پہلی بار ہاتھی نما مارکوس کے چہرے پر غصے کے علاوہ پریشانی کے آثار بھی دیکھے۔ تینوں گن مین حبشی تھے۔ وہ کمانڈوز کے مخصوص لباس میں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انگلش میں ہونے والی یہ گفتگو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے' تاہم ان کے سیاہ چمکیلے چہروں کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ صورت حال کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ ہیں' اور مائیکل کے صرف ایک اشارے پر "اے ٹو" پر حملہ کردیں گے۔

مائیکل نے مارکوس کی آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "پیارے! تمہارے سامنے اب راستے دو ہی ہیں۔ پہلا راستہ سلامتی کا ہے۔ اس میں تمہارے تمام ساتھی بچ جائیں گے' جن میں تمہاری بیوی بھی شامل ہے۔ تم خود بھی محفوظ رہو گے۔ بے شک تم لوگوں کو آزادی میسر نہیں ہوگی مگر زندگی تو میسر ہوگی اور ہوسکتا ہے کسی وقت آزادی بھی میسر آجائے۔ کوئی آقا تم کو آزاد کردے' تم اپنی عیاری سے آزادی چھیننے میں کامیاب ہوجاؤ یا ایسا ہی کچھ اور ہوجائے' زندگی ہو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے میرے موٹے بیل۔۔۔ دوسرا راستہ واقعی تباہی کا ہے۔ میں بس تھوڑی دیر اور انتظار کروں گا' اس کے بعد تمہارے اس حرامی "اے ٹو" کو آگ کا گولا بنادوں گا۔ یقیناً اس میں میرا نقصان ہوگا۔ قریباً چالیس عدد بڑے ہاتھ سے نکل جائیں گے' اس کے علاوہ ایک قیمتی جہاز سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے' مگر تمہیں یادگار سبق تو مل جائے گا۔ اس سبق کے بعد جو سزا تمہیں ملے گی وہ بھی اپنی مثال آپ ہوگی۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال کون اتارتا ہے؟ لیکن تمہیں اتارنا پڑے گی۔"

"تم۔۔۔ کچھ بھی کرلو' لیکن اے ٹو کے لوگ اس جہاز پر نہیں آئیں گے۔" مارکوس نے لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ کہا۔

"اگر وہ یہاں نہیں آئیں گے تو پھر اوپر جائیں گے۔ یہ لو واکی ٹاکی۔۔۔ میں تمہیں آخری بار ان سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" مائیکل نے کہا۔

مارکوس نے واکی ٹاکی ایک طرف پھینک دیا۔ نائب کپتان نے بڑی پھرتی سے اپنا آٹومیٹک ریوالور نکالنا چاہا مگر مائیکل کے گارڈ نے اسے عقب سے دبوچ لیا اور یوں اپنے شکنجے میں کسا کہ اس کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہا' فربہ اندام مارکوس نے گارڈ کی رائفل پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی مگر مائیکل نے اسے اڑنگا لگا کر اوندھے منہ گرادیا۔ وہ ہاتھی کا ہاتھی یوں گرا کہ پورا فرش تھرا کر رہ گیا۔ مائیکل نے اس کی پشت پر گھٹنا رکھا اور اس کے دونوں بازو موڑ کر پشت سے لگا دیئے۔

"میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں۔" مائیکل نے گرج کر کہا۔

"تمہیں پچھتانا پڑے گا۔" مارکوس نے کراہتے ہوئے جواب دیا "وہ لوگ ٹیلی اسکوپ سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں انہیں پچھتاوے سے بچالیتا ہوں۔" مائیکل نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ آتش بازی کے روشن جھماکوں کا عکس مائیکل کے چہرے پر تھا۔ سفید دانت چمک رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے انسانی کندھوں پر کسی آدم خور درندے کا چہرہ رکھا ہو۔

"فائر کرو!" اس نے چیخ کر حکم دیا۔

میرا پورا جسم جیسے سکتے کی زد میں آگیا۔ میرا دل چاہا کہ میرے کئی ہاتھ ہوں اور میں ان تمام ہاتھوں سے گن مینوں کو دبوچ لوں۔ اس بارود کا راستہ روک لوں جو ایرانی جہاز پر موت بن کر برسنے والا تھا لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ مائیکل کی زبان سے وہ لفظ ادا ہوچکے تھے جنہوں نے ایرانی جہاز اور اس کے سواروں کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا' وہ سوار جو جہاز کے عرشے پر بڑی دلچسپی سے آتش بازی دیکھ رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے' تالیاں پیٹ رہے تھے۔

ابھی میں بمشکل چوکور ستون کی اوٹ سے نکلا ہی تھا کہ ZPU-4 کے خوفناک قہقہوں سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ تینوں ہیوی گنوں نے ایک ساتھ آگ اگلنا شروع کی تھی موت بانٹنے والی سیکڑوں روشن لکیریں تڑپ کر ایرانی جہاز کی طرف گئیں۔ ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے "ہرکولیس" کی مسرت میں شامل ہونے کے لیے "اے ٹو" والوں نے بھی آتش بازی شروع کردی ہے۔ یہ آتش بازی تو تھی مگر وہ آتش بازی تھی جس کے بعد بین کیے جاتے ہیں' گریبان پھاڑے جاتے ہیں اور سروں میں خاک ڈالی جاتی ہے۔ صرف چند سیکنڈ اور اس کے بعد ایک ایسا دھماکا ہوا جس کی چکاچوند نے آنکھیں خیرہ کردیں۔ آگ کا ایک بہت بڑا ستون اے ٹو کے عرشے سے بلند ہوا اور اس نے پھیل کر پورے جہاز کو اپنے اندر چھپالیا۔ اس منظر کی اصل شدت اور ہیبت کو بیان کرنا شاید لفظوں میں ممکن نہ ہو۔ درجنوں جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے انسان دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے مہیب شعلوں میں گھر گئے تھے اور پھر چند لمحے بعد ایک سیکنڈ کے وقفے سے یکے بعد دیگرے دو ساعت شکن دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں کی روشنی ہرکولیس

تک پہنچی۔ میں بے اختیار نیچے جھک گیا۔ چند لمحے بعد میں نے دیکھا' آسمان سے جیسے شعلوں کی بارش ہورہی تھی۔ یہ "اے ٹو" کے جلتے ہوئے ٹکڑے تھے۔ دونوں راکٹ جہاز کے اندر ہی پھٹ گئے تھے اور انہوں نے "اے ٹو" کی دھجیاں اڑادی تھیں۔ مارکوس' مائیکل کے نیچے اوندھا پڑا ہوا دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت "اے ٹو" کے نائب کپتان کی تھی۔ میں دوڑتا ہوا پہلے عرشے پر پہنچا۔ کچھ دیر پہلے جو لوگ ہرکولیس پر گا بجا رہے تھے وہ سکتے کی سی حالت میں "اے ٹو" کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اے ٹو اب ملبے کے بہت سے جلتے ہوئے ٹکڑوں کا نام تھا۔ یہ چھوٹے بڑے ٹکڑے خلیج عدن کے تاریک پانی میں قریباً سو مربع میٹر کے رقبے میں بکھرے ہوئے تھے۔ ایرانی جہاز کا ایک حصہ ٹوٹ کر پہلو کے بل پانی پر تیر رہا تھا۔ اسے بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سرخ رنگ کے کسی مگرمچھ نے پانی سے منہ نکال رکھا ہو۔

ہرکولیس کے انجن اسٹارٹ ہوچکے تھے پھر وہ حرکت میں آیا اور تیزی سے جائے وقوع کی طرف بڑھنے لگا۔ دو منٹ سے بھی کم وقفے میں ہم جلتے ہوئے جہاز کے ٹکڑوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ دفعتاً میرا دھیان شائستہ کی طرف چلا گیا۔ دل پر گھونسا سا لگا۔ پروفیسر کی لاڈلی بیٹی' من موہنی صورت والی شائستہ بھی اسی بدنصیب جہاز پر سوار تھی۔ نجانے اس پر کیا گزری تھی اور جہاز کو تباہ ہوتے دیکھ کر پروفیسر پر کیا گزری تھی۔ میں عرشے پر پروفیسر کو تلاش کرنے لگا اور آوازیں دینے لگا۔ عرشے پر ہر طرف افراتفری نظر آرہی تھی۔ "بو" کی طرف کچھ سیاہ فام ہتھیار لہرا لہرا کر فاتحانہ نعرے بلند کرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ "اے ٹو" پر سوار کئی افراد زندہ بچ گئے تھے اور پانی پر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ان میں سے کچھ پانی پر تیرنے والی مختلف اشیاء سے چمٹے ہوئے تھے اور مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ جلد ہی بڑے بڑے دو روشن دائرے پانی پر حرکت کرنے لگے۔ یہ وہ دیوہیکل سرچ لائٹس تھیں جو برج کے پاس لگی ہوئی تھیں۔ ہرکولیس کے پہلو سے رسی اور پائپ کی بنی ہوئی سیڑھیاں لٹکا دی گئیں۔ حبشی پہرے دار پھرتی سے نیچے اترنے لگے۔ یقیناً ان کی پھرتی انسانیت کے ناتے سے نہیں تھی' یہ ان کے کاروبار کے ناتے سے تھی۔ وہ انسانوں کو نہیں قیمتی سامان تجارت کو پانی سے نکالنے جارہے تھے۔ اچانک میری نگاہ جہاز کے عقبی حصے کی طرف اٹھ گئی۔ سرچ لائٹ کے متحرک دائرے میں مجھے صرف ایک سیکنڈ کے لیے پروفیسر اللہ دتا کی صورت نظر آئی

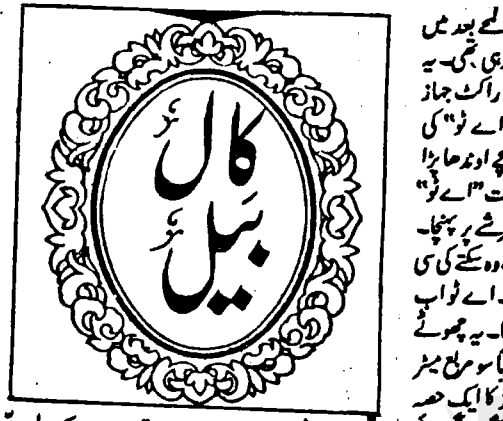

تھی۔ وہ پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ میں نے پروفیسر کو اس کے بالوں کی سفیدی اور قمیص کے رنگ سے پہچانا۔ پروفیسر کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور کڑی سے کڑی مل گئی۔ پروفیسر کا جذباتی پن میرے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ بیٹی کے ساتھ اس کی محبت ایک تند و تیز دھارے کی طرح تھی۔ یقیناً اس نے پانی میں شائستہ کو دیکھا تھا اور اس کو بچانے کے لیے دیوانہ وار کود پڑا تھا' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کودا پہلے ہو اور شائستہ پر اس کی نگاہ بعد میں پڑی ہو' بہرحال جو کچھ بھی تھا' وہ پانی کی زد میں تھا' اور عین ممکن تھا کہ شائستہ بھی اس کے ساتھ ہی مدد کے لیے چیخ چلا رہی ہو۔ وہی شائستہ جو پانی سے ڈرتی تھی۔ جو بچپن میں پانی میں غوطہ کھا کر باپ سے چمٹ گئی تھی' آج برسوں بعد اس نے پھر پانی میں غوطہ کھایا تھا لیکن آج وہ ٹب میں نہیں' سمندر میں ڈوبی تھی۔ سمندر جس کے سامنے اس کا کمزور باپ بے بس تھا' جس کے سامنے بڑے بڑے پیراک بے بس ہوجاتے ہیں۔ یہ سمندر جذباتی نہیں ہوتا' بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے اصول اور ضوابط ہوتے ہیں' ڈوبنے والا کتنا خوب صورت ہے' کتنا جوان ہے' اس کے اندر کس کس کی جان اٹکی ہوئی ہے' اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

مجھے لگا جیسے میرے کانوں میں معصوم صورت شائستہ کی چیخ گونجی ہے۔ پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت' بہرحال میرے دل کے اندر سے آواز ابھری کہ مجھے باپ بیٹی کی مدد کرنی ہے۔ میں دو پہرے داروں کو پیچھے ہٹا کر تیزی سے رسی کی سیڑھی کی طرف بڑھا' سیڑھی پر پہنچ کر چند STEP نیچے اترا پھر میں نے پانی میں چھلانگ لگادی۔

تاریک پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا میں اس سمت بڑھا جہاں مجھے پروفیسر اللہ دتا کی جھلک نظر آئی تھی۔ میرے اردگرد غوطے کھاتے ہوئے لوگوں کی چیخ و پکار تھی اور شعلوں کا رقص تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پانی کو آگ لگی ہوئی ہے۔ سرچ لائٹ کا روشن دائرہ میرے اوپر سے ہو کر گزرا۔ اس دائرے میں مجھے بہت سی چیزیں پانی پر تیرتی نظر آئیں۔ ملبے کے ٹکڑے' صوفوں کے کشن' شراب کی بوتلیں' ایرانی کوسٹ گارڈز کی ٹوپیاں اور جوتے وغیرہ اور اس کے ساتھ ساتھ کئی افراد بھی۔ ان میں سے کئی ایک کے چہرے زخمی تھے اور وہ "ہرکولیس" کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔ اچانک آگ کے شعلوں میں مجھے پروفیسر کی نیلی اور سفید قمیص کی جھلک نظر آئی۔ میں تیزی سے پروفیسر کی طرف بڑھا' میں پروفیسر کو تھامنا چاہتا تھا لیکن جو جسم میرے ساتھ چمٹا وہ بہت نازک اور گداز تھا۔ میں ایک لمحے میں جان گیا کہ یہ شائستہ تھی۔ وہ بری طرح غوطے کھا رہی تھی اور سہارا ملتے ہی کسی آکٹوپس کی طرح مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا اور پروفیسر کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہاتھ چلائے۔ پروفیسر آس پاس کہیں نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح چمکا کہ پروفیسر ڈوب گیا ہے۔ میں نے جب اسے دیکھا تھا' اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں مجھے صاف نظر آیا تھا کہ وہ بری طرح غوطے کھا رہا ہے۔

"پروفیسر۔ پروفیسر۔" میں نے چیخ کر کہا۔

میری پکار کا جواب نہیں آیا۔ اسی دوران میں سرچ لائٹ کا دائرہ حرکت کرتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ میں نے دیکھا' پروفیسر تیرتا ہوا جہاز کی سیڑھی کی طرف جا رہا تھا۔ یقیناً وہ تیرنا جانتا تھا' وہ صرف شائستہ کے بوجھ کی وجہ سے ڈوب رہا تھا۔ اب شائستہ کو میرا سہارا مل گیا تھا۔ پروفیسر اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے اپنی جان بچانے کی کوشش میں لگ گیا تھا۔ شائستہ کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں' یقیناً اس کے پیٹ میں پانی بھرا ہوا تھا۔ میں نے لائف گارڈز کے انداز میں ایک بازو شائستہ کی کمر میں ڈالا اور منہ آسمان کی طرف کر کے "بیک اسٹروک" کے ذریعے تیرنے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں جہاز کی ایک سیڑھی تک پہنچ گیا' ایک حبشی گارڈ نے شائستہ کو سہارا دیا اور اوپر کھینچ لیا۔ وہ نیم بے ہوش ہو رہی تھی' حبشی اسے کندھے پر لاد کر سیڑھی چڑھنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر پانی میں ڈبکی لگائی اور ایک ایسے شدید زخمی شخص کو پانی سے نکال لایا جو بس ڈوبنے ہی والا تھا۔

یہ ہنگامہ آدھ پون گھنٹا جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ اب سطح سمندر پر ملبے کے جلتے ہوئے ٹکڑوں اور بیکار اشیا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ صرف ایک گھنٹا پہلے یہاں ایک صحیح سالم "اے ٹو" نامی جہاز موجود تھا اور اس پر ایرانی کوسٹ گارڈز "خوشی" منا رہے تھے۔ سمندر سے زندہ نکالے جانے والوں میں دس مرد اور تین چار عورتیں تھیں۔ چھبیس کے قریب افراد "اے ٹو" کے ساتھ ہی چیتھڑوں میں بدل گئے تھے اور پانی میں غرق ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں مائیکل کا چچا زاد بھائی بوب اور اس کا دوست بھی شامل تھے۔ یعنی ضمانت کے طور پر جو تین افراد "ہرکولیس" سے ایرانی جہاز پر گئے تھے ان میں سے صرف شائستہ ہی زندہ بچ سکی تھی۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے تین افراد زخمی تھے۔ ان میں سے دو تو بری طرح جھلسے ہوئے تھے اور ان کا بچنا محال تھا۔ زندہ بچنے والوں میں فریبہ اندام مارکوس کی فربہ اندام بیوی بھی شامل تھی۔ اس گوری چٹی عورت کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے جسم پر گوشت اور چربی کی موٹی تہیں تھیں۔ ایرانی جہاز کے دیگر مسافروں کی طرح اس عورت کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ سکتے کی سی حالت میں تھی۔ زندہ بچ جانے والے اکثر افراد رو رہے تھے اور ان میں شائستہ بھی شامل تھی۔ وہ اپنے والد سے اسی طرح لپٹی ہوئی تھی کہ جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پروفیسر خود بھی ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ شائستہ کا کندھا زخمی ہوا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔

فربہ اندام مارکوس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ایرانی جہاز کی تباہی اور کھلے کی ہلاکت پر وہ نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی چنگھاڑیں پورے جہاز میں گونج رہی تھیں۔ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ یقیناً اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گولیوں سے اڑا دیتا۔ مائیکل کے حکم پر اس کے طاقت ور کارندوں نے مارکوس کو زمین پر گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہونٹوں پر ایک چوڑا ٹیپ لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ہچکیاں بھی کس دی گئیں۔ وہ عرشے کے فرش پر کسی وہیل مچھلی کی طرح تڑپنے مچلنے لگا۔ دو ہیکل حبشی محافظ اسے اٹھا کر اندرونی حصے میں لے گئے۔

مائیکل کی اداکاری بڑی زبردست تھی۔ اس کے چچا زاد بھائی بوب کی لاش کا بالائی حصہ سمندر سے مل گیا تھا۔ مائیکل کی ہدایت پر لاش کے اس حصے کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا

گیا تھا۔ مائیکل لاش کے سرہانے کھڑا تھا اور اس کے چہرے سے سوگواری بارش کی طرح برس رہی تھی۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل لاش کے پاس بیٹھ گیا' بڑے رقت آمیز انداز میں چادر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ اس کے سیاہ فام ساتھی لمبے لمبے منہ لٹکائے ساکت کھڑے تھے اور اپنے "باس" کے غم میں شریک ہونے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے باس کے چہرے پر صرف دکھاوے کی سوگواری ہے' نہ ہی انہوں نے اپنے باس کے منہ سے تھوڑی دیر پہلے ادا ہونے والے الفاظ سنے تھے۔ وہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ الفاظ صرف میں نے سنے تھے اور میں نے ہی سمجھے تھے۔ مائیکل نے جب ایرانی جہاز کو آگ کا گولا بنا دینے کی دھمکی دی تھی تو مارکوس نے کہا تھا' یہ مت بھولو مائیکل کہ اگر ایرانی جہاز تباہ ہوا تو اس میں موجود تمہارے تین ساتھیوں کے پرخچے بھی اڑیں گے۔ جواب میں مائیکل نے غیر انسانی قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا' مجھے ان میں سے کسی کی پروا نہیں۔۔۔ وہ میرے نزدیک بے حیثیت لوگ ہیں۔

اور ان "بے حیثیت" لوگوں میں مائیکل کا چچا زاد بھائی ہی نہیں اس کی شریکِ حیات شائستہ بھی تھی۔ اب وہی مائیکل چچا زاد بھائی کے سرہانے بے حد "سوگوار" کھڑا تھا پھر وہ شائستہ کی طرف بڑھا۔ شائستہ اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا اور دلاسا دینے لگا "بس جو کچھ ہوا شاید' اچانک ہو گیا۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ ہم نے ایرانی جہاز کو ایندھن دے دیا تھا' باقی شرائط بھی مان لی تھیں لیکن ان کی نیت میں فتور تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ جونہی انہوں نے دیکھا کہ ہم لوگ آتش بازی میں مصروف ہیں' انہوں نے چالاکی دکھائی اور اپنے دونوں راکٹ آگے لا کر ہماری گنوں کا نشانہ لے لیا' اس کے ساتھ ہی اندھا دھند فائرنگ بھی کر دی۔ جواب میں مجھے فائرنگ کا حکم دینا پڑا۔"

"میرا خیال ہے کہ جو ڈیزل ہم نے دیا تھا وہ ابھی عرشے پر ہی پڑا تھا' فائرنگ سے اس میں آگ بھڑک اٹھی۔" کپتان جم نے خیال ظاہر کیا۔

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ بعد میں "اے ٹو" کے دونوں راکٹ بھی پھٹ گئے۔" مائیکل نے کہا۔

مائیکل سفید جھوٹ بول رہا تھا اور اس بات سے صرف میں آگاہ تھا۔ مائیکل نے اپنی آن اور انا کے لیے معاہدے کی دھجیاں اُڑائی تھیں اور ایرانی جہاز کے ارکان کو یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے "اے ٹو" کے چیتھڑے اڑا ڈالے تھے۔ وہ صرف آدم خور ہی نہیں تھا' ایک نہایت سفاک اور منتقم المزاج شخص بھی تھا۔ اے ٹو کو دھماکے سے اُڑاتے وقت اس کی آنکھوں میں جو وحشیانہ چمک دکھائی دی تھی وہ ابھی تک مجھے یاد تھی۔ اس نے اے ٹو کے خلاف نہایت عیارانہ چال چلی تھی۔ پہلے اے ٹو والوں کے مطالبے پر اے ٹو کو ڈیزل بھیجا تھا اور جب ڈیزل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا تھا تو اپنی ZPU-4 گنوں کا رخ عرشے کی طرف کر دیا تھا۔ مائیکل کی اس چال نے اس کی پہلی چال کی یاد تازہ کر دی تھی جب وہ اے ٹو اور اس کے ساتھی جہاز کو اپنے جہاز کے پیچھے لگا کر اتھلے سمندر میں لے گیا تھا اور وہاں دونوں جہاز ریت میں پھنسا ڈالے تھے۔

اے ٹو کے زندہ بچ جانے والے افراد کو نیچے کیبنوں میں بند کر دیا گیا۔ زخمی افراد کی دیکھ بھال غزالہ کے سپرد ہوئی۔ اس کے بعد اے ٹو میں مرنے والے دونوں بیاہ فاموں کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ لاشوں کے چہروں کو مختلف رنگوں سے رنگا گیا۔ مائی گیت وغیرہ گائے گئے اور انہیں "سپردِ آب" کر دیا گیا۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں ہی صبح ہو گئی۔ یہ آگ اور خون سے رنگی ہوئی رات کی صبح تھی۔ مشرقی افق پر سرخ اُجالا نمودار ہوا اور پھر آہستہ آہستہ سورج نے اپنا سر ابھارا۔ ہمارا جہاز اب تک وہیں کھڑا تھا جہاں رات کو خونیں معرکہ ہوا تھا۔ سطحِ سمندر پر دور تک "اے ٹو" کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ ایک دو لاشیں بھی تیرتی نظر آئیں۔ تباہ شدہ "اے ٹو" کا قریباً چالیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا ایک بیضوی حصہ ابھی تک سمندر پر تیر رہا تھا۔ جہاز کے اس حصے پر ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا اور ایک مستول نما ٹوٹا ہوا پول بھی نظر آ رہا تھا۔ مائیکل کے حکم پر حبشی کارندے ایک کشتی پر بیٹھ کر اس ٹوٹے ہوئے حصے پر پہنچے' یہاں سے انہوں نے چند رائفلیں نکالیں' پھر دو اٹیچی کیس برآمد کیے۔ یقیناً ان میں بھی سامان وغیرہ بھرا ہو گا۔ اس کے بعد وہ لوگ ہر ایسی شے اکھاڑنے لگے جو تھوڑی بہت قیمت پر فروخت ہو سکتی تھی۔ لالچ سے ان لوگوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ پورے پورے لٹیرے نظر آ رہے تھے۔ کچھ حبشی ویسے ہی سمندر میں کود پڑے اور جہاز کے تیرتے ہوئے ٹکڑوں کا معائنہ کرنے لگے کہ کوئی "کار آمد" شے ضائع نہ ہو۔

مائیکل جہاز پر موجود تھا۔ میری نگاہ جب بھی اس کے

چہرے پر پڑتی تھی' نفرت کی ایک بلند لہر میرے سینے میں اٹھتی تھی۔ میں نے کل رات اس شخص کا ایک نہایت خطرناک اور سفاک روپ دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس سے بڑھ کر بھی سفاکی دکھا سکتا ہے۔ دوپہر کے وقت میں نیچے کمپارٹمنٹ میں پہنچا تو صفدر اور زریں وغیرہ کو سخت پریشان پایا اور یہی کیفیت دوسرے کیبنوں میں موجود قیدیوں کی تھی۔ انہوں نے رات کو پہلے پہرو خوفناک دھماکے سنے تھے اور اس کے علاوہ اینٹی ائرکرافٹ گنوں کی فائرنگ کی زوردار آوازیں بھی ان تک پہنچی تھیں۔ میں نے صفدر اور زریں کو مختصر الفاظ میں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں ڈوب کر سنتے رہے۔ مائیکل کی عیاری اور سفاکی کا سن کر وہ بھی سکتے میں رہ گئے۔ بہرحال میں نے صفدر اور زریں کو پابند کردیا کہ وہ یہ باتیں صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔

صفدر نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے عملے کے دو اٹالین افراد یہاں آئے تھے۔ ہمارے کیبن میں ایک پرانا رسّا پڑا ہوا تھا' وہ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے پوچھا' رسّے کا کیا کرنا ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ دو بدمعاشوں کو پھانسی دینی ہے۔ پھر خود ہی کہنے لگا' اس کو مذاق مت سمجھو۔ باس واقعی دو بندوں کو لٹکا رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ وہ بولا' تمہارے ہی جیسے بندے ہیں' ایک گردن اور دو ٹانگوں والے۔"

"اس وقت سے ام بہت پریشان ہے استاد صیب۔" زریں نے کہا "امارے دل میں بہت بڑا برا خیال آرہا ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ بڑے کمینے انداز میں ہنس بھی رہا تھا۔" زریں کے چہرے پر پریشانی تھی۔ وہ صرف شلوار پہنے صفدر کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "تم نے ایسا کون سا خاص جرم کیا ہے جس کی پاداش میں وہ تمہیں پھانسی دے دیں گے؟"

"ام کو اپنا نہیں آپ کا فکر ہے استاد صیب! ام تو اس کمرے میں بند ہے' ام نے کیا جرم کرنا ہے؟ آپ جہاز پر گھومتا رہتا ہے' ام کو فکر تھا کہ شاید آپ سے اور غزالہ بی بی سے کوئی غلطی ملطی نہ ہوگیا ہو۔"

"ہم سے پچھلے پندرہ برس میں کوئی غلطی نہیں ہوا تو اب کیوں ہوگا۔" میں نے زیرلب کہا۔

زریں نہیں سن سکا لیکن صفدر نے سن لیا اور مسکرانے لگا "آپ نے کیا فرمایا ہے استاد صیب؟" زریں نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ کیبن میں بند رہ رہ کر تم کچھ وہمی ہوگئے ہو۔"

"آپ سچ کہہ رہا ہے۔ کسی وقت تو یہ کیبن ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اور تو اور' کبھی کبھی ام کلثوم سے بھی جھگڑ پڑتا ہے۔"

"یہ تو واقعی اخبار میں چھپنے والی خبر ہے مگر یہ انہونی ہوئی کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ کلثوم سے لڑائی...؟"

وہ بولا "بس اس پر اماری خدمت کا بھوت سوار ہے۔ ہر وقت یہی رٹ لگائے رکھتا ہے' ام تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہے' بتاؤ ام کیا کرے۔ ام نے کئی بار سمجھایا' اللہ کا بندی' ام تم کو کیا بتائے۔ ام تو خود یہاں قیدی ہے' ذرا اونچی آواز میں بولے تو امارے سر پر ڈنڈا پڑتا ہے' ام تم سے کیا خدمت کرائے گا... اور خدمت کراتے ہوئے کیا اچھا لگے گا۔ وہ امارا ٹانگیں دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ام تمہارے جسم کا مالش کرے گا' تمہارے سر سے جوئیں نکالے گا۔ آپ ہی بتائیں' کیا اس کیبن میں سب کے سامنے یہ سارا کام ہوسکتا ہے؟"

"ہاں سارا کام تو واقعی سب کے سامنے نہیں ہوسکتا لیکن جتنا ہوسکتا ہے اتنا کرالیا کرو۔" میں نے کہا۔

"بس اس کے اندر چین نہیں ہے استاد صیب! ہر وقت یہی کہتا ہے' ام کو کوئی خدمت بتاؤ۔ کرنے کو کوئی کام بتاؤ۔" زریں نے جلے ہوئے لہجے میں کہا "ام نے آج اپنا قمیص پھاڑ کر اسے دے دیا' ام نے کہا کہ چلو کونے میں بیٹھ جاؤ اور سوئی دھاگے سے اسے سیو۔ جب یہ سل جائے گا تو ام اپنا شلوار پھاڑ کر دے دے گا' پھر اسے سیتی رہنا۔ بس اسی بات پر وہاں کونے میں منہ پھلائے ہوئے بیٹھا ہے۔" اب میری سمجھ میں آیا کہ زریں نے صرف شلوار کیوں پہن رکھی ہے۔

میں نے دیکھا' کلثوم واقعی ایک کونے میں گم صم بیٹھی تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے "کیا بات ہے کلثوم؟" میں نے پوچھا۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "ام ادھر نہیں رہتا۔ ام کو گھر بھیجو۔"

میں نے کہا "جاؤ بھئی زریں! تانگا لے کر آؤ' کلثوم اپنے میکے جائے گی۔"

صفدر نے کہا "یہ زریں بہت خوچل ہے شاہ جہاں صاحب' اسے پتا ہے کہ کلثوم اپنے میکے نہیں جاسکتی اور اس

جہاز میں سے تو میکے جانے کا کوئی رستہ ہی نہیں نکلتا اسی لیے تنگ کرتا ہے اسے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں میکے کا انتظام کردیتا ہوں۔" میں نے کہا "غزالہ کے اپارٹمنٹ کو کلثوم کا میکا قرار دے دیتے ہیں۔ میں ابھی کلثوم کو میکے بھجواتا ہوں۔ چلو کلثوم' تم اپنا سامان باندھ لو۔ میں تمہیں میکے چھوڑ آتا ہوں۔"

زریں ایک دم چونک گیا' پھر کلثوم کے پیچھے ہو کر مجھے اشارے کرنے لگا کہ میں ایسی بات نہ کروں۔ ورنہ کلثوم سچ مچ یہاں سے جانے کی ضد کرنے لگے گی۔

صفدر نے کہا "یہ کیا اشارے کررہے ہو۔ جو بات بھی کرنی ہے' کلثوم کے سامنے آکر کرو۔" زریں بوکھلا گیا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ صفدر نے کہا "اب ہاتھ کیوں جوڑ رہے ہو۔ اوپر سے ببر شیر بنتے ہو' اندر سے بھیگی بلی ہو۔"

زریں کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ کلثوم نے گھبرا کر کہا "کہاں ہے شیر؟"

میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں تھا' اب بلی بن کر بھاگ گیا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ زریں گل بھی اسی طرح بھاگ جائے گا۔ نہیں بھاگے گا تو ہم بھگائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد میں عرشے پر گیا تو وہاں واقعی پھانسی گھاٹ کا منظر نظر آیا۔ جہاز کے دو پولوں پر ایک موٹی سی ولی (لکڑی) افقی رخ پر رکھ دی گئی تھی۔ اس ولی کے ساتھ ایک پھندا جھول رہا تھا۔ غالباً یہ وہی رسّا تھا جو صبح کے وقت نیچے کیبن سے لایا گیا تھا۔ اس عارضی پھانسی گھاٹ کے اردگرد بہت سے افراد جمع تھے اور مزید جمع ہورہے تھے۔

یہاں میری نگاہ انورادھا عرف انو پر پڑی' وہی حسین مگر سیدھی سادی دیہاتن لڑکی جو دیگر دو لڑکیوں کے ساتھ بمبئی سے آئی تھی۔ دو روز پیشتر وہ فریہ اندام مارکوس کی رات کو رنگین بنانے کے لیے اس کے پاس بھیجی گئی تھی۔ آج وہ اپنے آقاؤں کی سفاکی کا ایک اور مظاہرہ دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھی۔

پروفیسر اللہ دتا بھی مجھے ایک گوشے میں بیٹھا نظر آیا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا تو اس نے بتایا "ایرانی جہاز سے پکڑے جانے والے دو افراد کو لٹکایا جارہا ہے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"میرا خیال ہے کہ موٹا مارکوس اور ایرانی جہاز کا نائب کپتان جمشید ہیں۔ ان پر ہیرکولیس کے نائب کپتان فلیمنگ اور دیگر دو افراد کو قتل کرنے کا الزام ہے۔"

"لیکن یہ افراد تو دو طرفہ فائرنگ میں مارے گئے تھے!"

"مائیکل کا کہنا ہے کہ اس فائرنگ کی شروعات ایرانی جہاز کے حملے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے مارکوس اور جمشید ان ہلاکتوں کے ذمے دار ہیں۔"

اچانک چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ میں نے دیکھا کہ مائیکل اپنے لگژری اپارٹمنٹ کی طرف سے برآمد ہوا۔ کوئی عورت اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی اور واویلا کررہی تھی۔ یہ وہی سرخ و سپید صحت مند عورت تھی جو ایرانی جہاز سے پکڑی گئی تھی اور جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ مارکوس کی بیوی ہے۔ یہ عورت اب چیخ چیخ کر مائیکل سے رحم کی درخواست کررہی تھی۔ یقیناً اس کی یہ درخواست اپنے شوہر مارکوس کے لیے تھی۔

وہ انگلش میں بول رہی تھی "مارکوس بے قصور ہے۔ اگر کپتان کی مرضی شامل نہ ہوتی تو حملہ کیسے ہوتا۔ حملہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" اس کے علاوہ بھی خبر نہیں وہ کیا کچھ کہہ رہی تھی لیکن مائیکل نے اپنے کان جیسے بند کر رکھے تھے۔

مائیکل نے اپنے دوسرے پاؤں کی ٹھوکر سے فربہ اندام عورت کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ پھر روتی ہوئی مائیکل کے قدموں سے چمٹ گئی۔ مائیکل نے حبشی کارندوں کو اشارہ کیا' وہ فربہ اندام عورت کو بازوؤں اور بالوں سے کھینچتے ہوئے پیچھے لے گئے۔ وہ اب بھی مائیکل کو خدا اور یسوع مسیح کے واسطے دے رہی تھی۔ حبشی پہرے داروں نے اس کے منہ پر چوڑا ٹیپ چپکا کر اس کی بولتی بند کردی۔ عرشے پر ایک طرف تین چار قطاروں میں کرسیاں رکھی تھیں۔ مائیکل... کپتان جم' نائب کپتان آرتھر اور دیگر سرکردہ افراد اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ یہ درندہ صفت لوگ تھے اور درندگی کا مظاہرہ ان کے لیے دلچسپ تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مائیکل کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے مجھے بھی اپنے پاس بلا کر بٹھالیا۔

"کیا اس سزا کا سرعام مظاہرہ ضروری تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں' اس میں کیا برائی ہے۔ مرنے والا تو مرے گا ہی' دیکھنے والوں کی تفریح مفت میں ہوجائے گی۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اس تفریح کو خواتین بھی دیکھیں گی' جن میں تمہاری "پیاری" بیوی شائستہ بھی ہے۔ اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا۔"

"اچھا اثر ہی پڑے گا۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس کا خاوند کوئی کمزور شخص نہیں ہے۔ وہ اپنے مجرم کا پنجہ موڑنے کی

طاقت رکھتا ہے اور اسے عبرت ناک سزا بھی دے سکتا ہے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ سفاکی کے اس مظاہرے سے دوسروں پر تمہاری ہیبت طاری ہوگی جن میں تمہاری مبینہ بیوی بھی شامل ہے۔"

"یہ تمہاری اپنی سوچ ہے جو سراسر غلط ہے۔" مائیکل نے کہا "مجھے شاستے کا پورا پورا خیال ہے اور میں اس کی رائے کا احترام بھی کرتا ہوں۔ شاید تم یقین نہ کرو مگر یہ حقیقت ہے کہ شاستے ہی کے کہنے پر میں ان دونوں افراد کو پھانسی دے رہا ہوں' ورنہ میں نے تو ان کے لیے ایسی سزا سوچی تھی کہ قیامت تک ان کی روحیں چیختی چلاتی رہتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ دونوں بدبخت اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال اتارنے پر مجبور ہوجاتے۔ تین سی سی کا صرف ایک ایک انجکشن ان دونوں کو لگایا جاتا اور یہ خود کو کھجا کھجا کر اپنی چمڑی ادھیڑ ڈالتے۔ خود کو کھجاتے چلے جاتے' یہاں تک کہ مرجاتے۔"

میں لرز کر رہ گیا۔ اس بدنام زمانہ کیمیائی مرکب کے بارے میں' میں نے بھی سن رکھا تھا۔ اس مرکب کو اگر کسی طرح انسانی جسم میں داخل کردیا جائے تو پوری جلد میں نہایت شدید قسم کی خارش شروع ہوجاتی ہے اور انسان خود کو اتنا کھجاتا ہے کہ اپنی جان تک لے لیتا ہے۔

"بہت خوب۔" میں نے کہا "خود کو رحم دل ثابت کرنے کی یہ مثالی دلیل ہے۔ میں تمہاری ذہانت کا معترف ہوگیا ہوں۔"

"معترف تو ابھی تمہیں بہت سی باتوں کا ہونا ہے ڈیئر! آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔"

اسی دوران میں دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ میں نے دیکھا ایک جانب سے دونوں مجرمان برآمد ہورہے تھے۔ ان دونوں کے جسموں پر صرف ایک ایک انڈرویئر تھا۔ دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور منہ پر چوڑا ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ ان دونوں کے رنگ بالکل سفید ہورہے تھے اور آنکھوں میں دہشت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ توانا جیٹی گارڈز ان دونوں کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے پھانسی گھاٹ تک لا رہے تھے۔

نائب کپتان جمشید تو خیر مناسب جسم کا تھا مگر فریہ اندام مارس کو برہنہ حالت میں نہایت ہی مضحکہ خیز نظر آرہا تھا۔ اس کا پہاڑ سا جسم تھل تھل کررہا تھا اور توند عجیب انداز میں دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ اس کی توند دیکھ کر میدے کے بہت بڑے پیڑے کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اپنے سامنے پھانسی کا پھندا دیکھ کر دونوں افراد کی حالت مزید پتلی ہوگئی تھی اور وہ خود کو چمڑانے کی بے تحاشا کوشش کرنے لگے تھے۔ سیاہ فام پہرے داروں نے نائب کپتان جمشید کو تو ایک پول کے ساتھ نائیلون کی رسی سے باندھ دیا۔ مارکوس کو وہ کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے پھندے کی طرف لے گئے۔ مارکوس ہاتھوں سے نکل نکل کر جارہا تھا مگر پہرے داروں کے سامنے اس کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا۔ مارکوس کو ایک چار فٹ اونچے تختے پر کھڑا کرکے اس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا پھر اس کے پاؤں بھی باندھ دیے گئے۔ مارکوس کے ہونٹوں پر ٹیپ تھا مگر اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور منہ سے مسلسل "غوں غاں" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یقینی موت کو سامنے دیکھ کر اس کے حواس مختل ہوگئے ہیں اور وہ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہا ہے۔ مائیکل ٹہلتا ہوا مارکوس کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔ مزاحیہ انداز میں بولا "موٹے بیل! تیری بسیار خوری اور شراب نوشی نے تیرا بیڑا غرق کیا ہے۔ اگر تیرے اندر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں اور تیرا گوشت قدرے بہتر ہوتا' تیری بیوی کی طرح تو تجھے شاید پھانسی کی سزا نہ ہوتی۔ تجھے بے ہوشی کا انجکشن لگا کر بڑی دردمندی سے ذبح کردیا جاتا اور تیرا جسم خلق خدا کے پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آتا مگر افسوس ایسا نہیں ہوسکا۔ تیری چربی میں اتنا ڈھیلا پن ہے اور تیرے گوشت میں اتنی نمی ہے کہ تجھے پھانسی دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ لہٰذا میرے پیارے بیل! خدا تمہارا نگہبان ہو۔"

مائیکل پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر اناڑلین فربہ اندام مارکوس کے قریب کھڑا ہوگیا اور انجیل سے کچھ اقتباسات پڑھنے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے شائستہ کا چہرہ دیکھا' وہ مائیکل کی خوشنودی کے لیے حاضرین میں بیٹھی تھی مگر اس کی رنگت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ہاں دیگر حاضرین بڑے خوش و خرم نظر آرہے تھے' ان میں فلیمنگ کی بیوہ ڈورتھی بھی تھی۔ اس کی خوشی قابل فہم تھی۔ ان افراد کو سرعام پھانسی ہورہی تھی جنہیں فلیمنگ اور دیگر افراد کے قتل کا ذمے دار قرار دیا جارہا تھا مگر دوسرے افراد بھی بڑھ چڑھ کر مسرت کا اظہار کررہے تھے۔ غالباً سفاکی کے ایسے مظاہرے دیکھ دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر مہریں لگ چکی تھیں۔ اب یہ سب کچھ ان کے لیے ایک دلچسپ تماشے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص انجیل پڑھ کر پیچھے ہٹا تو مائیکل نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لکڑی کا چار فٹ اونچا تختہ مارکوس کے پاؤں تلے سے کھینچ لیا گیا۔ پھندے کے رسے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ مارکوس شدید جھٹکے سے نیچے گرتا اور اس کی گردن وغیرہ ٹوٹتی۔ تختہ کھسکنے سے وہ بس تین چار انچ نیچے آیا اور گلا گھٹ جانے سے تڑپنے لگا۔ یہ ایک دلدوز منظر تھا۔ مارکوس کا پہاڑ سا جسم جان کنی کے عذاب میں تھا۔ مارکوس کے چہرے کو نقاب سے چھپایا نہیں گیا تھا لہٰذا اس کے بھیانک تاثرات واضح نظر آرہے تھے' آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور گلے سے "گیں گیں" کی خوفناک آواز نکل رہی تھی۔ تختہ ہٹانے سے چند سیکنڈ پہلے اس کے ہونٹوں پر چپکا ہوا ٹیپ ہٹالیا گیا تھا' اب مارکوس کے کھلے ہوئے منہ سے اس کی زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ قریباً ایک منٹ تک ماہی بے آب کی طرح پھندے میں تڑپتا رہا۔ پھر اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ جاں کنی کی خوفناک اذیت میں اس کا پیشاب بھی خارج ہوگیا تھا۔

ایرانی جہاز کا نائب کپتان جمشید بھی پول سے بندھا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا مگر یقینی موت کو روبرو دیکھ کر اس کا پتا پانی ہوچکا تھا۔ آٹھ دس منٹ تک مارکوس کی لاش پھندے سے جھولتی رہی پھر تختہ رکھ کر اسے نیچے اتار لیا گیا۔ اب جمشید کی باری تھی۔ حبشیوں نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا تو وہ بری طرح مچلنے لگا اور خود کو چمڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ مائیکل کے ذہن میں کوئی بات آئی اور اس نے جمشید کے ہونٹوں سے ٹیپ اتارنے کا حکم دیا۔

جمشید اور مائیکل کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔ مائیکل نے کہا "ہمارے تین بندے مارنے کی جو سزا تمہیں مل رہی ہے یہ بہت تھوڑی ہے اور اس پر تم خدا کا جتنا بھی شکر کرو کم ہے۔"

جمشید گھگیایا "مائیکل' دیکھو ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے کیا۔ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی' نہ کوئی لالچ تھا' مجھے اعلیٰ افسروں کی طرف سے جو حکم ملا تھا وہی کرنا تھا۔"

"تم سو فی صد بکواس کررہے ہو۔ اعلیٰ افسران کی بات ماننے کی ذمے داری تم سے زیادہ تمہارے کپتان پر عائد ہوتی تھی مگر اس نے پھر بھی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ ہمارے مقابلے میں آنے کے بجائے اس نے ہنگامی رخصت لے لی اور جہاز سے اتر گیا۔ تمہارا مسئلہ ڈیوٹی نہیں تھا۔ حرامی مارکوس سے تمہاری دوستی اور ڈیلنگ تھی۔ تم نے ایرانی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مارکوس اور اس کی بیوی کو سرکاری جہاز پر سوار کرایا اور اپنے جہاز کی کمان ایک طرح سے مارکوس کے سپرد کردی۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی تم دونوں منہ بولے بھائی ہمارے لیے ایسے ہی مصائب کھڑے کرچکے ہو' بولو کرچکے ہو یا نہیں؟"

جمشید گھگیایا "تمہیں ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ہم دونوں میں دوستی ضرور تھی لیکن اس سے پہلے۔۔۔ ہم نے۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" مائیکل دہاڑا "اس سے پہلے تم تین مرتبہ ہمارا تعاقب کرچکے ہو۔ میرے پاس پورے اعداد و شمار موجود ہیں۔ پچھلے سال ایک مرتبہ جون میں اور اس سے پچھلے سال جون اور دسمبر میں تم نے ہمارا پیچھا کیا۔ دسمبر میں ہمارے جہاز پر جو اندھا دھند فائرنگ ہوئی تھی اس کے ذمے دار بھی صرف تم ہی تھے۔ اس وقت بھی غیر قانونی طور پر یہ سویلین مارکوس تمہارے جہاز پر موجود تھا۔"

"لیکن اس وقت تو کپتان صاحب خود بھی اے ٹو پر موجود تھے۔ میری حیثیت ماتحت کی تھی۔"

"تم ایک برس بھی اپنی صفائی میں دلائل دیتے رہو گے تو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ تمہاری سزا حتمی ہے۔"

دلائل کو ناکام ہوتے دیکھ کر جمشید کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کا چہرہ رنج و الم کی تصویر تھا۔ مائیکل گہری نظروں سے اس کو دیکھتا رہا' پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اس نے کہا "لگتا ہے' لٹکنے سے بہت ڈرتے ہو تم۔۔۔ یا پھر مارکوس کا حشر دیکھ کر تمہارا پتا پانی ہورہا ہے۔"

نائب کپتان جمشید کچھ نہیں بولا' فقط خوف زدہ نظروں سے مائیکل کو دیکھتا رہا۔ مائیکل نے اسٹائلش انداز میں کہا "اچھا تمہیں ایک آپشن دیتے ہیں۔ سمندر میں کود جاؤ۔"

"سس۔۔۔ سمندر میں۔" جمشید ہکلایا۔

"ہاں سمندر میں۔۔۔ یہ کوئی نئی چیز تو نہیں ہے تمہارے لیے' پچھلے دس بارہ سال سے سمندر میں گھوم رہے ہو۔ کوسٹ گارڈ کی ڈیوٹی دے رہے ہو۔ یقیناً تیراکی بھی خوب آتی ہوگی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا تو بہ آسانی تیر لیتے ہوگے۔ کیا پتا کہ کوئی معجزہ ہوجائے اور تمہاری جان بچ جائے اور اگر کچھ نہیں تو ایک ڈیڑھ گھنٹا زندگی تو بڑھ جائے گی۔ کیا خیال ہے؟"

جمشید کی زبان اس کے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ بڑی مشکل کے ساتھ اس کی زبان سے بس یہ جملہ ادا ہو سکا "میں تمہیں ہر طرح کا ہرجانہ دینے کو تیار ہوں۔"

"ہرجانے میں مجھے تمہاری جان چاہیے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ بات کو طول دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا چھوٹے بیل۔ تمہارے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں۔ پھانسی کے لیے تیار ہو جاؤ یا پھر سمندر میں کود جاؤ۔"

"میرا بازو زخمی ہے' میں زیادہ دیر نہیں تیر سکوں گا۔ اگر تم مجھے۔۔۔"

"تقریر نہیں چاہیے۔" مائیکل نے اس کی بات کاٹی "بس دو حرفی فیصلہ کرو۔ گلے میں پھندا ڈالنا ہے یا پانی میں چھلانگ لگانی ہے؟"

دہشت کے سبب جمشید کا بدن پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ فقط ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ ان لمحوں میں وہ "اے ٹو" کا نائب کپتان نظر نہیں آ رہا تھا' ایک معمولی سا غبی شخص دکھائی دے رہا تھا جو اپنے سامنے ایک دوراہا دیکھ رہا ہو اور مفلوج ذہن کے ساتھ سوچتا چلا جا رہا ہو کہ کس طرف جائے۔ مائیکل نے جھنجلا کر اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جمشید کی بغلوں میں ہاتھ دیے اور بے رحمی سے پھندے کی طرف کھینچنے لگے۔ وہ چیخنے لگا۔ بالکل کسی بچے کی طرح۔۔۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر شخص کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے۔ جب اسے لکڑی کے تختے پر چڑھایا گیا تو میں نے کن انکھیوں سے شائستہ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کے اپنے بس میں ہوتا تو وہ غالباً ایک سیکنڈ بھی وہاں نہ بیٹھتی لیکن اسے وہاں بٹھانے والا اس کا شوہر نامدار مائیکل تھا۔ اس کے لیے یہاں سے اٹھنا ممکن نہیں تھا۔ جب پھانسی کا پھندا جمشید کی گردن کی طرف بڑھایا گیا تو اس نے نہایت بے قراری کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلایا اور پہرے داروں کو بتایا کہ وہ پھانسی پانا نہیں چاہتا۔

پہرے داروں نے جواب میں اس سے کہا کہ پھر اسے سمندر میں کودنا ہوگا۔

جمشید کے چہرے پر کرب کی ایک شدید لہر ابھری۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' پہرے داروں نے اس کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے اور رائفلیں اس کی طرف سیدھی کر لیں۔ پھر وہ اسے دھکیلتے ہوئے جنگلے کی طرف لے گئے۔ عین جنگلے پر پہنچ کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ جمشید نے بے بسی سے اردگرد دیکھا۔ رائفلوں نے اس کا نشانہ لے رکھا تھا۔ ایک کراہ کے ساتھ اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا عریاں جسم سورج کی روشنی میں تیزی سے نیچے گرتا نظر آیا' پھر وہ ایک چھپاکے کے ساتھ سمندر میں پہنچ گیا۔ حاضرین میں سے بہت سے افراد اٹھ کر جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور جمشید کو ہاتھ پاؤں چلاتے دیکھنے لگے۔ وہ بغیر کسی امید اور آسرے کے تیر رہا تھا۔ یہاں کون تھا جس نے اسے بچانے آنا تھا اور جو یہاں موجود تھے وہ اسے بچا نہیں سکتے تھے' وہ تو اسے سزا دے رہے تھے۔ لوگ ایسی جگہوں پر ڈوبتے ہیں جہاں انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوتا' یہاں بے شمار بچانے والے تھے اور وہ سب کے سامنے ڈوب رہا تھا۔ وہ بار بار جہاز کی طرف آتا' اس سے ٹکراتا اور پھر چند فٹ پیچھے چلا جاتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولتے جا رہے تھے اور اس کی چیخ و پکار میں پہلے سی شدت نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا لیکن میں بھی کیا کر سکتا تھا' میری حیثیت ایک بے بس قیدی کی تھی۔

میں جنگلے سے ہٹ کر واپس کرسی پر آ بیٹھا۔ شائستہ اٹھ کر اپنے اپارٹمنٹ میں جا چکی تھی۔ پروفیسر اللہ دتا ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "یہ تو ظلم کی انتہا ہے پروفیسر! وہ بدنصیب چیخ چیخ کر اور ہاتھ پاؤں چلا چلا کر ڈوب جائے گا۔"

"بے وقوف نے خود ہی یہ اذیت مول لی ہے۔" پروفیسر نے اداسی سے کہا "پھانسی پا لیتا تو ایک آدھ منٹ میں جان چھوٹ جاتی۔"

"انسان اپنی فطرت سے بھاگ تو نہیں سکتا' وہ آخر وقت تک جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کے لیے تو لوگ لڑتے ہی ہیں' موت سے چند منٹ کی مہلت پانے کے لیے بھی لڑتے ہیں۔"

"اور یوں کبھی کبھی موت کو اور اذیت ناک بنا لیتے ہیں!" پروفیسر نے کہا۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے مائیکل کو دیکھا۔ وہ بڑی شان سے جنگلے پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ اس نے جمشید کی جاں کنی کا منظر زیادہ وضاحت سے دیکھنے کے لیے آنکھوں پر ٹیلی اسکوپ لگا رکھی تھی۔ میرا جی چاہا' کسی حبشی گارڈ سے رائفل چھینوں اور اس ماڈرن آدم خور کو اڑا کر رکھ دوں۔ مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا' اس نے مجھے حدود میں رکھنے کے لیے بڑا پکا بندوبست کر رکھا تھا۔ غزالہ کے اپارٹمنٹ میں لگا ہوا وڈیو کیمرا اور سائیڈ ٹیبل میں پڑا ہوا وہ طاقت ور بم جسے ایک سیکنڈ کے اندر ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ کیا جا سکتا

تھا۔۔۔ زبردست بندوبست ہی تو تھا۔ غزالہ ہر لحظہ نشانے پر تھی۔ میری کوئی بھی حرکت غزالہ اور میرے دیگر ساتھیوں کی زندگی کے لیے شدید خطرہ بن سکتی تھی۔ میں جنگلے سے دور ہٹ آیا تھا مگر اب مجھے یہاں بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پیٹ میں عجیب سی گھٹن بھرتی جا رہی تھی' میں اٹھ کر زریں کے اپارٹمنٹ میں اپنے ساتھیوں کے پاس چلا آیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد مجھے پہرے دار جوزف کی زبانی خبر ملی کہ ایرانی جہاز کا نائب کپتان ایک گھنٹا مسلسل پانی میں تیرنے کے بعد ڈوب کر مر گیا۔ اس کا ایک بازو زخمی تھا اور وہ آخری آدھ گھنٹا ایک بازو سے ہی تیرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

اس رات میری آنکھ میں شدید درد ہوا۔ یہ وہی آنکھ تھی جس پر آدم خور سائیں سے لڑائی کے دوران میں چوٹ لگی تھی۔ کئی ہفتے گزرنے کے باوجود آنکھ کے نچلے حصے میں ابھی تک تھوڑی سی لالی موجود تھی۔ کسی وقت سر جھکانے سے شدید ٹیس بھی اٹھتی تھی۔ رات کو شروع ہونے والا درد صبح تک جاری رہا اور سر کا ایک حصہ پھوڑا سا بن گیا۔ صبح نو دس بجے کے قریب مائیکل زریں کے اپارٹمنٹ میں آیا۔ اس وقت میں کیبن کے فرش پر لیٹا ہوا تھا اور زریں کل میرے منع کرنے کے باوجود میرا سر دبا رہا تھا۔ مائیکل نے پوچھا "کیا ہوا؟"

صفدر نے بتایا کہ رات سے آنکھ میں درد ہے' شب بیداری کی وجہ سے ہلکا سا بخار بھی ہو رہا ہے۔

مائیکل نے مجھے فوراً اٹھنے کا حکم دیا اور غور سے میری آنکھ کا معائنہ کرنے لگا پھر بیزاری سے بولا "کچھ بھی نہیں ہے۔ ہلکی سی سرخی ہے' ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہارے تو اپنے گھر میں ڈاکٹر موجود ہے' وہ تمہاری سویٹ ہارٹ غزالہ۔ اس کو دکھاؤ' دو منٹ میں تمہیں ہنستا کھیلتا کر دے گی۔" مائیکل کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"مشورے کا شکریہ۔" میں نے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

درحقیقت میرا دل مائیکل کی شکل دیکھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ میرے اندازوں سے زیادہ سفاک اور درندہ صفت نکلا تھا۔ اپنے غرور اور تکبر کا سر اونچا رکھنے کے لیے اس نے جس طرح "اے ٹو" کے پرخچے اڑائے تھے وہ ایک ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ یہ سب کچھ کر کے بھی اس بدبخت کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور اس نے کل دو افراد کو نہایت بے دردی سے سزائے موت دے دی تھی۔

بہرحال مائیکل کے جانے کے بعد صفدر اور زریں نے بھی مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ میں ایک بار غزالہ کو آنکھ دکھا لوں بلکہ ایک طرح سے انہوں نے مجھے دھکیل کر کیبن سے باہر بھیج دیا۔ میں نے اوپر جا کر غزالہ کو صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے دھیان سے میری آنکھ کا معائنہ کیا' میں نے بھی اسے ساری کیفیت بتائی۔ غزالہ بظاہر تو پرسکون رہی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ اندر سے کچھ مضطرب ہو گئی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو بار میری آنکھ کے حوالے سے تشویش کا اظہار کر چکی تھی مگر اب اس کی تشویش بڑھی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے صوفے پر لٹا دیا اور سر درد کم کرنے کے لیے گولی دی۔ اس کے بعد اس نے پہرے دار جوزف کے ذریعے کلینک کے انچارج کو بلایا۔ یہ ایک کمپاؤنڈر نما شخص تھا۔ شکل و صورت سے اٹالین ہی نظر آتا تھا۔ غزالہ نے اس سے دستیاب دواؤں کے بارے میں پوچھا پھر اس نے چند دواؤں کے نام ایک کاغذ پر لکھ کر اٹالین شخص کو دے دیے اور کہا کہ ان میں سے جو دوا بھی موجود ہو وہ لے آئے۔

اٹالین کمپاؤنڈر کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے پاس ایک "آئی ڈراپس" اور کیپسول تھے۔ آئی ڈراپس ملنے پر غزالہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ آج سارا دن دو دو گھنٹے بعد یہ ڈراپس میری آنکھ میں ڈالے جانے چاہئیں۔ کیپسول غالباً اینٹی بایوٹک تھا' وہ اس نے مجھے فوراً ہی پانی کے ساتھ کھلا دیا۔ میں واپس جانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے کیبن میں ہی روک لیا تاکہ ڈراپس باقاعدگی سے آنکھ میں ڈالے جا سکیں۔

ننھا تابی میرے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ غزالہ نے اسے ڈانٹا "دیکھو تم آنکھ چھونے میں لگے رہتے تھے نا' آنکھ خراب ہو گئی ہے۔"

غزالہ کی بات کہاں اس کی سمجھ میں آئی ہوگی لیکن غزالہ کے لہجے اور تاثرات سے وہ سہم گیا۔ وہ اپنی گول گول آنکھوں سے کبھی میری طرف اور کبھی غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ اس کی شرارتوں کی بات ہو رہی ہے اور میری زخمی آنکھ کی بات ہو رہی ہے۔ غزالہ نے مزہ لینے کے لیے اس کے سر پر ہلکی سی ایک چپت لگائی "بٹر بٹر کیا دیکھ رہے ہو۔ نظر نہیں آتا' انکل کی آنکھ کتنی سرخ ہو رہی ہے۔"

اس نے منہ بسورنے والے انداز میں نچلے ہونٹ کو حرکت دی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے نتھنے پھولے پچکے اور پھر ایک دم وہ پورے زور سے رو دیا۔ بچہ مار کھا کر بھی ناں ہی

کی طرف جاتا ہے' تابی بھی دوڑتا ہوا غزالہ کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ غزالہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی "میں بالکل نہیں بول رہی تم سے۔ تم بہت خراب بچے ہو۔" وہ اور زور سے رونے لگا۔

میں نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کرلیا۔ تھوڑا سا پچکارا' تھوڑا سا دلاسا دیا۔ میں لیٹا ہوا تھا' اس نے میرے پیٹ پر سر رکھ دیا اور کن انکھیوں سے غزالہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ ہچکیاں بھی لیتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب غزالہ نے اسے اپنے ساتھ لگایا تو اس کا رونا دھونا بند ہوا۔ غزالہ سارا دن میری دیکھ بھال میں لگی رہی۔ اس نے کھانا بھی میرے لیے خود بنایا۔ ٹائم کے عین مطابق وہ آنکھ میں ڈراپس بھی ڈالتی رہی۔ میں نے کہا "تم نے تو واقعی مجھے مریض بنا کر رکھ دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کسی آئی سی یو وارڈ میں ہوں۔ بھئی قریب المرگ نہیں ہوں میں۔ ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"میں بھی تو ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔" وہ زیر لب مسکرائی "سر پر معمولی چوٹیں آئی تھیں' آپ چوبیس گھنٹے میرے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔"

"وہ تو واقعی شدید چوٹیں تھیں۔"

"یہ بھی تو۔۔۔ میرا مطلب ہے۔" وہ ایک دم گڑبڑا کر چپ ہوگئی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی "آپ آنکھ کی چوٹ کو معمولی نہ سمجھیں۔ بے احتیاطی سے یہ بگڑ بھی سکتی ہے۔ سمندری ہوا اور موسمی تبدیلی بھی اس کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"چوٹ تو آنکھ میں ہے' سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آنکھ سے نکلنے والے اعصاب پیچھے تک جاتے ہیں' اس کے علاوہ خون کی بہت باریک رگیں ہوتی ہیں۔ جس طرح سر پر چوٹ لگنے سے بعض اوقات آنکھ میں سرخی جم جاتی ہے' اسی طرح آنکھ کی چوٹ سے سر کے کسی حصے میں درد شروع ہوسکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ کی آنکھ کے اردگرد کسی رگ میں خون جما ہوا ہے' چند دن احتیاط کی جائے اور دوا وغیرہ لی جائے تو بالکل ٹھیک ہوجائے گا لیکن اگر بے احتیاطی کی گئی تو خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں آپریشن تک کی نوبت آسکتی ہے۔"

"لگتا ہے کہ ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"نہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

شام تک میری طبیعت کچھ بہتر ہوگئی۔ آنکھ کی چبھن میں بھی افاقہ ہوا۔ تابی میرے اردگرد موجود رہا' تاہم غزالہ کی سرزنش کام کرگئی تھی' اس نے میری آنکھ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس غزالہ کے کہنے پر وہ بڑے پیار سے میری آنکھ پر ہاتھ پھیرتا رہا اور پھونکیں مارتا رہا۔ اس کی ادائیں واقعی دل لبھانے والی تھیں۔ کل آدھی رات سے ہمارا جہاز پھر حرکت میں تھا۔ وہ حسب سابق مغرب کی طرف سفر کر رہا تھا "کیا خیال ہے آپ کا' ہم کب تک ساحل پر پہنچ جائیں گے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" میں نے کہا "ٹائیگل اور اس کے ساتھی جس طرح ایرانی جہاز کو ایندھن دینے سے ہچکچا رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحل اتنا قریب بھی نہیں ہے۔"

"کبھی تو دل چاہتا ہے کہ سفر جلد ختم ہو اور کبھی دل چاہتا ہے کہ ہم راستہ بھٹک جائیں اور اسی طرح سمندر میں گھومتے رہیں۔"

"کیوں' بھٹکنے کا خیال کیوں ذہن میں آتا ہے؟"

"منزل کے ڈر سے۔" غزالہ نے اداس لہجے میں کہا "خوف نہیں کہ وہاں پہنچ کر کیا ہوگا۔ کیا حالات پیش آئیں گے ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ہم سب اکٹھے رہ بھی سکیں گے یا نہیں۔"

"ہاں یہ اندیشے تو واقعی ہیں۔" میرے لہجے میں آپوں آپ اداسی در آئی تھی۔

"آپ نے مجھے معاف کردیا ہے نا؟" غزالہ کی آنکھوں میں اچانک نمی آگئی۔

"کس بات پر؟"

"ہر بات پر۔۔۔ اور اس بات پر بھی کہ میں آپ سے قریب ہوکر بھی آپ سے بہت دور ہوں۔"

"معاف تو غلطی پر کیا جاتا ہے اور یہ تمہاری غلطی نہیں مجبوری ہے۔"

"جو بھی ہے لیکن۔۔۔ اس سے آپ کا دل تو دکھتا ہے نا۔"

"یہ بڑا پیارا دکھ ہے۔ ایسے دکھ کے حوالے سے معافی دینے یا مانگنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس کی لرزتی پلکوں نے اس کی آنکھوں پر سایہ کرلیا' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "ان لوگوں نے مقابلے کی بات دوبارہ تو نہیں کی؟"

"نہیں پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید کچھ دنوں کے لیے یہ "احمقانہ پروگرام" ٹل ہی جائے۔ ویسے بھی اے ٹو کو ہلاک کرکے ان لوگوں کی تفریح کا کوٹا پورا ہو ہی گیا ہوگا۔"

"شائستہ بھی کہہ رہی تھی کہ ایسے مقابلے عام طور پر جہاز پر نہیں ہوتے۔"

"چلو جب بھی ہوگا' دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

غزالہ نے رسٹ واچ دیکھی' ڈراپس کا وقت ہوگیا تھا۔ اس نے آنکھ میں ڈراپس ڈالے۔ اس کے ہاتھ کا لمس میرے رخسار پر تھا' انگلیاں میری ناک سے چھو رہی تھیں۔ اتنا قریب تھی کہ میں اس کے سانسوں کی جانی پہچانی مہک محسوس کرسکتا تھا۔ آنکھیں بند کرکے میں خاموش لیٹا رہا' ڈراپس ڈالنے کے بعد غزالہ اپارٹمنٹ کے چھوٹے سے کچن میں چلی گئی اور میرے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ میرے نتھنوں سے جو خوشبو ٹکرا رہی تھی وہ پیاز کے تڑکے والے چاولوں کی تھی۔ یہ خوشبو سونگھ کر دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ غزالہ جانتی تھی کہ ماش کی دال کی طرح پیاز کے تڑکے والے چاول بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ ہمارے لڑکپن کی کئی عیدیں بھی ان تڑکے والے چاولوں کے ساتھ منسوب تھیں۔ ننھیال کوٹ میں ان چاولوں کی خوشبو مجھے اکثر غزالہ کے گھر کی طرف کھینچ لیا کرتی تھی' پھر چچی فاخرہ کی گھرکیوں کے باوجود میں چاول کھائے بغیر نہیں ٹلا کرتا تھا۔ غزالہ چچی کے پہلو میں بیٹھ کر کبھی غصے سے اور کبھی شرارت سے مجھے دیکھا کرتی تھی۔ چچا جلیس ازراہ مذاق کہا کرتے تھے' شاہ جہاں کو چاولوں کی خوشبو تو سو میل دور سے بھی آجاتی ہے۔ آج غزالہ ویسے ہی چاول پکا رہی تھی' شاید میری طرح وہ بھی ماضی کو یاد کر رہی تھی' سنہری دور کی سنہری یادوں کے لیے ایک سبب صورت اشارہ دے رہی تھی اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ سب میری خام خیالی ہی ہو۔ محبت کے مارے ہوئے لوگوں کو ایسے مغالطے اکثر ہوا ہی کرتے ہیں۔ کسی دانا نے سچ کہا ہے کہ اسیران محبت کے لیے زندگی ایک مسلسل آس ہے اور ہر آس ایک خوش فہمی۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اپنے قریب مجھے آہٹ سنائی دی' پھر غزالہ کی آواز آئی "آپ کو چاولوں کی خوشبو کیسی لگی؟"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے کہا "سچ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے' شاید اسی کو ٹیلی پیتھی کہا جاتا ہے۔ میں بھی تم سے ان چاولوں اور خوشبو کی بات ہی کرنے والا تھا۔"

"آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چاولوں پر ڈالنے کے لیے میں نے کیا سالن پکانا ہے؟"

"میرا خیال ہے ثابت مسور۔"

"سو فی صد درست ہے۔ لگتا ہے کہ آپ کے بچپن کی پسند برقرار ہے۔"

"برقرار ہے اور رہے گی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

میرے معنی خیز لہجے کو نوٹ کرکے غزالہ کے چہرے پر شفق کا رنگ دوڑ گیا۔ اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے ہمیں چونکا دیا۔ غزالہ نے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے نائب کپتان آرتھر اور محافظ جوزف کھڑے تھے۔

آرتھر نے غزالہ سے پوچھا "ڈاکٹر! مسٹر شاہ جہاں کہاں ہے؟"

غزالہ نے کہا "وہ لیٹے ہوئے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی عرشے کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا تھا جیسے بہت سے افراد وہاں جمع ہوں اور چاندنی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ آرتھر ایک قدم آگے بڑھا کر دروازے سے اندر آگیا۔ مجھ سے کہنے لگا "چلو شاہ جہاں۔ تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"عرشے پر۔۔۔ آج تمہارا مقابلہ ہے بھئی۔"

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ پچھلے کئی روز میں مقابلے کے لیے تیار رہا تھا بلکہ اب بھی تھا لیکن یوں بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے مقابلے کے RING میں دھکیل دیا جائے گا' اس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ میری طرح غزالہ بھی ششدر رہ گئی "کس مقابلے کی بات کر رہے ہیں آپ؟" غزالہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ' وہی مقابلہ جو پرسوں ہونا تھا۔ پرسوں چونکہ ایرانی جہاز کے ساتھ فساد ہوگیا لہٰذا مقابلہ نہ ہوسکا۔ آج باس کے حکم کے مطابق پہلی فرصت میں مقابلہ منعقد کرایا جا رہا ہے۔"

غزالہ میرے اور آرتھر کے درمیان کھڑی ہوگئی "یہ نہیں جاسکتے۔" غزالہ نے کہا۔

"کیوں؟" آرتھر نے پوچھا۔

"یہ صحت مند نہیں ہیں۔ یہ بات میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"ان کی آنکھ ٹھیک نہیں۔ آنکھ میں سرخی تم اب بھی دیکھ سکتے ہو۔ انفیکشن کی وجہ سے انہیں بخار بھی ہے' اگر یقین نہیں تو تم تھرمیٹر استعمال کرسکتے ہو۔"

آرتھر مسکرایا "یہ معمولی باتیں ہیں بی بی۔ تم جیسی نازک مزاج لڑکی کے لیے ان کی اہمیت ہو سکتی ہے' شاہ جہاں تو ہنا کٹا مرد ہے۔ اگر یہ ایسی باتوں کو اہمیت دے گا تو یہی سمجھا جائے گا کہ یہ مقابلے سے بچنے کے لیے بہانے بازی کر رہا ہے' ایسے مردوں کے لیے یار لوگ "ہیجڑے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اپنی زبان کو لگام دو آرتھر۔ ایسا نہ ہو کہ مقابلے سے پہلے ہی ایک مقابلہ یہاں تمہارے ساتھ ہو جائے۔ اگر تم نے ہیجڑے کا لفظ استعمال کرنا ہی ہے تو اپنے باس مائیکل کے لیے استعمال کرو۔ میں نے اسے مقابلے کی دعوت دی تھی لیکن وہ اپنے ایک چمچے کو مروانے کے لیے آگے لے آیا ہے۔"

آرتھر زہر خند لہجے میں بولا "تمہیں اپنے بارے میں جو شدید قسم کی غلط فہمیاں ہیں وہ ابھی تھوڑی دیر میں دور ہو جائیں گی۔"

"یہ یہاں سے نہیں جائیں گے' ان کی آنکھ میں شدید تکلیف ہے۔" غزالہ نے کہا "اگر تم لوگوں میں کوئی بندہ میڈیکل کی سمجھ بوجھ رکھنے والا ہے تو اسے بلاؤ۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ اس وقت شاہ جہاں کے لیے مکمل آرام کتنا ضروری ہے۔"

"ہاں بھئی ڈاکٹر جوزف' یہ ڈاکٹر صاحبہ کیا فرما رہی ہیں؟" آرتھر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحبہ جو بات کر رہی ہیں وہ ان کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔" جوزف نے طنزیہ انداز میں کہا "شاہ جہاں صاحب خاصے بیمار ہیں اور ان کی بیماری کا علاج ڈاکٹر صاحبہ کے پاس ہی ہے۔ شاہ جہاں صاحب جتنا بھی آرام فرمائیں' کم ہے اور بہتر ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحبہ کے اپارٹمنٹ میں ہی آرام فرمائیں۔"

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے ایک قدم جوزف کی طرف بڑھایا' وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا اور رائفل کندھے سے لگا کر انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ اس کا اسٹائل خطرناک تھا۔ میں نے قدم روک لیے۔

آرتھر نے کہا "کول مائی ڈیئر کول۔۔۔ دماغ گرم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا' اگر گرمی کھانی ہی ہے تو پھر ابھی تھوڑی دیر بعد کھانا۔ شاید مقابلے میں دو چار ہاتھ دکھا سکو تم۔"

"ٹھیک ہے' جاؤ کہہ دو اپنے ہیجڑے باس سے' میں اس کے ہیجڑے چمچے سے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں تمہاری تماشا گاہ میں۔"

آرتھر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت نو بجے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک ٹائم بتاؤ کتنے منٹ میں پہنچ رہے ہو؟"

"پندرہ منٹ میں۔" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جائیں گے۔ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔" غزالہ روہانسی آواز میں بولی۔

"سچ کہتے ہیں' عورتیں مردوں کو بہادر بناتی ہیں اور بزدل بھی وہی بناتی ہیں۔" آرتھر نے کہا۔

"تم اپنی بک بک بند کرو۔ میں تمہارے باس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" غزالہ غصے سے بولی۔

"غزالہ! پلیز تم خاموش رہو۔" میں نے قدرے تحکم سے کہا "اگر یہ ابھی مقابلہ چاہتے ہیں تو ابھی ہوگا اور اللہ نے چاہا تو میں جیت کر بھی دکھاؤں گا۔"

پھر میں نے آرتھر سے کہا کہ وہ جائے میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ آرتھر زیر لب مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ میرے مدِ مقابل ٹام پر بے حد بھروسا رکھتا ہے اور ٹام کی کامیابی کا اسے پختہ یقین ہے اور یہ صرف آرتھر کی ہی توقعات نہیں تھیں' میرے تجزیے کے مطابق ہر کولیس پر موجودہ ۸۰ فی صد افراد کو یقین تھا کہ ٹام میرا حشر خراب کر دے گا۔

غزالہ نے دروازہ بند کیا' وہ ایک دم اداس اور زرد نظر آنے لگی تھی۔ وہ بولی "شاہ جہاں! یہ مقابلہ ایک بے مقصد کشت و خون کے سوا اور کچھ نہیں۔ آپ اس میں حصہ لے کر خود کو شدید مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو انکار کرنا چاہیے تھا' اگر وہ لوگ دو مرتبہ مقابلے کو التوا میں ڈال سکتے ہیں تو ایک مرتبہ آپ بھی ڈال سکتے تھے۔"

"کچھ نہیں ہوگا' تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم بس اپنے ہاتھ سے میری آنکھ میں قطرے ڈالو اور دو گلاس ٹھنڈا پانی مجھے پلا دو' اس کے بعد میں چلتا ہوں۔"

اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا "آپ کو اب بھی بخار ہے۔ اسی وجہ سے پیاس لگ رہی ہے۔ آپ کچھ بھی سمجھ نہیں رہے ہیں۔"

"جو بھی سمجھانا ہے' واپسی پر سمجھانا۔ بس اب مجھے جانے دو۔ ورنہ وہ یہ کہنے سے باز نہیں آئیں گے کہ میں ڈر کر اندر گھسا بیٹھا ہوں۔"

ایک دم غزالہ کی حسین آنکھوں میں نمی لرز گئی "میں نے تو آپ کے لیے کھانا بنایا تھا۔"

"زندگی رہی تو آکر کھالوں گا۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

غزالہ کچھ دیر میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ عجیب سے تاثرات تھے اس کے چہرے پر۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لپک کر مجھ سے لپٹ جائے گی اور اتنا روئے گی کہ اس کے آنسوؤں میں سبھی کچھ بہہ جائے گا۔ مگر پھر اس کی غیر معمولی قوتِ ارادی نے اس کا ساتھ دیا اور وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی۔ وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی اور آنسو گرانے لگی۔ میں لیٹ گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میری آنکھ میں دو ڈراپس ڈالے اور پانی کے ساتھ ایک کیپسول مجھے کھلا دیا۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے پندرہ منٹ کا فاصلہ طے کر رہی تھیں۔ اب صرف دو تین منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "مقابلہ نہیں دیکھو گی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "تمہارے ہوتے ہوئے مجھے حوصلہ رہتا۔"

"میں یہیں سے آپ کے لیے دعا کروں گی۔" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ خوابیدہ تابی کے پاس گم صم بیٹھی رہی۔ کمرے کی فضا میں مایوسی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولتا' وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولی "شاہ جہاں!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس کھڑی روتی رہی۔ شاید اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ لاچاری کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر اپنے پورے بازو کھول کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کتنی ہی دیر اس نے میرے سینے سے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے آنسوؤں نے میرا گریبان بھگو دیا تھا۔ خود میری نگاہیں بھی دھندلا رہی تھیں۔ میں نے سر جھکا کر آہستگی سے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اس کا جسم تھرا کر رہ گیا۔ وہ مجھ سے جدا ہوئی اور صوفے پر بیٹھ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا' ہچکیاں مسلسل اس کے سینے کو دہلا رہی تھیں۔

"کیا ناراض ہو گئی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ یہ خاموشی جاں گسل تھی' میں نے اپنا سوال دہرایا "کیا ناراض ہو گئی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ چوبدار ستور ہاتھوں میں چھپا دیا تھا۔

میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اچانک میرے اندر روشنی' محبت اور توانائی کا ایک دریا بہنے لگا ہے۔ میرے شانے حد نگاہ تک چوڑے ہو گئے تھے اور قد جیسے آسمان سے چھونے لگا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ میں کوئی کامیابی لڑکا نہیں تھا جو اپنی محبوبہ کی طرف سے پہلی بار محبت کا جواب پا کر نیم دیوانہ ہو جاتا ہے اور خوشی میں آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے پھر بھی میری کیفیت اس لڑکے سے مختلف نہیں تھی۔ معلوم نہیں کہ قدرت نے انسان کی فطرت میں یہ کیسی کج روی رکھ دی ہے۔ وہ کسی وقت پیار کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر سکتا' کسی وقت نفرت کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر سکتا' ایک وقت تھا جب غزالہ میری ایک مہرباں نگاہ کے لیے ترس رہی تھی لیکن مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں تھا۔ آج غزالہ کو اپنے دل پر اختیار نہیں تھا اور میں اس کے لیے ترس رہا تھا۔ پیاس کے صحرا کے لیے ایک گھونٹ پانی میسر آیا تھا اور میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ ہاں یہی زندگی کا انوکھا پن ہے' کبھی سمندر بیکار ہوتے ہیں' کبھی ایک ایک بوند کی اہمیت ہوتی ہے۔

غزالہ کا سر انکار میں ہلا تھا اور میرے ویران دل میں اثبات کا موسم اترنا شروع ہو گیا تھا۔ میں والہانہ نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کمرے میں ابھرنے والی ہر آواز ایک قریبی کیبن میں سنی جا رہی ہے اور ہر منظر وڈیو کیمرے کے ذریعے دیکھا جا رہا ہے مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ یہاں جو کچھ تھا' سچ تھا اور سچ چھپایا نہیں جاتا۔ غزالہ کا چوبدار ستور اس کی ہتھیلیوں پر جھکا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کے بالوں کو سہلایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر۔۔۔ جہاں ایک خوفناک مدِ مقابل ٹام کی صورت میں میرے لیے موجود تھا۔

میں باہر نکلا تو جوزف کو اپنی طرف آتے پایا۔ پندرہ منٹ پورے ہو چکے تھے اور وہ یقیناً دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا اور پھر اپنے ساتھ لے کر اسی ہال میں پہنچ گیا جہاں پانچ روز پہلے ایسٹرنائٹ منائی گئی تھی اور بعد ازاں آدم خور ٹام کے ساتھ میرے مقابلے کا آغاز ہوا تھا۔ آج بھی ہال میں پانچ روز پہلے کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ ویسے ہی کرسیاں رکھی تھیں' یہاں ہر کولیس کے من چلے "جہازی" بیٹھے پی پلا رہے تھے اور اپنی ساتھی لڑکیوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ پورا ہال مخمور قہقہوں سے گونج رہا تھا اور دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ آج ڈانسنگ فلور پر جوڑے نظر نہیں آ رہے تھے' ایک نیم برہنہ اٹالین لڑکی اکیلی ہی رقص کر رہی تھی' تاہم اس کے ساتھ ایک انڈین لڑکی بھی موجود

تھی۔ یہ قبول صورت لڑکی ساڑی میں تھی اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ لڑکی بمبئی سے سوار کیے جانے والے بردوں میں سے تھی۔ اٹالین لڑکی اسے کھینچ کھینچ کر اپنے ساتھ رقص کرنے پر آمادہ کررہی تھی۔ لڑکی رقص سے ناآشنا نظر آتی تھی اور گھبرائی ہوئی بھی تھی لہٰذا اس سے کچھ بن نہیں پا رہا تھا۔ اٹالین لڑکی تشدد پر اتر آئی' اس نے انڈین لڑکی کو تھپڑ مارے اور ٹھوکروں سے تواضع کی۔ وہ لڑکی مار سے بچنے کے لیے الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ تماشائی قہقہے لگانے لگے اور آوازے کسنے لگے۔

ٹام ایک جانب کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور ٹیوب لائٹس کی روشنی میں سیاہ فولاد کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے مالشیے ٹائپ کے دو ساتھی اس کے ساتھ تھے اور اس کی مٹھی چاپی کررہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ٹام نے نفرت سے تھوکا اور منہ میں نجانے کیا بڑبڑانے لگا۔ جونہی میں ہال میں داخل ہوا تھا' وہاں موجود لوگ ایک دائرے کی صورت میں سمٹنا شروع ہوگئے تھے۔ اس دائرے کے درمیان کچھ خالی جگہ تھی۔ اس کے علاوہ کرسیاں اور میزیں بھی تھیں۔ کئی میزوں پر برتن بھی موجود تھے۔ ان چیزوں کو قصداً وہاں سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مقابلے کے دوران میں مختلف اشیا کی توڑ پھوڑ مقابلے کو سنسنی خیز بناتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈانسنگ فلور پر ہونے والا رقص تھم گیا اور لوگ پوری طرح میری اور ٹام کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ڈانسنگ فلور ایک اسٹیج کے مانند نظر آتا تھا۔ اس اسٹیج پر مائیکل اور اس کے مقرب ساتھیوں کے لیے کرسیاں رکھ دی گئیں' میری نگاہ مائیکل پر پڑی تو تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس کی غیر معمولی سفاکی نے میرے دل میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت بھر دی تھی۔ وہ شائستہ کو پہلو میں لیے بیٹھا تھا اور اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کررہا تھا۔ وہ اسے اپنی محبوب بیوی کا درجہ دیتا تھا لیکن یہ میں جانتا تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی محبوب ہے اور وہ اسے کیا حیثیت دیتا ہے۔ دو دن قبل اے ٹوکی تباہی سے چند لمحے پہلے میں نے مائیکل کی زبان سے جو الفاظ سنے تھے وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مائیکل نے آنجہانی مارکوس سے علی الاعلان کہا تھا کہ شائستہ کی زندگی یا موت کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے یہ الفاظ مارکوس کے علاوہ صرف میں نے سنے تھے لیکن مائیکل کو معلوم نہیں تھا کہ یہ الفاظ مارکوس کے علاوہ بھی کسی کے کانوں تک پہنچے ہیں۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اے ٹوکی ہولناک تباہی کے بعد مارکوس نے چیخنا چلانا شروع کیا تھا اور مائیکل نے فوراً اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ٹیپ چڑھانے کا حکم دیا تھا۔ شاید مائیکل کے پیش نظر یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں مارکوس کے منہ سے شائستہ اور دیگر دو ضمانتیوں کے حوالے سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ نکل جائے' کوئی ایسی بات جس کی وجہ سے اس کے اپنے ساتھی اس کے بارے میں منفی انداز میں سوچنے لگیں۔ بعد ازاں مارکوس کی آواز اس کے حلق میں ہی گھونٹ دی گئی تھی یعنی اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اب مائیکل اسی شائستہ کو بڑے پیار سے پہلو میں بٹھائے ہوئے تھا جو اپنے ہونے والے بچے سمیت اس کے لیے ایک بیکار چیز تھی اور جس کی موت یا زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔

میں تماشائیوں کے دائرے کے درمیان پہنچا تو ہال میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ ٹام اپنی جگہ سے اٹھا اور پاؤں سے فرش کو کوٹتا ہوا میرے مقابل آگیا۔ جوش سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی' ریفری کے فرائض انجام دینے والا فورمین ایڈی سن آگے آیا' اس نے حسب سابق مجھے اور ٹام کو مقابلے کی شرائط بتائیں۔ ہم کوئی ہتھیار استعمال نہیں کرسکتے تھے' ہاں آس پاس موجود کسی بھی شے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ پہلے دو راؤنڈ پانچ پانچ منٹ کے تھے' ان راؤنڈز کے دوران میں کوئی بھی حریف مقابلے سے دستبردار ہوسکتا تھا لیکن تیسرا راؤنڈ حتمی نتیجے تک جاری رہنا تھا اور اس راؤنڈ کے آغاز کے بعد کوئی حریف ریٹائرمنٹ نہیں لے سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنی قمیص اور گھڑی اتار دی۔ ریفری نے ہم دونوں کی اچھی طرح تلاشی لی اور مقابلہ شروع کرانے کے لیے اجازت طلب نظروں سے مائیکل کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں ایک عورت میری طرف بڑھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ ڈورتھی تھی۔ ڈورتھی آنجہانی نائب کپتان فلیمنگ کی بیوہ تھی۔ غزالہ نے جس طرح فلیمنگ کی زندگی بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی تھی اس سے ڈورتھی بے حد متاثر تھی۔ وہ اس سلسلے میں دو تین بار میرا اور غزالہ کا شکریہ بھی ادا کرچکی تھی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی۔ اس نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں میرا شانہ تھپتھپایا۔ چند رسمی کلمات ادا کیے۔ ان کلمات کے دوران میں اس نے بڑی تیزی کے ساتھ ایک سرگوشی بھی کرگئی۔ اس نے کہا "یہ

ٹام اپنا بایاں مُکا بڑی بیدردی سے استعمال کرتا ہے۔ سیدھا کلیجے پر مارتا ہے اور بندے کو ختم کردیتا ہے۔"

ڈورتھی واپس چلی گئی لیکن اس کی یہ سرگوشی میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اگر اس نے درست اطلاع دی تھی تو پھر یہ بڑی کارآمد اور بروقت سرگوشی تھی۔ دوسری طرف مائیکل مقابلے کی اجازت دے چکا تھا۔ ریفری ایڈی سن نے ہاتھ کے اشارے سے مقابلے کا آغاز کیا اور ہمارے درمیان سے ہٹ گیا۔ مسلسل انتظار سے ٹام کا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا تھا' وہ تیندوے کی طرح جھپٹ کر مجھ پر آیا۔ میں نے پھرتی سے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی۔ وہ میری ضرب سے نہیں بچ سکا مگر جوابی کارروائی کے طور پر اس نے میرا ٹخنا دبوچ لیا۔ اگر ٹانگ کا نچلا حصہ مدِمقابل کی گرفت میں آجائے تو اس کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے کہ زمین کی طرف جھک کر اپنا وزن ہاتھوں پر ڈالا جاتا ہے اور دوسری ٹانگ سے مدِمقابل کو ضرب لگا کر ٹانگ چھڑالی جاتی ہے اور اگر ہاتھوں پر وزن نہ ڈالا جاسکے تو ویسے ہی اچھل کر ٹانگ رسید کردی جاتی ہے مگر ٹام نے مجھے ان میں سے کوئی حربہ استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے میری ٹانگ کو گرفت میں رکھنے کے بجائے تیزی سے جھٹکا دیا اور گھما کر چھوڑ دیا۔ اردگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں ناچ کر رہ گئی۔ میں اڑتا ہوا سا کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا' سر میں رنگ دار پٹاخے سے چھوٹ گئے۔ تماشائیوں کی پُرمسرت چیخیں میرے کانوں میں گونجیں۔ مجھے لگا کہ بلندی سے کئی ٹن وزن مجھ پر گرا ہے۔ یہ ٹام تھا' اس نے جست لگا کر مجھے چھاپ لیا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کا منحوس چہرہ میری آنکھوں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا' اس کی بدبودار سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں پھر مجھے اس کے دانت نظر آئے۔ بے حد سفید اور بے حد خوار دانت۔ یہ ایک آدم خور کے دانت تھے۔ میرے ذہن کو جھٹکا لگا اور میں نے ان دانتوں کو اپنے جسم سے دور رکھنے کے لیے ایک دم پوری قوت لگا دی۔ میں نے ٹانچے اپنے جسم کو پہلے دائیں طرف موڑا اور پھر اچانک بائیں طرف زور لگا کر اسے الٹا دیا۔ اب ٹام نیچے اور میں اوپر تھا مگر یہ برتری تادیر برقرار نہیں رہ سکی۔ ٹام نے فوراً ہی مجھے ٹانگوں کے زور سے پیچھے اچھال دیا اور خود بھی جمپ کرکے کھڑا ہوگیا۔

ٹام کے ٹانگ کھینچنے کی وجہ سے میں ایک ستون سے ٹکرایا تھا اور اس ٹکر نے جہاں چند لمحے کے لیے میرے حواس معطل کردیے تھے وہاں میری آنکھ میں بھی شدید ٹیسیں اٹھنا شروع ہوگئی تھیں۔ آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہی ٹام نے ایک بار پھر چنگھاڑ کر مجھ پر حملہ کیا۔ پہلے اس نے کراٹے کے انداز میں ٹانگ چلائی پھر اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا' ڈورتھی کی نصیحت مجھے یاد تھی۔ میں نے اپنی بہترین کوشش کرکے خود کو ٹام کے طوفانی مکے کی زد سے نکالا۔ ڈورتھی کی اطلاع سو فی صد درست تھی۔ ٹام کے اس برق رفتار مکے نے میرے سینے کے زیریں حصے ہی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ٹام کے خالی مکے کی پاداش میں' میں نے اس کے چہرے پر تین چار تسلی بخش مکے رسید کیے اور پھر لات مار کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ ایک میز پر گرا اور اسے اپنے ساتھ ہی فرش بوس کرگیا۔ میز پر رکھی ہوئی کراکری چاروں طرف فرش پر بکھر گئی۔ میری اس کامیابی پر بھی داد کی آوازیں بلند ہوئیں مگر ان کی تعداد تین چار سے زائد نہیں تھی۔ شاید ان میں سے ایک آواز ڈورتھی کی بھی تھی۔ ٹوٹے ہوئے برتنوں میں سے ٹام نے شراب کی ایک خالی بوتل اٹھالی۔ اس بوتل کا نچلا حصہ ٹوٹ کر تیز دھار آلے کی سی شکل اختیار کرگیا تھا۔ ٹام بازو پھیلا کر میرے سامنے آیا اور ماہر چاقو زن کی طرح اس نے پے در پے کئی وار مجھ پر کیے۔ میں نے ہر بار حتی الامکان تیزی سے خود کو بچایا۔ سینے پر ایک معمولی خراش کے سوا میرا کچھ نہیں بگڑا۔ جونہی مجھے موقع ملا' میں نے ناک کر ٹام کی بغل کے نیچے لات رسید کی' وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا' اس کا سر پھٹ گیا اور بوتل چکنا چور ہوگئی۔

چوٹ کھا کر وہ زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ وہ اپنا مخصوص داؤ آزمانے کے چکر میں تھا' دوسری طرف میں بھی اس کی گردن ناپنے کے لیے موقع تاڑ رہا تھا' ڈیڑھ دو منٹ تک ہمارے درمیان شدید کشمکش ہوئی' وہ واقعی ایک سخت جان مدِمقابل تھا پھر آدم خوری کے حوالے سے اس کی ایک خاص دہشت تھی۔ اس سے لڑتے ہوئے مجھے یہی محسوس ہورہا تھا کہ میں بیک وقت ایک انسان نما درندے اور ایک درندہ نما انسان سے لڑ رہا ہوں۔ اس شدید کشمکش کے دوران میں ٹام نے دو تین بار نہایت وحشیانہ بے حجابی کے ساتھ میرے جسم پر دانت آزمانے کی کوشش کی' ایک بار تو اس کا منحوس منہ میری گردن سے چھو ہی گیا تھا تاہم میں کسی نہ کسی طرح خود کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اچانک ٹام نے مجھے اڑنگا لگایا' میں اوندھے منہ ایک میز پر گرا' اس کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زخمی آنکھ کے پیچھے دھماکے سے ہونے لگے ہیں' اس کے علاوہ درد کی ایک شدید ٹیس بھی محسوس ہوئی۔ یہ ٹیس میری داہنی کہنی سے اٹھی تھی۔ درحقیقت

مجھے میز پر اوندھا گراتے ہوئے ٹام نے میرے بازو کو پہلوانی انداز میں موڑا تھا اور کسی اندرونی پٹھے کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ کہنی کی تکلیف اپنی جگہ شدید تھی مگر آنکھ میں اٹھنے والی ٹیسیں مجھے جسمانی کے علاوہ نفسیاتی نقصان بھی پہنچا رہی تھیں۔ کوشش کے باوجود دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو رہا تھا کہ شاید اس مارا ماری میں میری آنکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے۔ ٹام نے عقب سے میرے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے اور میرا سر بار بار آہنی میز سے ٹکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے شک ایک طاقت ور شخص تھا' لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی آگاہ تھا لیکن وہ میرے لیے کبھی اتنا سخت مدِمقابل ثابت نہ ہوتا اگر میری آنکھ میں شدید تکلیف نہ ہوتی۔ اس تکلیف نے میری جسمانی و ذہنی توانائی کو آدھا کر رکھا تھا۔ کہنی پر دباؤ مزید بڑھا تو میں نے بے قرار ہو کر اپنی ایڑی سے ٹام کی ناف میں ضرب لگائی۔ جونہی بازو پر اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی' میں نے میز کا ایک کنارہ پکڑا اور خود کو میز سمیت الٹا دیا' یوں ٹام میرے اوپر میز کے نیچے آگیا پھرتی سے کروٹ بدل کر میں نے ٹام کی ہٹی کٹی گردن اپنے بازو کی گرفت میں لینا چاہی۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا مگر اس کے ساتھ ہی مجھ پر یہ مایوس کن انکشاف ہوا کہ کہنی پر سے میرا بازو تقریباً سن ہو گیا ہے اور لرزتا چلا جا رہا ہے۔ میں زور لگانے کے باوجود ٹام کی گردن پر مخصوص دباؤ نہیں ڈال سکا۔ ٹام نے جھٹکا دے کر اپنی گردن میرے بازو کے شکنجے سے آزاد کرالی۔ اپنے جس حربے پر مجھے ہمیشہ ناز رہا تھا وہ آج کام نہیں کر رہا تھا۔ آنکھ کی تکلیف کے بعد یہ دوسرا دھچکا تھا جو اس مقابلے میں مجھے پہنچا تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ تک میرے اور ٹام کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر مکے برسائے۔ اس نے بھی کئی بار میرے چہرے کو نشانہ بنایا۔ ہال میں زبردست ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ ہر طرف ٹوٹا ہوا فرنیچر اور برتن بکھرے تھے۔ غالباً کچھ لوگوں نے اس لڑائی پر شرطیں وغیرہ بھی لگا رکھی تھیں۔ وہ بڑھ چڑھ کر شور مچا رہے تھے۔ ٹام نے کئی بار مجھ پر اپنا مخصوص "پنچ" آزمانے کی کوشش کی مگر میں ہر بار بچ گیا' صرف ایک بار یہ پنچ اچٹتا ہوا سا میری پسلیوں پر لگا اور مجھے اس کی قوت و خطرناکی کا صحیح اندازہ ہوا۔ ڈور تھی کی اطلاع میرے لیے واقعی بہت کارآمد ثابت ہو رہی تھی۔

دوسرے راؤنڈ کے اختتام پر تین چار منٹ کا وقفہ ہوا۔ ریفری ایڈی سن نے ہم دونوں سے پوچھا کہ ہم میں سے کوئی ریٹائر ہونا تو نہیں چاہتا۔ ٹام نے انکار کر دیا' میں نے بھی انکار کیا۔ آخری اور فیصلہ کن راؤنڈ شروع ہو گیا۔ یہ راؤنڈ شروع ہونے کے ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی میری زخمی آنکھ کے قریب مکا لگا اور آنکھ سے باقاعدہ خون ٹپکنا شروع ہو گیا۔ ان لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ کو شدید نقصان پہنچ گیا ہے۔ اس مایوس کن خیال نے میرے اندر غم و غصے کی شدید لہر پیدا کی۔ میں نتائج سے بے پروا ہو کر اور پوری قوت جمع کر کے ٹام پر ٹوٹ پڑا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں اس لڑائی میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کیونکہ میرے پیچھے غزالہ تھی' اس کی عزت و آبرو تھی اور میرے دیگر ساتھی تھے۔ مجھے اپنے لیے زندہ رہنے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی ان کے لیے زندہ رہنے کی فکر تھی۔ میری ہار صرف میری ہار ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی' یہ میرے تمام ساتھیوں کی ہار تھی اور غزالہ کی ہار تھی۔ میں نے اسے سرِعام نہ چوم کر شرمندہ ہونے سے بچایا تھا' اب اگر میں ہار جاتا تو وہ شرمندگی کئی گنا اضافے کے ساتھ غزالہ کی طرف واپس لوٹ آتی۔ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ عین ممکن تھا کہ جو کام میں نے کرنے سے انکار کیا تھا' وہی کام میرا حریف ٹام انجام دیتا اور سب کے سامنے انجام دیتا' یا پھر۔ اس سے بھی بدترین صورتِ حال کا سامنا غزالہ کو کرنا پڑتا۔ میں نے اپنی زخمی آنکھ بچانے کا خیال یکسر ذہن سے نکال دیا اور کشتیاں جلا کر ٹام پر ٹوٹ پڑا۔

یہ اس مقابلے کی شدید ترین لڑائی تھی۔ میرا ایک مکا کھا کر ٹام اڑتا ہوا سا تماشائیوں پر گرا۔ ہم تماشائیوں کا گھیرا توڑ کر ہال کے ایک گوشے میں لڑنے لگے' ٹام میرے بازو پر دو جگہ اپنے دانت گاڑنے میں کامیاب ہوا تھا اور دونوں جگہ سے اس نے گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آخر ٹام ایک ایسے داؤ کی زد میں آگیا جو مقابلے کے شروع میں اس نے مجھ پر آزمایا تھا' اس کی ٹانگ میری گرفت میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری ٹانگ استعمال کرتا' میں نے طوفانی جھٹکے کے ساتھ اسے ہوا میں معلق کر دیا۔ بالکل جیسے "ہیمر تھرو" کی جاتی ہے۔ میں نے اسے پورے زور سے دو چکر دیے اور دیوار سے دے مارا۔ اس کی قسمت نے تھوڑی بہت یاوری کی کہ دیوار سے ٹکرانے سے پہلے وہ ایک پہرے دار سے ٹکرایا ورنہ اس کی کھوپڑی خربوزے کی طرح پھٹ گئی ہوتی۔ کھوپڑی پھٹی نہیں لیکن اسے ناقابلِ برداشت ضعف ضرور پہنچا۔ ٹام اپنی جگہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میں نے اسے دبوچ لیا۔ یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا' میں ٹام کی گردن توڑ کر یہ کھیل ختم

کرسکتا تھا۔ میرے اردگرد تماشائیوں کا شور فلک شگاف ہوگیا تھا۔ اب بہت سے لوگ میرے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ غالباً وہ میری اس شدید مزاحمت سے متاثر ہوئے تھے جو میں نے زخمی آنکھ کے باوجود ٹام کو پیش کی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک ماؤزر پر پڑی۔ یہ ماؤزر اس پہرے دار کی بیلٹ سے گرا تھا جو ابھی چند لمحے پہلے ٹام سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیم جان ٹام آخری کوشش کے طور پر ماؤزر کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ یہ سراسر فاؤل پلے تھا مگر جب موت سامنے نظر آرہی ہو تو کھیل کے قواعد و ضوابط پر کس کی نگاہ رہتی ہے۔ ٹام کا ہاتھ ماؤزر سے قریباً ایک فٹ کی دوری پر تھا مگر یہ ناقابلِ عبور فاصلہ تھا۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لیے ٹام کو ایک اور زندگی درکار تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں یہ مقابلہ جیت چکا ہوں' میں ٹام پر پوری طرح حاوی ہوچکا تھا' میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت ٹام کی گردن پر تھی' اس کا منکا توڑنے کے لیے بس ایک مذبذب سے جھٹکے کی ضرورت تھی مگر اس سے پہلے کہ میں یہ کام کر گزرتا' دو دھماکے ہوئے' میں نے ٹام کی کنپٹی پر ایک نیم سرخ سوراخ نمودار ہوتے دیکھا' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' دوسرا سوراخ اس کی سیاہ پیشانی پر نمودار ہوا تھا۔ ٹام کے جسم نے جھٹکا کھایا اور میرے بوجھ تلے یک دم بے جان ہوگیا۔ اس کی گردن جو چند لمحے پہلے میرے ہاتھوں میں لکڑی کی طرح سخت تھی' باسی مولی کی طرح ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے دیکھا' گولی چلانے والا مائیکل خود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اعشاریہ تین آٹھ کا کولٹ پسٹل صاف نظر آرہا تھا۔ تماشائی چند لمحے کے لیے سکتے میں چلے گئے تھے پھر وہ ایک دم ہماری طرف لپکے' مجھے اور ٹام کو گھیر لیا گیا۔ میں ٹام کے اوپر سے اٹھ گیا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ہال کے فرش پر دور تک پھیل رہا تھا۔

مائیکل مستحکم قدموں سے چلتا ہوا ٹام کے قریب پہنچا۔ اس نے پہرے دار کا گرا ہوا ماؤزر اٹھالیا اور بڑے اسٹائل سے بولا "اصول اور ضابطے کی خلاف ورزی جو بھی کرے گا اسے سزا ملے گی۔ چاہے وہ ہمارا ساتھی ہی کیوں نہ ہو۔"

میں نے کہا "سزا تو اسے میرے ہاتھوں ملنے والی تھی مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے سزا دینے کی جلدی تھی۔"

"اسی جلدی نے تمہیں شدید خطرے سے بچایا ہے۔" مائیکل نے کہا "اس کا ہاتھ ماؤزر تک پہنچ جاتا تو تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ کیا ہوسکتا تھا۔"

میں نے گہری نظروں سے مائیکل کو دیکھا' مجھے اس کی آنکھوں میں کینگی کی جھلک نظر آئی۔ وہ واقعی ایک گہرا' خطرناک اور کینہ دشمن تھا۔ میرے خیال میں ہال میں موجود دوسرے لوگوں کی طرح اس نے بھی صاف دیکھ لیا تھا کہ میں ٹام کو قریباً بے بس کرچکا ہوں اس نے صرف میری واضح برتری کو شک میں ڈالنے کے لیے گولی چلائی تھی۔ یہ ایک تیر سے دو شکار والا معاملہ تھا' ایک طرف اس نے مجھ پر احسان کیا تھا کہ اصول کی خلاف ورزی کرنے پر اس نے اپنے ہی ساتھی کو گولی سے اڑا دیا ہے' دوسری طرف میری صاف فتح کے تاثر کو دھندلا دیا تھا مگر سچائی بناوٹ کے اصولوں سے مکمل طور پر چھپائی نہیں جاسکتی' اردگرد کے لوگوں پر اس کا تھوڑا بہت اثر ہو کر رہتا ہے۔ میں تماشائیوں کے چہرے دیکھ رہا تھا' ان میں زیادہ تر ٹام ہی کے حامی تھے' اس کے باوجود ان کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس مقابلے میں مجھے غالب سمجھ رہے ہیں۔

ڈورتھی تماشائیوں کو چیرتی ہوئی آگے آئی۔ اس نے مجھے گلے لگالیا اور زور سے بھینچتے ہوئے بولی "تم کامیاب ہو شاہ جہاں۔ تم نے اپنی برتری ثابت کردی ہے۔ ٹام کا ماؤزر پکڑنے کی کوشش کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مکمل طور پر ہار چکا تھا۔"

دو چار اور ہاتھ بھی تھپکی دینے والے انداز میں میرے شانوں پر آئے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر مجھے قمیص پہنا دی اور دستی گھڑی میرے ہاتھ پر باندھ دی۔ مائیکل چند لمحے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اعلان کرنے والے انداز میں بولا "مقابلے کے جو اصول اور قاعدے تھے ان کے مطابق تم فاتح ہو شاہ جہاں۔ میرے خیال میں اب تمہیں اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ایک بالکل صاف مقابلہ تھا اور ہم اس میں قطعی غیر جانبدار تھے۔"

اس اعلان پر چند پرجوش افراد کے سوا سب نے رسمی انداز میں تالیاں بجائیں اور منتشر ہونے لگے۔ ان کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ ٹام کی لاش کو سیدھا کیا گیا پھر ایک اسٹریچر پر ڈال کر وہاں سے ہٹالیا گیا۔ میرا ایک بازو ابھی تک لرزتا چلا جارہا تھا' آنکھ کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ ڈورتھی نے گیلے رومال سے میری آنکھ کا خون صاف کیا اور تشویش ناک نظروں سے جائزہ لینے لگی۔ میں نے ایک آنکھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بصارت چیک کی' سرخی نے ہر شے کو دھندلا رکھا تھا۔ میں ڈورتھی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہال سے باہر آگیا۔ ڈورتھی مجھے سیدھا

غزالہ کے پاس لے گئی۔

غزالہ کھڑکی سے لگی باہر دیکھ رہی تھی' وہ لپک کر باہر آئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پہلی نظر میں پتا چلتا تھا کہ وہ مسلسل روتی رہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پارہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈورتھی سے پوچھا "مقابلہ ختم ہوگیا؟"

"ہاں' مقابلہ ختم ہوگیا اور مقابلہ کرنے والا بھی۔"

غزالہ کا رنگ زرد ہورہا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ میری آنکھ پر مرکوز کردی۔ وہ ڈورتھی سے بولی "ان کی آنکھ کو بڑی اچھی طرح دیکھنا پڑے گا۔ کیا ہم کسی طرح کلینک میں نہیں جاسکتے؟"

"اس کے لیے مائیکل سے اجازت لینا پڑے گی۔" ڈورتھی نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی "اچھا میں کوشش کرتی ہوں' تم ادھر ہی رکو۔"

ڈورتھی چلی گئی۔ اپارٹمنٹ کے دروازے پر مسلح پہرے دار چوکس کھڑا تھا۔ چند منٹ بعد ڈورتھی واپس آئی' اس کے ساتھ ایک اور محافظ بھی تھا' ڈورتھی نے کہا "مائیکل نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ تمہارے ہاتھ میں لاک لگایا جائے گا۔" لاک سے ڈورتھی کی مراد ہتھکڑی تھی۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اگر میں اس کے نزدیک اتنا ہی ناقابلِ بھروسا ہوں تو وہ ہتھکڑی لگالے۔"

محافظ نے آگے بڑھ کر میری کلائیاں ہتھکڑی میں جکڑ دیں۔ ہاں اتنی رعایت کی گئی تھی کہ ہتھکڑی سامنے کی طرف لگائی گئی تھی۔ درحقیقت غزالہ اس اپارٹمنٹ میں ایک یرغمالی کی حیثیت سے رکھی گئی تھی۔ دوسرے کیبن میں بیٹھا ہوا ایک شخص صرف ایک بٹن دبا کر غزالہ کے اپارٹمنٹ میں موجود بم کو بلاسٹ کرسکتا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے مشروط آزادی ملی ہوئی تھی' یعنی میری آزادی کی شرط یہ تھی کہ غزالہ اور تابی اپارٹمنٹ میں موجود رہیں۔ اب چونکہ غزالہ میرے ساتھ کلینک میں جارہی تھی لہٰذا مجھے ہتھکڑی ڈال دی گئی تھی۔ غزالہ مجھے لے کر کلینک نما کمرے میں پہنچی۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں چند روز پہلے ہم نے نائب کپتان فلیمنگ کا آپریشن کیا تھا۔ یہاں دوائیں اور طبی امداد کا کافی سامان موجود تھا۔ غزالہ نے مجھے صوفے پر لٹا دیا اور آنکھ کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ بعد ازاں اس نے کسی محلول سے آنکھ دھوئی اور ڈراپس وغیرہ ڈال کر پٹی باندھ دی۔ غزالہ کچھ مطمئن نظر آرہی تھی۔ کم از کم اتنی پریشان نہیں تھی جتنا میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہوگی۔ آنکھ سے فارغ ہو کر اس نے میری کہنی کا معائنہ کیا اور کوئی دس قسم کی چیز لگانے کے بعد پٹی کے ذریعے بازو میرے گلے میں لٹکا دیا۔ اس کے بعد اس نے میری چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ پر توجہ دی۔ ماہر مستری کی طرح کئی جگہ مجھے مرہم لگائی اور کھانے کے لیے بھی ایک دو گولیاں دیں۔

میں نے کہا "میری چشمِ بیمار کا کیا حال ہے؟"

"اتنا برا نہیں جتنا نظر آرہا تھا اور جتنا مجھے اندیشہ تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے کہ آنکھ کے پیچھے خون کا انجماد نہیں رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ شاک کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی اور سبب سے۔ بہرحال خون کا بہہ نکلنا آپ کے حق میں اچھا ہی رہا ہے۔"

میں نے کہا "شاید اسی قسم کے موقع کے لیے محاورہ استعمال کیا جاتا ہے کہ گیدڑ کی لات راس آگئی۔"

"آپ کو مذاق کی باتیں سوجھ رہی ہیں لیکن یہ کچھ مجھے ہی معلوم ہے کہ پچھلا ایک گھنٹا میں نے کیسے گزارا ہے۔ ہر لمحہ گولی پر لٹکی رہی ہوں۔ میں لڑائی دیکھ تو نہیں رہی تھی لیکن ساری آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے' چیزیں ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں پھر گولیوں کے دھماکے سنائی دیے۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہورہا ہے۔"

"اسی لیے تو کہا تھا کہ ساتھ چلی چلو۔ سامنے کے خوف سے چھپا ہوا خوف زیادہ وحشت ناک ہوتا ہے۔"

"وہاں جاتی تو اسٹریچر پر ہی آتی۔"

"کیوں' اتنی اہمیت ہے میری؟"

ایک دم غزالہ کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ بول گئی ہے' اس کے ساتھ ہی شاید اسے وہ "صورتِ حال" بھی یاد آگئی تھی جس میں اسے چھوڑ کر "دنگل" میں شرکت فرمانے گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم سرخی لہرائی۔ کچھ بولنے کے بجائے وہ ایک دم گم صم ہوگئی اور میرے لیے انجکشن تیار کرنے لگی۔ اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے میں نے بھی مزید مکالمے سے اجتناب کیا۔

انجکشن لگوانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ خوفناک مشقت کے بعد یوں لیٹنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں ایک جان لیوا مقابلے سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا مگر میرے ہونٹوں پر ابھی تک وہ لمس موجود تھا جو میرے لیے زندگی کا دوسرا نام تھا۔ اس لمس کے احساس کو ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا مگر اس لمس کی شیرینی اور محبت پہلے لمحے کی

طرح میرے ذہن پر موجود تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" غزالہ نے پوچھا۔

"جو سوچ رہا ہوں وہ مجھ تک ہی رہنے دو۔"

غزالہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "ایک ایڈوائس کرنا چاہتی ہوں آپ کو۔ سمندری ہوا سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کیجئے۔ اس میں نمک کے بخارات اور کئی دوسرے فاسد مادّے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو کبھی کبھار ایسا سفر کرتے ہیں' اکثر متاثر ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دو تین دن تابی کو حرارت رہی ہے' اب شائستہ بھی بیمار ہے۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"بس ٹھیک نہیں ہے وہ۔ سینے میں درد بتاتی ہے۔ کل بلڈ پریشر بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ یہاں بس گنتی کی دوائیں ہیں' ان میں سے ہی میں نے ایک دوا دی تھی۔ اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔ دراصل وہ موجودہ صورتِ حال کا اثر بھی بہت لے رہی ہے۔ ایرانی جہاز کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کے لیے ایک دہشت ناک خواب کی طرح ہے۔ اگر آپ بر وقت اسے غوطے کھانے سے نہ بچاتے تو شاید وہ زندہ بھی نہ ہوتی۔ اس واقعے کو یاد کر کے وہ دو تین بار تو میرے سامنے روئی ہے پھر اسے باپ کا غم بھی ہے۔ وہ پروفیسر سے ملنے کے لیے ترس رہی ہے مگر مائیکل نے باپ بیٹی کے ملنے پر پابندی لگا دی ہے۔ اس کی منطق یہ ہے کہ پروفیسر سے مل کر شائستہ روتی دھوتی ہے اور اس کی طبیعت مزید خراب ہو جاتی ہے۔"

"وہ بڑا کمینہ شخص ہے۔" میں نے کہا "میرے خیال میں وہ پروفیسر کو اس لیے شائستہ کے پاس نہیں جانے دے رہا کہ باپ بیٹی کے ملنے سے اس کا راز فاش ہو گا۔"

"کیسا راز؟"

"یہی کہ مائیکل نے شائستہ اور دیگر دونوں افراد کو سیر کے لیے ایرانی جہاز پر نہیں بھیجا تھا بلکہ ان کی حیثیت وہاں ضمانتیوں کی سی تھی۔"

"ہاں یہ بات بھی ہو سکتی ہے۔"

"سو فی صد یہی بات ہے۔ بلکہ ایک بات اس سے بھی بڑی ہے اور زیادہ گمبھیر بھی۔ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں کسی راز میں شریک کر کے کبھی افسوس نہیں ہوا۔"

"کیسی بات؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "غزالہ! یہ مائیکل بدبخت ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر سفاک اور بد باطن شخص ہے۔ شائستہ کی حیثیت اس کے نزدیک ایک زر خرید کنیز کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایرانی جہاز کی تباہی کے وقت اس نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے شائستہ کی موت کو بخوشی قبول کر لیا تھا۔ فریہ اندام مارکوس اور مائیکل کے درمیان ہونے والا مکالمہ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ یہ مکالمہ "اے ٹو" کی تباہی سے صرف چند سیکنڈ قبل ہوا تھا۔"

میں نے اس واقعے کی تفصیل غزالہ کو بتائی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بولی "اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اپنے چچا زاد بھائی اور تیسرے ساتھی کی موت کا ذمے دار بھی وہ خود ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔"

"لیکن چچا زاد کی موت پر تو وہ سوگ منا رہا تھا اور اپنے قبیلے والوں سے گلے مل مل کر ان سے تسلیاں لے رہا تھا۔"

"میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ہماری توقعات سے بڑھ کر بد باطن ثابت ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جہاز کے منزل پر پہنچنے تک پروفیسر اور شائستہ کو ملنے نہیں دے گا۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ پروفیسریوں غائب ہو جائے جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اسے مار دیا جائے گا؟"

"مار دیا جائے۔ یا بیچ دیا جائے۔ یا کہیں اور بھیج دیا جائے' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

پہرے دار جوزف کلینک سے باہر چوکس کھڑا تھا۔ غزالہ میری مرہم پٹی سے فارغ ہو گئی تو جوزف نے غزالہ سے کہا کہ باس کی ہدایت کے مطابق اسے واپس اپنے اپارٹمنٹ میں جانا ہو گا۔ میں وہیں کلینک کے ایک صوفے پر لیٹا رہا' غزالہ گم صم سی ہو کر اپارٹمنٹ میں تابی کے پاس واپس چلی گئی۔ غزالہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک پہرے دار نے میری ہتھکڑی کھول دی تاکہ میں آرام سے لیٹ سکوں۔ مجھے نیند آ گئی مگر میں ساری رات درد سے کراہتا بھی رہا۔ بدن کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا۔ جہاں جہاں میرے آدم خور حریف نے اپنے دانت آزمائے تھے وہاں رات بھر جلن ہوتی رہی۔ سب سے زیادہ تکلیف دائیں بازو کی کہنی میں تھی۔ کروٹ بدلتا تھا تو فوراً آنکھ کھل جاتی تھی۔

علی الصباح میں اٹھ بیٹھا۔ ابھی اُجالا اندھیرے پر غالب نہیں آیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا عرشے پر پہنچ گیا۔ میرا ارادہ غزالہ کی طرف جانے کا تھا۔ عرشے کی سیڑھیوں کے قریب مجھے پروفیسر اللہ دتا نظر آیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے فرش پر بیٹھا تھا' میں نے اسے آواز دی تو وہ چونک کر میری

طرف دیکھنے لگا' مجھے یوں لگا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک رو رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

پروفیسر نے کہا "نئی زندگی مبارک ہو شاہ جہاں۔ ٹام سے مقابلہ جیتنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جیتا کہاں ہوں۔ وہ تو "باس صاحب" نے بروقت گولی چلا کر میری جان بچالی۔"

پروفیسر بولا "اس نے تمہاری فتح کو دھندلانے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت کو بناوٹ سے چھپایا نہیں جا سکتا۔ وہاں جو کچھ ہوا ہے وہ سب نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"خیر چھوڑیں اس بات کو۔" میں نے کہا "آپ بتائیں۔ آپ کیوں اتنے گم صم نظر آ رہے ہیں؟"

میرے اظہارِ ہمدردی پر ایک دم پروفیسر کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولا "غزالہ نے تمہیں بتایا ہی ہو گا کہ شائستہ بیمار ہے۔"

میں نے کہا "مگر اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ سمندری سفر ہے' بہت سے لوگوں کی طبیعت سُست ہو رہی ہے۔"

"نہیں شاہ جہاں۔" پروفیسر نے بے قراری سے سر ہلایا "میری بیٹی بڑی نازک مزاج ہے۔ وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔ وہ جتنے ناز و نعم میں پلی تھی اتنی ہی بڑی مصیبتیں اس پر آن پڑی ہیں۔ اس کے سینے میں جو درد ہے وہ سانس کی تکلیف کی وجہ سے ہے' یہ تکلیف ایک دو بار پہلے بھی اسے ہوئی ہے۔ اس کا علاج میں نے خود ہی کیا تھا۔ اب بھی کر سکتا ہوں۔ مگر مائیکل مجھے اس سے ملنے نہیں دے رہا۔ کتنے افسوس کی بات ہے شاہ جہاں! ایک خلقت کو میرے ذریعے سے شفا ملی ہے لیکن آج میں اپنی ہی بیمار بیٹی کو دوا نہیں دے سکتا۔ مائیکل مجھے نیم حکیم اور ڈھونگی کا خطاب دے رہا ہے۔"

پروفیسر کا چہرہ غم کی آماجگاہ بن گیا۔ میں نے پوچھا "کیا آپ نے اس سے کہا تھا کہ آپ شائستہ کا علاج کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں میں نے کہا تھا۔ میں نے مائیکل کو بتایا تھا کہ میں ایک دو بار پہلے بھی اس کا علاج کر چکا ہوں۔ وہ دو تین روز میں بھلی چنگی ہو جائے گی۔ جواب میں وہ بولا ــــ تم بیٹی سے ملنے کے لیے صرف ڈھونگ رچا رہے ہو۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے دھونے والی باتیں کرو گے اور اسے بھی رلاؤ گے۔ میں نے قسم کھا کر مائیکل کو یقین دلایا کہ میری آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلے گا' نہ ہی میں کوئی ایسی بات کروں گا مگر اس نے مجھے دھکے دے کر واپس بھیج دیا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے پہلو سے سوچ رہا ہو۔ آپ کے پاس یہاں اپنی دوائیں موجود نہیں ہیں۔ آپ شائستہ کو کیا دیتے؟"

"میں نے مائیکل کو اس بات کا جواب بھی دیا تھا۔" پروفیسر نے کہا "شاید تمہیں علم ہی ہو گا' میری دواؤں کا بنیادی جزو مٹی ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرح کا اناج اور چند ایلوپیتھک میڈیسن بھی یہاں موجود ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنا گزارہ کر سکتا ہوں مگر یہ سب باتیں تو اس وقت کی ہیں جب مائیکل رضامند ہو' وہ تو مجھے شائستہ کو دیکھنے تک کی اجازت نہیں دے رہا۔ یہ کیسا ستم ہے شاہ جہاں۔ وہ میری اولاد ہے' میں نے اسے پالا ہے' بیس سال وہ میرے جسم کے حصے کی طرح رہی ہے' آج اسی شائستہ پر میرا حق نہیں۔ وہ شخص اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے جسے کل تک وہ جانتی بھی نہ تھی۔ وہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے۔ نہ اپنی مرضی سے بیٹھ سکتی ہے نہ اٹھ سکتی ہے' نہ سانس لے سکتی ہے۔"

پروفیسر بھی غالباً بہت سے لوگوں کی طرح آدابِ غلامی سے واقف نہیں تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ بااختیار انسان کبھی کبھی اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے لیے کتنا جابر اور قہرمان بن جاتا ہے۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ غزالہ شائستہ کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اسے امید ہے کہ شائستہ کی تکلیف طول نہیں کھینچے گی۔

پروفیسر نے دائیں بائیں دیکھا پھر سرگوشی میں بولا "شاہ جہاں! میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

پروفیسر نے چادر کی بکل سی مار رکھی تھی۔ بکل کے نیچے اس نے کچھ ٹٹولا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ عرشے پر جس جگہ ہم بیٹھے تھے اسے دیکھا جا رہا تھا۔ مائیکل نے مجھے خود ہی وی کیمرے کے ذریعے عرشے کے اس حصے کا منظر دکھایا تھا۔ میں نے غیر محسوس طور پر بکل کے اندر ہی پروفیسر کا ہاتھ دبوچ لیا "نہیں' ابھی رہنے دیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" پروفیسر قدرے حیران تھا۔

"یہ آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ــــ آپ مجھے زبانی بتا دیں کہ یہ کیا چیز ہے۔"

"مگر ــــ بات کیا ہے؟"

"دیکھیں ــــ یہاں ان لوگوں نے وڈیو کیمرا لگایا ہوا ہے۔ جہاز کے مختلف حصوں کی ہر وقت نگرانی کی جاتی ہے۔"

پروفیسر کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا میں اسے مزید تفصیل بتاتا' بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دو حبشی پہرے دار وہاں پہنچے۔ ان کے ساتھ عملے کا ایک اٹالین رکن بھی تھا۔ اٹالین شخص نے پروفیسر کو بتایا کہ "باس" اسے یاد کر رہے ہیں۔ پروفیسر کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور یہ صرف پروفیسر کی بات ہی نہیں تھی' مائیکل کی دہشت ہی اتنی تھی۔ وہ کسی کو بھی طلب کرتا' اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ پروفیسر اٹھا اور پہرے داروں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اگلے روز شام کو میں نیچے کیبنوں میں پہنچا تو زریں گل نظر نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ ٹوائلٹ میں ہو گا مگر صفدر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کتنے بھی بے تکلف سہی' اکٹھے تو ٹوائلٹ میں نہیں جا سکتے تھے۔ یقیناً ان دونوں میں سے ایک کیبن میں موجود نہیں تھا پھر میری نگاہ گلثوم پر پڑی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور خاصی اداس نظر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ زریں گل کیبن میں نہیں ہے۔

میں نے گلثوم سے پوچھا "خیریت تو ہے' زریں کہاں ہے؟"

وہ بولی "زریں کو نوکری مل گیا۔ وہ ماشاء اللہ باہر گیا۔"

میں حیران رہ گیا' گلثوم تو ایسے کہہ رہی تھی جیسے جہاز کے اندر ہی زریں کا ویزا آ گیا ہو اور وہ فورمین بن کر کویت یا دبئی وغیرہ چلا گیا ہو۔ میں نے پوچھا کہ کیسی نوکری؟

وہ بولی "تیل کا نوکری۔"

"یا خدا خیر۔ کہیں وہ تیل کا وزیر وغیرہ تو نہیں لگ گیا۔" میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "تیل رگڑنے کا نوکری۔"

"تیل رگڑنے کی نوکری؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

اگر رگڑنے سے گلثوم کی مراد خرد برد کرنا تھی' تو پھر تو زریں ضرور وزیر پیٹرولیم لگ گیا تھا' ایسے لوگ سب کچھ رگڑ جاتے ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا۔

اسی دوران میں صفدر مسکراتا ہوا ٹوائلٹ سے باہر آ گیا۔ بولا "گلثوم کے سبب ہم سب کی زبان بہت اچھی طرح خراب ہو گی انشاء اللہ۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے بھی کہا "لیکن یہ کہہ کیا رہی ہے اور زریں گل کا بچہ کہاں ہے؟"

صفدر بولا "وہ بتا تو رہی ہے کہ وہ تیل رگڑنے چلا گیا ہے' یعنی مالش کرنے۔"

"کس کی مالش؟"

صفدر نے بتایا "ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے موصوف میرے سر پر مالش کر رہے تھے۔ بڑے ایکشن کے ساتھ' بالکل مالشیوں والے انداز میں۔ ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہے تھے۔ اسی دوران میں نائب کپتان آرتھر اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ یہاں پہنچ گیا۔ میرا اور زریں کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ دونوں پیچھے کھڑے خاموشی سے زریں کے ایکشن دیکھتے رہے پھر آرتھر نے زریں گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تو زبردست مساج کرتا ہے بلکہ اسے تو مساج مشین کہنا چاہیے" پھر اس نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں نہ یہ مشین باس کو تحفے میں دی جائے۔ ان کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گا اور خوش بھی بہت ہوں گے۔" بس اس کے بعد زریں گل کو باہر نکالا گیا۔ اس نے بہتیرا پوچھا کہ کہاں لے جا رہے ہو۔ انہوں نے ایک نہیں سنی اور دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ اس وقت سے یہ بلبلِ صحرا چونچ لٹکائے بیٹھی ہے۔" صفدر کا اشارہ گلثوم کی طرف تھا۔

میں نے گلثوم کو سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ زریں گل پکی نوکری پر نہیں گیا۔ کچی نوکری ہے۔ تیل رگڑائی کے بعد واپس آ جائے گا۔

"انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔" گلثوم نے جلدی جلدی سر اوپر نیچے ہلایا "ام کو اس کا بہت فکر۔۔۔ وہ ٹھیک نہیں۔ اس کا دماغ ہلتا ہے۔"

صفدر مسکرایا "دماغ ہلتا نہیں بلکہ ہلا ہوا ہے۔"

"نہیں ہلتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب سر ہلتا ہے تو دماغ بھی ہلتا ہے۔ اس کے سر میں درد ہوتا۔ اس کو ڈاکٹری کھلاؤ۔"

"ڈاکٹری نہیں کھلاتے' دوائی کھلاتے ہیں۔" صفدر نے تصحیح کی "اگر زریں ڈاکٹری ہی کھا گیا تو پھر جہاز کے مریضوں کا علاج کون کرے گا اور صرف مریضوں کا ہی نہیں اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کا نقصان ہو گا۔" صفدر نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

میں رات گئے تک صفدر اور گلثوم کے پاس رہا۔ ہم نے رات کا کھانا بھی کیبن میں ہی کھایا۔ صفدر نے بتایا کہ انڈین قیدیوں سمیت اب تمام قیدی سکون سے ہیں۔ اکثر پردیشی قیدی بھی اب باقاعدگی سے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے۔ حبشی پہرے داروں کے حوالے سے ان کا غیر معمولی خوف بھی اب قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کیبن کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ لیتے تھے تو اپنے مخصوص لہجے میں تیز تیز بولنے لگتے تھے اور ہاتھوں کے اشاروں سے مجھے اپنے پاس

بلاتے تھے۔ اگر میں قریب جاتا تھا تو وہ اپنے مسائل بیان کرتے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل ہوتے تھے۔ کسی کے بچے کو بخار ہوتا تھا' کسی کو رات میں اوڑھنے کے لیے چادر وغیرہ درکار ہوتی تھی' کسی کیبن میں پانی وغیرہ کا مسئلہ ہوتا تھا۔ میں پہرے داروں سے کہہ کر یہ مسائل حل کر دیتا تھا۔ میری اس معمولی سی کاوش کے بدلے میں وہ ایسی احسان مندی کی نظروں سے مجھے دیکھتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا۔ نو عمر ماں کملا خاص طور پر مجھ سے مانوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ جاتی تھی۔ ایک دو بار میں نے اس کا بچہ گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ایسی خوشی نظر آئی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ وہ ایک ماں تھی لیکن اپنے بچے ہی کی طرح معصوم اور سادہ دل نظر آتی تھی۔

رات دس بجے کے بعد سمندر میں ہلکی سی طغیانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس طغیانی کا اندازہ جہاز کو لگنے والے ہچکولوں سے ہوتا تھا۔ میں سمندر کا نظارہ کرنے کے لیے زریں کمپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ اب میرے اس طرح آنے جانے پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ میں پہلے عرشے پر پہنچا تو وہاں مکمل سکوت تھا۔ دور سیڑھیوں کے پاس بس ایک پہرے دار نظر آ رہا تھا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے' اکثر لوگ سو رہے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا لہٰذا جہاز کے اردگرد لہروں کا نظارہ کرنا مشکل تھا۔ میں عرشے کے جنگلے کے ساتھ کہنیاں ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ غزالہ کی پیش گوئی کے عین مطابق آنکھ کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ جسم کی دیگر چوٹوں میں بھی افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آہٹ میرے عقب میں اسٹور روم کی طرف سے ابھری تھی۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے کوئی بھاگ کر اسٹور کے پیچھے چھپ گیا ہو۔ میں چوکنا ہو گیا۔ صرف ۴۸ گھنٹے پہلے حبشی ٹام سے میرا خون ریز مقابلہ ہو چکا تھا اور ٹام اس مقابلے کے نتیجے میں عدم آباد سدھار چکا تھا' یقینی بات تھی کہ ٹام کے ساتھیوں اور دوستوں نے یہ سب کچھ آسانی سے برداشت نہیں کیا ہو گا۔ مجھے ان لوگوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں نائب کپتان آرتھر نے بھی مجھے ہلکا سا اشارہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا "تم نے پہلے سائن کو اور اب ٹام کو مار کر حبشیوں کے پورے ایک قبیلے کو اپنے خلاف کر لیا ہے۔"

میں تیزی سے اسٹور روم کی طرف آیا اور اس کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر کوئی واقعی یہاں موجود تھا تو وہ اسٹور روم کی دوسری طرف تاریکی میں تھا۔ میں چند لمحے تک سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر بے آواز قدموں سے اسٹور کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں ایک بار پھر کھٹ پٹ ہوئی اور ایک سایہ اسٹور کے عقب سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں نے تیزی سے اس کا پیچھا کیا۔ سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سایہ دائیں جانب اپارٹمنٹس کی طرف مڑ گیا۔ وہ بہت زیادہ پھرتیلا نظر نہیں آتا تھا' جسم بھی قدرے بھاری تھا۔ غالباً اسی لیے اس نے سیڑھیوں کا رخ نہیں کیا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اگر اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترنے کی کوشش کی تو لڑھک جائے گا۔ عرشے پر بھاگ دوڑ کی آواز سن کر سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا محافظ بھی رائفل لہراتا ہوا دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر بھاگنے والا اپارٹمنٹس تک پہنچ گیا تو پھر اس کے بچ نکلنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کی اور پھر جست لگا کر اسے عقب سے دبوچ لیا۔ وہ میرا دھکا کھا کر اوندھے منہ گرا۔ چوٹ لگنے سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کراہ نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ پروفیسر اللہ دتا تھا۔ میرا ایک ہاتھ پروفیسر کی کمر پر اور دوسرا بازو پر تھا۔ میں نے پروفیسر کو جلدی سے سیدھا کیا۔ اسی اثنا میں رائفل بردار پہرے دار بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے عقب میں عملے کے دو اٹالین ارکان تھے۔ حبشی پہرے دار نے خوفناک انداز میں اپنی رائفل کی نال پروفیسر کے سینے پر رکھ دی۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس ایک اٹالین کے ہاتھ میں بھی ریوالور نظر آ رہا تھا۔

اس نے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بہت خوب۔۔۔ تو یہ تم ہو بوڑھے گدھ۔"

اس نے پروفیسر کو قمیص کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ پروفیسر تھر تھر کانپ رہا تھا "ایک نمبر کے ڈھیٹ ہو تم۔" اٹالین نے کہا "تمہارا نام تو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہونا چاہیے۔ ریکارڈ کا ٹائٹل ہونا چاہیے۔۔۔ سیانی بیٹی کا دیوانہ باپ!"

چند لمحے میں وہاں مزید کچھ افراد بھی اکٹھے ہو گئے۔ پروفیسر مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ دونوں اطالویوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ پروفیسر چونکہ بار بار شائستہ سے ملنے کا تقاضا کرتا تھا لہٰذا مائیکل کے حکم پر اس کا داخلہ پہلے اور دوسرے عرشے پر قطعی بند کر دیا گیا تھا' مائیکل نے اسے پہرے داروں کی تحویل میں دے دیا تھا تاکہ وہ اسے گودام کے قریب واقع اپنے کیبنوں میں رکھیں۔ کل صبح جب میں اور پروفیسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے' مائیکل کے آدمی

آگر پروفیسر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس وقت مائیکل نے پروفیسر کے لیے یہی ہدایت جاری کی تھی۔

مائیکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا موقع پر پہنچا تو سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ مائیکل اپنے سامنے کھڑے پروفیسر کو زہریلی نظروں سے گھور رہا تھا پھر زہر خند لہجے میں بولا "ہاں پروفیسر ڈیئر! کہاں سے تشریف لا رہے ہیں جناب!" پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ریوالور بردار اطالوی نے کہا "سر! میرا اندازہ ہے کہ یہ چوری چھپے دوسرے عرشے پر گیا تھا' وہاں سے واپس گودام کی طرف جا رہا تھا کہ کسی کو دیکھ کر اسٹور روم کے پیچھے چھپ گیا۔"

مائیکل نے اطالوی سے کہا "تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ پروفیسر ڈیئر یقیناً دوسرے عرشے سے آ رہے ہوں گے یا پھر وہاں جا رہے ہوں گے۔ اس عرشے کے علاوہ انہیں بھلا اور کہاں کام ہو سکتا ہے۔ کیوں پروفیسر ڈیئر؟"

پروفیسر نے گلوگیر لہجے میں کہا "خدا کے لیے مائیکل۔۔۔ خدا کے لیے اتنا ظلم مت کرو' ایک باپ کی محبت کا اتنا سخت امتحان مت لو۔ شائستہ کی طبیعت تمہارے اندازے سے زیادہ خراب ہے۔ اسے میری ضرورت ہے۔ میری بیٹی کو ضرورت ہے میری۔ میں مانتا ہوں وہ۔۔۔ تمہاری بیوی ہے لیکن اس کے بیوی بننے سے میرا حق بالکل ختم تو نہیں ہو جاتا۔"

مائیکل مسکرایا "پروفیسر ڈیئر! آپ کا حق تسلیم شدہ ہے۔ یہ حق تو اس وقت بھی ختم نہیں ہوگا جب وہ سو سال کی بڑھیا ہو جائے گی۔" پھر ذرا توقف سے کہنے لگا "ویسے آپ اچھے وکیل کبھی نہیں بن سکتے۔ آپ نے تو خود اپنے ہی خلاف دلائل دے دیے۔ یہ کہہ کر کہ میری بیوی کی طبیعت زیادہ خراب ہے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ ابھی اس سے مل کر واپس آ رہے ہیں۔"

"ہاں میں مل چکا ہوں اس سے۔" پروفیسر اٹک اٹک کر آواز میں بولا "وہ میری بیٹی ہے' میں اس سے دور نہیں رہ سکتا۔ وہ رات دن میرا انتظار کرتی ہے۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کو ترستی ہے۔ میں آس پاس رہ کر بھی اس سے کیوں نہ ملوں۔"

"اوکے۔۔۔ اوکے۔" مائیکل نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "یہاں سب کے سامنے جذباتی ڈراما بولنے کی ضرورت نہیں۔ آیئے' میں آپ کو ملواتا ہوں شائستہ سے۔" اس نے بڑے احترام سے پروفیسر کو ساتھ چلنے کو کہا۔

پروفیسر چند لمحے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا پھر مائیکل کے ساتھ چل دیا۔

میں جانتا تھا کہ پروفیسر کے لیے مائیکل کا ادب و احترام طنزیہ ہے' وہ اس کے ساتھ برے سے برا سلوک بھی کر سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا سوچتا رہا کہ پروفیسر کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس وسیع و عریض سمندر میں ہر کولیس نامی اس جہاز پر ہم کچھ نہایت شاطر لوگوں کے نرغے میں تھے انہوں نے ہمیں اپنی اپنی جگہ اتنی ہوشیاری سے باندھ رکھا تھا کہ تلملانے کے سوا کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

○☆○

اگلے روز صبح سویرے میں نے زریں گل کو بالائی عرشے پر ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا' سر پر ٹوپی تھی۔ یہ وہی لباس تھا جو اس نے لاہور سے "اغوا" ہوتے وقت پہن رکھا تھا۔ (جب سے ہمیں دوسرے قیدیوں سے علیحدہ کر کے اول درجے کے کیبن میں جگہ دی گئی تھی' ہم پر قیدیوں کا مخصوص کرتہ پائجامہ پہننے کی پابندی بھی نہیں رہی تھی) غالباً زریں گل کو خطرہ تھا کہ اس کی ٹوپی تیز سمندری ہوا سے اڑ جائے گی' وہ بار بار ٹوپی کو سر پر سنبھالا دے رہا تھا۔ وہ کئی روز سے کھلا آسمان اور سمندر دیکھنے کے لیے بے قرار تھا' اب اس کی یہ آرزو پوری ہو گئی تھی۔ مالشیے کی حیثیت سے ہی سہی لیکن وہ اس تاریک زنداں سے باہر تو آیا تھا پھر یکایک میرا ذہن دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ زریں گل سخت لاابالی اور من موجی شخص تھا۔ ہمارا تجربہ اس بات کا شاہد تھا کہ وہ دنگے فساد سے ڈرنے والا نہیں اور ہر قسم کے حالات میں مزاحمت جاری رکھنے والا شخص ہے۔ عین ممکن تھا کہ زریں کمپارٹمنٹ سے آزادی ملنے کے بعد اس کی سوچ پر پر نکالتی اور وہ کسی طرح کی مہم جوئی کی کوشش کرتا۔ اسے ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ غزالہ یہاں کتنے شدید خطرے کی زد میں ہے اور بات صرف غزالہ ہی کی نہیں تھی' ہمارے دیگر ساتھی یعنی صفدر اور گلثوم بھی مکمل طور پر لاچار تھے' اگر ہم کسی طرح کی گڑبڑ کرتے تو ان تینوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی ہو سکتی تھی۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس سلسلے میں زریں کے کانوں کی کھڑکیاں کھول دوں۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی عرشے پر چلا گیا۔ یہاں دو تین مسلح افراد موجود تھے لیکن اب وہ میری نقل و حرکت پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ زریں مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپک آیا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اس نے دو منٹ کے اندر اندر مجھے بتا اور سمجھا دیا کہ وہ کیسے' کب اور

کیونکر یہاں پہنچا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے پہلے ہی صفدر اور گلثوم سے معلوم ہو چکی تھیں۔ آخر میں زریں گل نے کہا "استاد صیب! آپ یہ مت سمجھیں کہ ام یہاں آ کر بہت خوش ہوا ہے۔ ام قسم کھاتا ہے' ام پریشان ہے۔ ام کو تو اپنی عزت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے کہا۔

وہ بولا "کل رات ام کو اس بدبخت مائیکل نے کمرے میں بلایا۔ ام نے دو گھنٹے تک اس کا مالش کیا۔ امارا بازو مازو بالکل شل ہو گیا۔ ام سمجھتا تھا کہ اب ام کو آرام فرمانے کا موقع ملے گا لیکن اس بدبخت نے ام کو فوراً ایک دوسرے کمرے میں ارسال کر دیا۔ اس کمرے میں امارے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ یہاں چالیس پینتالیس سالہ ایک دُہرے جسم کی فرنگن موجود تھی۔ بالکل گوری چٹی جیسے سفید باندری (بندریا) ہوتا ہے۔ خوچے امارا خیال ہے کہ وہ جہاز کے چیف انجینئر کا بدبخت بیوی ہے۔ ایک تو وہ عورت اوپر سے فرنگن۔۔۔ آپ ذرا اپنے دماغ سے سوچے ام کو اس کا خدمت کرنا کتنا مشکل لگا ہوگا۔ امارا تو دل چاہتا تھا کہ پہلی فرصت میں اس کا گلا گھونٹ دے لیکن وہ اپنا ٹانگیں گھٹنوں تک ننگا کیے بیٹھا تھا اور ام سے فرماتا تھا کہ ام اس کی پنڈلیوں کا مالش کرے۔ ام خدا کا قسم کھاتا ہے کہ ام نے صرف آپ سب کی خاطر یہ ذلت برداشت کیا ہے۔ وہ سفید باندری ام سے مالش کراتا رہا۔ ساتھ ساتھ بیئر پیتا رہا اور ام کو گھورتا رہا۔ اس نے امارے گالوں پر چٹکیاں بھی کاٹا اور "سویٹ کالی سویٹ کالی" بولتا رہا۔" زریں گل نے ذرا توقف کیا پھر بولا "ام کو بہت پریشانی لگ رہا ہے استاد صیب۔ اگر اس فرنگن نے ام کو پھر بلایا اور پھر امارے ساتھ دیدہ زیب (نازیبا) حرکت کیا تو ام چپ نہیں بیٹھے گا۔ جو امارا ایمان خراب کرنے کا کوشش کرے گا' ام اس کا بیڑا غرق فرما دے گا۔"

"بھئی اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری پیاری سی صورت دیکھ کر اسے اپنا کوئی چھوٹا یاد آ گیا ہو۔"

"کچھ بھی ہو استاد صیب۔" زریں نے میری بات کاٹی "ام اس فرنگن کو پنڈلی سے آگے ہاتھ نہیں لگائے گا اور اگر ام کو لگانا ہی پڑا تو پھر اس کے گلے پر ہاتھ لگائے گا اور گھونٹ دے گا کم بخت کا گلا۔"

زریں گل کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے پوچھا "رات تم مائیکل کے پاس تھے؟"

"ہاں دو تین گھنٹے رہا تھا۔" زریں نے جواب دیا۔

"وہاں پروفیسر تو نہیں تھا؟"

ایک دم زریں کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا "ہاں پروفیسر اللہ دتا بھی وہیں تھا۔ خوا اس کے ساتھ بہت برا سلوک کر رہا ہے یہ مائیکل خنزیر کا بچہ۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یہ پوچھیں جی کیا نہیں ہوا۔" زریں بولا "حشر خراب کر دیا ان لوگوں نے پروفیسر کا۔"

اس کے بعد زریں گل نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔

"جس وقت مائیکل' زریں گل سے مالش کروا رہا تھا' پروفیسر کو وہاں لایا گیا۔ مائیکل نے پروفیسر کو بڑے احترام سے صوفے پر بٹھایا' حال چال دریافت کیا پھر اس سے پوچھنے لگا کہ آپ کیا پئیں گے۔ پروفیسر نے کچھ بھی لینے سے انکار کیا۔ مائیکل نے اصرار کر کے دودھ منگوا لیا۔ (یاد رہے کہ یہ ساری کارروائی مائیکل کے اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ اس سے ملحقہ ایک دوسرا... اپارٹمنٹ تھا) پروفیسر نے مائیکل کے اصرار پر دودھ کا گلاس پی لیا۔ مائیکل بولا "پروفیسر ڈیئر کچھ اور پیجئے۔" ملازم ایک اور گلاس لایا' پروفیسر نے مائیکل کے اصرار پر وہ بھی پی لیا۔ اس کے بعد مائیکل نے ایک اور گلاس منگوا لیا۔ یہ بھی پروفیسر کو زبردستی پلایا گیا۔ پروفیسر کا دل متلانے لگا لیکن مائیکل کسی طرح ٹلنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرا گلاس منگوا لیتا تھا۔ پانچواں گلاس پینے کے بعد پروفیسر نے قے کر دی مگر اس کی خطا معاف نہیں ہوئی۔ اسے دودھ پلانے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ پروفیسر نے ہاتھ جوڑے' منتیں کیں لیکن کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ پروفیسر پینے سے انکار کرتا تھا تو اس کے سر پر کھڑا محافظ ریوالور کے وزنی دستے سے اس کے سر پر ضرب لگاتا تھا۔ یہ ضرب یوں لگائی جاتی تھی کہ خون نہ بہے اور تکلیف بھی زیادہ ہو۔ پروفیسر کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی' وہ جتنا دودھ پیتا تھا اتنا ہی باہر نکل آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور قے کر کر کے گلا رندھ گیا تھا۔ وہ رو رہا تھا مگر اس کا رونا دھونا بیکار تھا۔ آخر وہ نیم بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ مائیکل نے اپنے کارندوں سے کہا کہ پروفیسر ڈیئر شاید سیر ہو گئے ہیں۔ باقی کا دودھ رکھ لیں' یہ کل پی لیں گے۔"

پروفیسر کے بارے میں زریں کی یہ اطلاع سن کر مجھے خاصا دکھ ہوا۔ مجھے کل صبح ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ پروفیسر کو

ذلیل و رسوا کیا جائے گا۔ میرے لیے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ پروفیسر بے خبری میں میرے ہی ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ بیٹی سے مل کر واپس آرہا تھا' سیڑھیوں کے قریب پہرے دار کو دیکھ کر اس نے چھپنے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش کے سبب میں چوکنا ہوا اور پروفیسر مجھ سے بچنے کے لیے بھاگ نکلا۔

چند روز پہلے بھی جب شائستہ نے فائرنگ کے دوران میں پروفیسر کو بچانے کی کوشش کی تھی تو مائیکل باپ بیٹی پر بہت ناراض ہوا تھا اور میری اطلاع کے مطابق نہ صرف اس نے پروفیسر کو برا بھلا کہا تھا بلکہ شائستہ سے بھی خفا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا کہ یہ سونڈ بونڈ آدم خور نفسیاتی مریض بھی ہے۔ اپنے اردگرد کے لوگوں کو دکھ دے کر اور انہیں تکلیف دہ طریقے سے حیران کر کے اسے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

میں نے زریں سے پوچھا کہ اب پروفیسر کہاں ہے؟

زریں نے بتایا "خواسی اپارٹمنٹ میں ہے۔ رات کو ام اس کے پاس ہی سویا تھا۔ شاید اس کو نیند کا گولی مولی کھلایا گیا تھا' وہ ساری رات نیم بے ہوش پڑا رہا تھا۔"

میں زریں کے بتائے ہوئے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ اسی اپارٹمنٹ کے ایک حصے میں' میں نے ٹی وی اسکرینیں دیکھی تھیں اور ان کے سامنے آپریٹر کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو پروفیسر سامنے ہی نظر آگیا۔ وہ ایک اُجلے بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے سرہانے ٹیبل پر سیب اور انار رکھے تھے۔ چند فٹ کے فاصلے پر مائیکل بھی ایک کرسی پر براجمان تھا۔ میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر مائیکل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل گئی۔

میں نے کہا "مائیکل! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ پروفیسر کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ ایسا خاص تو نہیں ہوا۔" مائیکل نے شانے اچکائے "بس کھانے پینے میں تھوڑی سی بے احتیاطی ہو گئی تھی' اب تو جناب بالکل ٹھیک ہیں۔"

"یہ تو کئی ہفتے کے بیمار نظر آرہے ہیں۔" میں نے پروفیسر کے زرد چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

مائیکل نے قہقہہ لگایا "تم خواہ مخواہ پروفیسر کی فکر میں دُبلا ہونے کی کوشش نہ کرو' یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس رات کو تھوڑی سی بدپرہیزی ہو گئی۔ شاستے نے دو تین بار کہا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے پروفیسر ڈیئر دودھ پیتے ہیں۔ میں نے کہا' چلو اتنے دن نہیں پیا' آج جی بھر کر پی لیں گے' میں نے تھوڑا سا زیادہ منگوالیا۔ پروفیسر ڈیئر بھی جوش میں تھے' بس پیتے گئے۔ بعد میں طبیعت ناساز ہو گئی لیکن دیکھو۔۔۔ ارادے کے کتنے پکے ہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے' باقی کا دودھ منگوا پیوں گا۔"

میں نے دیکھا' دودھ کا نام سن کر ہی پروفیسر کے چہرے پر متلی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ پروفیسر نحیف آواز میں بولا "خدا کے لیے۔۔۔ میرے سامنے یہ بات نہ کرو' میرا معدہ الٹ جائے گا۔"

"چچ چچ چچ۔" مائیکل نے تاسف کا اظہار کیا "یہ شراب تو نہیں ڈیئر۔۔۔ دودھ ہے۔ دودھ جیسے حلال مشروب سے ایک مسلمان کو ایسی بیزاری نہیں دکھانی چاہیے۔ بہت بری بات ہے یہ۔"

پروفیسر نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے رسنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کے کان کے پاس ایک جگہ تھوڑا سا خون جما ہوا تھا۔ زریں گل کی یہ اطلاع بالکل درست تھی کہ رات کو زبردستی دودھ پلانے کے دوران میں پروفیسر کو زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "مائیکل! تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔"

"جو ہو رہا ہے یہ سب پروفیسر ڈیئر کے مرتبے اور حیثیت کو مدنظر رکھ کر ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ سب ٹھیک ہو رہا ہے تو پھر تمہیں یقیناً دماغی علاج کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر میں اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

دوسری بار پروفیسر سے میری ملاقات شام کو ہوئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے گیا۔ وہ اسی طرح بستر پر لیٹا ہوا تھا اور خزاں رسیدہ پتے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں میں شفا بانٹنے والا آج خود مسیحائی کا طلب گار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا غم زدہ چہرہ کچھ اور بھی غم زدہ نظر آنے لگا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر فریاد کناں لہجے میں بولا "شاہ جہاں! یہ شخص مجھے مار کر چھوڑے گا۔ آج سونے سے پہلے یہ پھر مجھے۔۔۔ دودھ۔۔۔ پلائے گا۔ پلیز تم مجھے کہیں سے نیند کی دو تین گولیاں لا دو۔ میں رات ہونے سے پہلے ہی سو جانا چاہتا ہوں۔ گہری نیند میں ہوں گا تو شاید یہ لوگ مجھے نہ اٹھائیں۔ پلیز میری مدد کرو۔"

پروفیسر کی حالت قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ انسان بھی کتنا بے بس ہے۔ اسے سزا دینے کے لیے دہکی ہوئی سلاخوں اور کوڑوں وغیرہ کی صورت نہیں ہوتی' اس کی نہایت دل پسند چیزوں کے ذریعے بھی اسے زندہ درگور کیا جا سکتا ہے۔

آزاد خیال لوگوں کے نزدیک شراب' عورت اور گوشت خوری زبردست عیاشی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن اگر کسی شخص کو یہی چیزیں مسلسل زبردستی استعمال کرائی جائیں تو یقیناً اس کی جان لبوں پر آجائے گی اور یہ سب کچھ اس کے لیے بدترین سزا کا ذریعہ بن جائے گا۔

میں نے پروفیسر کو تسلی دی اور کہا کہ میں اس کے لیے خواب آور دوا کا انتظام کرتا ہوں۔ میں پروفیسر کے کمرے سے نکل کر ٹہلتا ہوا کلینک کی طرف چلا گیا۔ یہاں سلیپنگ پلز کی ایک شیشی موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے دوا لینے پر کمپاؤنڈر کسی طرح کا اعتراض نہیں کرے گا۔ جہاز کا عملہ مجھے اہمیت دینے لگا تھا' خاص طور سے جب سے میں مائیکل کے ہمراہ خصوصی ساتھی کی حیثیت سے "محبت کے جزیرے" رات گزار کر آیا تھا' میری حیثیت مسلّمہ ہو گئی تھی۔ میں کلینک میں داخل ہو کر مطلوبہ الماری تک پہنچا لیکن۔۔۔ مایوسی ہوئی' سلیپنگ پلز والی بوتل وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر پلز کہیں نہیں ملیں حالانکہ آج دوپہر ہی میں نے وہ پلز الماری میں دیکھی تھیں۔ میں نے کمپاؤنڈر سے پوچھا۔ یہ اطالوی شخص بے حد کم گو تھا۔ اس نے مختصراً نفی میں جواب دیا۔ اسے بھی پلز کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

میں سوچتا ہوا باہر آگیا۔ کلینک سے چند قدم کے فاصلے پر ہی زریں گل سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں سے آرہا ہوں۔

میں نے اسے تفصیل بتائی۔ پروفیسر کی پتلی حالت کا سن کر وہ بھی افسردہ ہو گیا۔ میں نے کہا "ابھی دو تین گھنٹے پہلے ہی میں نے نیند کی گولیاں یہاں دیکھی تھیں' اب مل نہیں رہیں۔ کمپاؤنڈر بھی بے خبر ہے۔"

اچانک زریں کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑے' پھر وہ بولا "استاد صیب! کہیں وہ گولی شائستہ بی بی تو نہیں لے گیا۔ ابھی۔۔۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے ام نے اس کو کلینک سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے کندھوں پر نیلا شال لے رکھا تھا۔ اوہ خدایا۔۔۔ استاد صیب ام کو پورا یقین ہو گیا۔ پورا پورا یقین ہو گیا۔"

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ گولی مولی شائستہ بی بی لے کر گیا ہو گا۔"

زریں کی آنکھیں حلقوں میں گول گول گھوم رہی تھیں۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" میری بھی کان کھڑے ہو گئے۔

"ام یہ ایسے کہہ سکتا ہے کہ وہ بہت۔۔۔ بہت پریشان لگتا ہے۔ ام نے دیکھا ہے' اس کا آنکھیں رو رو کر آڑو کے مافق سوجا ہوا ہے۔ بالکل۔۔۔ نیم پاگل سا نظر آرہا تھا وہ۔ اس کے ارادے میں ضرور کوئی خرابی ہے استاد صیب۔ خوام سچ کہتا ہے' آپ اس کا پتا کریں' کہیں وہ کوئی الٹا سیدھا کام نہ کر جائے۔"

زریں بے شک اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ اردگرد کے حالات پر اس کی گہری نظر رہتی تھی۔ اس کے تجزیے اکثر درست ثابت ہوتے تھے۔ میں اور زریں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی عرشے پر پہنچے۔ اب شام کے جھٹپٹے میں آسمان پر اکا دکا تارے نظر آنے لگے تھے۔ مائیکل اور شائستہ کا اسپیشل اپارٹمنٹ چند گز کے فاصلے پر نظر رہا تھا مگر ہم اس کے اندر نہیں جا سکتے تھے۔ دروازے پر مسلح پہرے دار موجود تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو اندر داخل ہونا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اچانک زریں کی نگاہ عرشے کے آخری حصے کی طرف اٹھ گئی اور وہ چیخ پڑا "استاد صیب! شائستہ بی بی تو شاید وہ بیٹھا ہوا ہے۔"

میں نے دیکھا' نیلی شال اور سفید قمیص کی جھلک دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عرشے پر لگی ایک رنگ دار چھتری کے نیچے کرسی پر ساکت بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ اس کے خوب صورت بال سمندری ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو رہے تھے مگر وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ میں دھیمے قدموں سے چلتا اوپر عرشے پر پہنچ گیا۔ یہاں ہوا کافی تیز تھی اور سمندر دور تک نظر آتا تھا۔ غزالہ کی ہدایت پر میں نے آنکھ سے پٹی اتار دی تھی اور سن گلاسز استعمال کر رہا تھا "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے شائستہ سے شائستگی سے پوچھا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں کانپ گیا۔ اس کا چہرہ ایک خرابا نظر آرہا تھا اور آنکھیں اس خرابے میں دو ویران کھنڈروں کی طرح تھیں۔ وہ خشک لبوں کو حرکت دے کر بولی "بیٹھیے۔" میں اس کے سامنے کرسی سنبھال لی۔

"کیا بات ہے' آپ کچھ پریشان ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک گئے "آپ ڈیڈی سے ملتے ہیں نا؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "میرا پیغام ان تک پہنچا دیجیے گا۔ ان سے بولیے گا۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں' مجھے معاف کر دیں۔"

شائستہ کے لہجے میں غم کا ایک سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ بات آپ خود بھی تو اپنے ڈیڈی سے کہہ

سکتی ہیں۔"

"مجھے ان سے ملنے نہیں دیا جاتا۔" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔

"چلیں آج نہیں' کل سہی' دس دن بعد سہی' آخر کبھی تو ملاقات ہوگی۔ اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پتا نہیں ہوگی یا نہیں۔" آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ کر ریلے کی طرح بہہ نکلنا چاہتے تھے۔ ایک خوں خوار دنیا چند گز کے فاصلے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شائستہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ شاید وہ خوف زدہ تھی کہ اس کے آنسو بہہ نکلیں گے اور دنیا انہیں دیکھ لے گا۔

میں نے شائستہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنے ڈیڈی سے دوبارہ ملنے کے سلسلے میں اتنی مایوس کیوں ہیں؟" وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ خواب آور گولیاں آپ نے کہاں رکھی ہیں؟"

وہ بری طرح چونک گئی اور اس کے ہونٹ تھرا اٹھے۔ میں نے نرم لہجے میں کہا "مسز شائستہ! مسائل کا جو حل آپ سوچ رہی ہیں' وہ یکسر غلط ہے۔ آپ مشکلات سے فرار چاہ رہی ہیں۔ آپ کا یہ فرار آپ کے ڈیڈی کو زندہ درگور کردے گا۔"

وہ ایک دم بھڑک اٹھی "وہ پہلے کون سا زندہ ہیں۔ ان کو بے عزت کیا جارہا ہے' بے رحمی سے اذیت دی جارہی ہے۔ میرے ڈیڈی۔۔۔ میرے ڈیڈی کو تنکے سے حقیر کردیا گیا ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی "اور یہ سب کس وجہ سے ہورہا ہے؟ میری وجہ سے ہورہا ہے۔ صرف میری وجہ سے۔ میں ہی نہ رہوں گی تو ڈیڈی کی مجبوریاں بھی نہ رہیں گی۔ میری موت ہی میرے ڈیڈی کے دکھوں کا علاج ہے۔"

اس نے سر میز سے ٹکایا اور ہچکیوں سے روتی چلی گئی۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی اس نے گولیاں وغیرہ کھانے کی حماقت نہیں کی ہے مگر وہ اس حماقت کے لیے پوری طرح تیار نظر آرہی تھی۔ میں نے کہا "شائستہ حالات بے شک مشکل ہیں لیکن تم اس کا اثر ضرورت سے زیادہ لے رہی ہو۔ اگر تم۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹی "رات اپنے بیڈ روم میں' میں اپنے ڈیڈی کی آوازیں سنتی رہی ہوں۔ وہ ساتھ والے اپارٹمنٹ میں روتے رہے ہیں۔ بار بار تے کرتے رہے ہیں۔ مجھے سب پتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ انہیں آخری حد تک ذلیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کا سبب میں ہوں۔ میں نہ رہوں گی تو مائیکل کے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی اور ڈیڈی کی مصیبتیں بھی آسان ہوجائیں گی۔"

"لیکن آپ کی اس بے وقوفی سے وہ جس نئے عذاب میں مبتلا ہوں گے اس کے بارے میں آپ کچھ جانتی ہیں؟ وہ جو آپ کی دوری نہیں برداشت کرسکتے' آپ کا "نہ ہونا" کیسے برداشت کریں گے؟"

"پھر میں کیا کروں۔ مجھ سے ڈیڈی کی یہ توہین اور تکلیف مزید برداشت نہیں ہوتی۔ میں انہیں ہر مجبوری سے آزاد کردینا چاہتی ہوں۔"

"دیکھیں شائستہ! خودکشی ایک سنگین جرم ہے لیکن آپ اس کے ساتھ ساتھ قتل بھی کریں گی۔ آپ کے جسم میں جو معصوم زندگی ہے اس کا خون بھی آپ کی گردن پر ہوگا پھر میں آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں' آپ ایک اور شخص کو بھی جان سے ماریں گی اور وہ آپ کے پیارے پاپا ہوں گے۔ اللہ نہ کرے اس کی نوبت آئے لیکن مجھے پچانوے فی صد یقین ہے کہ آپ نے زندگی سے منہ موڑا تو وہ بھی موت کو گلے لگالیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مائیکل ہی کو مارنے کی کوشش میں زندگی ہار بیٹھیں۔"

میں بڑی نرمی اور ہمدردی سے شائستہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے اشتعال میں معمولی سا فرق محسوس ہونے لگا۔ وہ روتے ہوئے بولی "مسٹر شاہ جہاں! آخر ڈیڈی ایسے کیوں ہیں' وہ کیوں اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے؟ کبھی کبھی تو مجھے ان پر بھی غصہ آنے لگتا ہے' کیوں وہ مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ دیتے' جو میری قسمت میں لکھا ہے وہ میرے ساتھ ہو کر رہنا ہے۔ وہ کیوں میری ہر مشکل کو اپنے دل و دماغ کا روگ بنا رہے ہیں۔ وہ جب۔۔۔ مائیکل کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں تو میرا دل خون ہوجاتا ہے۔ وہ اس کا حکم یوں مانتے ہیں جیسے یہ خدائی حکم ہو' مائیکل انہیں گھٹیا ترین کاموں پر آمادہ کرتا ہے اور وہ آمادہ ہوتے چلے جاتے ہیں' مائیکل کے کہنے پر انہوں نے برش سے قالین تک صاف کیے ہیں۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں برداشت ہوتا۔ کاش وہ اصرار کرکے اس جہاز پر سوار نہ ہوئے ہوتے۔ وہیں پاکستان میں رہ گئے ہوتے۔"

میں شائستہ کی ذہنی کیفیت کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا اور جب کسی کی ذہنی کیفیت کا پتا چل جائے تو پھر اس کو قائل کرنا قدرے آسان ہوجاتا ہے۔ پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کیا سوال کرے گا اور پہلے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کا

جواب کیا ہوگا اور جب ایسا ہوجائے تو پھر بات چیت میں ایک ریڈنگ پوزیشن حاصل ہوجاتی ہے۔ میں شائستہ کے ساتھ دس پندرہ منٹ مصروفِ گفتگو رہا۔ میں نے اسے ڈرامائی انداز میں یقین دلایا کہ نہ صرف پروفیسر کے رویے میں نمایاں تبدیلی ہوگی بلکہ حالات بھی بڑی تیزی سے تبدیل ہوں گے۔ میں نے شائستہ سے کہا "دیکھیں۔ آپ مجھے صرف دو روز کی مہلت دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے پاپا کو ایک بدلا ہوا شخص پائیں گی' آپ کو ان کے حوالے سے کوئی ایسا منظر نظر نہیں آئے گا جس سے آپ کو شرمندگی ہو۔ اس کے علاوہ مایوس کن حالات بھی بس چند دن کے مہمان ہیں۔ یہ سب کچھ بدلنے والا ہے۔"

میرے مسلسل سمجھانے بجھانے کے نتیجے میں شائستہ قدرے نارمل نظر آنے لگی' اس نے کہا "میری طرف سے خواہ مخواہ فکرمند نہ ہوں' میں کچھ نہیں کرنے جارہی۔" مگر میں اتنی آسانی سے اس کی بات پر یقین کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سلیپنگ پلز مجھے واپس دے دے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی اور پس و پیش سے کام لیتی رہی' آخر میرے پیہم اصرار پر وہ میرے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں آئی اور اس نے گولیوں والی شیشی مجھے واپس کردی۔ بہرحال مجھے شک رہا کہ اس نے زیادہ نہیں تو دو چار گولیاں ضرور پاس رکھی ہیں۔ اس کامیاب "مشن" کے بعد میں نیچے زریں گل کے پاس واپس آگیا۔ وہ ایک کیبن کی اوٹ میں نیم دراز بڑی بے قراری سے میرا انتظار کررہا تھا۔

"کچھ پتا چلا استاد صیب؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"کس چیز کا؟"

"گولیوں کا۔"

"ہاں گولیوں کا پتا چل گیا اور گولیوں والی کا بھی۔ وہ بے چاری کافی سے زیادہ دکھی ہورہی ہے۔ بڑی مشکل سے سنبھالا دیا ہے اسے۔۔۔ لیکن ابھی صرف پچاس ساٹھ فی صد ہی سنبھلی ہے۔"

"مگر جناب گولیاں تو آپ لے ہی آیا ہے نا۔"

"جس نے مرنے کا ارادہ کرلیا ہو اس کے پاس ایک سو ایک راستے ہوتے ہیں' بہرحال امید ہے کہ کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوگی۔"

زریں کے ہاتھ میں زیتون کے تیل کی شیشی نظر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا چکر ہے بھئی؟"

وہ بولا "وہی مصیبت جی! اب ایک حبشی فورمین نے ام کو مالش کے لیے بلایا ہے۔ پتا نہیں ام سے کون سا گناہ ہوا تھا جو اللہ نے ام کو یہ مصیبت دکھایا۔ اگر ادھر امارے پشاور میں کسی کو پتا چل جائے کہ ام انگریزوں کا مالش کرتا رہا ہے تو سب ام پر تھو تھو کرے گا۔ ام کو تو علاؤ الدین کا وہ فلم یاد آنے لگا ہے جس میں اس نے ایک ذلیل نوکری سے تنگ آکر خودکشی کا کوشش کیا تھا۔"

میں نے کہا "اگر تم ایسی کوئی کوشش کرنا چاہو تو میں مدد کرسکتا ہوں' یہ نیند کی گولیاں حاضر ہیں۔"

زریں بولا "شاید کھا ہی لیتا' اگر کلثوم کا خیال نہ ہوتا تو۔۔۔ ویسے بھی کل ام نے مائیکل سے جو بات سنی ہے اس نے دل میں تھوڑا بہت امید پیدا کیا ہے۔"

"کیا بات؟"

"کل جب ام مائیکل کے گینڈے جیسے پنڈے کا مالش کررہا تھا' وہ بولا تھا کہ ام بس تین دن بعد خشکی پر ہوگا۔"

زریں کی اطلاع واقعی اہم تھی مگر سوال یہ تھا کہ زریں تو انگریزی جانتا نہیں' اس نے مائیکل کی بات کیسے سمجھی۔ میں نے جب یہی بات زریں سے پوچھی تو وہ بولا "استاد صیب! ام آپ کا شاگرد ہے۔ اتنا گیا گزرا ابھی نہیں ہے۔ ام کو "بیچ" کا پتا ہے۔ بیچ وہی ہوتا ہے نا جہاں فرنگی لوگ ننگا نہاتا ہے پھر خوچے اپنا پیچھا آسمان کی طرف کرکے دھوپ میں لیٹا رہتا ہے؟" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ زریں بولا "مائیکل نے ام کو بتایا کہ بیچ یا کوسٹ اب زیادہ دور نہیں۔ اس نے ہاتھ کی انگلیاں کھڑی کیں اور ساتھ میں DAYS کہا۔ یعنی تین دن بعد ام ساحل پر ہوگا۔"

"ممکن ہے کہ اس نے کچھ اور کہا ہو۔ مثلاً یہ کہ ساحل پر جاکر وہ تم سے تین دن مالش کرایا کرے گا اور باقی تین دن تمہیں چیف انجینئر کی موٹی تازی بیوی کی مالش کرنی پڑے گی۔"

"خدا کے لیے استاد صیب! امارے سامنے اس پلپلی فرنگن کا ذکر مت کرو۔ امارا پتا منہ کو آنے لگتا ہے۔"

"پتا منہ کو نہیں آتا کلیجا منہ کو آتا ہے۔"

"جب دل زیادہ خراب ہو تو سب کچھ منہ کو آجاتا ہے۔ باقی یہ سب ام آپ کو ابھی بتادے کہ اگر اس فرنگن نے ام کو اپنی پنڈلیوں سے آگے جانے کو کہا تو ام قاتل بننے سے گریز نہیں کرے گا۔"

"اچھا چھوڑ اس بات کو۔" میں نے کہا "اگر تمہاری اطلاع واقعی درست ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اگلے اڑتالیس گھنٹے میں ہم افریقہ کے کسی کنارے کو چھو سکتے

ہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" زریں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ام تو چاروں طرف سمندر دیکھ دیکھ کر عاجز آگیا ہے' جی چاہتا ہے کہ کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر گانا شروع کردے ۔۔۔ زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا۔ ام بھی تو انسان ہے پتھر تو نہیں۔"

"زندگی کی جگہ سمندر کا لفظ لگالو تو یہ گانا زیادہ فٹ بیٹھے گا۔"

زریں سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "رات ام سونے کی کوشش کررہا تھا۔ کچی پکی نیند میں اچانک ام کو یوں لگا جیسے سائیں عالی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بوری تھی۔ کہنے لگا' زریں گل ام تمہارے لیے نسوار لے کر آیا ہے۔ پشاور کا اصلی مسالے والا نسوار' تمہارا جی خوش ہوجائے گا' ام نے پوچھا' سائیں جی' ابھی امارا کتنا مشکل باقی رہ گیا ہے' ام اپنے وطن کب لوٹے گا۔ وہ بولا' تمہارا ستارہ ابھی گردش سے نکلا نہیں' میں نے اپنے ایک سو مؤکلوں کو حکم دیا ہے' وہ تمہارے ستارے کو باقاعدہ کھینچ کھانچ کر گردش سے نکالنے کا کوشش کرے گا۔ بالکل جیسے دلدل میں پھنسی ہوئی بیل گاڑی کو زور لگا کر نکالا جاتا ہے۔ ام نے پوچھا' سائیں جی پھر بھی کتنا دیر لگے گا' وہ بولا' جب تمہاری نسوار کا یہ بوری ختم ہوجائے گا تو تمہارا مشکل بھی ختم ہوجائے گا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا جی' ام ساری رات کچی پکی نیند میں رہا' ام کو یوں لگا کہ ام مٹھیاں بھر بھر کر نسوار اپنے منہ میں رکھتا رہا ہے اور بوری جلد سے جلد ختم کرنے کا کوشش کرتا رہا ہے۔"

"سائیں عالی دوبارہ تشریف نہیں لایا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو بس اک خیال تھا جی۔ وہ جس طرح وحید مراد صاحب کا گانا ہے نا' بھولی ہوئی ہوں داستاں' گزرا ہوا خیال ہوں۔"

زریں گل نے بیٹھے بٹھائے سائیں عالی کی یاد دلا دی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ اور سروج کہاں اور کس حال میں ہیں۔ سائیں سے آخری ملاقات لاہور میں ہی ہوئی تھی۔ جب اس نے غزالہ کے حوالے سے رات گیاہ چالیس پر کسی زلزلے کی پیش گوئی کی تھی اور ہم سب مائیکل جیسی آدم خور "مصیبت" کا شکار ہوکر اس بحری جہاز پر آن پہنچے تھے آج تک اس سے پہلے ہم جہاں کہیں بھی گئے تھے سائیں کسی پرچھائیں کی طرح ہمارے پیچھے ہی آگیا تھا' اور اگر کبھی نہیں آیا تھا تو اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتا رہا تھا لیکن اس بار ایسا کوئی چمتکار نہیں ہوا تھا اور نہ ہی امید تھی کہ ہوگا۔

میں پروفیسر اللہ دتا سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں اپارٹمنٹ میں پہنچا تو دروازے پر مسلح پہرے دار موجود تھا۔ اپارٹمنٹ کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں' اندر سے کوئی آواز وغیرہ بھی نہیں آرہی تھی' پہرے دار جوزف سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب سو رہے ہیں۔ میں نے کہا "میرا ملنا ضروری ہے۔"

وہ بولا "باس نے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے۔ انہیں سونے دیا جائے۔"

میں سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا' اپارٹمنٹ کے اندر کسی طرح کی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد میں واپس آگیا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ پروفیسر چونکہ کل ساری رات کا جاگا ہوا تھا لہٰذا آج بغیر سلیپنگ پلز کے ہی سو گیا تھا۔

پروفیسر سے اگلی صبح دوسرے عرشے پر ملاقات ہوئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا اور بہت تھکا ماندہ نظر آرہا تھا۔ وہ بے دم سا ہوکر میرے پاس ہی ایک تختے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں پروفیسر' کیا حال ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بس کچھ نہ پوچھو۔" اس نے مری مری آواز نکالی "یہ مائیکل۔۔۔ مجھے مار کر ہی چھوڑے گا۔"

میں نے دیکھا کہ پروفیسر کے گال اور گردن پر دو سرخ نشان سے نظر آرہے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ لپ اسٹک سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ میں نے کہا "رات کو کوئی مشکل پیش تو نہیں آئی؟"

پروفیسر نے آہ بھر کر کہا "اس بدبخت نے ایک فاحشہ میرے کمرے میں بھیج دی تھی' رات بھر اس نے میرا جینا دوبھر کیے رکھا ہے۔ وہ ہر طرح مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچا رہا ہے۔" شدتِ جذبات سے پروفیسر کی آواز بھرا گئی "اب ذرا سوچو' میری بیٹی کی عمر کی لڑکی مجھ سے واہیات باتیں کرے اور میرے ساتھ سونے پر اصرار کرے تو میری کیا حالت ہوگی۔ میں قسم کھاتا ہوں شاہ جہاں۔۔۔ اگر چند روز اور میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہا تو میں ضرور پاگل ہوجاؤں گا۔"

پروفیسر نے جو تفصیل بتائی اس سے معلوم ہوا کہ رات پروفیسر کی منت سماجت پر مائیکل نے "دودھ سے تواضع" کرنے والی سزا تو معطل کردی تھی مگر اس کے بدلے میں ایک اور سزا مسلط کردی گئی تھی اور پروفیسر کے لیے یہ سزا

بھی کچھ کم اذیت ناک نہیں تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھتے رہتے تھے' پروفیسر ایک مذہبی شخص تھا۔ اکثر اس کے ہاتھ میں تسبیح نظر آتی تھی اور وظائف اس کے ہونٹوں پر رہتے تھے۔ ایسے شخص کو ایک پٹاخا قسم کی کم عمر لڑکی کے ساتھ کمرے میں بند کردیا گیا تھا اور یقیناً لڑکی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پروفیسر کی پارسائی پر حملے کرکے ہر طرح اسے ٹارچر کرے۔

میں نے دیکھا کہ پروفیسر کا رنگ ہلدی ہو رہا ہے اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپتا جارہا ہے۔ پروفیسر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ایک دم سہم کر خاموش ہوگیا۔ وہ برج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ مجھے مائیکل نظر آیا۔ اس کے ساتھ جہاز کا شرابی کپتان جم تھا۔ دونوں جہاز کے مستول کی طرف جارہے تھے۔ دیو ہیکل مائیکل کا سیاہ رنگ فولاد کے مانند دمک رہا تھا۔ وہ ایک مہذب درندہ تھا جو تھری پیس سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر چشمہ لگائے خراماں خراماں چلا جارہا تھا۔ وہ جب نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو پروفیسر کی جان میں جان آئی۔

میں نے کہا "پروفیسر! آپ مائیکل سے اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ آپ کا ہراس آپ کی بیٹی کا حوصلہ بھی پست کردے گا۔ اسے تو آپ سے بھی زیادہ حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ اسے دن رات مائیکل کے ساتھ رہنا ہے' اس کے ساتھ گزر بسر کرنی ہے۔ اسے نفسیاتی طور پر بہت مضبوط ہونا چاہیے۔"

پروفیسر نے کہا "میں کیا کروں۔ میں اپنی شائستہ سے دور نہیں رہ سکتا اور اس کے قریب رہنے کے لیے ضروری ہے کہ میں مائیکل سے کسی بات پر اختلاف نہ کروں۔"

میں نے ذرا بیزاری سے کہا "اختلاف کرنا اور بات ہے پروفیسر۔ خود کو کسی کے قدموں میں گرا دینا اور بات۔ باقی یہ جو آپ کہہ رہے ہیں نا کہ آپ شائستہ سے دور نہیں رہ سکتے۔ یہ بھی بلند ہمتی کی نشانی نہیں ہے۔ آپ خدا پر بھروسا رکھنے والے شخص ہیں' آپ کو شائستہ کے سلسلے میں اس قدر پریشانی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"سچ جانو شاہ جہاں! میں نے پچھلے بیس برسوں میں شاید ایک دن کے لیے بھی اپنی بیٹی کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کیا۔ اب اسے مہینوں یا برسوں کے لیے خود سے جدا کردوں۔ یہ سوچ کر ہی میری سانس رکنے لگتی ہے۔"

"پروفیسر! آپ شائستہ کو ایک دن کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرتے نا۔۔۔ لیکن کل رات وہ آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے جارہی تھی۔" میں نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

پروفیسر کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ دہشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا "کیا۔۔۔ کہہ رہے ہو۔۔۔ تم؟" وہ ہکلایا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سلیپنگ پلز کی شیشی نکال لی "شائستہ کل رات خودکشی کرنے لگی تھی۔ یہ دیکھیں۔ یہ تھیں وہ گولیاں جو میں نے اس سے زبردستی لی ہیں۔"

کانپتا ہوا پروفیسر کچھ اور بھی لرزہ براندام ہوگیا۔ اس نے شیشی میرے ہاتھ سے لی اور دیکھتا چلا گیا۔ میں نے کہا "جب کل شام میں آپ کے لیے نیند کی دوا لینے گیا تو یہ شیشی الماری میں سے غائب تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ شیشی شائستہ کے پاس ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا وہ بھی میں نے پروفیسر کو بتایا۔ پروفیسر بالکل نڈھال سا ہوگیا۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔ تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا "پروفیسر اگر آپ اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتے تو پھر خود کو سنبھالنا ہوگا۔ مجھے یہ بات کہنی نہیں چاہیے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اگر شائستہ آپ کو اسی طرح مائیکل کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھتی رہی تو وہ اپنی جان لے لی گی۔ میں اس کا نفسیاتی مسئلہ بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' موجودہ حالات اسے دکھ تو دیتے ہیں لیکن وہ ان کا مقابلہ کرسکتی ہے بلکہ میں نے تو یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ ہر بڑی سے بڑی آفت کو بھی قبول کرلے گی' اگر کوئی بات اس کی برداشت سے باہر ہے تو وہ مائیکل کے ہاتھوں آپ کی مسلسل توہین اور رسوائی ہے۔ یہ سب کچھ اس کی روح کو چھید ڈالتا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" پروفیسر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ نے اپنے دل و دماغ پر مائیکل کا جو بے پناہ خوف طاری کر رکھا ہے اسے اتار پھینکیں۔ مائیکل کے سامنے آپ کی حد سے بڑھی ہوئی عاجزی اور بات بات پر منت سماجت کا رویہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچائے گا اور نہ شائستہ کو۔ الٹا یہ سب کچھ آپ کی جگ ہنسائی کا سبب بنے گا اور مائیکل کی آپ پر سختی بڑھتی چلی جائے گی۔"

"تم ایک بیٹی کے باپ نہیں ہو نا اس لیے ایسی بات کررہے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ مجھ جیسے بدنصیبوں کی کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔"

"میں بیٹی کا باپ نہیں ہوں لیکن آپ کا درد بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اور اس درد کو بھی سمجھ رہا ہوں جو

خدانخواستہ شائستہ کے کسی غلط قدم کی وجہ سے آپ کے حصے میں آسکتا ہے۔" پروفیسر کے ہونٹ ایک بار پھر کانپنے لگے۔ میں نے کہا "آپ کو یہی ڈر ہے نا کہ آپ کی حکم عدولی کی سزا شائستہ کو ملے گی۔ وہ مائیکل کی سفاکی کا نشانہ بنے گی اور اسے جان کا خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ کم از کم چند ماہ تک تو اس قسم کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شائستہ مائیکل کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ہونے والے بچے کا مائیکل کو بہت چاؤ ہے اور اس سلسلے میں وہ محتاط بھی بہت ہے۔ اپنے ہونے بچے کی زندگی کے لیے وہ کسی قسم کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا۔ مائیکل جیسے درندہ صفت لوگوں کی نفسیات بہت عجیب ہوتی ہے' یہ کئی معاملات میں بہت حساس بھی واقع ہوتے ہیں۔"

میں نے غور سے پروفیسر کے تاثرات دیکھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری بات کسی حد تک اس کے دل کو لگی ہے۔ میں نے قریباً آدھ گھنٹے تک اس سے بات چیت جاری رکھی۔ میں نے یہ بات بڑی اچھی طرح اس کے ذہن میں ڈال دی کہ اگر وہ شائستہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر اسے حالات کا مقابلہ حوصلے سے اور باوقار طریقے سے کرنا ہوگا۔ باوقار طریقے سے اذیت برداشت کرلینا یا جان دے دینا اور بات ہے لیکن ایک ظالم کے سامنے سرنگوں ہونا اور اس کے قدموں میں گر کر رُسوا ہونا اور بات ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں دو تین بار قدموں میں گرنے کا ذکر کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پروفیسر کو مائیکل کا وہ ذلت آمیز سلوک یاد آجائے جب اس نے پروفیسر کو نہ صرف اپنے جوتے چاٹنے پر مجبور کیا تھا بلکہ اس شرمناک منظر کی تصویر کشی بھی کرلی تھی۔ معلوم نہیں کہ پروفیسر کو وہ بات یاد آئی یا نہیں بہرحال اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میری باتوں نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں پروفیسر کی نگاہ گاہے بہ گاہے سلیپنگ پلز کی شیشی پر چلی جاتی تھی اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ اندیشے اُمڈ آتے تھے۔

اچانک میں ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ یہ دُبلی پتلی اطالوی لڑکی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے صرف ایک آدھ بار ہی جہاز میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کا نام سوزی تھا اور یہ جہاز کے اس حصے میں رہتی تھی جہاں جہاز کی خفیہ فورس ۲۰ عدد کمانڈوز اور ZIGU-4 گنوں کی صورت میں موجود تھی۔ یہ لڑکی خفیہ فورس کے ارکان کے دل بہلاوے کے لیے جہاز میں موجود تھی۔ وہ لٹکتی مٹکتی ہوئی ہمارے پاس پہنچی۔ اس نے براؤن نیکر پہن رکھی تھی اُوپر نیلے رنگ کی پتلی سی ہاف سلیو شرٹ تھی۔ شرٹ لمبائی میں کافی کم تھی۔ شرٹ اور نیکر کی بیلٹ کے درمیان جو تین انچ کا فاصلہ تھا' اس میں لڑکی کا سرخ و سپید پیٹ جھانک رہا تھا' اس کی نہایت باریک شرٹ کا ہونا یا نہ ہونا بھی برابر ہی لگتا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو شانوں پر جھٹکتی اور اپنے انگ انگ کو حرکت دیتی ہوئی ہمارے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

"ہیلو ٹیک مین' کیا حال ہے؟" وہ پروفیسر کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے بولی۔

مجھے پتا چلا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو رات کو پروفیسر کے لیے عذاب بنی رہی ہے۔ اس کا فراوا کے انگ انگ سے شوخی اور مستی ٹپک رہی تھی۔ آنکھیں یوں نیم باز تھیں جیسے پوری بوتل چڑھا کر آئی ہے لیکن یہ شراب کا نہیں اس کے اپنے خون کا نشہ تھا۔ اس نے پروفیسر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور ایک آنکھ میچ کر مسکرائی۔

پروفیسر نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر لڑکی سے بولا "جاؤ' اپنے کمرے میں جاؤ۔"

وہ سسکاری لے کر بولی "اف گاڈ' اکیلی کیسے جاؤں۔ کمرا کاٹنے کو دوڑتا ہے تمہارے بغیر ٹیک مین۔"

پروفیسر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا' دوسرا جارہا تھا۔ میں نے دیکھا' اوپر برج پر اور مستول کے قریب تین چار افراد موجود تھے اور شوخ نظروں سے پروفیسر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

سوزی نامی یہ لڑکی بڑی قاتلانہ ادا کے ساتھ پروفیسر کے پہلو میں بیٹھ گئی' وہ پروفیسر پر قریباً لد سی گئی تھی "اوہ سویٹ۔ تمہیں چھو کر تو بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی سویا ہوا آتش فشاں ہو۔ اوپر سے ٹھنڈا' اندر سے انگارا۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا "لگتا ہے کہ گرمی تمہارے اندر بھی بہت زیادہ ہے؟" میں نے کہا۔

"تت۔۔۔ تم کون ہو؟" وہ ہکلائی۔

"جاگتا ہوا آتش فشاں۔" میں نے کہا۔

اس نے انگلش میں گالی داغ دی۔ جواباً میں نے بھی انگلش کی ایک کلاسیکل گالی دی۔ اس نے اپنا آزاد ہاتھ گھمایا۔ غالباً طمانچہ لگانا چاہ رہی تھی مگر گھوم کر رہ گئی۔ دوسری کلائی چونکہ میری گرفت میں تھی لہٰذا اس کا بازو مڑ کر کمر سے جالگا۔ میں نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ پروفیسر کا چہرہ فق ہورہا تھا۔ لڑکی لڑائی بھڑائی کی بھی شُدبُد رکھتی تھی' اس

مزاحمت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ہی سیکنڈ بعد وہ عرشے کے فرش پر اوندھی پڑی تھی اور میں نے اپنا گھٹنا احتیاطاً اس کی کمر پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی شرٹ اوپر تک کھسک گئی تھی کمر قریباً کندھوں تک نظر آنے لگی تھی۔ مسلح حبشی دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کر رکھی تھیں۔ انہوں نے مجھے سوزی سے علیحدہ کیا۔ جوزف نے رائفل کی نال بالکل میرے سینے سے لگا رکھی تھی۔ سوزی جیسے غصے سے پاگل ہورہی تھی۔ وہ مجھ پر چیخی پھر اس نے تیزی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ایک پہرے دار کے ہاتھوں میں "کی بوکو" نظر آیا۔ اس نے "کی بوکو" چھینا اور تند بگولے کی طرح میری طرف آئی۔ اس کے تیوروں سے لگتا تھا کہ چند سیکنڈ میں میری چمڑی ادھیڑ دے گی مگر اس سے پہلے کہ کی بوکو مجھ پر اٹھتا' میری خیر خواہ ڈور تھی نے سوزی کا راستہ روک لیا۔ نائب کپتان فلیمنگ کی بیوہ اس سے پہلے بھی اپنی خیر خواہی کا ثبوت دے چکی تھی۔ وہ سوزی کو سنبھال کر ذرا پیچھے لے گئی۔ اسی دوران میں جہاز کا کپتان فریہ اندام جم بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ فل نشے میں نظر آرہا تھا۔ نشے میں اس کی آواز کچھ مزید بارعب اور آنکھیں چمک دار ہوجاتی تھیں۔ اس نے کی بوکو سوزی کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا "سویٹ گرل! میں کتنی بار تم لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے جہاز پر دنگا فساد نہیں چاہیے۔ یہ میرا جہاز ہے اور میں اس پر کسی طرح کی نحوست نہیں دیکھ سکتا۔"

سوزی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کا حسین چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا۔ کیپٹن جم نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "دماغ ٹھنڈا کرو لڑکی' دماغ ٹھنڈا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ کس سے جھگڑ رہی ہو؟"

"کون ہے یہ باسٹرڈ؟"

"جب تمہیں معلوم ہوجائے گا تو تم باسٹرڈ نہیں کہو گی اور نہ ہی تمہارا غصہ باقی رہے گا لیکن پہلے بیئر کے یہ دو گھونٹ پی لو تاکہ تمہارا اور جذبہ حرارت کچھ کم ہو۔"

اس نے بیئر کا ٹن سوزی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سوزی نے غصے میں کھولتے ہوئے دو گھونٹ لیے۔ کپتان جم اسے بازو سے پکڑ کر تھوڑی دور ایک کرسی پر لے گیا۔ وہ قدرے پُرسکون دکھائی دینے لگی۔ تاہم اس کا سینہ ابھی بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کپتان جم نے کہا "کل تم پوچھ رہی تھیں نا کہ ٹام کو مقابلے میں کس نے چت کیا تھا؟"

سوزی کی سوالیہ نظریں کپتان جم پر لگی تھیں۔

جم نے کہا "یہی ہے وہ شخص۔ اس کا نام شاہ جہاں ہے۔"

سوزی کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وہ کچھ دیر تک یک ٹک میری جانب دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے کے تمام نقوش ملائم اور مسکراتے ہوئے دِکھنے لگے۔ وہ اٹھ کر میری طرف آئی "تو تم شاہ جہاں ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "مجھے بہت افسوس ہے کہ ہماری ملاقات اس انداز میں ہوئی۔ میں تو دو تین بار کپتان صاحب سے تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہوں۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولی "ٹام کا حشر خراب ہونے سے مجھے دلی مسرت ہوئی ہے۔ میرے خیال میں تو وہ انسان تھا ہی نہیں۔ اس کی ماں یقیناً کسی پاگل ریچھ کے ساتھ سوتی رہی تھی۔" اس نے نفرت سے فرش پر تھوک دیا۔

یقیناً سوزی نامی یہ لڑکی آنجہانی ٹام کے ہاتھوں کوئی زبردست قسم کی زک اٹھا چکی تھی جو اس کی موت پر اتنی خوش ہورہی تھی۔

کپتان جم جھومتا ہوا ہمارے قریب آیا اور سوزی سے مخاطب ہوکر بولا "میرا خیال ہے کہ اب تو تمہیں کی بوکو کی ضرورت نہیں ہے؟"

"ضرورت تو ہے مگر اب میں یہ کی بوکو مسٹر شاہ جہاں کے ہاتھ میں تھمانا چاہتی ہوں۔ میں نے ان کی کافی بے عزتی کی ہے۔"

کپتان جم نے کہا "تیری اُجلی چمکیلی چمڑی پر کی بوکو کون برسانا چاہے گا' یہ تو پیار کرنے کے لیے بنی ہے۔"

سوزی نے مست نظروں سے میری طرف دیکھا' جیسے بہ زبانِ خاموشی پوچھ رہی ہو "کیا خیال ہے' کپتان جم کی رائے کے بارے میں؟"

میں نے محسوس کیا کہ مسز ڈورتھی خشک نظروں سے سوزی کو گھور رہی ہے۔ غالباً سوزی ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں بڑی عمر کی سنجیدہ عورتیں ایسی ہی نظروں سے گھورتی ہیں۔ میں نے سوزی کو ذرا لگاوٹ سے دیکھا "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے گرم جوشی سے ہاتھ دبایا۔ ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ یوں لگا کہ جیسے یہ ہونٹ خفیہ قسم کے اشارے کررہے ہیں۔

اسی شام سات آٹھ بجے کے قریب سوزی سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں کنٹرول روم کے

عقب میں ریلنگ کے سہارے کھڑا تھا۔ کوئی دبے قدموں آیا اور میرے شانے سے شانہ لگا کر کھڑا ہوگیا۔ یہ سوزی تھی۔ اس کے سنہری بال سمندری ہوا کے جھونکوں سے اڑ رہے تھے اور میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اس نے انہیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بڑی حوصلہ افزا قسم کی ادا تھی۔ سوزی ٹائپ کی لڑکیاں ایسی اداؤں میں ماہر ہوتی ہیں۔ میں نے آج صبح جان بوجھ کر سوزی میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کی کوشش کرے گی اور میرا یہ یقین درست ثابت ہوا تھا۔

میں اور سوزی ریلنگ کے سہارے کھڑے اپنے سامنے نیم تاریک سمندر کو گھورتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ رسمی سی باتیں تھیں' موسم کی' سمندر کی اور سفر کی۔ سوزی کا خیال بھی یہی تھا کہ ایک آدھ دن میں ہم منزل پر پہنچ جائیں گے۔ منزل کون سی تھی' اس بارے میں وہ نہیں جانتی تھی یا بہت سی دوسری باتوں کی طرح وہ اس موضوع پر بھی اظہار خیال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت محتاط گفتگو کررہی تھی اور اپنے ٹائپ کی لڑکیوں کی طرح خاصی چالاک نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ ٹام کے ساتھ اس کی کیا دشمنی تھی' اس نے صرف اتنا بتایا کہ ٹام اسے جنسی طور پر ہراساں کیا کرتا تھا' تاہم اس کے انداز سے عیاں تھا کہ بات کچھ اور بھی ہے۔ جلد ہی میں اصل موضوع پر آگیا۔ میں نے سوزی سے پوچھا کہ وہ ہاتھ دھو کر پروفیسر اللہ دتا کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟

وہ بولی "میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔۔۔ اور نہ ہی میرے دماغ میں خلل ہے کہ میں اپنی راتیں اس پلپلے اولڈ مین کے ساتھ برباد کروں۔ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی ہے اور میں اسے نبھانے پر مجبور ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ یہی جواب دے گی۔ میں نے اسے بتایا کہ پروفیسر اس کے ہاتھوں کتنا دکھی ہے اور آنے والی راتوں کا خوف اسے کس طرح ہلکان کررہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اس معاملے میں میرے کہنے پر پروفیسر سے خصوصی رعایت برتے۔ ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ سوزی مان گئی۔ وہ بڑی زود فہم لڑکی تھی اور اس سارے معاملے کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

جس وقت ہم گفتگو کررہے تھے' ایک چھوٹی سی گیند فرش پر لڑھکتی ہوئی آئی۔ چند لمحے بعد گیند کے پیچھے ہی پیچھے ننھا تابی برآمد ہوا۔ تابی کے پیچھے غزالہ تھی۔ اس نے شام کے جھٹپٹے میں مجھے اور سوزی کو ریلنگ کے سہارے کھڑے دیکھا تو چونک سی گئی۔ اسی دوران میں سوزی نے جھک کر گیند اٹھائی۔ وہ بدستور نیکر اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کا جسم توبہ شکن انداز اختیار کرلیتا تھا اور وہ اپنی اس حشر سامانی سے پوری طرح آگاہ بھی رہتی تھی۔ تابی نے گیند لینے کے لیے سوزی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے تابی کو اٹھا کر "چٹ چٹ" اس کے دو تین بوسے لیے اور پھر اسے گیند سمیت غزالہ کے حوالے کردیا۔ غزالہ تابی کو لے کر اپارٹمنٹ کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو غزالہ کچھ خاموش خاموش نظر آرہی تھی۔ آج کل میں اکثر و بیشتر غزالہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ذہن کی زمین پر جو پودا برسوں کی خشک سالی سے سوکھ گیا تھا وہ اب پھر زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے' اس کی شاخوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ ٹام کے ساتھ خون ریز مقابلے سے پہلے میرے اور غزالہ کے درمیان قرب کا جو لمحہ آیا تھا وہ کئی روز و شب سے مسلسل میرے ذہن پر مسلط تھا۔ یہ کچھ عجیب سا احساس تھا لیکن میں اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ جیسے غزالہ سے میری محبت ایک بار پھر پہلے قدم سے "آغاز" ہورہی ہے۔ وہی روز و شب جو گردش ایام میں کہیں کھو گئے تھے' مجھے پلٹتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو غزالہ نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ تابی کا فیڈر دھونے میں مصروف رہی۔ تابی میری ٹانگوں سے لپٹ گیا' میں نے اسے اٹھالیا۔ تابی سے مخاطب ہو کر میں نے کہا "کیا بات ہے بھئی! آپ دونوں آج کچھ چپ چپ سے لگ رہے ہیں۔"

تابی نے جواباً میرے بال پکڑ لیے اور کھینچنے لگا "تو اب لڑائی بھی شروع کردی' لیکن بھئی وجہ تو معلوم ہو۔" میں نے کہا۔

غزالہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی یہ بے رخی مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس بے رخی میں ایک ایسا لطف تھا جسے کچھ میں ہی محسوس کرسکتا تھا۔ میں اس پیاری سی بے رخی کی وجہ جانتا تھا' غزالہ نے ابھی مجھے سوزی کے ساتھ اکیلے میں کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے نوٹس لیا تھا۔ اس کا نوٹس لینا میرے لیے بے حد۔۔۔ بے حد اہمیت رکھتا تھا ورنہ اس سے پہلے تو جب ہم امارات کے صحرا میں تھے تو مجھے دن رات شاری کے ساتھ دیکھ کر بھی غزالہ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ وہ بالکل لاتعلق سی نظر آتی تھی' بس اپنے میں اور تابی میں گم۔

وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو میں نے سنجیدگی سے کہا "غزالہ! تم نے پوچھا نہیں کہ میں وہاں اطالوی لڑکی کے ساتھ کیوں کھڑا تھا؟"

"آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں' میں پوچھنے والی کون ہوتی ہوں۔"

"یہ تو ایک لطیفہ ہے کہ' میں پوچھنے والی کون ہوتی ہوں۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے لیے میری اہمیت کیا ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔"

پھر میں نے سنجیدگی کے ساتھ غزالہ کو ساری تفصیل بتائی۔ میرے سنجیدہ لہجے نے اسے جلد ہی مطمئن کردیا۔ وہ کہنے لگی "یہ لڑکی یہاں کافی بدنام ہے۔ ذرا محتاط رہیے گا۔"

"سبحان اللہ۔ کیا بات ہے۔ بہت خوب!" میں نے کہا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"تمہاری اس نصیحت میں اتنی اپنائیت ہے کہ جی چاہتا ہے۔۔۔ جی چاہتا ہے' جہاز میں ڈھیروں ڈھیر لڑکیاں ہوں اور سب ایک سے بڑھ کر ایک بدنام ہوں۔ تم ہر وقت میرے ساتھ رہو اور قدم قدم پر مجھے ٹوکتی رہو۔"

اس کے حسین ہونٹوں کے گوشے مسکرانے والے انداز میں پھڑک گئے۔ اپنے ہونٹوں کی یہ جنبش چھپانے کے لیے اس نے جلدی سے منہ پھیرلیا۔ یہی وقت تھا جب میں اور غزالہ ایک ساتھ چونک گئے۔ آبی پرندوں کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز ساحل کی آمد آمد کا اعلان تھی۔ کئی روز تک ہم نے اس آسمان کے نیچے صرف اور صرف سمندر کا شور سنا تھا۔ آج یہ آواز اتنی بھلی لگی تھی کہ اس کا سرور کانوں کے راستے جسم میں اتر گیا تھا۔ میں غزالہ اور تابی کو وہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا باہر آیا۔ دور کہیں مغربی افق پر روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک روشن لکیر سی تھی جو شمالاً جنوباً دور تک چلی گئی تھی۔ کسی ایسے ہی منظر کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں ترس گئی تھیں۔ یہ منظر خشکی کی علامت تھا۔ خشکی جو سمندر کے خاتمے کا اعلان تھی۔ عرشے پر ایک ہلچل سی نظر آرہی تھی۔ جہاز کا عملہ تیز قدموں سے آجا رہا تھا۔ حبشی پہرے دار بھی سرگرمی سے مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ میں واپس جاکر غزالہ کو ساحل کے بارے میں بتانا چاہتا تھا کہ پہرے دار جوزف نے مجھے روک لیا۔ حسب معمول گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ درشت لہجے میں بولا "تمہیں نیچے کیبن میں چلنا ہوگا۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں جانتا۔ یہ باس کا حکم ہے۔ دوسرے لوگ بھی جارہے ہیں۔"

"دوسرے لوگ کون؟"

"ہمارے اور عملے کے سوا باقی سب لوگ۔" جوزف نے جواب دیا۔

اسی دوران میں' میں نے غزالہ' تابی اور انڈین لڑکی انوپما دھا عرف انو کو دیکھا۔ ان تینوں کو ایک حبشی پہرے دار بالائی عرشے سے زیریں کمپارٹمنٹ میں لے جارہا تھا۔ غزالہ کچھ حیران نظر آرہی تھی جبکہ سیدھی سادی دیہاتی انو باقاعدہ خوف زدہ تھی۔ کہتے ہیں کہ بے آسرا عورت کے لیے حسن ایک وبال ہوتا ہے اور اگر عورت حد سے زیادہ معصوم بھی ہو تو پھر یہ وبال جان بن جاتا ہے۔ انو کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہورہا تھا۔ ہر کوئی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اور کچا چبا جانے کا خواہش مند تھا۔ انو کی لاچار صورت دیکھ کر میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب چند روز پہلے وہ ایرانی بارکوس کے پنجۂ ستم سے نکل کر سیڑھیوں کے نیچے جا چھپی تھی۔ میں کافی دیر تک سیڑھیوں کے نیچے اس کے پاس بیٹھا رہا تھا اور اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔ وہ اپنے "اندر نگر والے گھر" جانا چاہتی تھی کیونکہ وہاں اس کا پتی رہتا تھا جو رات دن اس کا انتظار کررہا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ اندر نگر کہاں تھا اور وہاں انو کا کون سا گھر تھا مگر ان لفظوں کے پیچھے بھی یقیناً کوئی کہانی ہی پوشیدہ تھی۔ انو میرے قریب سے ہو کر گزری تاہم اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ اسے نجانے کتنے ہفتوں یا مہینوں سے ماڈرن اور فیشن ایبل بنانے کی کوشش کی جارہی تھی اور وہ بظاہر نظر بھی آتی تھی مگر جب اسے ذرا دھیان سے دیکھا جاتا تھا تو اس کے اندر چھپی ہوئی سیدھی سادی دیہاتن صاف نظر آجاتی تھی۔

وہ لوگ زیریں کمپارٹمنٹ کی طرف چلے گئے' تھوڑی دیر بعد جوزف نے مجھے بھی چور دروازے سے گزار کر وہاں پہنچا دیا۔ وہاں پروفیسر اللہ دتا اور زریں گل پہلے سے موجود تھے۔ اس کے علاوہ سیاہ بالوں اور براؤن آنکھوں والی وہ دو لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں جنہیں میں انو سمیت بمبئی سے جہاز پر لایا تھا۔ یہ سب لوگ حیران دکھائی دے رہے تھے۔ میں جب وہاں پہنچا تو پروفیسر اللہ دتا ایک حبشی سے الجھ رہا تھا۔ اس حبشی نے کمپارٹمنٹ کے زینوں سے اترتے ہوئے انو کو دھکا دیا تھا اور وہ آخری زینے سے لڑکھڑا کر گر گئی تھی۔ اب وہ ایک طرف کھڑی زار و قطار رو رہی تھی اور اپنی چھلی ہوئی کہنی سے خون صاف کررہی تھی۔

پروفیسر کا حبشی سے تکرار کرنا مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ

"تکرار" درحقیقت پروفیسر کے بدلے ہوئے خیالات کی ایک جھلک تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پروفیسر کے اندر مزاحمت کی کونپل پھوٹ نکلی ہے۔ آج صبح میں نے پروفیسر کے ساتھ جو طویل گفتگو کی تھی اس نے اس کونپل کے لیے آب پاشی کا کام دیا تھا۔ پروفیسر کی جھکی ہوئی عاجز اور مسکین گردن اب اپنے سر کا بوجھ سہارتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ آنے والے دنوں میں پروفیسر اپنے نام نہاد داماد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا اور نہ بھی کرتا تو کم از کم اتنا تو ہو ہی گیا تھا کہ اس کا "ذلت آمیز عاجزی والا رویہ" بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ صبح میں نے پروفیسر کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ شائستہ اب مائیکل کے بچے کی ماں بننے والی ہے لہٰذا مائیکل شائستہ کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتا' میرا یہ بیان کسی لحاظ سے بھی درست نہیں تھا۔ کسی اور کو معلوم نہ ہو مگر مجھے تو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ آدم خور مائیکل کے نزدیک شائستہ کی زندگی کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہونے والے بچے کی۔ اگر اس کے ذہن میں زچہ و بچہ کا تھوڑا بہت بھی خیال ہوتا تو شاید ایرانی جہاز کی تباہی کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں نے پروفیسر کے سامنے یہ "جھوٹ" صرف پروفیسر کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بولا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ مجھے اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی ہو گئی تھی۔

ہم نے وہ ساری رات کیبنوں کے اندر ہی گزاری۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ جہاز بدستور حرکت میں تھا مگر یہ بہت آہستہ حرکت تھی۔ پہرے دار بالکل چوکس نظر آتے تھے' اگر کوئی بلند آواز سے بولتا بھی تھا تو وہ اسے گھورنے لگتے تھے۔ ایک اُتر پردیشی قیدی کو گردے کا درد تھا۔ وہ درد سے بیتاب ہو کر گاہے بہ گاہے چلانے لگتا تھا۔ پہرے دار پہلے تو اسے منع کرتے رہے پھر ایک نیامی پہرے دار نے بھنا کر پیتل کا منحوس پھندا کیبن کے اندر داخل کر دیا۔ پھندا بدنصیب شخص کی گردن میں فٹ ہوا' دو پہرے دار اسے کھینچ کر دروازے کے خلا کے قریب لے آئے۔ اب اس کا سر دروازے کے خلا سے باہر اور دھڑ اندر تھا۔ وہ کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک نیامی نے کی بو کو نکالا اور وحشت ناک انداز میں قیدی پر پل پڑا۔ میں اور صفدر اپنے کیبن کے سوراخ میں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شراب شراب کی محض آواز کمپارٹمنٹ میں گونجی اور بدنصیب شخص کے چہرے کی کھال ادھڑنا شروع ہو گئی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا' جو زف دہاڑا "چیخو اور زور سے چیخو۔"

قیدی اس ہدایت پر عمل کیسے کر سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی پورے زور سے چیخ رہا تھا۔ اس کی آواز پھٹ گئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اگر چند سیکنڈ کی بو کو مزید اس پر برستا تو یقیناً کھال چہرے سے علیحدہ ہونا شروع ہو جاتی۔ خبر نہیں کہ پہرے داروں کے ذہن میں کیا آیا' انہوں نے مضروب کی گردن شکنجے سے نکال کر اسے واپس کیبن میں دھکیل دیا۔

اس واقعے کے بعد کمپارٹمنٹ میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ بس پہرے داروں کے بھاری قدموں کی آوازیں تھیں جو راہداری میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ مجھے زیادہ فکر اُتر پردیشی قیدیوں کی تھی۔ وہ اس قسم کی صورت حال میں بہت غم زدہ ہو جاتے تھے اور جب وہ غم زدہ ہوتے تھے تو ان کا دھیان میری طرف ہی جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں ہر مشکل میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔ وہ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح سویرے یوں لگا کہ جہاز رک گیا ہے۔ تاہم باہر سے کسی طرح کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ بالکل خاموشی تھی۔ اچانک کمپارٹمنٹ کے دروازے کھلے اور مزید آٹھ دس مسلح افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے کچھ تو حبشی پہرے دار تھے جبکہ چار پانچ سفید فام عملے کے افراد تھے' ان کے ہاتھوں میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ تین چار نیامی حبشیوں کے ہاتھوں میں کی بو کو بھی موجود تھے۔

سب سے پہلے تین کیبنوں کے دروازے کھولے گئے اور قیدیوں کو ہانک کر سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا۔ وہ ڈرے سہمے' پہرے داروں کے نرغے میں چلتے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر چلے گئے۔ قریباً پانچ منٹ بعد پہرے داروں کی واپسی ہوئی' اس مرتبہ پھر تین کیبنوں کے دروازے کھولے گئے اور قیدیوں یعنی بردوں کو ہانک کر باہر پہنچا دیا گیا۔ یہ سلسلہ قریباً ایک گھنٹا جاری رہا پھر ہماری باری بھی آ گئی۔ مسلح پہرے دار ہمیں لے کر کمپارٹمنٹ کے چور دروازے پر پہنچے۔ حسب معمول چاول کی بوریوں کی دو قطاریں سلائیڈنگ تختے پر پیچھے ہٹ گئیں اور ہم بوریوں کے انبار میں سے گزر کر عرشے پر آ گئے۔ ابھی صبح کا اجالا کافی دور تھا۔ قرب و جوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر کولیس کسی ویران کھاڑی پر کھڑا تھا۔ یہاں کھجور اور تاڑ کے بلند و بالا درخت بادِ صبا میں جھوم رہے تھے۔ جہاز سے نیچے کھاڑی کے پلیٹ فارم پر اترنے کے لیے ایک کشادہ ڈھلوان راستہ تھا۔ یہ راستہ لکڑی کے بڑے بڑے تختوں کو لوہے کی پٹیوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ہم اس راستے سے پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

درختوں میں پانچ بڑے بڑے لوڈر کھڑے تھے' یہ چاروں طرف سے بند تھے' لوڈرز کی مقبی سرخ روشنیاں اندھیرے میں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ مسلح پہرے داروں نے ہمیں اپنے نرغے میں ایک خالی لوڈر تک پہنچایا۔ ہم تین چار زینے طے کر کے لوڈر میں داخل ہو گئے اور فرش پر بیٹھ گئے۔ ننھا تابی' غزالہ کی گود میں تھا۔ وہ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لوڈر اسٹارٹ تھا۔ اس لوڈر میں غالباً اس سے پہلے تربوز وغیرہ بار کیے گئے تھے۔ فرش پر تربوز کے چھلکے نظر آ رہے تھے اور در و دیوار میں سڑے ہوئے تربوز کی باس رچی تھی۔ ہمیں لوڈر پر بٹھانے کے بعد دروازہ بند نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی اور افراد لوڈر پر بٹھائے جائیں گے۔ پہرے داروں کی حرکات و سکنات سے عیاں تھا کہ سب کام بہت جلدی جلدی میں کیے جا رہے ہیں۔

بمشکل آٹھ دس منٹ گزرے تھے کہ جہاز کی طرف چیخ و پکار سنائی دی۔ ہم نے لوڈر کے اندر سے دیکھا' یہ اُتر پردیشی قیدی تھے۔ انہیں جہاز سے پلیٹ فارم کی طرف لایا جا رہا تھا کہ انہوں نے اچانک چیخ و پکار شروع کر دی تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کس وجہ سے ڈرے تھے مگر ڈر گئے تھے اور جب وہ ایک بار ڈر جاتے تھے تو پھر انہیں سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حبشی پہرے دار ان پر بے تحاشا کی بو کو برسا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ انہیں کھینچ رہے تھے اور دھکیل رہے تھے مگر قیدی پلیٹ فارم کی طرف آنے کے بجائے واپس جہاز کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ فرش پر لیٹ گئے تھے اور کچھ خوف زدہ کیکڑوں کی طرح جہاز کی ریلنگ سے چمٹ گئے تھے۔ وہ سب کے سب بلند آواز میں بین کر رہے تھے۔

پہرے داروں نے بہت زیادہ کھینچا تانی کی تو چند قیدیوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ان میں ایک عورت اور دو مرد تھے۔ انہیں بچانے کے لیے تین چار اطالویوں کو سمندر میں کودنا پڑا۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ مائیکل پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور چیخ چیخ کر اپنے کارندوں کو ہدایات دے رہا تھا مگر کسی کا کچھ بس نہیں چل رہا تھا۔ مائیکل کے حکم پر حبشی محافظوں نے بید کی طویل چھڑیوں (کی بو کو) سے قیدیوں کو بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ کئی مرد و زن کے کپڑے پھاڑ دیے گئے اور انہیں بازوؤں اور ٹانگوں سے کھینچ کھینچ کر جہاز سے اتارنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش بھی پندرہ بیس فی صد سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ قیدی قطعی طور پر اڑ گئے تھے اور جو شے ان کے قریب تھی اس کے ساتھ مضبوطی سے چمٹ گئے تھے۔

غزالہ نے میرے کان میں سرگوشی کی "آپ ہی کچھ کریں۔"

میں لوڈر سے اترا۔ مسلح محافظ بالکل چوکس ہو گئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ آپوں آپ میری جانب ہو گیا تھا۔ میں مائیکل کے پاس پہنچا۔ پریشانی سے اس کا برا حال تھا' گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور آنکھیں سرخ انگارا ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے کارندوں پر مسلسل چیخ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مائیکل اور اس کے ساتھی بردوں کی نقل و حمل کا کام جلد سے جلد نمٹانے کے خواہش مند ہیں۔ شاید انہیں کسی جانب سے کوئی خطرہ تھا مگر اُتر پردیشی قیدی تھے کہ پتھر ہو کر رہ گئے تھے۔ مائیکل نے چلا کر نائب کپتان آرتھر سے کہا "ان میں سے دو چار حرام زادوں کو گولی سے اڑا دو۔"

آرتھر پہلے ہی بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مائیکل کا حکم بجا لانے میں زیادہ تاخیر نہیں کرے گا۔ میں نے مائیکل سے کہا "دیکھو مائیکل! تشدد سے تمہارا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اپنے ڈشکروں سے کہو کہ پیچھے ہٹ جائیں اور اپنی شکلیں ذرا کم کر دیں۔ میں ابھی ان قیدیوں کو آمادہ کر لیتا ہوں۔"

مائیکل نے چونک کر میری طرف دیکھا' مجھ سے مدد لینے کا خیال غالباً اس کے ذہن سے بالکل نکلا ہوا تھا۔ وہ دوڑ کر عرشے پر پہنچا اور اپنے کارندوں کو مختلف ہدایات دینے لگا۔ دو تین منٹ کے اندر وہ سب کے سب پیچھے ہٹ گئے۔ اب ساری نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ افریقہ کی سرزمین پر جو کڑی آزمائشیں مجھے پیش آنا تھیں ان کا آغاز اس قدرے چھوٹی آزمائش سے ہو چکا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور عرشے کی طرف قدم بڑھائے۔ یہی وقت تھا جب کسی نے مجھ پر فائر کر دیا!

گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں نے خود کو اوندھے منہ زمین پر گرالیا۔ اس کے ساتھ ہی گولی چلانے والا شخص بھی میری نگاہ میں آگیا۔ وہ راجن تھا۔ اتر پردیشی قیدیوں میں سے یہ شخص ابھی تک مجھ سے عناد رکھتا تھا۔ میں نے کافی کوشش کی تھی مگر اپنی طرف سے اس کا دل صاف کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ آج اس نے موقع دیکھ کر میرے خلاف ایک سنگین قدم اٹھایا تھا۔ درحقیقت اس نے قریب کھڑے ایک اطالوی کے ہولسٹر سے پسٹل کھینچا تھا اور بے دریغ مجھ پر فائر جھونک دیا تھا۔ صرف ایک فائر کرنے کے بعد وہ چیختا ہوا عرشے کی ریلنگ کی طرف بھاگا۔ غالباً اپنے چند خواص یافتہ ساتھیوں کی طرح وہ بھی سمندر میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ریلنگ تک پہنچتا ایک حبشی محافظ نے اسے بازوؤں میں جکڑلیا۔ اسی دوران میں وہ فربہ اندام اطالوی بھی دوڑتا ہوا عرشے پر پہنچ گیا جس کے ہولسٹر سے پستول کھینچا گیا تھا۔ وہ دونوں راجن کو فرش پر گرا کر بری طرح پیٹنے لگے۔ میں اٹھ کر دوڑتا ہوا عرشے پر پہنچا اور راجن کو دو تین افراد کے نرغے سے نکالا۔ راجن کی براؤن قمیص پھٹ گئی تھی، اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسی اثنا میں نائب کپتان آرتھر تین حبشی محافظوں کے ساتھ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے راجن کو ایک بار پھر فرش پر گرا دیا اور اس کی مشکیں کسنے لگے۔ خونخوار حبشی پہرے داروں کو اپنے قریب دیکھ کر خوف زدہ اتر پردیشی قیدی کچھ اور بھی سہم گئے۔ وہ ابھی تک جہاز کی مختلف اشیاء سے چمٹے ہوئے تھے اور ہراساں نظروں سے پلیٹ فارم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی خاموش نگاہیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ جہاز سے اتر کر اس اجنبی سرزمین پر قدم رکھنا نہیں چاہتے۔

میں نے نائب کپتان آرتھر کو مخاطب کرکے خشک لہجے میں کہا "میں آپ سے کئی درجن مرتبہ درخواست کرچکا ہوں کہ اپنے ان خون آشام سیاہ فاموں کو ان قیدیوں سے دور رکھو۔ ان کی صورتیں دیکھ کر ہی بے چاروں کی جان نکل جاتی ہے۔"

آرتھر نے حبشی محافظوں کو اشارہ کیا کہ وہ جہاز سے نیچے چلے جائیں۔ راجن کو اچھی طرح باندھا جاچکا تھا لہٰذا حبشی اسے چھوڑ کر پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔ میں اتر پردیشی قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اتر پردیشی قیدیوں کو فرداً فرداً سمجھانے کے بجائے ان کے دو تین سرکردہ افراد کو سمجھانا اور اپنا ہم خیال بنالینا زیادہ آسان ہے۔ میں قبیلے کے سب سے معمر شخص کے پاس پہنچا۔ اس کا نام سیوک تھا۔ میں نے اسے فرش سے اٹھایا، وہ بری طرح لرز رہا تھا۔

"ہم مرجاوت نیچے نہیں اترت۔ ہم کو چھوڑ دیو۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "لیکن تم نیچے اترنا کیوں نہیں چاہتے ہو۔"

وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں واویلا کرنے لگا۔ میں نے توجہ سے اس کی بات سنی تو سمجھ میں آیا کہ ان لوگوں کو جہاز سے اترنے پر تو کوئی اعتراض نہیں، مگر وہ لوڈرز پر کسی صورت بیٹھنا نہیں چاہتے۔ پتا نہیں یہ بات ان کے دماغ میں کیوں گھس گئی تھی کہ وہ لوڈرز میں بیٹھے تو کہیں بہت دور پہنچا دیے جائیں گے۔ حالانکہ "بہت دور" تو وہ پہنچ ہی چکے تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ بحری جہاز پر سمندر میں سفر کرتے رہے تھے۔ یہ بس ان کی سادہ لوحی تھی کہ لوڈرز پر سوار ہونے سے بدک رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لوڈرز کے انجنوں کا شور انہیں مزید ڈسٹرب کررہا ہے۔ میں نے آرتھر سے کہا کہ وہ لوڈرز کے انجن بند کرا دے اور ٹیل لائٹس بجھوا دے۔ آرتھر نے ایسا ہی کیا۔ اتر پردیشیوں کا خوف قدرے کم ہوگیا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ لوڈرز ہمیں زیادہ دور نہیں لے جائیں گے۔ ساحل سے تھوڑا آگے ایک محفوظ مقام پر ہمیں رکھا جائے گا۔ وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ جگہ گرمی اور مچھر مکھی وغیرہ سے محفوظ ہے۔ وہاں سب لوگ نہا دھو سکیں گے اور اچھا کھانا ملے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ وہاں خون خوار حبشیوں کے منحوس چہرے نظر نہیں آئیں گے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میری آخری بات نے سیوک کمار کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ میں دھیمے لہجے میں کئی منٹ تک سیوک کمار اور دوسرے لوگوں کو سمجھاتا رہا۔ بالآخر وہ رضامند نظر آنے لگے۔ میں انہیں بڑی محبت سے ہاتھ پکڑ پکڑ کر نیچے لے آیا۔ انہیں لوڈر میں بٹھایا جانے لگا تو انہوں نے شرط پیش کی کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں گا۔ انہیں پُرسکون اور خاموش رکھنے کے لیے مائیکل نے مجھے اور صفدر کو ان کے ساتھ بٹھادیا۔

جلد ہی ہرکولیس کے تمام بڑے ساحل پر کھڑے دیوہیکل لوڈروں میں سوار ہوگئے۔ لوڈروں کے دروازے یکے بعد دیگرے بند کردیے گئے تھے۔ سب سے آخر میں ہمارے لوڈر کا دروازہ بند کیا گیا۔ اس لوڈر میں سے کافی اور چائے کی خوشبو آرہی تھی۔ کافی کے پتے بھی فرش پر بکھرے

ہوئے تھے۔ پانچ دس منٹ بعد ہمارا لوڈر حرکت میں آگیا۔ ظاہر ہے کہ باقی لوڈر بھی چل پڑے تھے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا، مگر یہ لوڈرز چونکہ چاروں طرف سے بند تھے لہٰذا ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر لوڈر کی چھت پر ایک ایگزاسٹ فین موجود تھا مگر یہ فین اندر کے حبس اور گھٹن کو کم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ کچھ دیر تو لوڈر ہموار راستے پر چلتا رہا پھر اس نے ٹرن لیا اور ایک اونچے نیچے راستے پر آگیا۔ یہ نیم پختہ راستہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا چلا گیا۔ لوڈر کی رفتار بمشکل بیس میل فی گھنٹا رہی ہوگی۔ گرمی اور حبس سے ہمارا برا حال تھا۔ جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ پسینے کی بو چائے اور کافی کی خوشبو میں شامل ہوکر عجیب سے رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ میرے اور صفدر کے اردگرد اتر پردیشی قیدی خوف زدہ جانوروں کی طرح ساکت و جامد بیٹھے تھے۔ میں نے گنا، اس لوڈر میں وہ ستر تھے۔ ان کے چند ساتھی ایک دوسرے لوڈر میں بٹھائے گئے تھے۔ اتر پردیشی قیدیوں کی نظریں رہ رہ کر میری طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جیسے پوچھ رہے ہوں کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں؟ وہ مجھے باخبر سمجھ رہے تھے مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں بھی اتنا ہی لاعلم ہوں جتنے کہ وہ۔۔۔ شدید گرمی کے سبب بچے کملا سے گئے تھے اور مرد و زن نڈھال ہورہے تھے۔ کم سن ماں "کملا" کا بھی برا حال تھا۔ مزید ستم یہ ہوا تھا کہ اس کا شیر خوار بچہ بھی بھوک اور پیاس کی وجہ سے بلکنے لگا تھا۔ وہ مسلسل رو رہا تھا۔ ماں کے قابو میں آرہا تھا اور نہ نانی کے۔ یہاں تک کہ اس کا گلا بیٹھ گیا اور حلق سے "گیں گیں" کی آواز نکلنے لگی۔ اپنے بچے کی حالت دیکھ کر کملا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ وہ بار بار بچے کو اپنی میلی کچیلی ساڑی کے نیچے چھپالیتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ چمٹاتی تھی، تھپکتی تھی، بچہ اپنی خورک حاصل کرنے کے لیے بے قراری سے سر کو جنبش دیتا تھا اور ناکام ہوکر ایک بار پھر پورے زور سے چلّانے لگتا تھا۔ دراصل کمزوری، گرمی اور شدید پیاس کے سبب ماں کا دودھ بھی سوکھا ہوا تھا۔ بچے کا فیڈر کملا افراتفری میں جہاز کے اندر ہی بھول آئی تھی۔

لوڈر میں کم و بیش دس عورتیں ایسی تھیں جن کے پاس شیر خوار بچے تھے۔ ان میں سے چار پانچ کے پاس فیڈر بھی موجود تھے، مگر کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ اپنے بچے کا دودھ کملا کے بچے کو دے دیتی۔ یہ بے یقینی مصیبت اور بھوک پیاس کا سفر تھا، کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کتنی دیر اور کب تک اس مشکل کا شکار رہنا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں خدا ترسی ایک خاصا دشوار کام ہوتا ہے۔

اچانک صفدر نے میرا گھٹنا دبایا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا پیکٹ نظر آرہا تھا۔ ایسے پیکٹ جہاز میں شیر خوار بچوں کی ماؤں کو دیے جاتے تھے "یہ کہاں سے لیا ہے؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

اس نے اپنے قریب ہی اونگھتی ہوئی ایک اتر پردیشی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس نے لوڈر کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور اس کی گود میں ایک بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ صفدر نے یہ پیکٹ عورت کی ساڑی کے اندر سے کھسکایا ہے اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہم زیادہ دیر محو سفر نہیں رہیں گے اور منزل پر پہنچ کر سب کو خوراک میسر آجائے گی۔ فی الوقت کملا کے بچے کو دودھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ میں نے پیکٹ کملا کے ہاتھ میں تھمایا تو اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو مسکرا اٹھے۔ اس نے تشکر کی نگاہوں سے مجھے اور صفدر کو دیکھا۔ کملا کی ماں نے ایک عورت سے خالی فیڈر حاصل کیا اور پیکٹ کا دودھ اس میں انڈیل کر کملا کو دے دیا۔

خوراک ملتے ہی بچے کی چیخ و پکار بند ہوگئی۔ صفدر نے میرا گھٹنا پھر دبایا اور اشارے سے مجھے پروفیسر کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے ہوئے ہیں اور اس کے چہرے پر شدید کرب نظر آرہا ہے، پھر اچانک وہ ابکائیاں لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کھانسی نے اس کے پورے بدن کو دہلا دیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ پھر یکایک بات ذہن میں آگئی۔ پروفیسر کی یہ حالت دودھ دیکھ کر ہوئی تھی۔ جہاز میں مائیکل کی طرف سے پروفیسر کو اتنی "محبت" سے اور اتنی زیادہ مقدار میں دودھ پلایا گیا تھا کہ اب دودھ کو دیکھ کر ہی اس کا "دل باغ باغ" ہوجاتا تھا۔

پروفیسر نے خود کو بمشکل سنبھالا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ خدا کی ایک ہی نعمت دو انسانوں کے لیے کس قدر مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ ایک بچے کے لیے دودھ، بھوک پیاس سے نجات کا باعث بنا تھا اور اسے سکون حاصل ہوا تھا۔ ایک دوسرے شخص کے لیے اسی دودھ کو پینا تو درکنار، دیکھنا بھی آنکھوں کا عذاب تھا۔ چند راتیں پہلے جہاز میں جو کچھ پروفیسر پر گزری تھی وہ میں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھی تھی مگر اب اس لوڈر میں پروفیسر کی حالتِ زار دیکھ کر مجھے اس قیامت کا تھوڑا بہت اندازہ ہوگیا۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید چلنے کے بعد لوڈر رک گیا۔ ہمیں باہر نکالنے کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ زندگی بخش ہوا دیوانہ وار اندر گھس آئی۔ باقی لوڈر بھی قریب ہی نظر آرہے تھے۔ ان کے عقبی دروازے ابھی بند تھے۔ ہم ایک وسیع فارم نما جگہ پر کھڑے تھے۔ یہاں درخت تھے اور ایک ترتیب میں دور تک کھیت نظر آرہے تھے۔ ان کھیتوں میں اگی ہوئی فصل چار پانچ فٹ تک اونچی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کافی کے پودے ہیں۔ لمبوترے پتوں والے ان پودوں کے درمیان کئی کھیت مزدور نظر آئے۔ ان سیاہ فام افراد نے بغیر آستین کے شلوے کے پہن رکھے تھے۔ نیچے نیکریں یا لنگوٹیاں تھیں۔ چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے سروں پر ٹنکوں کی ٹوپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں چند سیاہ فام عورتیں بھی تھیں۔ ان کے سروں پر اسکارف نما سفید کپڑے نظر آرہے تھے۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ مسلح حبشی محافظوں کے نرغے میں ہمیں لوڈر سے نیچے اتارا گیا اور کافی کے پودوں کے درمیان سے گزار کر درختوں میں گھرے ہوئے ایک گودام نما مکان میں پہنچا دیا گیا۔ اس وسیع عمارت کی دیواریں گارے اور مٹی سے بنی ہوئی تھیں۔ چھت لکڑی اور درختوں کی چھال کی تھی اور اس پر بھی گارے کا لیپ تھا۔ اتر پردیشی قیدی' جہاز میں سیاہ فام محافظوں کو دیکھ دیکھ کر دہشت زدہ ہوئے تھے' مگر یہاں تو ہر طرف سیاہ فام ہی نظر آرہے تھے۔ بہرحال وہ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے اور کسی نے ہم پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں باقی تمام افراد بھی لوڈروں سے اتر کر عمارت میں پہنچ گئے۔ یہاں کئی ہوادار کمرے تھے' قیدیوں کو مختلف کمروں میں بانٹ دیا گیا اور دروازے باہر سے مقفل کرکے پہرے دار کھڑے کردیے گئے۔ میں صفدر اور پروفیسر' اتر پردیشی قیدیوں کے ساتھ علیحدہ کمرے میں تھے۔ اس کمرے کے دروازے کے عین سامنے ایک خوں خوار کتا چکرا رہا تھا۔ ایسے ہی چند اور کتے بھی یہاں موجود تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم کسی مقامی جاگیردار کی کافی اسٹیٹ میں ہیں۔ مائیکل ہمیں یہاں کیوں لے کر آیا تھا؟ یہ ہماری مستقل منزل تھی یا عارضی؟ اگر عارضی منزل تھی تو پھر ہمیں آگے کس ذریعے سے سفر کرنا تھا؟ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کس ملک میں ہیں۔ میرے ناپ کے مطابق ہم افریقہ کے مشرقی ساحل پر تھے۔ اگر ہم مشرقی ساحل پر تھے تو پھر یہ ملک کینیا' تنزانیہ' موزنبیق کوئی بھی ہوسکتا تھا۔

میری طرح صفدر اور پروفیسر کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ ہماری منزل نہیں ہے بلکہ رستے کا ایک پڑاؤ ہے۔ جب ہم لوگ بمبئی سے مشرق کی طرف روانہ ہوئے تھے تو ہم نے ماریطانیہ کا نام سنا تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ ہم ماریطانیہ جارہے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ ماریطانیہ افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ اگر ہمیں ماریطانیہ ہی جانا تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ ہمیں خشکی کا ایک طویل سفر درپیش ہوتا' لیکن یہ بات میرے اور صفدر کے ذہن میں کچھ بیٹھ نہیں رہی تھی' بلکہ ایسا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ پاپیادہ سفر' مصیبتوں کو خود دعوت دینے والی بات تھی۔ ہماری حیثیت اسمگلنگ کے مال کی سی تھی اور اسمگلنگ کا مال بحری جہازوں کے خفیہ خانوں سے بڑھ کر اور کہاں محفوظ ہوسکتا ہے۔

اچانک صفدر کی نگاہ ایک براؤن کاغذ پر پڑی۔ یہ کسی پیکنگ کا کاغذ تھا۔ صفدر اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ خبریں سنانے والے انداز میں بولا "صاحبان! تازہ ترین اطلاع کے مطابق ہم اس وقت تنزانیہ میں ہیں۔"

"کیا لکھا ہے اس پر؟"

صفدر نے کہا "لکھا ہے کہ دنیا کی بہترین کافی تنزانیہ کی کافی ہے اور اس فارم کی کافی تنزانیہ کی بہترین "کافیوں" میں شمار ہوتی ہے اور کافی کا یہ بلینڈ بہترین کافیوں میں سے بہترین ہے وغیرہ وغیرہ۔ اوپر فارم کا نام بھی لکھا ہے۔ "پرل فارم" یقیناً ہم اس وقت پرل فارم میں تشریف فرما ہیں۔" صفدر نے پوری تفصیل بتادی۔ میں نے وہ براؤن کاغذ دیکھا۔ وہ کافی کی پیکنگ ہی کا کاغذ تھا۔ تنزانیہ کے الفاظ نمایاں نظر آرہے تھے۔

کافی کے اس گودام سے باہر افریقہ کا سورج آگ برسا رہا تھا۔ جوں جوں دھوپ تیز ہورہی تھی' حدت بڑھتی چلی جارہی تھی۔ گودام میں بہت سے ایگزاسٹ فین لگے تھے اس کے علاوہ پنکھے بھی موجود تھے مگر پسینہ پھر بھی دھاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں کھانا دیا گیا۔ کوئی مقامی سبزی تھی۔ اس کے علاوہ گائے کا گوشت تھا۔ روٹیاں بھی عجیب ڈیزائن کی تھیں اور ان کا مزہ ڈبل روٹی جیسا تھا۔ اتر پردیش کے قیدیوں نے گائے کا گوشت پہچانتے ہی کھانے کو ہاتھ لگانے سے انکار کردیا۔ میں نے حبشی کارندوں سے کہا کہ وہ گائے کا گوشت یہاں سے لے جائیں ورنہ پھر جہاز والے حالات پیدا ہوجائیں گے (جب ان قیدیوں نے طویل بھوک ہڑتال کردی تھی اور جاں بلب ہوگئے تھے) کارندوں نے میری بات مان لی۔ بعد ازاں تھوڑی سی پس و پیش کے بعد یہ لوگ کھانا کھانے پر آمادہ ہوگئے۔

کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مائیکل معائنے کے لیے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک گنجے ہوئے جسم کا کوتاہ قد حبشی ہی تھا۔ اس نے نہایت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ گلے کی چین' انگوٹھیوں اور بٹنوں کی صورت میں اس کے جسم پر بہت سا سونا بھی نظر آرہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس شخص کا نام مبارک امین تھا اور یہ اس بہت بڑے کافی فارم کا مالک تھا۔ اس نے گودام میں جس محسوس کیا تو اپنے سیاہ فام کارندوں کو کھڑکیاں وغیرہ کھولنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم پر ہمیں فوری طور پر کھانے کے لیے پھل بھی فراہم کیا گیا۔ پھل میں کیلے اور تربوز وغیرہ شامل تھے۔ معائنے کے دوران میں مائیکل کی نگاہ پروفیسر پر پڑی تو وہ فوراً اس کے قریب چلا آیا۔ بڑے احترام سے بولا "پروفیسر ڈیئر' یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں' آپ ان ہندوستانی قیدیوں کے ساتھ یہاں فرش پر بیٹھے ہیں۔ چچ چچ۔ یہ تو ٹھیک بات نہیں۔ آپ میری عزت کا ہی کچھ خیال کرلیا کریں۔ چلیں انھیں' میں آپ کے لیے علیحدہ رہائش کا انتظام کرتا ہوں۔"

اس نے پروفیسر کو اٹھایا۔ پروفیسر کا رنگ ہلدی ہورہا تھا مگر میں نے ایک بات نوٹ کی۔ پروفیسر کے چہرے پر وہ حد سے زیادہ عاجزی اور مسکینی دکھائی نہیں دیتی تھی جو اس سے پہلے مائیکل کو دیکھتے ہی پروفیسر کو گھیر لیتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ عاجزی مائیکل کو مزید تشدد اور سفاکی پر ابھارتی تھی۔

اسی دوران میں مائیکل کی نگاہِ کرم مجھ پر بھی پڑ گئی۔ اس نے مجھے اشارے سے قریب بلایا "تم یہاں کیا کررہے ہو شاہ جہاں۔ چلو آؤ میرے ساتھ' تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا ٹمارتو دی آئی پی سیٹر میں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا وی آئی پی بننے سے بہتر ہے کہ انسان جانوروں کے ساتھ رہائش اختیار کرلے۔"

"اوہو ہو۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی بدگمان ہوتے جارہے ہو۔ آخر ایسا کیا دیکھ لیا ہے تم نے مجھ میں؟"

"دھنواؤں گا تو غصے سے گیس کا بم بن جاؤ گے اور پھٹ جاؤ گے۔ لہٰذا اپنی اور میری بہتری کے لیے مجھے خاموش ہی رہنے دو۔"

مائیکل یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے ایک گہری سانس لی "چلو ٹھیک ہے بھئی۔ خاموش ہی رہو' لیکن یہاں سے تو چلو۔ میں تمہارے سلسلے میں ہلکا سا رسک بھی لینا نہیں چاہتا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل نے مسکرا کر اپنے سیاہ فام پہرے داروں کی طرف اشارہ کیا "تمہیں ان کی طرف سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ پہلے تم نے ان کے ساتھی سائن کو ہلاک کیا' اس کے بعد جہاز پر ہونے والے مقابلے میں ٹام کو تمہاری وجہ سے شوٹ کرنا پڑا۔ سائن کی بات تو چلو قدرے پرانی ہوگئی ہے لیکن ٹام والا زخم تو بالکل تازہ تازہ ہے۔ ٹام کا کوئی دوست تمہارے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے اور یہاں جو لوگ پہرے پر مقرر ہیں وہ زیادہ تر ٹام ہی کے ساتھی ہیں۔"

مائیکل مجھے لے کر گودام سے باہر آگیا۔ دوپہر اب سہ پہر میں ڈھل رہی تھی۔ میرے بازو پر کھڑی موجود تھی گھڑی پر ابھی تک بمبئی ہی کا وقت چل رہا تھا۔ مائیکل نے مجھے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو بڑے اسٹائلش انداز میں بولا "تنزانیہ کی گھڑیوں کے مطابق اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں۔ تم اپنی گھڑی پر وقت درست کرلو۔"

"تو گویا ہم تنزانیہ میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو تنزانیہ میں ہی ہیں۔"

"تمہاری باتوں سے تو پتا چلتا تھا کہ ہم ماریطانیہ جارہے ہیں۔"

وہ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے مسکرایا "ماریطانیہ بھی پہنچ جائیں گے۔ تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ ایک آدھ دن یہاں کھلی فضا کا مزہ لو۔ کھاؤ' موج اڑاؤ اور کافی پیو لیکن ایک بار پھر تمہیں وارننگ دے دیتا ہوں' اپنی بہت پرانی عادت کے مطابق کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ چالاکی تمہارے ساتھیوں اور خاص طور سے تمہاری

مہر الدین نواب کی طرف سے ایک خوبصورت ناول

جرمِ وفا

☐ الجھی ہوئی لچکی' سسکتی' تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان۔
☐ مصنف نے اس ناول میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی مکمل عکاسی اور تجزیہ پیش کیا ہے۔
☐ سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان مسلم تاریخ کا بڑا ہی شرمناک سنگِ میل ہے۔ بغداد' غرناطہ اور حصہ پاکستان کے آخری آدوار کا جائزہ لیا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ حکمرانوں کی عیاشیاں اور اخلاق و کردار کی کمزوریاں نمایاں نظر آتی ہیں۔

قیمت [illegible] ڈاک خرچ [illegible]

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر [illegible]

سویٹ ہارٹ کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "کافی تو یہاں کی واقعی اچھی ہوگی لیکن میرا خیال ہے کہ تم صرف ہمیں کافی پلانے کے لیے یہاں نہیں لائے ہو۔ یقیناً کوئی اور وجہ ہوگی اس کی۔"

"اچھا تم بتاؤ۔ تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟" وہ سگریٹ کا کش لے کر ذرا بے تکلفی سے بولا۔

میں نے کہا "کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمہیں بحری راستے پر آگے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔"

وہ قدرے حیرانی سے مجھے دیکھ کر بولا "تمہارا تُکا لگ گیا ہے۔ ہمیں کچھ ایسی ہی مشکل درپیش تھی۔"

"کہیں وہ ایرانی جہاز والا معاملہ تو درپیش نہیں؟"

"نہیں، یہ ان کے بھی باپ تھے۔ بہرحال امید ہے کہ کل تک ہمارا راستہ صاف ہوجائے گا اور ہم اپنا سفر دوبارہ شروع کرسکیں گے۔"

"کیا مطلب؟ ہمیں پھر ہرکولیس پر سوار ہونا ہوگا؟"

"تو تم کیا سمجھتے ہو ہم پیدل ہی افریقہ کے دوسرے سرے پر پہنچیں گے؟"

اس نے اپنے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر مجھے دیا۔ وہ قدرے اچھے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ سخت گرمی کے باوجود مائیکل نے پینٹ کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ ہم ایک گھنے درخت کے سائے میں جا کھڑے ہوئے اور کافی کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مرد و زن کو دیکھنے لگے۔ مزدور عورتوں نے بڑے ہلکے پھلکے لباس پہن رکھے تھے۔ مائیکل کے ضیائی گارڈز ان عورتوں کو گاہے گاہے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ لیتے تھے۔

اچانک "بیپ بیپ" کی مخصوص آواز بلند ہوئی۔ یہ مائیکل کے طاقت ور واکی ٹاکی کا سگنل تھا۔ مائیکل نے واکی ٹاکی کوٹ کی جیب سے نکالا "ہیلو۔ مائیکل اسپیکنگ!" اس نے کہا۔ دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا کہ مائیکل کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔ وہ قدرے پریشانی سے بولا "اور ڈبل زیرو پوائنٹ کی کیا پوزیشن ہے؟"

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف کی جانے والی بات سنتا رہا، پھر ماؤ نامی کسی شخص کو ہدایات دینے لگا۔ واکی ٹاکی پر مائیکل نے جو گفتگو کی اس سے معلوم ہوا کہ آگے موزنبیق کے ساحل کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ناکا بندی کی گئی ہے۔ یہ ناکہ بندی اسمگلنگ کی روک تھام کے سلسلے میں تھی۔ غالباً اس ناکا بندی میں انٹرپول کا کوئی کردار بھی موجود تھا، کیونکہ مائیکل کی زبان سے دو تین بار میں نے انٹرپول کا لفظ بھی سنا۔ اسی ناکا بندی کی خبر ملنے کے بعد ہرکولیس کو افراتفری میں ویران کھاڑی میں لایا گیا تھا، ہمیں اس پر سے اتار کر اس "کافی اسٹیٹ" میں پہنچایا گیا تھا۔ مائیکل کا خیال یہ تھا کہ یہ ناکا بندی ایک آدھ دن میں ختم ہوجائے گی اور ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے، مگر مائیکل کو جو اطلاع ملی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ناکا بندی ابھی جاری ہے اور شاید دو چار دن مزید جاری رہے گی۔

مائیکل نے مجھے فارم کے رہائشی حصے میں پہنچایا۔ رہائشی عمارت کافی آرام دہ اور ٹھنڈی تھی۔ یہاں ڈیزرٹ کولر اور ائرکنڈیشنر وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا وہاں زریں گل، گلثوم پہلے سے ہی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ میں نے مائیکل سے کہا کہ صفدر کو بھی یہاں پہنچا دیا جائے۔ معمولی تذبذب کے بعد مائیکل نے صفدر کو یہاں شفٹ کرنے کی ہامی بھرلی۔

میں نے زریں سے پوچھا "غزالہ کو تو نہیں دیکھا؟"

وہ بولا "غزالہ بی بی اور تابی دونوں اسی بلڈنگ کے کسی کمرے میں ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ام کو بچے کے رونے کی آواز آیا تھا۔ ام کو پکا یقین ہے کہ وہ تابی ہی تھا۔"

مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ مائیکل، غزالہ کو ہمارے ساتھ رکھنے کا رسک نہیں لے گا، جہاز کی طرح یہاں بھی غزالہ کی حیثیت یرغمالی کی سی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صفدر بھی دو مسلح افراد کی نگرانی میں ہم تک پہنچ گیا۔ صفدر کی موجودگی سے میری ڈھارس سی بندھ جاتی تھی، غالباً صفدر بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ ہمیں یوں لگتا تھا کہ ہمارے اردگرد کہیں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، اور اگر ہے تو ہم اسے چٹکیوں میں حل کرلیں گے۔ صفدر نے بتایا کہ میرے چلے آنے سے اس پر دشی بہت اداس ہوگئے ہیں۔ کملا کی آنکھوں میں تو باقاعدہ آنسو چمک رہے تھے۔

زریں گل سخت بے قرار نظر آرہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور جو معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں ان میں سے کچھ اس تک پہنچائیں۔

وہ بولا "استاد صیب! ایک تو ام کو اس گلثوم نے پاگل کردیا ہے۔ اس کی ہر وقت بس ایک ہی رٹ ہے۔ یہ پشاور واپس جانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ ام کو اپنے گھر لے جاؤ۔ ام رات دن تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے کپڑے دھونا چاہتا ہے، تمہارے لیے روٹی پکانا چاہتا ہے۔ جھاڑو دینا چاہتا ہے اور برتن مانجھنا چاہتا ہے۔ اب بتائیں استاد صیب ام اس کو یہ سب کچھ کیسے مہیا کرے۔ اماری سمجھ میں تو بس

ی بات آتا ہے آپ مائیکل سے کہہ کر بہت سے گندے برتن اور جھوٹے برتنوں کا انتظام کرا دیں۔ ام اس کو کہتا کہ یہ برتن مانجھو اور کپڑے دھو دھو کر استری کرو۔ شاید طرح اس کا طبیعت کچھ بحال ہوجائے۔"

صفدر نے کہا "جھوٹے برتن اور گندے کپڑے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ مائیکل سے صرف یہ کہہ دیا جائے کہ وہ ہمارے روٹی کپڑے کی کوئی فکر نہ کرے، ہمارے ساتھ ایک رضا کار موجود ہے اور وہ اپنے شوہر اور اس کے دوستوں کی خدمت کے لیے تڑپ رہی ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں مسئلہ ایسے بھی حل نہیں ہوگا۔ تم نے گلثوم کی بات پر غور نہیں کیا۔ وہ زریں سے کہتی ہے کہ میں دن رات تمہاری خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ ذرا الفاظ پر غور کرو، دن اور رات خدمت۔"

صفدر مسکرانے لگا مگر زریں کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا، وہ خاموش تھا۔ میں نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

"خوچے! آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ الفاظ پر غور کرو۔"

"پھر کیا سمجھ میں آیا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں آیا۔ آپ نے غور ہی نہیں کرنے دیا۔"

"غور کرنے کے لیے ایک خاص چیز کی ضرورت ہوتی ہے، جو تمہارے پاس نہیں ہے۔" صفدر نے فقرہ چست کیا۔

"ہاں وہ واقعی ختم ہوگئی ہے۔" زریں گل کے جواب نے ہمیں حیران کردیا۔ یقیناً صفدر کا طنز اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"کیا ختم ہوگئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جس کا ذکر صفدر صیب کررہا ہے۔ وہ راستے ہی میں خرچ ہوگیا تھا۔"

"کیا خرچ ہوگیا تھا۔ اس کا نام بھی تو لو۔" میں نے کہا۔

زریں گل نے بڑی دانائی سے اوپر نیچے سر ہلایا "آپ بار بار کا ذکر کررہا ہے ناں، یہ ٹھیک ہے کہ ام کو نسوار کے بغیر رہنے میں مشکل پیش آتا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کے بغیر اما را عقل خبط ہوجائے۔"

"صفدر نسوار کی نہیں عقل کی بات کررہا ہے۔ جو نسوار کے بغیر واقعی خبط ہوچکی ہے۔"

زریں گل چکرا کر رہ گیا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صفدر کو کوئی کڑاکے دار جواب دیتا۔ گلثوم چیخیاں لینے لگی۔ زریں ایک دم ساری چوکڑی بھول گیا اور لپک کر گلثوم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس کے آگے پیچھے گھومنے لگا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں اور غزالہ کئی بار اسے سمجھا چکے تھے کہ ایسی حالت میں عورت کی طبیعت اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے لیکن زریں کی پریشانی۔ دلیل سے ختم ہونے والی چیز تھوڑی ہی تھی۔ جو شی گلثوم کا دل مالش کرتا تھا زریں کے طوطے اڑ جاتے تھے۔

اس کمرے میں اگلے دو روز ہم نے بڑے آرام سے گزارے۔ اٹرکنڈیشنر چوبیس گھنٹے چالو رہتا تھا۔ مچھر مکھی کا نشان تک نہیں تھا۔ کھانے کو بھی خوب مل رہا تھا۔ بہرحال کمروں سے باہر نکلنے کی آزادی نہیں تھی۔ اس دوران میں ہم کمرے کے اندر سے ہی حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ یہ کافی فارم بڑی سڑک اور آبادی سے خاصے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کا مالک وہی چھوٹے قد کا سیاہ فام تھا جو قیمتی لباس پہنتا تھا اور جس کے گلے میں جھولتی ہوئی سونے کی موٹی چین دور ہی سے نظر آجاتی تھی۔ یہ شخص مسلمان تھا اور اس کا نام مبارک امین تھا۔ مائیکل کے ساتھ اس شخص کی پرانی دوستی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مائیکل کو اپنا بحری سفر عارضی طور پر روکنا پڑا تو اس نے پناہ کے لیے مبارک امین کے کافی فارم کا انتخاب کیا۔ مبارک اپنے رنگ ڈھنگ سے خود بھی کوئی اچھا شخص نظر نہیں آتا تھا، تاہم مائیکل کے برعکس وہ تند مزاج نہیں تھا۔ وہ مائیکل اور اس کے تجارتی سامان (بردوں) کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کررہا تھا۔ یہ فارم وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ رہائشی حصے اور گودام کے اردگرد بڑے اہتمام سے خاردار باڑھ لگائی گئی تھی۔ غالباً جنگلی جانوروں سے حفاظت کی غرض سے ایسا کیا گیا تھا۔ رہائشی حصے سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا گیٹ تھا۔ گیٹ کے قریب ہی گھاس مٹی اور کھجور کے دیوہیکل تنوں سے بنائے گئے بڑے بڑے سائبان تھے۔ ان سائبانوں کے نیچے ٹرالر کھڑے تھے اس کے علاوہ چند ایک کاریں اور جیپیں بھی نظر آتی تھیں۔ گیٹ پر سخت پہرا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ خاردار تار کے ساتھ ساتھ بھی مسلح حبشی دکھائی دیتے تھے۔ یقیناً ہماری آمد سے قبل یہاں اتنا سخت پہرا نہیں تھا۔

ان دو تین دنوں میں ہم نے خوب آرام کیا۔ صفدر اور زریں کی نوک جھوک گاہے گاہے دلچسپی کا سامان بھی پیدا کرتی رہی۔ کھانا ہمیں فارم کے ملازمین ہی دیتے تھے۔ ان میں ایک سوکھا سڑا ملازم سادات بہت ہنس مکھ تھا۔ اس کی پیشانی پر نظر آنے والی محراب گواہی دیتی تھی کہ وہ نماز روزے کا پابند ہے۔ صفدر خاص طور پر اس کی طبیعت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ سادات کے گیارہ بچے تھے، وہ فارم کے بیشتر ملازمین کی طرح "پکا ملازم" تھا اور فارم کی حدود کے اندر ہی واقع ایک بستی میں رہتا تھا۔ غربت، محنت اور قناعت پسندی سادات کے چہرے پر یوں رقم تھی جیسے اخبار کی پیشانی

پر ہیڈ لائن ہوتی ہے۔ صفدر کے پاس وہ چھوٹا سا طلائی ہار ابھی تک محفوظ تھا جو اسے بمبئی کی بندرگاہ پر ملا تھا۔ ہمارے چالاک گائیڈ نے کوسٹ گارڈز کے خوف سے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔ اس واقعے سے چند لمحے پہلے صفدر نے یہ ہار اس کی جیب سے پار کرلیا تھا۔ صفدر نے بڑی ہوشیاری سے اب تک یہ اپنے لباس میں چھپائے رکھا تھا۔۔۔ وہ غریب صورت سادات پر اتنا مہربان ہوا کہ آدھا ہار اسے دے دیا۔ اس آدھے ہار میں بھی آٹھ طلائی موتی تھے' اور ان کی قیمت پانچ چھ ہزار پاکستانی روپے سے کم نہیں تھی۔

کافی فارم میں اپنے قیام کے تیسرے روز ہم پر انکشاف ہوا کہ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کو ابھی راستے کی کلیئرنس نہیں ملی اور کم از کم چار پانچ روز مزید ہمیں یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ اس صورتِ حال پر مائیکل اور اس کے ساتھی کافی جھنجلائے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک روز ان کے ساتھ مجھے "جہاز ہرکولیس" کا شرابی کپتان جم بھی نظر آیا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہرکولیس ہم سے زیادہ دور نہیں ہے' وہ ساحل کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ عین ممکن تھا کہ کسی تکنیکی خرابی کا بہانہ کرکے اسے کھاڑی کے پاس ہی لنگر انداز کردیا گیا ہو۔

میرے اور صفدر کے ذہن میں ایک خیال بار بار شدت سے پیدا ہو رہا تھا۔ اگر ہم بردہ فروش مائیکل کے چنگل سے نکلنا چاہتے تھے تو اس کے لیے یہ حالات بڑے سازگار تھے۔ غزالہ کی حیثیت اب بھی بے شک ایک یرغمالی کی سی تھی مگر جہاز والی صورتِ حال یہاں نہیں تھی۔ وہاں غزالہ ہر گھڑی وڈیو کیمرے کی نظر میں تھی اور ہماری کسی غلطی کے سبب ایک لمحے میں اس کی جان جاسکتی تھی۔ پھر وہاں ہم سمندر کے قیدی تھے۔ جہاز سے فرار بھی ہوجاتے تو کہاں جاتے اور جہاز سے فرار ہونا بھی کون سا سہل تھا۔ ہمیں جہاز کے زیریں کمپارٹمنٹ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے نکلنا سوئی کے ناکے میں سے گزرنے کے برابر تھا۔ اب ہم ٹھوس زمین پر کھڑے تھے' یہاں حفاظتی انتظامات بھی عارضی نوعیت کے تھے۔ ان انتظامات میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈا جاسکتا تھا۔ ہم سب ساتھی ایک ہی جگہ پر موجود تھے' صرف غزالہ کا مسئلہ تھا۔ اگر ہم کسی طرح اس تک پہنچ جاتے تو پھر یہاں سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی جاسکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آدھی رات کے بعد حفاظتی انتظامات کافی نرم ہوجاتے ہیں۔ خاردار تار کے قریب پہرا دینے والے اکثر افراد بھی رائفلوں کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتے تھے' اونگھنے لگتے تھے یا سو جاتے تھے۔ صرف دو عدد کتے تھے جو گیٹ کے قریب رات بھر جاگتے اور بھونکتے رہتے تھے۔

میں اور صفدر پہرے داروں کے معمولات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ صفدر باتوں باتوں میں ملازم سادات سے کچھ معلومات حاصل کررہا تھا۔ فارم کے رہائشی علاقے کا تقریباً سارا نقشہ صفدر نے سادات سے معلوم کرلیا تھا۔ جوں جوں ہماری معلومات میں اضافہ ہورہا تھا ہماری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ہمیں یہ احساس شدت سے ہونے لگا تھا کہ ہمیں بردہ فروش مائیکل کے جال سے نکلنے کی ایک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم یہ کوشش کیے بغیر دوبارہ ہرکولیس پر پہنچ جاتے تو اس کا افسوس ہمیں تادیر رہتا۔ فارم میں ہمارے قیام کے چوتھے پانچویں دن کی بات ہے۔

صبح آنکھ کھلی تو ڈھول ڈھمکے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا' بہت سے حبشی ایک دائرے کی شکل میں ناچ رہے تھے اور اپنی بندوقیں لہرا رہے تھے۔ ان کے درمیان تین سیاہ فام لڑکیاں محوِ رقص تھیں۔ لڑکیوں نے رواج کے مطابق بڑی ہلکی پھلکی بنیان نما شرٹس پہن رکھی تھیں۔ یہ شرٹس ان کے صحت مند جسمانی خدوخال کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کررہی تھیں۔ زیریں جسم پر لنگی کی طرح کا لباس تھا۔ یہ لباس لڑکیوں کو صرف گھٹنوں تک ہی ڈھانپ رہا تھا۔ افریقی طرز کے کچھ ساز بھی بجائے جارہے تھے۔ ساز بجانے والوں نے اپنے چہرے جنگلیوں کے سے انداز میں رنگے ہوئے تھے۔ انہوں نے آنکھوں میں سرخ رنگ ڈال رکھا تھا جس کے سبب آنکھیں انگاروں کے مانند دکھائی دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد فارم کے ملازمین ہمیں ناشتا دینے کے لیے آئے تو وہ بھی نئے کپڑوں میں نظر آرہے تھے۔ صفدر نے اپنے "یار" سادات سے پوچھا "یہ کیا چکر ہے بھئی؟"

وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "یہ یہاں کا مقامی تہوار ہے۔ اسے "سابورا" کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ آج کے روز جو دل کھول کر ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے سال بھر کے لیے دکھ اور غم اس سے دور رہتے ہیں۔"

اس روز رہائشی حصے کے اردگرد اور گودام کے قریب جوار میں موج میلے کا سماں رہا۔ سب لوگ بہت ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آتے تھے۔ کافی کے کھیتوں میں کام بند تھا۔ مزدور عورتوں اور مردوں نے رنگ برنگ لباس پہن رکھے تھے اور ادھر سے اُدھر چہکتے پھر رہے تھے۔ اتفاقاً اس روز چلچلاتا سورج سر پر نہیں تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور اس موسم نے لوگوں کو اور بھی نہال کر رکھا تھا۔ جس قسم کا یہ علاقہ تھا وہاں ابر آلود موسم شاذ و نادر ہی جھلک دکھاتا ہے۔ لوگ ایک

سیاہی مائل مشروب بڑے شوق سے پی رہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ تاڑی تھی۔ تاڑی اس رس کو کہا جاتا ہے جو تاڑ کے درخت سے نکلتا ہے اور یہ نشہ آور مشروب ہوتا ہے۔ جوں جوں تاڑی سیاہ فاموں کے اندر جارہی تھی ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہورہا تھا اور وہ عجیب عجیب حرکتیں کررہے تھے۔ کبھی چند افراد مل کر کسی عورت کو بازوؤں پر اٹھا لیتے اور اسے اٹھائے اٹھائے میدان کا چکر لگانے لگتے' کبھی نوجوان آپس میں دست و گریباں ہوجاتے اور ایک دوسرے کو غلیظ گالیوں سے نوازتے' اور بے ہودہ اشارے کرتے۔ کہیں پاس ہی لائیو میوزک بھی ہورہا تھا لیکن سازندے اور گانے والے ہمیں کھڑکی میں سے نظر نہیں آرہے تھے۔

مائیکل کے سیاہ فام ساتھی بھی اس ہلے گلے میں شریک تھے' تاڑی پینے والوں میں بھی وہ سب سے آگے آگے تھے۔ آدم خور نمیامی حبشی نشے میں کچھ اور بھی خوں خوار نظر آنے لگے تھے۔ ہم نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ فارم کے عام حبشی ان نمیامی حبشیوں کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں' اور ان سے کنی کتراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نمیامی حبشی عام سیاہ فاموں میں ایسے ہی تھے جیسے چرندوں میں چند درندے گھوم رہے ہوں۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں کہیں پاس ہی سے گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیں' جیسے کوئی عورت چیخنے کی کوشش کررہی ہو مگر اس کا منہ کسی نے مضبوطی سے بند کر رکھا ہو۔ اس کے بعد دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا کہ عورت جدوجہد کررہی ہے۔ چند مرد اس کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے زور لگا رہے تھے پھر عورت کی جدوجہد دم توڑ گئی۔ کسی نمیامی حبشی کی دبی دبی وحشیانہ ہنسی سنائی دی۔ خبر نہیں کہ یہ مظلوم عورت کون تھی اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہورہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ کھڑکی میں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ کمرے کے عقب میں نہیں بلکہ پہلو میں تھا۔ اچانک مجھے ٹوائلٹ کا خیال آیا۔ ٹوائلٹ میں دس بارہ فٹ کی بلندی پر ایک روشن دان موجود تھا۔ وہاں سے کچھ دیکھنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ میں اور صفدر ٹوائلٹ میں داخل ہوئے' میں صفدر کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا اور تنگ روشن دان میں سے دوسری طرف کا منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ یہ ایک چھوٹا سا عقبی صحن تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی اور کیلے کے دو درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں تلے جو منظر مجھے دکھائی دیا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اس چاروں طرف سے بند صحن میں چار نمیامی حبشی تھے اور ایک عورت تھی۔ کچھ دیر پہلے دبی دبی آوازیں سننے کے بعد میرے اور صفدر کے ذہن میں یہ خدشہ جاگا تھا کہ شاید کسی بے کس قیدی خاتون کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی جارہی ہے مگر جو کچھ دکھائی دیا وہ زیادہ بھیانک تھا۔ مجھے اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہورہا تھا۔ میں نے فربہ اندام اپرانی مارکوس کی زندہ بچ رہنے والی بیوی کو دیکھا۔ اپنے آنجہانی خاوند کی طرح وہ بھی بے حد سرخ و سفید تھی اور قدرے فربہ بھی تھی۔ بہرحال خاوند کی طرح اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا نہیں تھا اور نہ ہی اس پر فالتو چربی تھی۔ اسے ایک پُرکشش موٹی عورت کہا جاسکتا تھا۔ وہ اس حالت میں زمین پر پڑی تھی کہ اس کے پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے اور جس طرح گائے کو تکبیر پھیری جاتی ہے بالکل اسی طرح بدنصیب عورت کا گلا کٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن سے بہنے والا خون ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع تھا اور اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ عورت کے جسم پر لباس کے نام پر بس چند دھجیاں سی رہ گئی تھیں' اس کے بال مٹی اور خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ آدم خور حبشی اس کے بے جان جسم کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں بے نام خوشی کروٹیں لے رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے خون سے بھرے ہوئے گڑھے کو مٹی ڈال کر برابر کردیا اور ذبح شدہ جسم کو ہاتھوں میں اٹھا کر اندر لے گئے۔ یہ جشن کا دن تھا' ایسے پُرمسرت موقعوں کا حُسن بہترین کھانوں سے ۔۔۔ الا ہوتا ہے۔ یقیناً ان آدم خوروں کے لیے اس پُرمسرت موقع کا حُسن دوبالا ہوچکا تھا۔

میں روشن دان سے نیچے اتر آیا لیکن میری آنکھیں جیسے روشن دان میں ہی رہیں' میں تصور کی نظر سے وحشی نمیامیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ تاڑی کے نشے میں بدمست ہوکر قہقہے لگا رہے تھے اور ساتھ ساتھ بدنصیب عورت کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے۔ صفائی سے کاٹے گئے گوشت کے چھوٹے بڑے لوتھڑے میری نگاہوں میں گھومنے لگے اور میرا دل اچھل اچھل کر حلق کی طرف آنے لگا۔

صفدر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! کیا ہے وہاں؟ کون عورت تھی؟"

"مارکوس کی بیوی۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"وہی موٹی عورت نا۔۔۔۔ جس نے مارکوس کو پھانسی سے بچانے کے لیے بڑا واویلا کیا تھا۔"

"ہاں وہی۔۔۔ بعد میں مائیکل نے اس کی مٹھکیں کروادی تھیں۔"

"ہاں' کیا ہوا اس کے ساتھ؟" صفدر کے لہجے میں بے قراری تھی۔

"وہ آج خیامیں کے جشن کو پُر لطف بنائے گی، ان کے کھانوں میں لذت پیدا کرے گی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ وہ اس سے کھانا پکوا رہے ہیں۔"

میں نے اپنے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ محسوس کی "کھانا پکوا نہیں رہے وہ اسے کھانے میں شامل کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے کسی جانور ہی کی طرح ذبح کر دیا گیا ہے' اب وہ درندے اس کے حصے بخرے کر رہے ہوں گے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" صفدر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

آدم خوری کے واقعات ہم پڑھتے اور سنتے آئے تھے' کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اب یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ابھی تک سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے واقعی یہ سب کچھ دیکھا ہے یا میرے تصور نے پختہ ہو کر ایک بھیانک منظر کی شکل اختیار کی ہے۔ جس وقت ہمیں کمرے کے باہر سے دبی دبی آوازیں آرہی تھیں اس وقت یقیناً کیم سخیم عورت کو زمین پر گرا کر ذبح کیا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے دھینگا مشتی کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت عورت کو زمین پر گرانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بدنصیب عورت کی لاش پر مجھے چونوں کے تازہ نشان نظر آئے تھے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ شہ رگ کٹوانے سے پہلے اس نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔

ہم نے باقی ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا۔ میرے اندر ایک جوالا مکھی دہکنے لگا تھا۔ میرے اندر سے جیسے آواز آرہی تھی کہ مائیکل کے جال کو کاٹنے کا اس سے بہتر موقع پھر نہیں ملے گا۔ زیادہ تر پہرے دار اور مسلح افراد تاڑی کے نشے میں بدمست تھے۔ ان میں ڈسپلن نظر آرہا تھا اور نہ کسی قسم کی ذمے داری کا احساس۔ شام ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جس نے ان لوگوں کو اور بھی مسرور کر دیا تھا۔ نیم تاریکی میں کئی افراد درختوں تلے لیٹے نظر آتے تھے' ہمارے کمرے کے دروازے پر بھی صرف ایک پہرے دار موجود تھا۔ میں نے دیکھا صفدر کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔ وہی امنگ وہی ترنگ جو ہمیں بے خطر مصائب سے ٹکرانے پر اکساتی تھی' وہی جوش جو ہمارے سینے میں لہر لیتا تھا تو موت ہمیں ایک حقیر اور بے وقعت شے نظر آنے لگتی تھی۔

میں نے زریں اور گلثوم سے کہا کہ وہ تیار ہو جائیں۔ زریں کا رنگ پہلے تو پھیکا پڑا مگر پھر اس کے چہرے پر بھی سرخی لہرائے گی۔ وہ میری بات کے معنی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ یہ معنی اس نے گلثوم کو بھی سمجھا دیے۔ میری توقع کے عین مطابق گلثوم کے چہرے پر بھی کسی طرح کا خوف و ہراس دکھائی نہیں دیا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہاں سے نکلنے اور نکلنے کے سلسلے میں پیش آنے والے تمام خطرات کے لیے تیار تھی۔ وہ گلگت کے برف زاروں میں پرورش پانے والی ایک دلیر و جفاکش قبائلی لڑکی تھی' حوادث سے کھیلنا اس کے لیے کوئی انوکھا کام نہیں تھا۔

میں اور صفدر بڑی شدت سے آٹھ بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے چار روزہ جائزے کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے فارم کا ایک ملازم دوپہر کے خالی برتن لینے کے لیے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ اپنی کارروائی کے آغاز کے لیے ہم نے اسی وقت کا انتخاب کر رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے آج بھی ملازم ٹھیک وقت پر ہی نمودار ہو گیا۔ مسلح محافظ نے دروازہ کھولا اور رائفل ہاتھ میں لے کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ محافظ کی سانپ سی آنکھیں بے حد تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ وہ جیسے ایک ہی نظر میں کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔ جونہی ملازم کمرے میں داخل ہوا میں نے اپنا جسم تول لیا۔ ایک لمحے کے لیے ملازم میرے اور مسلح محافظ کے درمیان آیا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اسی دوران میں صفدر نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر محافظ کو چھاپ لیا۔ محافظ کی توجہ چونکہ مکمل طور پر میری طرف تھی لہٰذا صفدر کو کسی طرح کی مشکل پیش نہیں آئی۔ بوکھلا کر محافظ اگر لبلبی دبا بھی دیتا تو نشانہ فارم کا ملازم ہی بنتا جسے میں نے ڈھال کی صورت اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ملازم کی گردن کو اپنے بازو کے مخصوص شکنجے میں جکڑا اور ایک جھٹکے میں اس کا تنا ہوا جسم میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ دوسری طرف صفدر نے محافظ کا سر پوری قوت سے دیوار کے ساتھ دے مارا تھا۔ صفدر کے فولادی بازوؤں کی لگائی ہوئی یہ ایک ضرب ہی محافظ کے لیے تسلی بخش ثابت ہوئی اور رائفل اس کے ہاتھوں سے گر پڑی جسے زریں نے گرنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ صفدر نے احتیاط کے طور پر محافظ کا کھوپڑا ایک بار پھر دیوار سے ٹکرا دیا اور اس کے بعد اسے بڑے اطمینان سے فرش پر لمبا لٹا دیا۔ محافظ کی رائفل صفدر نے اپنے قبضے میں لے لی اور محافظ کی پتلون کی جیبوں سے دو بھرے ہوئے میگزین بھی نکال لیے۔ دونوں بے ہوش سیاہ فاموں کو گھسیٹ کر ہم نے ٹوائلٹ میں پہنچا دیا۔ زریں نے بڑی پھرتی کے ساتھ ایک چادر کی لمبی لمبی

پٹیاں پھاڑنی شروع کر دیں۔ وہ یقیناً ان پٹیوں کے ساتھ دونوں افراد کی مشکیں کسنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں اور صفدر کمرے سے باہر نکل آئے' صفدر کی ہدایت پر گلثوم نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ہم دونوں بڑی احتیاط کے ساتھ راہداری میں آگے بڑھے۔ وسیع احاطے میں سائبانوں تلے تین ٹرالر کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں انہی میں سے کسی ایک ٹرالر کو پناہ کے لیے استعمال کرنا تھا لیکن اس سے پہلے غزالہ کی رہائی ضروری تھی۔ تابی کے رونے کی آواز اکثر آتی رہتی تھی۔ اس کی آواز سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ غزالہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہم اس کمرے تک پہنچ گئے یہاں بھی ایک محافظ موجود تھا۔ اس کے بے حد چوڑے جبڑے اس بات کے غماز تھے کہ وہ سیاہ فاموں کی آدم خور نسل سے تعلق رکھتا ہے' یعنی یہ انہی منحوس خیامیں میں سے ایک تھا جنہیں تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک عورت کو نہایت درندگی سے ذبح کرتے دیکھا تھا۔

یہاں مسئلہ یہ تھا کہ پہرے دار برآمدے کی طرف کھڑا تھا۔ اگر ہم وہاں جا کر اسے قابو کرتے تو عین ممکن تھا کہ درختوں کے نیچے موج میلہ کرنے والے لوگوں میں سے کسی کی نظر اس منظر پر پڑ جاتی اور یہ ایک سنگین رسک تھا۔ صفدر اور میں دیوار سے چپکے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ محافظ چہل قدمی کرتا ہوا ہماری جانب آئے اور ہم اس کی خیر خیریت پوچھ سکیں۔ وہ بدبخت چہل قدمی تو کر رہا تھا لیکن ہم سے سات آٹھ فٹ کی دوری پر آکر واپس چلا جاتا تھا۔ قریباً دو منٹ تک ہم نے سچے عاشقوں کی طرح اس کی آمد کا انتظار کیا لیکن وہ مسلسل ہم سے بے رخی برتتا رہا۔ آخر اسے اپنے قریب کرنے کے لیے صفدر نے اس کی طرف ایک "لولیٹر" پھینکا۔ یہ لولیٹر دراصل ایک کنکری تھی جو محافظ کی گردن پر لگی۔ اس نے راہداری کی طرف دیکھا اور افریقی زبان میں کچھ کہا۔ یقیناً وہ اسے اپنے کسی ساتھی کی شرارت سمجھا تھا اور اس شرارت کے بدلے میں اسے کوئی بے تکلف قسم کی گالی دے رہا تھا' صفدر نے یکے بعد دیگرے دو کنکریاں اور ماریں۔ اب محافظ کے لیے تاریک راہداری کی طرف آنا اور اندر جھانکنا ضروری ہو گیا۔ جونہی اس نے گردن لمبی کر کے راہداری میں دیکھا' میں نے اس کی گردن یوں جکڑی کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکا۔ میں نے گردن کی رگ پر جونہی مخصوص دباؤ ڈالا' اگر انڈیل آدم خور میرے بازوؤں میں تو رٹی کی طرح لٹک گیا۔ صفدر نے اس کی ٹریل ٹو گن تھام لی جبکہ میں نے اس کی کمر میں اڑسا ہوا ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا کھینچ لیا۔ صفدر نے پھرتی سے اس کی جامہ تلاشی لی۔ ہماری خوش قسمتی کہ کمرے کی چابیاں اس کی پتلون کی جیب سے مل گئیں۔ میں نے دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے ہی پیچھے صفدر بھی آدم خور کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر اندر لے آیا۔

غزالہ اور تابی کمرے میں موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر غزالہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ صفدر نے تابی کو اٹھایا' میں نے غزالہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ بڑے خطرناک لمحات تھے' احاطے میں موجود کسی نیگرو کی نگاہ بھی ہم پر پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ راہداری میں سے بھی کوئی مسلح شخص اچانک ہمارے روبرو آسکتا تھا۔ میں نے گن کندھے سے لٹکالی تھی اور چھرا ہاتھ میں لے لیا تھا۔ صفدر اور میں دونوں مرنے مارنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہم قریباً دوڑتے ہوئے اپنے دیگر ساتھیوں یعنی زریں اور گلثوم تک پہنچے وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ احاطے میں آکر خاردار باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہم ان سائبانوں کے نیچے پہنچ گئے جہاں بڑے بڑے ٹرالر کھڑے تھے۔ یہ ایک خوش کن اتفاق تھا کہ ٹرالروں تک آتے آتے ہمیں کسی نے دیکھا نہیں' اور اگر دیکھا بھی تو زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہم نے ٹرالروں کے عقبی دروازوں کو آزمانا شروع کیا' تیسرے ٹرالر کا دروازہ کھل گیا۔ ہم یکے بعد دیگرے اندر گھس گئے۔ یہاں خشک کافی کے بڑے بڑے پیکٹ رکھے تھے اور فرش پر بھی خشک پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اب تک میں اور صفدر ٹرالروں کی آمد و رفت کا بغور جائزہ لیتے رہے تھے' ٹرالر رات کے نو بجے احاطے سے نکل جاتے تھے اور ان کی واپسی اگلے روز بارہ بجے کے قریب ہوتی تھی۔ میری گھڑی کے مطابق سوا آٹھ بج چکے تھے' اگر معمول کے مطابق یعنی ٹھیک نو بجے ٹرالر یہاں سے نکل جاتے تو بھی ابھی ہمیں ۴۵ منٹ مزید انتظار کرنا تھا۔ یہ ۴۵ منٹ بہت رسک والے تھے۔ اگر اس دوران میں غزالہ کے کمرے یا ہمارے کمرے میں جھانک لیا جاتا تو پورے احاطے میں تہلکہ مچ جاتا۔ چاروں طرف ہماری تلاش شروع ہو جاتی' اور بڑی بات نہیں تھی کہ آٹھ دس منٹ کے اندر تلاشی لینے والے ان ٹرالروں تک بھی پہنچ جاتے۔ ہماری سلامتی اسی میں تھی کہ یہ چالیس پینتالیس منٹ خیریت سے گزر جائیں اور معمول کے مطابق نو بجے ٹرالر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

ہم نے ٹرالر کا دروازہ بند کر دیا تھا' اندر گھپ اندھیرا تھا

اور گرمی بھی بہت تھی۔ ہمیں زیادہ ڈر تابی کی طرف سے تھا۔ وہ گرمی سے بے قرار ہو رہا تھا' اگر وہ رونا شروع کر دیتا تو مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ میری گھڑی کا چمکنے والا ڈائل بتا رہا تھا کہ نو بجنے میں ابھی بھی تیس منٹ باقی ہیں۔ ایک ایک لمحہ سُولی پر کٹ رہا تھا۔ اچانک ہمارے دل اُچھل کر حلق میں آگئے۔ ٹرالر کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ صفدر نے اپنی ٹرپل ٹورا نگل کا بیرل دروازے کی طرف کر دیا اور ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کسی بھی کارروائی کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ میں نے ڈیڑھ فٹ لمبے چھُرے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اندھیرے میں مجھے صفدر کا صرف ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دوسری دستک کا انتظار کیا۔ دوسری دستک پہلے سے زیادہ واضح انداز میں ہوئی' بہرحال وہ بھی بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔ صفدر نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک اکیلا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز تھی مگر یہ ہتھیار نہیں تھا۔ یہ ایک ٹارچ تھی۔ صفدر کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "سادات تم؟"

سادات نے ٹارچ روشن کر کے ہمارے چہرے دیکھے اور اگلے ہی لمحے ٹارچ بجھا دی۔ وہ سرا سیمہ لہجے میں بولا "یہ آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔" صفدر نے کہا "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

وہ شکستہ انگریزی میں بولا "میں گودام کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے آپ کو ٹرالر کی طرف آتے دیکھا' میرے دیکھتے ہی دیکھتے آپ لوگ دروازہ کھول کر اندر گھس گئے۔"

"کسی اور کو تو معلوم نہیں کہ ہم یہاں ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"میں نے تو کسی کو نہیں بتایا اور اگر میرے علاوہ کسی کو پتا ہوتا تو اب تک یہاں قیامت برپا ہو گئی ہوتی۔" سادات کی بات منطقی تھی۔

"ایک بات پوچھوں' بتاؤ گے؟" صفدر نے کہا۔

اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے "میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ صاحب لوگ مجھے کسی کڑی آزمائش میں نہیں ڈالیں گے۔"

صفدر نے کہا "نہیں کڑی آزمائش تو نہیں ہے۔ صرف اتنا بتا دو کہ یہ ٹرالر آج بھی نو بجے نکل جائیں گے یا نہیں؟"

وہ ذرا ہچکچا کر بولا "امید تو یہی ہے کہ نکل جائیں گے' لیکن۔۔۔ آپ نے ایک غلطی کی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہ لوڈر جس میں آپ گھسے ہیں' خراب ہے' شاید آپ اندھیرے کی وجہ سے اس کا اگلا حصہ نہیں دیکھ سکے' اس کے اگلے حصے کو کھولا گیا ہے۔"

یہ اطلاع سن کر ہم سناٹے میں رہ گئے۔ چند لمحے کے توقف کے بعد صفدر بولا "پھر اب کیا کرنا چاہیے۔"

اس نے بے قراری سے اپنے گھنگریالے بال کھجائے۔ یقیناً وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں غیر ارادی طور پر کسی سازش کا حصہ نہ بن جائے۔ ممکن ہے کہ تذبذب کے ان لمحات میں اسے صفدر کا وہ حُسنِ سلوک یاد آیا ہو جو وہ اس سے کرتا رہا تھا' اور پھر وہ فراخ دلی بھی یاد آئی ہو جو طلائی ہار کے سلسلے میں صفدر نے اس سے برتی تھی۔ وہ ہچکچاتے لہجے میں بولا "جو کچھ آپ نے سوچا ہے یہ کافی خطرناک ہے' بہرحال اگر آپ یہ کرنا ہی چاہتے ہیں تو پھر لوڈر تبدیل کر لیں اور بہتر ہے کہ اس لوڈر میں بیٹھیں جو گیٹ کی طرف ہے' امید ہے کہ وہ پہلے نکل جائے گا۔ باقی دونوں شاید بعد میں آئیں۔"

اتنا کہتے کہتے سادات آگے نکل گیا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ چند سیکنڈ بھی مزید یہاں رکا تو اس کی دنیا اور عاقبت برباد ہو جائیں گی۔

میں نے اچھی طرح اردگرد کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے میں باہر نکلا اور احتیاط سے چلتا ہوا دوسرے لوڈر تک پہنچ گیا۔ لوڈر کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا یہاں بھی کافی کے بڑے بڑے بنڈل نظر آ رہے تھے۔ میرے اشارے پر صفدر اور باقی افراد بھی اس دوسرے لوڈر میں آگئے۔ لوڈر کا دروازہ ہم نے اندر سے کھلا رہنے دیا' کیونکہ اگر لوڈرز کے روانہ ہونے سے پہلے کوئی شخص دروازہ چیک کرتا تو بند دروازے کی وجہ سے وہ الرٹ ہو جاتا۔ تاہم اگر وہ دروازہ کھول کر اندر جھانک بھی لیتا تو تاریکی کی وجہ سے ہمارا نظر آنا آسان نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ ٹارچ استعمال کرتا تو اور بات تھی۔

نو بجنے میں ابھی بھی بیس منٹ باقی تھے۔ میں اور صفدر ایک ایک پل گن گن کر گزار رہے تھے۔ اب تک کے جائزے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ یہاں وقت کی بے حد پابندی کی جاتی ہے۔ ہر کام گھڑی کی سُوئیوں کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا لیکن آج صورتِ حال کچھ مختلف تھی۔ ہلے گلے اور مستی میں یہاں کا نظام اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ لوڈر بھی وقت پر یہاں سے نکل سکتے یا نہیں۔ اگر ان لوڈرز یعنی ٹرالرز کے نکلنے میں تاخیر ہو جاتی اور اندر کمروں میں بھانڈا پھوٹ جاتا تو یہ ٹرالر ہی ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہو سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے نو بجے' دو تین افراد کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کسی شخص نے ٹرالر کا دروازہ کھولا' بے دھیانی سے اندر جھانکا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ یہ مرحلہ تو بخوبی طے ہو گیا تھا' اب ٹرالر کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار تھا۔ گھڑی کی سُوئیاں نو سے آگے بڑھتی چلی گئیں مگر ٹرالر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ آس پاس کسی طرح کی سرگرمی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

غزالہ کی پُرتشویش آواز تاریکی سے ابھری "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔"

زریں نے بڑے عزم سے کہا "ام گڑبڑ سے ڈرنے والا نہیں ہے غزالہ بی بی! اگر گڑبڑ ہو گا تو ام جوابی گڑبڑ کرے گا۔ ایسے لوگوں کے خلاف لڑتے ہوئے اگر جان بھی چلا گیا تو پروا نہیں۔"

"لیکن تمہارے ساتھ صرف "جان" ہی نہیں" "جانِ من" کا مسئلہ بھی ہے۔ میرا مطلب گلشوم سے ہے۔" صفدر فقرہ چسپاں کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

زریں کے بجائے گلشوم کی آواز ابھری "ام بڑی خوشی سے زریں کو ساتھ لے کر مرے گا سپدر صیب۔۔۔ ام انشاء اللہ ایک دم قربان ہے۔"

وہ ایسی ہی اوٹ پٹانگ اردو بول رہی تھی۔

نو بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے' ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ اچانک ایک تسلی بخش تھرتھراہٹ کے ساتھ ٹرالر اسٹارٹ ہو گیا۔ کچھ دیر اسٹارٹ رہنے کے بعد اس نے حرکت کی اور رینگتا ہوا خاردار باڑھ والے احاطے سے باہر آ گیا۔ ہمیں قدرے اطمینان محسوس ہوا اب کسی بھی جگہ ہم کیبن میں شور برپا کر کے ڈرائیور کو ٹرالر روکنے پر مجبور کر سکتے تھے' اس کے بعد ٹرالر کے ذریعے یا ٹرالر کے بغیر فرار ہونا ہمارے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ہم کسی بھی نزدیکی پولیس اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ اس کے بعد اعلیٰ حکام سے ہمارا رابطہ ہو سکتا تھا یا کوئی بھی بہتر صورتِ حال سامنے آ سکتی تھی۔

ابھی ہمیں احاطے سے نکلے بمشکل چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ٹرالر کے عقب میں کسی گاڑی کا مسلسل ہارن سنائی دینے لگا۔ ہارن کی یہ آواز تشویش ناک تھی۔ جلد ہی یہ گاڑی ٹرالر کے عین عقب میں پہنچ گئی۔ ٹرالر اونچے نیچے راستے پر پندرہ بیس میل کی رفتار سے جا رہا تھا۔ اس کی رفتار ایک دم کم ہوئی اور پھر وہ راستے کے کنارے رک گیا۔ عقب میں آنے والی گاڑی بھی رک گئی تھی۔ گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر چند افراد بلند آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جو خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا وہ سامنے آ گیا ہے۔ ٹرالر کے عقب میں آنے والی گاڑی یقیناً اسے روکنے کے لیے آئی تھی اور وہ اسی لیے آئی تھی کہ فارم کے رہائشی کمروں میں ہماری کارروائی راز نہیں رہ سکی تھی۔

میں اور صفدر بالکل چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ اپنے دفاع کے لیے دو چار بندوں کو پھڑکانے کا ہم پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ میری ہدایت پر غزالہ۔۔۔۔ گلشوم اور زریں کافی کے بڑے بڑے پیکٹوں کی اوٹ میں چلے گئے اور ٹرالر کے تپے ہوئے فرش پر اوندھے لیٹ گئے' میں اور صفدر ٹرالر کے کیبن کی دیواروں کے ساتھ چپک گئے۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ چند لمحے بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور وہ کھل گیا۔ مجھے ایک لحیم شحیم شخص کا ہیولا نظر آیا' یقیناً وہ ٹرالر کا ڈرائیور تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی کیبن میں پھینکی۔ اس کی نگاہ صفدر پر پڑی' ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ناقابلِ فہم زبان میں چلّا کر بھاگا۔ ٹرالر کے عین عقب میں ہمیں ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور دروازوں کے عقب میں دو مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ ٹرالر ڈرائیور چیخ کر بھاگا تو دونوں مسلح افراد نے رائفلیں ہماری طرف سیدھی کیں مگر ان کے ٹریگرز دبانے سے بہت پہلے ہماری رائفلوں نے دھماکوں کے ساتھ شعلے اُگلے اور دونوں افراد تڑپ کر زمین بوس ہو گئے۔ اسی دوران میں جیپ کے پچھلے حصے سے ہم پر خود کار رائفل کا برسٹ مارا گیا۔ یہ برسٹ ٹرالر کے ادھ کھلے دروازے میں لگا۔ شاید ایک آدھ گولی اندر کیبن میں بھی پہنچی ہو لیکن اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تاریکی میں چمکنے والے شعلوں کی وجہ سے ہمیں فائرنگ کے ٹھیک ٹھیک مقام کا اندازہ ہو گیا تھا' یہ فائرنگ جیپ کے عقبی حصے میں سے کی گئی تھی۔ حملہ آور ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا ہم نے جیپ کی عقبی نشست کا نشانہ لے کر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ اچانک جیپ کے عقب سے شعلے بلند ہوئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا جیپ کے عقبی دروازے پر آئل کا گیلن (کنٹینر) میں موجود تھا۔ گولیاں اس میں لگی تھیں اور جیپ دھماکے سے شعلوں کی زد میں آ گئی تھی۔ میں اور صفدر جست لگا کر ٹرالر سے اترے' میں نے ٹرالر ڈرائیور کی گری ہوئی طاقت ور ٹارچ اٹھائی۔ اسے روشن کیا' ڈرائیور کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ دکھائی نہیں دیا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ

موقع سے فرار ہو گیا ہے۔ صفدر دوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا۔ ٹرالر کی چابی اگنیشن میں موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈرائیور چابی سمیت فرار ہو گیا ہے۔ میں نے دیگر ساتھیوں کو ٹرالر سے اترنے کی ہدایت کی۔ وہ سب یکے بعد دیگرے پیکٹوں کی اوٹ سے نکلے اور نیچے آ گئے۔

یہی وقت تھا جب دور عقب میں گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ گاڑیاں ہماری ہی طرف آ رہی تھیں۔ فارم ہاؤس اتنا دور نہیں تھا کہ یہاں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی آواز وہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ آواز وہاں تک پہنچ گئی تھی اور مائیکل اپنے خوں خوار ساتھیوں کے ہمراہ ہمارے پیچھے لپک رہا تھا۔

"صفدر چلو نکلیں یہاں سے۔" میں نے کہا۔

ہم سب فوراً کچے پکے راستے سے اترے اور ایک میدان میں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے عقب میں جلتی ہوئی جیپ کی روشنی تھی اور جلے ہوئے گوشت کی بو تھی۔ جس شخص نے عقبی نشست سے ہم پر برسٹ مارا تھا وہ ہماری فائرنگ کا نشانہ بننے کے بعد جیپ ہی میں جل گیا تھا۔ دیگر دو افراد کی لاشیں بھی آگ کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم بڑی تیزی کے ساتھ راستے سے دور ہو رہے تھے اور گاڑیوں کی اچھلتی کودتی روشنیاں بھی تیزی کے ساتھ ٹرالر اور جیپ کے قریب پہنچ رہی تھیں۔ غزالہ کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے زریں گل نے تابی کو اٹھا لیا تھا، گلثوم سب سے زیادہ چوکس نظر آ رہی تھی۔

اندازاً آدھ گھنٹے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ فارم ہاؤس سے آنے والی گاڑیوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا ہے، ان کی روشنیاں گاہے گاہے جھاڑیوں کے اندر سے چمک جاتی تھیں اس کے علاوہ ایک پُر خطر آواز بھی ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہ کتوں کی آواز تھی۔ متلاشی پارٹی کے ساتھ یقیناً کتے بھی موجود تھے۔ یہ ایک حبس زدہ رات تھی، پسینہ ہمارے جسموں سے دھاروں کی صورت نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پیاس بھی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارا اور گاڑیوں کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ گاڑیوں کی تعداد کم از کم چھ تھی، وہ پھیل کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے کے ساتھ ساتھ اب انجنوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہماری دائیں جانب ایک نشیب سا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، یہ دراصل ایک خشک آبی گزرگاہ تھی۔ اس گزرگاہ کی دوسری طرف زیادہ گھنے درخت نظر آ رہے تھے۔

میں نے صفدر سے کہا "یار! ہم غلطی کر رہے ہیں۔ اس میدان میں گاڑیاں بڑی جلدی ہم تک پہنچ جائیں گی۔ کیوں نہ ہم یہ آبی گزرگاہ پار کر جائیں۔"

صفدر نے تائید کی "پرلی طرف کے درخت گھنے ہیں۔ اگر گاڑیاں یہ نالا پار کر بھی گئیں تو ان درختوں میں وہ تیز رفتاری سے نہیں چل سکیں گی۔"

"تو ٹھیک ہے، پھر پار جاتے ہیں۔"

ہم نے رخ تبدیل کیا اور خشک آبی گزرگاہ میں اتر گئے۔ یہاں کافی نشیب و فراز تھے۔ تاریکی کے سبب پاؤں بہت سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑتا تھا۔ ٹارچ تو موجود تھی لیکن اسے روشن کرنے کا خطرہ ہم مول نہیں لے سکتے تھے۔ جیسے تیسے ہم نے گزرگاہ پار کی اور نسبتاً گھنے درختوں میں گھس گئے۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے اگا ہوا تھا۔ گڑھے بھی کافی تھے ہمیں قوی امید پیدا ہو گئی کہ متعاقب افراد کو اپنی جیپوں وغیرہ سے اترنا پڑے گا۔

ساحلِ تنزانیہ کی اس حبس زدہ رات میں زندگی اور موت کا یہ تعاقب دو گھنٹے جاری رہا۔ ہماری توقع کے عین مطابق متعاقب افراد کو گاڑیاں چھوڑنا پڑی تھیں اور وہ پیادہ ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی تعداد ہماری توقع سے زیادہ تھی۔ میرے اور صفدر کے قیافے کے مطابق وہ کسی طرح بھی تیس سے کم نہیں تھے۔

انجانے راستوں پر ہمارے پاؤں چھل گئے تھے اور جھاڑیوں سے رگڑ رگڑ کر جسم پر جلتی ہوئی خراشیں آ گئی تھیں۔ تابی کی حالت ترس ناک تھی۔ ٹرالر کے اندر ہی اس کا پیاس سے برا حال تھا اور اب تو دو گھنٹے مزید گزر چکے تھے۔ وہ اب رو رو کر نڈھال ہو گیا تھا اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر بے سُدھ پڑا تھا۔ اچانک صفدر رک گیا "وہ دیکھیے شاہ جہاں صاحب۔" اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

کچھ ٹارچوں کی روشنیاں، ہمیں اب جنوب کے رخ پر نظر آ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ اب قریب آنے کے بجائے دور جا رہی ہیں۔ چار پانچ منٹ میں یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ روشنیاں ہم سے دور جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی مدھم پڑ گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بوگیر کتے کسی وجہ سے بھٹک گئے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے مالکوں کو بھی بھٹکا دیا ہے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے بڑی خوش آئند تھی۔

زریں نے کہا "سائیں عالی نے ام کو ایک وظیفہ بتایا تھا

وہ ام مسلسل پڑھ رہا تھا۔"

صفدر بولا "کاش تم نے اس وقت بھی یہ وظیفہ پڑھ لیا ہوتا جب مائیکل ہمیں لاہور سے کراچی لانے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"صفدر صیب! آپ وظیفے کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

میں نے کہا "وظیفہ خواں سے مت بگاڑو ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ دو تین ٹولیوں میں بٹ گئے ہوں۔ جو لوگ ہم سے دور جا رہے ہیں وہ صرف ایک ٹولی کے لوگ ہوں' اتنے فاصلے سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا تو ممکن نہیں۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ تابی نے بے تاب ہو کر ایک بار پھر رونا شروع کر دیا وہ میرے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا' میں نے اسے غزالہ کو تھما دیا۔ غزالہ نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر کوئی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ یہ بے بسی ہم سب کے لیے تکلیف دہ تھی' مگر ہم کر کچھ نہیں سکتے تھے' ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ معصوم بچے کی پیاس سے ہمیں اپنے حلق میں پڑے ہوئے کانٹے بھول گئے تھے۔ کچھ دیر بعد تابی پھر نڈھال ہو گیا اور غزالہ کے کندھے سے لگ کر سو گیا۔ بہرحال اس نیند کو نیم بے ہوشی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تقریباً معدوم ہو چکی تھیں اور اگر کبھی کوئی روشنی دکھائی بھی دیتی تھی تو وہ بہت فاصلے پر ہوتی تھی۔

یکایک ہم بری طرح چونک گئے۔ ہمیں اپنی دائیں جانب بالکل پاس سے اچانک بہت سی روشنیاں دکھائی دیں اور اس کے ساتھ ہی خودکار رائفل کی "تڑ تڑ" سے جنگل کا سناٹا درہم برہم ہو گیا۔ "دوڑو!" میں نے پکار کر کہا۔

ہم سب جنوب کی سمت میں دوڑے' یہاں بلند و بالا سرکنڈے موجود تھے اور یہ سرکنڈے آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ قریباً تین چار ایکڑ میں پھیلے ہوئے تھے۔ عقب سے ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ ہوئی' گولیاں درختوں کی شاخوں کو توڑتی اور کاٹتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر گئیں۔ اس وقت سرکنڈے ہماری بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتے تھے۔ میں اور صفدر اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھے۔ دوڑتے دوڑتے ہم نے اپنے عقب میں چند برسٹ چلائے۔ مقصد یہی تھا کہ متعاقب افراد ہمارے زیادہ نزدیک آنے کی کوشش نہ کریں۔ ان کا فاصلہ نصف فرلانگ کے قریب تھا۔ ہماری فائرنگ سے یہ فاصلہ کچھ بڑھ گیا۔ بالآخر ہم بلند و بالا سرکنڈوں کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں زمین کیچڑ آلود تھی اور پاؤں پھسل پھسل جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کیا الا بلا ان سرکنڈوں میں موجود تھا۔ مگر ہمارے پیچھے جو بلائیں لگی تھیں انہوں نے ہمیں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

آبی گزرگاہ کے بالکل کنارے پر سرکنڈوں کے درمیان ایک گڑھا سا تھا۔ اس میں بھی جھاڑیاں اور سرکنڈے نظر آ رہے تھے۔ ہم اس گڑھے میں گھسے اور چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ بڑے پُرخطر اور غیر یقینی لمحات تھے' ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ہمیں تلاش کرنے والوں کی صحیح تعداد کیا ہے اور ان کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہے۔ ہم اردگرد سے آنے والی آوازوں کو بغور سن رہے تھے۔ وہ لوگ ہمارے آس پاس ہی موجود تھے۔ گاہے گاہے ان میں سے کوئی ہوائی فائر بھی کر دیتا تھا۔ ان میں ایک دو عورتیں بھی تھیں کیونکہ ان کی نسوانی آوازیں صاف پہچانی جا رہی تھیں۔ تاہم کتوں کی منحوس آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور یہ ایک اچھا شگون ہی تھا۔

کچھ دیر بعد ایک للکارتی ہوئی آواز سناٹے میں گونجی "ہو سکتا ہے کہ ان سرکنڈوں میں گھس گئے ہوں۔"

یہ بارعب آواز دہشت کی علامت تھی۔ یہ آدم خور مائیکل کے بدبخت گلے سے برآمد ہوئی تھی۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ مائیکل اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا کہ وہ سرکنڈوں کو گھیرے میں لیں۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھی دو درجن سے کم نہیں ہیں اور سب کے سب جدید اسلحے سے مسلح بھی ہیں۔ دو درجن مسلح افراد کے مقابلے میں ہمارے پاس ایک ٹرپل ٹو اور ایک سیون ایم ایم رائفل تھی۔ جبکہ ایمونیشن کی مقدار بس اتنی تھی کہ ہم دو تین منٹ سے زیادہ مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہمارے لیے بہترین صورتِ حال یہی ہو سکتی تھی کہ مائیکل اینڈ کمپنی ہمیں ڈھونڈ نہ سکے۔ مگر عملاً ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ اپنی توجہ سرکنڈوں پر مرکوز کر چکے تھے' اور یوں آدھی کامیابی انہوں نے حاصل کر لی تھی۔

"فائر!" ایک کڑکتی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچی۔

اس کے فوراً بعد اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ تین اطراف سے کی جا رہی تھی اور اس کا ہدف سرکنڈوں کا یہی ذخیرہ تھا۔ دو مار رائفلوں کی گولیاں بارش کی بوچھاروں کی طرح برسیں اور ہمارے اردگرد سرخ لکیروں کا جال سا بچھ گیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم گڑھے میں تھے

ورنہ جانی نقصان اٹھائے بغیر نہ رہتے۔ چند سیکنڈ بعد فائرنگ ایک دم رک گئی۔ مائیکل کی چیختی ہوئی آواز رات کے سناٹے میں گونجی۔

"شاہ جہاں! تم لوگ گھیرے میں آ چکے ہو۔ زندگی چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ ورنہ اندر ہی بھون دیے جاؤ گے۔"

مائیکل نے اپنا یہ اعلان' الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ دو تین بار دُہرایا۔ اس کے بعد چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ ہم جانتے تھے یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے' اچانک ایک بار پھر یہ ویرانہ خودکار رائفلوں کے وحشیانہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ یہ فائرنگ پہلے سے بھی زیادہ شدید تھی اور سرکنڈوں کے اس سارے جھنڈ کو کور کر رہی تھی۔ مائیکل اور اس کے ساتھی بے تحاشا ایمونیشن لے کر آئے تھے۔ غالباً اب ان کی خواہش تھی کہ سرکنڈوں میں داخل ہوئے بغیر ہمیں ختم کرا لیں۔ اور اگر ہم گڑھے کی گہرائی میں نہ ہوتے تو مائیکل لازماً اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ یہ گڑھا ہمارے لیے گوشۂ عافیت بن گیا تھا۔ خبر نہیں کہ یہ کن ہاتھوں نے کھودا تھا اور کس مقصد سے کھودا تھا۔ بعض اوقات ایسے گڑھوں میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا ہے' جنگلی جانوروں کو پکڑنے کے لیے بھی اس قسم کے گڑھے کھودے جاتے ہیں' بہرحال کچھ بھی تھا اس گڑھے نے ہمیں "موت کے گڑھے" میں گرنے سے بچا رکھا تھا۔ ہم سب گڑھے کی تہ سے چپک گئے تھے۔ پگھلا ہوا سیسا ہمارے سروں کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔

"لگتا ہے کہ پاگل ہو گئے ہیں۔" صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

زریں نے کہا "وہ دیکھیں استاد صیب! وہاں آگ بھڑک اٹھا ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا' خشک سرکنڈوں میں کئی جگہ اندھا دھند فائرنگ نے آگ لگا دی تھی۔ تاہم یہ آگ ایسی نہیں تھی کہ فوراً دور تک پھیل جاتی۔

قریباً تین منٹ بعد فائرنگ تھم گئی۔ شاید مائیکل کو یقین ہو چکا تھا کہ اب سرکنڈوں کے اندر گھسنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس نے للکار کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ سرکنڈوں کے اندر داخل ہو جائیں۔

ان لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ یا تو ہم راہی عدم ہو چکے ہیں' یا پھر ان سرکنڈوں میں موجود ہی نہیں۔ وہ تینوں سمتوں سے سرکنڈوں میں داخل ہو گئے اور ہمیں تلاش کرنے لگے۔ ان کی روشن ٹارچوں سے ان کے رخ اور پھیلاؤ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ پچیس کے قریب افراد تھے۔ ان کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان میں اٹالین بھی تھے۔ شرابی کپتان جم کی آواز تو میں نے صاف پہچانی۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہا تھا کہ ہم نے نہ صرف جشن کا مزہ کرکرا کیا بلکہ اتنی خوب صورت رات بھی برباد کر دی۔ طیش کے عالم میں وہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر بھی کر دیتا تھا۔ مائیکل بھی بلند آواز میں اپنے کارندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہ لوگ ہمارے بالکل قریب پہنچ گئے تھے' ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے ہمارے آس پاس تھے' ان کے قدموں سے سرکنڈے ٹوٹ رہے تھے اور یہ آوازیں بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ہم نے دم سادھ لیے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے حرکت ہو گئے تھے۔ افریقہ کا ساحلی مچھر غول در غول ہم پر حملہ آور تھا' چہرے پر چھینٹے سے پڑ رہے تھے اور جسم کے تمام کھلے حصے "الاماں" پکار رہے تھے' مگر اتنی رعایت ہمیں حاصل نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتے۔

دو ٹارچیں ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں' یہاں تک کہ مجھے اور صفدر کو رائفل کے بیرل نظر آنے لگے اور آنے والوں کی مدھم سرگوشیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک مرد تھا اور ایک عورت' تاہم رائفل دونوں کے پاس تھی۔ پھر ایک ٹارچ کا رخ دائیں جانب ہو گیا جبکہ دوسری ٹارچ سیدھی گڑھے کی طرف بڑھی۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی' ہمارا دیکھا جانا یقینی ہو گیا تھا۔ میں نے چھرے پر گرفت مضبوط کر لی۔ رائفل بردار دائیں بائیں دیکھتا عین گڑھے کے کنارے پر پہنچ گیا۔ نیم تاریکی میں مجھے اس کے فل بوٹ نظر آئے۔ فل بوٹس کے اوپر ٹانگیں عریاں تھیں۔ یہ خوب صورت نسوانی ٹانگیں تھیں۔ ٹانگوں کی آخری حد پر مختصر نیکر نظر آ رہی تھی وہ لڑکی اس قدر نزدیک تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا اور اس کی خطرناک رائفل پکڑ کر اسے گڑھے میں بھی کھینچ سکتا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی دائیں بائیں پھینک رہی تھی مگر اپنے قدموں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے قدموں کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ مجھ پر اور صفدر پر پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے "اوہ" کی بے ساختہ آواز نکل گئی۔ مگر وہ چیخی نہیں اور اس کی یہی برداشت اسے فوری موت سے بچا گئی۔ اس نے جلدی سے ٹارچ کا رخ پھیر لیا اور خود بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا ساتھی آٹھ دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کی آواز آئی "کوئی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ ادھر بھی کوئی نہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"اچھی طرح دیکھ لیا؟"

"ہاں دیکھ لیا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

چند ہی لمحے بعد میں دیکھ رہا تھا کہ دونوں ٹارچیں گردش کرتی ہوئی ہم سے دور جا رہی ہیں۔ میرے اور صفدر کے سینے سے ایک ساتھ اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔ ہم ایک قیامت کو چھو کر واپس آ گئے تھے' کم از کم فوری اور شدید خطرہ تو ٹل ہی گیا تھا۔ میں نے آواز اور خدوخال سے لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ سوزی تھی۔ وہی آفتِ جاں لڑکی جو ہر کولیس پر کھلے اور گارڈز کے "دل بہلاوے" کا سامان کرتی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ایک حصے سے جیسے شرارت اور شوخی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ چند روز پہلے جہاز پر مائیکل نے اسے پروفیسر اللہ دتا کو زچ کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ رات کو پروفیسر کے بیڈ روم میں چلی جاتی تھی' اور پروفیسر کی نیند تو کیا زندگی بھی حرام کر ڈالتی تھی' بعد ازاں میرے کہنے پر اس نے پروفیسر سے نرمی اختیار کر لی تھی۔ میرا اور سوزی کا تعلق صرف اتنا تھا کہ میرے ہاتھوں دو بدو مقابلے میں سوزی کا دشمن ٹام ہلاک ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کسی موقع پر ٹام نے سوزی کے ساتھ زبردستی کا برتاؤ کیا تھا جس کے بعد وہ اس کی شکل سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ٹام کی ہلاکت کے سبب یقیناً میرے کچھ دشمن بنے ہوں گے لیکن ایک دوست بھی بن گئی تھی۔ اور آج اسی دوست نے ایک نہایت "خطرناک لمحے" میں خاموش رہ کر دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ واپس چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی آس پاس موجود چند اور افراد بھی واپس چلے گئے تھے' اب وہ سب لوگ سرکنڈوں کے انتہائی جنوب میں ٹارچیں چمکا رہے تھے۔ گاہے گاہے مائیکل کی تحکمانہ آواز بھی سنائی دے جاتی تھی' وہ ساتھیوں کو مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ آٹھ دس منٹ بعد یہ لوگ آبی گزرگاہ کے ساتھ آگے نکل گئے۔

ہمارے اردگرد مکمل سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں بس مچھروں کی "گھوں گھوں" تھی یا گیدڑوں اور جنگلی کتوں کی دور افتادہ آوازیں تھیں۔ جن سرکنڈوں کو آگ لگی تھی وہ اب دھواں دے رہے تھے' کہیں کہیں اب بھی اکا دکا شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ شعلے بجھ بھی سکتے تھے اور مزید بھڑک کر آگ بھی پھیلا سکتے تھے۔ ہم بدستور گڑھے میں دبکے بیٹھے رہے۔ زریں گل نے سرگوشی میں پوچھا "کیا لڑکی نے ام کو دیکھا نہیں تھا؟"

"کبھی کبھی دیکھ کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔" صفدر نے کہا۔

میں نے کہا "داناؤں کا قول ہے کہ دشمنوں میں سے ہی دوست بھی مل جاتے ہیں۔ یہ دوسری عورت ہے جس نے ہماری مدد کی ہے۔"

"اور پہلی کون تھی؟" غزالہ نے پوچھا۔

"وہی ڈور تھی' جس کے زخمی خاوند کو بچانے کے لیے تم نے کئی گھنٹے جان ماری تھی' میں سمجھتا ہوں کہ آدم خور ٹام سے میں نے جو مقابلہ جیتا تھا اس میں ڈور تھی کا اہم کردار تھا۔"

"کیا کوئی ٹیکنیکل پوائنٹ بتایا تھا اس نے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس نے عین مقابلے کے وقت مجھے ٹام کے ایک نہایت خطرناک داؤ کے بارے میں خبردار کیا۔ زوردار لڑائی میں یہ انفارمیشن میرے بہت کام آئی۔ کسی وقت تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔"

ہم قریباً پندرہ منٹ تک گڑھے میں رہے' پھر احتیاط سے باہر نکل آئے۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ ہمارے کپڑے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ چند گز کے فاصلے پر سرکنڈوں میں ایک خارپشت مرا پڑا تھا۔ کوئی اندھی گولی اس کا پیٹ چیر کر گزر گئی تھی۔ زیادہ دیر ٹارچ روشن رکھنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہم آبی گزرگاہ سے دور ہٹنے لگے۔ تھوڑا آگے سرکنڈوں میں لکڑبگھے کی قسم کا کوئی جانور مرا نظر آیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا' یہ ایک مادہ تھی۔ اس کے تھنوں سے دو بچے بھی چمٹے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اندھی گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔ زریں گل منمنایا "اگر ام گڑھے سے باہر ہوتا تو امارا حشر بھی اس سے ملتا جلتا ہی ہوتا تھا۔"

"پتا نہیں اتنا ایمونیشن کہاں سے آیا ان کے پاس۔ لگتا تھا کہ پورا ڈپو لے کر آئے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

اچانک صفدر خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھٹک کر قد آدم جنگلی گھاس کی طرف دیکھنے لگا تھا' اس کے انداز میں شکاری جانور کی سی توجہ اور چوکسی تھی۔ پھر دو قدم دوڑ کر اس نے جست لگائی۔ بالکل جیسے سوئمنگ پول میں ڈائیو کی جاتی ہے۔ وہ جنگلی گھاس میں چھپے ہوئے ایک جاندار جسم پر گرا۔ دونوں گتھم گتھا نظر آئے۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی' دوسرے ہاتھ سے میں نے ٹارچ روشن کی' مجھے صفدر کے نیچے ایک سیاہ فام نظر آیا۔ وہ کیچڑ اور مٹی میں لتھڑ کر بھوت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک رائفل دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً صفدر سے گتھم گتھا ہونے کے بعد یہ رائفل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ زریں گل نے لپک کر رائفل

اٹھالی۔ صفدر نے قدِ مقابل کے منہ پر دو تہلکہ خیز کے رسید کیے اور اسے بے بس کر ڈالا۔ زریں نے میرے اشارے پر آگے بڑھ کر رائفل کی نال حبشی کی کنپٹی سے لگا دی۔ صفدر اس کے اوپر سے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی سی دشواری کے ساتھ ہم اس شخص کو پہچاننے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ مائیکل کے مسلح محافظوں میں سے سینئر ترین تھا۔ اس کا نام جوزف تھا۔ صفدر نے اسے اوندھا کرنے کے بعد اس کی پتلون کی بیلٹ سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟" صفدر نے کڑک کر پوچھا۔

"میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔" وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔

"ایسی صورت میں' میں تمہیں گولی مارنا ضروری سمجھتا ہوں۔" میں نے رائفل کی نال بے دردی سے اس کی گردن میں گھسیڑ دی۔

وہ قدرے خوف زدہ نظر آنے لگا۔ صفدر نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تھوک نگل کر بولا "تین ساتھی اور ہیں۔۔۔"

"کہاں ہیں وہ؟" صفدر نے پوچھا۔

"میں ٹھیک سے بتا نہیں سکتا' آس پاس ہی ہیں۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد جو تھوڑا بہت شک تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔ ہم جوزف کو لے کر سرکنڈوں سے کافی دور چلے آئے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ہم اپنے عقب کا معائنہ بھی کرتے رہے۔ ہمیں کوئی متنفس نظر آیا اور نہ کسی طرح کی نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ رہی تھی کہ جوزف یہاں اکیلا ہی تھا۔ مائیکل اور اس کے ساتھی اسے قیاطاً یہاں چھوڑ گئے تھے۔ غالباً واپسی پر وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ صفدر کی نگاہ اچانک اس پر پڑ گئی تھی' یا یوں کہہ لیجیے کہ صفدر کی نگاہ نے اس کی موجودگی کو بھانپ لیا تھا' ورنہ وہ ہمارے لیے سخت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے گڑھے سے نکلنے میں تاخیر کی تھی وہ بھی ہمارے حق میں گئی تھی۔ اگر ہم مائیکل گروہ کے جانے کے فوراً بعد گڑھے میں سے نکل آتے اور جوزف کی نگاہ ہم پر پڑ جاتی تو وہ صرف ایک ہوائی فائر کر کے مائیکل کو واپس بلا سکتا تھا۔

جوزف کے پاس سے پانی کی ایک بوتل بھی برآمد ہو گئی۔ بوتل اس نے اپنی کمر سے اڑسی ہوئی تھی۔ یہ پانی ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ تابی پیاس سے رو رو کر نڈھال ہو چکا تھا۔ پہلے اسے پانی پلایا گیا' پھر سب نے ایک ایک گھونٹ لے کر حلق تر کیا۔ اس کے بعد ہم تیز قدموں سے شمالی رخ پر روانہ ہو گئے۔ ہم جتنی جلدی اس آبی گزرگاہ سے دور ہو جاتے ہمارے لیے اتنا ہی بہتر تھا۔ ہمارے اردگرد کا علاقہ آبی گزرگاہ ہی کی طرح خشک اور ویران تھا۔ درخت اور جھاڑیاں نظر آتی تھیں لیکن ہریالی کا شدید فقدان تھا۔ کسی وقت مدھم چاندنی میں قرب و جوار نسبتاً زیادہ روشن ہو جاتے۔ ہم دور تک نگاہ دوڑاتے' پام کے درختوں میں کہیں کہیں کسانوں کے اکا دکا مکانات نظر آ جاتے' مگر کہیں کوئی جنبش دکھائی دیتا اور نہ کوئی پگڈنڈی وغیرہ۔ پورے علاقے میں غربت اور افلاس کی جھلک نظر آتی تھی۔

ہمیں فوری طور پر کسی اچھی پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ ایسی پناہ گاہ جہاں ہم اپنے خشک گلے کو تر کر سکتے' اپنے جسموں کو آرام پہنچا سکتے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچ سکتے۔ کم و بیش ایک گھنٹے تک ہم سخت تناؤ کی کیفیت میں چلتے رہے' آخر ایک جگہ درختوں کے درمیان گھرا ہوا ایک تنہا مکان نظر آیا۔ مکان کے اردگرد چند کھیت بھی موجود تھے مگر یہ کھیت بھی درختوں ہی کی طرح سوکھے سڑے تھے۔ مکان میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ ایک پھاٹک سے باہر ایک لاغر سا گھوڑا کھڑا تھا۔ ہم ٹوٹے پھوٹے پھاٹک سے کچھ فاصلے پر درختوں میں رک گئے۔ میں جوزف کو لے کر پھاٹک پر پہنچا۔ پھاٹک اندر سے بند تھا۔ میں نے جوزف کو حکم دیا کہ وہ پھاٹک کھلوائے۔ جوزف نے دستک دی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ رائفل بدستور جوزف کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد اندر سے ایک بوڑھے کی کھانسی سنائی دی۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ جوزف نے جواب میں ایک دو فقرے بولے۔ پھاٹک کھل گیا۔ میں رائفل بدست تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اندرونی کمرے کی طرف سے' عورتوں کی چیخیں سنائی دیں۔ میرے سامنے کھڑا بوڑھا دہشت زدہ نظروں سے رائفل کو تک رہا تھا۔ میں نے رائفل اس کے لرزتے ہوئے سر سے لگا دی۔ اس دوران میں صفدر' زریں اور باقی ساتھی بھی پھاٹک پر پہنچ گئے۔ صفدر اور زریں تو اندر صحن میں آ گئے جبکہ غزالہ.... گلثوم اور تابی باہر ہی کھڑے رہے۔ میں نے جوزف سے انگلش میں کہا "اس سے پوچھو کہ گھر میں اور کون ہے؟"

جوزف نے میرا سوال بوڑھے تک پہنچایا۔ اس نے لرزتی کانپتی آواز میں جوزف کو جواب دیا۔۔۔ "گھر میں صرف

چار معصوم بچے اور ایک بوڑھی عورت ہے۔ اس کے علاوہ گھر میں ایک بھی قیمتی شے نہیں۔"

قیمتی شے کے بارے میں تو شاید بوڑھا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر گھر کے افراد کے بارے میں اس نے یقیناً غلط بیانی کی تھی۔ ابھی اندرونی کمرے سے مجھے ایک سے زیادہ عورتوں کی چیخیں سنائی دی تھیں۔

اسی دوران میں ہمیں ایک بوڑھی عورت اندرونی دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کی کلہاڑی تھی اور وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ نہایت تیز تیز لہجے میں اس نے کچھ کہا اور ڈری ہوئی نظروں سے ہمیں ڈرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میرے اشارے پر صفدر نے بھانک کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ ہم نے جوزف کے ذریعے سیاہ فام بوڑھے کو سمجھایا کہ ہم انہیں کسی طرح کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے' صرف چند گھنٹے یہاں رک کر چلے جائیں گے' اگر اس گھر میں کوئی عورت ہے تو وہ ہماری ماں بہن کی طرح ہے۔

بوڑھے کا خوف قدرے کم ہوا۔ ہم اسے اور جوزف کو لے کر اندر آگئے۔ بوڑھے کے کہنے پر بڑھیا نے کلہاڑی زریں گل کے حوالے کردی۔ وہ بے چاری اتنی ناتواں تھی کہ صرف کلہاڑی اٹھا کر ہی ہانپ گئی تھی۔ بوڑھا بھی کمزور اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگی نظر آرہی تھی۔ مدھم روشنی میں بھی اس کی پوری پسلیاں گنی جاسکتی تھیں۔ اس کے ماتھے پر بے شمار سلوٹیں تھیں اور گھنگریالے بالوں میں سیاہی کی بس چند لہریں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ یہ مکان چار پانچ خستہ حال کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ایک برآمدہ تھا اور جانور وغیرہ باندھنے کے لیے ایک طویل کوٹھڑی تھی۔ یہاں بجلی کا نام و نشان نہیں تھا۔ کمروں میں صرف دو گیس لیمپ روشن تھے' اتنی گرمی میں یہ لوگ پنکھے وغیرہ کے بغیر ہی گزارہ کررہے تھے۔ ایک کمرے میں چار بچے نظر آئے۔ ان میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سب سے بڑے بچے کی عمر تقریباً آٹھ سال اور سب سے چھوٹے کی تین سال تھی۔ سب سے چھوٹے کے سوا تینوں بچے جاگ گئے تھے اور سہمے سہمے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے بھی بھوک اور غربت عیاں تھی۔ جوزف کی زبانی معلوم ہوا کہ بوڑھا اور بوڑھی بچوں کے دادا دادی ہیں۔ ان کا باپ روزگار کے سلسلے میں شہر گیا ہوا ہے اور والدہ بھی گھر میں موجود نہیں۔

ہم نے اندازہ لگایا کہ بچوں کی ماں کے سلسلے میں ہم سے جھوٹ بولا جارہا ہے۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہ یہیں موجود تھی۔ شاید خطرے کی وجہ سے ساس سسر نے بہو کو کہیں چھپا دیا تھا۔

میں نے جوزف کے ذریعے بوڑھے سے کہا "دیکھو بزرگوار! ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ نہ تم ہم سے جھوٹ بولو' نہ ہم بولتے ہیں۔ گھر میں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟"

بوڑھے نے جوزف کے ذریعے جواب دیا "میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ بچوں کی ماں گھر میں نہیں ہے۔"

"لیکن جب ہم اندر آئے تو ہم نے خود ایک سے زیادہ عورتوں کی آواز سنی تھی۔"

"دوسری آوازیں بڑے بچوں کی ہوں گی۔" بوڑھے نے جوزف کے ذریعے جواب دیا۔

"جھوٹ بول رہا ہے۔" صفدر بڑبڑایا اور تفتیشی نظروں سے اردگرد دیکھنے لگا۔

مجھے بھی یقین تھا کہ ایک اور عورت موجود ہے۔ وہ یا تو اس چاردیواری میں کہیں چھپی ہوئی تھی۔ یا پھر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت زیادہ تشویش ناک تھی۔ میں نے صفدر کو جوزف اور بوڑھے جوڑے پر نگران مقرر کیا اور خود زریں کے ساتھ مل کر دوسری عورت کی تلاش شروع کردی۔ ہم نے تین کمرے اچھی طرح کھنگالے لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اب دو کمرے باقی تھے' ایک میں زریں اور دوسرے میں' میں داخل ہوگیا۔ بڑی احتیاط سے میں نے کونے کھدروں میں دیکھا۔ اچانک ایک سُریلی چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ ساتھ والے کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ میں رائفل بدست اس کمرے میں پہنچا تو زریں گل کو ایکشن میں دیکھا۔ اس نے کسی عورت کی ٹانگ پکڑ رکھی تھی اور پورے زور سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ عورت یا لڑکی کا باقی جسم لکڑی کے ایک بیڈ کے نیچے تھا۔ ٹانگ کی پوزیشن سے اندازہ ہوتا تھا کہ عورت بیڈ کے نیچے اوندھی پڑی ہے اور اس نے نیچے سے کوئی چیز مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ وہ ساتھ ساتھ چیخ بھی رہی تھی۔ زریں نے اس کی عریاں ٹانگ ٹخنے کے پاس سے پکڑ رکھی تھی اور یوں کھینچ رہا تھا جیسے کھیت میں بیٹھ کر شلجم یا مولی وغیرہ کو کھینچا جاتا ہے۔ زریں نے زیادہ زور لگایا تو بیڈ گھسٹ کر کمرے کے درمیان آگیا مگر عورت نے بیڈ کو چھوڑا نہیں۔

میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ ٹانگ چھوڑ دے۔ اس

نے ٹانگ چھوڑی تو ہم دونوں نے مل کر بیڈ کو الٹا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ہمارے سامنے ٹوٹے پھوٹے فرش پر ایک بیس بائیس سال کی لڑکی سمٹی سمٹائی پڑی تھی۔ اس سیاہ فام لڑکی کی ناک ضرورت سے زیادہ چپٹی تھی' بال چھوٹے اور گھونگریالے تھے۔ اس نے آدھی آستین کا لمبا افریقی چغہ پہن رکھا تھا' شکل و صورت کیسی بھی تھی بہرحال لڑکی جوان دکھائی دیتی تھی۔ میرے کندھے پر گن دیکھ کر وہ بری طرح نروس ہورہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ چار بچوں کی ماں نہیں ہوسکتی۔ تو پھر یہ کون تھی؟ اور ماں کہاں تھی؟ ان سوالوں کے جواب جوزف ہی کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے تھے۔ میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اس کمرے میں لے آیا جہاں سب موجود تھے۔

جوزف کو ترجمان بنا کر میں نے بوڑھے سے جو گفتگو کی وہ کچھ اس طرح تھی۔

میں نے بوڑھے سے کہا "تم تو کہہ رہے تھے کہ گھر میں اور کوئی عورت نہیں' یہ لڑکی کیا زمین میں سے اگ آئی ہے؟"

جواباً بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ منت سماجت کے لہجے میں بولا "مجھے معاف کردو۔ میں نے جھوٹ بولا۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

میں نے پوچھا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ رتابہ نام ہے۔"

"اور تمہاری بہو۔ ان بچوں کی ماں؟"

"میں نے بتایا ہے نا۔۔ کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ وہ۔۔ وہ اپنے والدین کے پاس گئی ہے۔"

"بچے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ کم از کم چھوٹے بچے کو تو جانا چاہیے تھا۔"

"وہ۔۔ ذرا ناراض ہو کر گئی ہے۔ مگر کوئی ایسی بات نہیں۔ مان جائے گی۔" بوڑھا ہکلایا۔

ہم نے محسوس کیا کہ بوڑھا اس سلسلے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ بہرحال یہ بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ گھر میں ان چار بچوں اور تین بڑوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا' نہ ہی میرے خیال میں کوئی یہاں سے فرار ہوا تھا۔ بوڑھے کی جہاں دیدہ نگاہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ہم پانی کی شدید طلب محسوس کررہے ہیں۔ اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ ہمارے لیے پانی کا انتظام کرے۔ اس کی بیٹی رتابہ پانی لینے گئی تو میں نے احتیاطاً زریں گل کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ چند منٹ بعد زریں اور لڑکی رتابہ دو لوٹا نما برتنوں میں میٹھا پانی لے کر آگئے۔ اس پانی میں کوئی خوشبو بھی ملائی گئی تھی۔ اپنی طرف سے لڑکی نے ہماری تواضع کی تھی' اس کے بجائے وہ سادہ لیکن ذرا ٹھنڈا پانی لے آتی تو ہمیں زیادہ تسکین ہوتی۔ بہرطور یہ اہلِ خانہ کی طرف سے ایک طرح کی خیرسگالی کا اظہار تھا' اس خیرسگالی کے جواب میں ہم نے بھی اپنی رائفلیں ایک گوشے میں رکھ دیں۔ جوزف کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ باقی معمر جوڑے اور ان کی بیٹی کی طرف سے ہمیں کیا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ اس گھر میں ان کا واحد ہتھیار ایک زنگ آلود کلہاڑی تھی۔ یہ کلہاڑی زریں نے اٹھا کر گھر کی چھت پر پھینک دی۔

پیاس بجھ گئی تو ہماری آنکھوں میں کچھ روشنی آئی اور ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ دوبارہ "ہرکولیس" میں قید ہونے سے پہلے ہم بردہ فروشوں کا مضبوط جال توڑنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ کم از کم اب تک تو کامیاب ہی تھے۔ گزرے ہوئے واقعات کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ فارم ہاؤس میں مارکوس کی بیوی کا ذبح ہونا۔ فارم ہاؤس سے ہمارا فرار۔ جیپ کا تعاقب' ہمارے اور جیپ سواروں کے درمیان اندھا دھند فائرنگ اور پھر جیپ کو آگ لگنا' سارے مناظر ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آئے۔ اس مقام پر مائیکل کے تین ساتھی ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دو لاشوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد سرکنڈوں کے جھنڈ میں مائیکل اینڈ کمپنی نے جو "والہانہ" فائرنگ کی تھی اس کی گونج ابھی تک ہمارے کانوں میں موجود تھی۔

صفدر کو جانوروں کی کوٹھڑی میں سے لوہے کی ایک زنجیر مل گئی۔ اس زنگ آلود زنجیر کی مدد سے اس نے مہمانِ خصوصی جوزف کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دیں اور اسے ایک نہایت "حرارت بخش" کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے بعد ہم اہلِ خانہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ بے حد مسکین اور عاجز نظر آرہے تھے۔ ان کی صورتیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ کلی طور پر ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ بوڑھے کا نام داراب تھا اور وہ بار بار میرے پاؤں کو چھونے کی کوشش کررہا تھا۔ غالباً وہ اس بات پر معذرت خواہ تھا کہ اس کی سٹھیائی ہوئی بیوی نے ہم پر کلہاڑی اٹھانے کی گستاخی کی تھی۔

میں نے اشاروں کنائیوں میں بوڑھے داراب کو تسلی دینے کی کوشش کی' اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم اس "اعلانِ جنگ" کو بھول چکے ہیں اور سامانِ جنگ (یعنی

کلہاڑی) ہم نے اٹھا کر کوٹھے پر پھینک دیا ہے' لہٰذا وہ بھی اس بات کو بھول جائے۔ اب رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ ضروری تھا کہ ہم بھی تھوڑا سا آرام کرلیں۔ اہلِ خانہ کو کمرے میں بند کرکے ہم نے باہر سے تالا لگا دیا۔ خود ہم برآمدے میں لیٹ گئے۔ زمین پر ہی ایک بڑا سا گدا بچھا ہوا تھا۔ کچھ موٹی چادریں بھی یہاں موجود تھیں۔ یہ چادریں اوپر لینے کے لیے تھیں۔ اکثر صحرائی لوگ گرمی سے مقابلہ کرنے کا اپنا ایک انداز رکھتے ہیں۔ وہ بغیر کسی پنکھے یا اٹر کولر کے بند کمرے میں لیٹتے ہیں اور اوپر سے کوئی گرم کپڑا بھی لے لیتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کا لباس اور وہ خود پسینے میں تر ہوجاتے ہیں۔ یوں خود بخود قدرتی طور پر ان کے لیے ٹھنڈک کا انتظام ہوجاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گرمی کی انتہا ہی ان کے لیے سکون کا باعث بن جاتی ہے۔ اس گھر کے افراد بھی یقیناً اسی طریقے سے گرمی کا سامنا کرتے تھے' اس سے پہلے فارم ہاؤس میں بھی ہم چند افریقیوں کو سخت گرمی میں کمبل اوڑھے دیکھ چکے تھے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے سوتے جاگتے گزارا۔ غزالہ اور گلشوم تو بالکل نہیں سو سکی تھیں۔ صفدر' زریں گل اور میں نے باری باری آنکھ جھپک لی تھی۔ ہم اس وقت سخت غیر یقینی حالات میں تھے۔ مائیکل اور اس کے ساتھیوں سے ہمیں ابھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ یہ بات ناممکن تھی کہ وہ ہمیں کھو کر آرام سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ یقینی بات تھی کہ وہ ہمیں پوری قوت اور سرگرمی سے ڈھونڈ رہے تھے۔ بے شک یہ مکان "وقوعہ" سے کافی فاصلے پر تھا اور ویسے بھی درختوں میں گھرا ہوا تھا' مگر کسی وقت بھی وہ لوگ یہاں پہنچ سکتے تھے۔

بہرحال رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ہم نے جوزف کی مدد سے اہلِ خانہ اور قرب وجوار کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ یہ مسلمان فیملی تھی۔ داراب گھرانے کا سربراہ تھا۔ وہ دے کا پرانا مریض تھا اور کام کاج سے قاصر تھا۔ اس کا ایک بیٹا اس سے علیحدہ ہوچکا تھا۔ اب وہ اپنے چھوٹے بیٹے واحد اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ گھر کے اردگرد کی اجاڑ زمین ان لوگوں کی اپنی تھی۔ اس زمین میں یہ لوگ چاول اور چائے وغیرہ کاشت کرتے تھے' مگر پچھلے دو سال سے بارشیں نہ ہونے کے برابر ہوئی تھیں لہٰذا فصلیں اجڑ کر رہ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ داراب اور اس کے اہلِ خانہ کو روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔ شکم سیر ہو کر تو انہوں نے پہلے بھی کبھی نہیں کھایا تھا اب مسلسل فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ مجبور ہو کر واحد نے قریبی شہر IRINQA کا رخ کیا تھا۔ چند ماہ اس نے تھوڑی تھوڑی رقم بھیجی تھی اب دو ماہ سے اس کی طرف سے بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ داراب اور دیگر اہلِ خانہ کی حالت بہت پتلی تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں وہ اپنی دو لاغر بکریاں ذبح کرکے کھا چکے تھے' اب ان کے پاس ذبح کرنے کو بھی کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ سارا دن بھی ہم نے داراب کے گھر میں چھپ کر گزارا۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی طرح قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد عین ممکن تھا کہ اپنے سفارت خانے تک بھی ہماری رسائی ہوجاتی' مگر فی الحال تو پولیس اسٹیشن تک پہنچنا بھی دشوار تھا۔ درحقیقت یہ تنزانیہ کے ساحل کا ایک غیر آباد اور دشوار علاقہ تھا۔ قریبی پولیس اسٹیشن بھی کم وبیش تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ تیس کلو میٹر طے کرنے کا خطرہ ہم کسی صورت مول نہیں لے سکتے تھے۔

گھر میں راشن نہ ہونے کے برابر تھا۔ مٹھی بھر چاول اور تھوڑی سی خشک کھجوریں تھیں۔ جوزف کی پتلون کی جیب سے ہمیں کچھ مقامی کرنسی مل گئی تھی۔ اس کرنسی کی مدد سے راشن خریدا جاسکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس خریداری کے لیے جائے کون؟ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے داراب کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ داراب سمجھ دار تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو اس کے اہلِ خانہ سخت مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گے اور اس سے بھی اہم ایک بات یہ تھی کہ اسے ہماری اندرونی شرافت پر یقین آگیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اگر وہ ہم سے سیدھا سیدھا چلتا رہا تو ہم بھی سیدھے سیدھے چلتے رہیں گے' ہماری طرف سے اس کے اہلِ خانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور جیسے ہی ہمارے لیے صورتِ حال بہتر ہوئی ہم اس کے گھر سے چلے جائیں گے۔

بوڑھا داراب قریباً ایک گھنٹے بعد کچھ دالیں اور چاول وغیرہ لے آیا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا سب سے چھوٹا پوتا مسلسل روتا رہا' اس کے آنے کے بعد بھی بچے کے رونے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ اتنے درد سے رو رہا تھا کہ ہمارے دل بھی بے چین ہوگئے۔ وہ بار بار ایک لفظ پکار رہا تھا' جوزف کے ذریعے پتا چلا کہ وہ ماں کے پاس جانا چاہتا ہے۔ سب سے چھوٹے بچے کے لیے ماں کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے' کئی بچے تو چند منٹ کے لیے بھی خود کو ماں سے دور نہیں رکھ سکتے۔ یہ بچہ بھی ماں کے بغیر کچھ ایسی ہی بے قراری محسوس کررہا تھا۔ وہ روتے روتے نڈھال ہوجاتا تو کچھ دیر کے

لیے خاموش ہوجاتا' تب ایک بار پھر نئے سرے سے رونا شروع کردیتا۔ اس کا نام ناصر تھا۔ مقامی خدوخال کے لحاظ سے وہ ایک خوب صورت بچہ تھا' مگر ماں کی مسلسل جدائی میں رو رو کر وہ مرجھا گیا تھا۔ اس کی ناک مسلسل بہہ رہی تھی اور آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ غزالہ نے اسے چیک بھی کیا کہ شاید اسے کوئی تکلیف ہو لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی' ویسے بھی اس کی عمر تین سال کے لگ بھگ تھی' اس عمر کا بچہ اپنی تکلیف بتا سکتا ہے۔ ناصر بھی بتا رہا تھا' وہ اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا تھا۔

نجانے کیوں میری چھٹی حس اب بھی یہی کہہ رہی تھی کہ داراب اپنی بہو کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ کچھ چھپا رہا ہے وہ ہم سے۔ جلتے سورج کے نیچے پہاڑ سا گرم دن گزر گیا اور شام ہوگئی۔ رات کو بھی بچہ مسلسل روتا رہا۔ بچے سے بڑی بچی کی عمر بھی بمشکل چار پانچ سال تھی' وہ بھی گاہے گاہے ماں کے لیے ٹھنکنے لگتی تھی۔ رات ہوتے ہی ہم سب کو "مچھر کا تیل" لگانا پڑا۔ میں چٹائی پر لیٹا تو آنکھوں کے سامنے اتر پردیش قیدیوں کی معصوم صورتیں گھومنے لگیں۔ وہ میرے ساتھ بہت مانوس ہوچکے تھے۔ پتا نہیں اب وہ کس حال میں تھے۔ گاہے گاہے پروفیسر اور شائستہ کا خیال بھی ذہن میں آرہا تھا۔ وہ باپ بیٹی مائیکل کے ہاتھوں سخت مشکل میں گرفتار تھے۔ رات قریباً دس بجے کے لگ بھگ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم اس قسم کی صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ سب لوگ پچھلے کمرے میں چلے گئے۔ ہماری موجودگی کی جو ایک آدھ نشانی آس پاس موجود تھی فوراً ہٹا دی گئی۔ میں اس لمبوتری کوٹھڑی میں چلا گیا جو کوئلہ وغیرہ باندھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ رائفل میرے پاس موجود تھی اور کوٹھڑی کے اندر سے میں پورے صحن اور برآمدے وغیرہ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق بوڑھے داراب نے پھاٹک کھولا۔ سامنے ایک لحیم شحیم افریقی کھڑا نظر آیا۔ اس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا' اس کی مونچھیں گھنی تھیں اور چہرے سے کھاتے پیتے گھرانے کا نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر داراب خوف زدہ نظر آنے لگا۔ درمیانی قد کے لحیم شحیم شخص نے داراب کو ایک گٹھڑی دی جو اس نے کچھ دیر ہچکچانے کے بعد لے لی۔ ایک وزنی تھیلا بھی اس شخص نے داراب کو دیا اور رعونت بھرے انداز میں کچھ کہنے لگا۔

جواب میں داراب معمول سے زیادہ عاجز اور کم تر نظر آنے لگا۔ وہ مقامی زبان میں لحیم شحیم شخص سے کچھ گزارش کرنے لگا۔ اس کا لہجہ منت سماجت کا تھا اور وہ بار بار نووارد کے پاؤں چھونے کی کوشش بھی کررہا تھا۔ جواب میں نووارد کا لب ولہجہ جارحانہ تھا اور وہ داراب کی منت سماجت کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ داراب کی سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ شخص واپس چلا گیا۔

میں پانچ دس منٹ کوٹھڑی کے اندر ہی رہا۔ واپس کمرے میں پہنچا تو منظر کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ نووارد کی دی ہوئی گٹھڑی کھلی پڑی تھی' اس میں بچوں کے رنگ دار کپڑے اور کچھ کھلونے تھے۔ تھیلے میں راشن بھرا ہوا تھا اور مٹھائی وغیرہ تھی۔ دونوں بڑے بچے مٹھائی کھا رہے تھے۔ چھوٹی بچی ایک گڑیا سے کھیلنے لگی تھی' مگر ننھا بچہ ناصر مسلسل رو رہا تھا۔ اس کی دادی بار بار اسے کھلونے سے بہلانے کی کوشش کررہی تھی' مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

میں نے جوزف کے ذریعے داراب سے پوچھا کہ ابھی جو شخص یہاں آیا وہ کون تھا؟

داراب نے بتایا "ہمارا دور کا رشتے دار ہے۔ شہر میں رہتا ہے۔ کافی کھاتا پیتا ہے۔ اپنی خوشی سے بچوں کے لیے سامان لے کر آیا ہے۔"

میں نے کہا "داراب! تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ بات کچھ اور ہے۔ وہ شخص تمہارے ساتھ بڑے غصے سے بات کررہا تھا۔ تم مسلسل اس کی منت سماجت میں مصروف تھے۔ میں نے صحن کے کمرے میں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

داراب کے جھریوں بھرے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ وہ سنبھل کر بولا "ایسا کچھ نہیں تھا' آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

میں نے داراب کو سخت الفاظ میں سمجھایا کہ وہ چکر دار بات کرنے کی کوشش نہ کرے' ورنہ سب کا نقصان ہوگا۔

داراب ہراساں نظر آنے لگا' اور اسے ہراساں دیکھ کر اس کی بیٹی بھی نروس ہوگئی۔ وہ خاص طور پر زریں گل سے بہت ڈر رہی تھی' زریں گل اسے گھورتا بھی ہلاکو خاں کی طرح تھا۔ دراصل کل رات جب زریں نے رتابہ نامی اس لڑکی کو بستر کے نیچے سے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے زریں کے منہ پر لات دے ماری تھی۔ بعد میں زریں نے بھنا کر اس کی ٹانگ پکڑلی اور جھٹکے دے دے کر اس کا انجر پنجر ہلا دیا۔ اب ان دونوں کے درمیان مخاصمت کی فضا موجود تھی۔

میں نے جوزف سے کہا کہ وہ داراب کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا جائے اور باتوں باتوں میں اس سے سچ اگلوائے کہ سامان دے کر جانے والا شخص کون ہے۔

جوزف کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ زنجیر بیڑی کی طرح پاؤں میں ڈال دی گئی تھی۔ وہ دو فٹ سے لمبا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق جوزف بوڑھے داراب کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ ان کے درمیان آدھ پون گھنٹا گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں لڑکی روتا یہ روتی رہی اور چاروں بچے بالکل سہمے بیٹھے رہے۔

گفتگو کے اختتام پر جوزف نے باہر آکر انکشاف کیا کہ داراب کی بہو میکے نہیں گئی بلکہ اسے ایک مقامی شخص زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ وہی لحیم شحیم شخص تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے گٹھڑی اور تھیلا لے کر آیا تھا۔

یہ ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ جوزف نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس شخص کا نام جلال ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر کافی کے چند کھیت اس کی ملکیت ہیں' اس کے علاوہ یہ ناریل کے تیل کی خرید و فروخت بھی کرتا ہے۔ تین چار برس سے اس نے داراب کی بہو پر بری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں وہ اتنا دلیر تھا کہ داراب کے علاوہ اس کے بیٹے واحد کو بھی برملا لالچ دیتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ واحد نے اپنے گھر میں اس کا آنا جانا بالکل بند کر دیا۔ اب چونکہ پچھلے کئی ماہ سے داراب اور اس کے اہل خانہ سخت ابتلا میں تھے' لہٰذا جلال پھر سے متحرک ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فاقہ کشی انسان کی عزتِ نفس پر کاری ضربیں لگاتی ہے اور اس کی مزاحمت کی قوت کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا اور انہیں اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر یہ کوششیں بار آور نہیں ہو رہی تھیں' اسی دوران میں ان لوگوں کے حالات زیادہ خراب ہو گئے اور واحد کو محنت مزدوری کے لیے شہر جانا پڑ گیا۔ واحد کی غیر موجودگی میں جلال اور بھی شیر ہو گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک ہفتہ پہلے وہ داراب کی بہو "بدر" کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ اس نے جاتے جاتے دھمکی دی کہ اگر داراب نے شور مچایا یا پولیس تک پہنچنے کی کوشش کی تو صورتِ حال مزید بری ہو جائے گی۔ اس نے اشارہ دیا کہ بہو کے بعد اس کی بیٹی کی باری بھی آسکتی ہے۔ وہ اثر و رسوخ والا شخص تھا' بوڑھا داراب اور اس کی بیوی لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ مفلسی اور ناتوانی نے انہیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دو روز بعد بوڑھا داراب جلال کے ڈیرے پر پہنچا اور اس سے کہا کہ وہ اس کی بہو کو واپس کر دے' مگر جلال نے اسے دھتکار کر واپس بھیج دیا۔ اب چھ روز ہو چکے تھے' بچے حد درجہ پریشان تھے۔ باپ کے بعد اب ماں بھی ان کے پاس نہیں تھی۔ خاص طور سے چھوٹا بچہ ناصر تو ماں کے بغیر بے حال تھا۔ وہ ماں کے بغیر پل نہیں گزارتا تھا اب اسے ماں کے لیے روتے چھ دن اور چھ راتیں ہو گئی تھیں۔ آج جلال نے ان پر احسان عظیم کیا تھا اور بچوں کے لیے کپڑے اور راشن وغیرہ دے کر چلا گیا تھا لیکن "بدر" ابھی بھی اس کے پاس تھی۔ بوڑھے داراب کی منت سماجت نے جلال پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ الٹا وہ داراب کو سمجھانے لگ گیا تھا کہ اگر وہ لوگ اس کی مرضی کے مطابق چلتے رہیں تو ان کے فاقہ زدہ گھر میں خوش حالی کا دور دورہ ہو جائے گا۔

میں نے جوزف سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟"

وہ زہر خند انداز میں بولا "ابھی تو تم لوگ تشریف لائے ہو' ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہاں ہر قدم پر ایسے ہی مسئلے مسائل نظر آئیں گے' کس کس کو سلجھاؤ گے۔"

صفدر نے پوچھا "کیا یہ جلال نامی بندہ واقعی اتنے اثر و رسوخ والا ہے۔"

"اثر و رسوخ نہ بھی ہو تو یہاں سب چلتا ہے' اصل چیز پیٹ کی بھوک ہے جو ان لوگوں کے پاس ہے' اور اصل چیز خوراک ہے جو جلال کے پاس ہے۔ میری بات شاید تمہارے دل کو نہ لگے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں داراب اور اس کے گھر والوں کا بھی قصور ضرور ہو گا۔ کمانے والا مرد تو گھر سے چلا گیا' باقی بڈھا بڈھی اور بچے رہ گئے ہوں گے' جلال ان کو ہڈی ڈالتا رہا ہو گا یہ اٹھاتے رہے ہوں گے' پھر اس کا حوصلہ بڑھ گیا ہو گا اور وہ "گھر والی" کو اٹھا کر لے گیا ہو گا۔ یہ پیٹ کی آگ ایسی ہی کتی چیز ہوتی ہے۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات بارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں
جو کہ جون 2001ء کو شائع ہو گا۔